سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ سرگزشت
جون 2012
معراج رسول
سے یورپ آج بھی تھراتا ہے
نہایت دلچسپ سچ بیانی

سرگزشت
ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارف خاص
15 — **اصول پرست** — ادارہ

گفت و شنید
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال
16 — **شہرِ خیال** — مدیر اعلیٰ

شخصیت
روح کی بالیدگی ذہن و دل کی تازگی کے لیے ایک سرفروش کی داستانِ حیات
24 — **مجاہدِ اعظم** — ڈاکٹر ساجد امجد

واقعات عالم
وہ ظالم ترین افراد تھے ان کے خوف سے ایک جہان لرزنے لگا تھا
45 — **لرزیدہ یورپ** — مریم کے خان

تحقیق
وہ ایک بڑی شخصیت تھی مگر اسے دی گئی سزا بھی بہت ہی بھیانک تھی
67 — **قاتل ہیرو** — مختار آزاد

جرم کہانی
وہ اس شہر کے محکمہ پولیس کو سہارا دینے کے لیے آیا تھا اور سب کا پیارا بن گیا
85 — **عقل مند** — سید احتشام

عزم و حوصلہ
عزم و حوصلے سے پل پل قریب آتی موت کو وہ پیچھے دھکیلتا رہا تھا
94 — **جوان ہمت** — طارق عزیز خان

معلومات
ماں باپ کے پیار کو ترسی ہوئی لڑکی نے ایک ملک کا تاج پہن کر راج کیا
109 — **کیتھرین** — ابن کبیر

فلم و صحافت
فلم و صحافت کی کہی ان کہی باتیں بھولی بسری یادیں
128 — **فلمی الف لیلہ** — علی سفیان آفاقی

زندگی نامہ
اس دنیا میں کیسے کیسے عجیب و غریب قوتوں کے حامل لوگ پائے جاتے ہیں
141 — **پراسرار بندے** — عائشہ جونیجو

سفر کہانی
اس ملک کا تذکرہ جہاں قانون کا احترام باقی ہے جہاں بجلی چلی جائے تو حکومت ہرجانہ ادا کرتی ہے
149 — **شہریوں کا شہر** — ایس جی یزدانی

چشم کشا
ایک معمولی بندے کے جذبات نے پورے ملک میں انقلاب لا دیا تھا
161 — **ڈنک** — جاذب احتشام

واقعات
ماضی قریب کی ایک عورت کے حوصلے کا قصہ ایک دلچسپ واقعہ
171 — **بھنور جال** — محمد ایاز راہی

معاشرت
بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان، لہو گرم کرنے والی تحریر
170 — **سراب** — کاشف زبیر

شعر و ادب
شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ
215 — **بیت بازی** — قارئین

انعامی مقابلہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ
218 — **علمی آزمائش** — ادارہ

پہلی سچ بیانی
محبت کرنے والے قربانیوں کی مثال قائم کرتے ہیں
220 — **کہانی محبت کی** — اشعر علی

دوسری سچ بیانی
میاں بیوی کی محبت میں ایک تیسرے کو بھی شامل کرنے کا انوکھا تجربہ
231 — **تجربہ** — فیصل اختر

تیسری سچ بیانی
اسے شرط لگانے کی عادت تھی کبھی کبھی سیر پر سوا سیر بھی پڑ جاتا ہے
237 — **آخری شرط** — بدرالدین

چوتھی سچ بیانی
اس نے نعال کا دل دکھایا تھا اس لیے اس کی زندگی دکھوں کی تصویر بن گئی
243 — **دعائے بد** — ڈاکٹر فرحان احمد

پانچویں سچ بیانی
وہ نقاب سے جھانکتی دو آنکھوں کا اسیر بن چکا تھا
257 — **آئینہ** — منظر امام

چھٹی سچ بیانی
ایک جعل ساز گروہ کی جعل سازی کا قصہ عیاری کا فسانہ
263 — **جھانسا** — ڈاکٹر نور احمد

ساتویں سچ بیانی
وہ [illegible] کو حاصل کرنے کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا
260 — **جنس** — [illegible]

آٹھویں سچ بیانی
اس نے گاؤں سے جاتے جاتے ایک غلطی کر دی تھی
277 — **منزل** — عبدالرحیم

نویں سچ بیانی
[illegible]
285 — **آس کے جگنو** — فراز علی

سوغات
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے
000 — **پارچے** — قارئین / ادارہ

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

جلد 22 ❖ شمارہ 08 ❖ جون 2012ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی بخش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

مہنگائی، بے روزگاری، خون ریزی...... اربابِ اختیار کی بے حسی، قانون کی ناقدری، سیاست کی بازیگری ان سب پر تواتر سے لکھا جا رہا ہے لیکن اب اکتاہٹ ہونے لگی ہے اس لیے کہ مسائل در مسائل کا ایک دریا سا بہنے لگا ہے۔ جہاں شکر کی قیمت میں ایک چونی (چار آنے) بڑھنے پر حکومت ڈگمگائی تھی اسی ملک میں اب ہر روز ہر چیز کی قیمت میں مسلسل اضافہ ہوتا ہی چلا جا رہا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ اربابِ اختیار تو عوامی مسائل سے "ناواقف" ہیں ہی خود ساختہ قومی رہنما یا حسبِ اختلاف بھی اس بارے میں زبان کھولنے سے گریزاں ہیں۔ ہاں تقریب میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے مہنگائی کی دہائی دے دی جاتی ہے لیکن اس سلسلے میں زیادہ غور کرنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ سیاسی پارٹیاں الزام تراشی اور انا پرستی جیسے خود ساختہ اہم مسائل سے نمٹنے میں ہی سارا زور لگا رہی ہیں تو پھر مہنگائی اور دیگر عوامی مسائل کے لیے وقت کہاں سے نکالیں کیونکہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے گر کوششیں کی جائیں گی تو اس میں صاحبانِ قضا و قدر کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اسی لیے ہم مصحفی کے اس شعر پر اکتفا کر لیتے ہیں

رہنے دو میرے سینے میں پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہر خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو

معراج رسول

اصول پرست

سرگزشت

15 اگست 1913ء کو سیالکوٹ کے قصبے بدوملہی میں ایک زمیندار ہوا کرتے تھے۔ نام ان کا چوہدری غلام حیدر تھا۔ ان کا شمار پنجاب کے چند بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے حقیقی غم خوار تھے اور صحیح معنوں میں ان کے مسائل حل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے زوال نے انہیں بے حد افسردہ کر دیا تھا لیکن سرسید کی تحریک ان کے لیے تقویت کا باعث تھی۔ دیگر زمینداروں کے برعکس وہ مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ اس ادارے میں بچوں کو داخلہ دلوانے کے لیے انہوں نے باضابطہ تحریک چلائی تھی۔ اپنے بیٹے کو وہ چاہتے تو دیگر بڑے زمینداروں کی طرح معروف پرائیویٹ اسکول میں بھیج سکتے تھے لیکن انہوں نے اسے بھی اپنے ہی اسکول میں مزارعوں کے بچوں کے ساتھ بٹھایا۔ اس تعلیمی ادارے میں کسی کو کسی پر فوقیت دینے کی پابندی تھی۔ صرف قابلیت کو ترجیح دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹے کو بھرپور محنت کرنا پڑتی تھی۔ اسی اسکول سے ان کے بیٹے نے میٹرک پاس کیا پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا جہاں سے اس نے گریجویشن کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی لا کالج سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی اور وکالت کے پیشے میں آ گیا۔ وکالت کے لیے آبائی شہر سیالکوٹ کو پسند کیا۔ خدمتِ خلق خون میں شامل تھی اس لیے عوام سے زیادہ قریب تھے۔ آہستہ آہستہ سیاست کی جانب مائل ہونے لگے۔ سیاست کا آغاز کیا انڈین نیشنل کانگریس سے۔ 1939ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ کے رکن منتخب ہوئے لیکن جب مسلم لیگ نے سالانہ کنونشن میں قراردادِ لاہور منظور کی تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ مسلم لیگ میں آ گئے۔ 1944ء میں پنجاب مسلم لیگ کنونشن میں قائداعظم کو شرکت کی دعوت دینے وہ خود بھی گئے اور وہیں ان کی ملاقات نواب بہادر یار جنگ سے ہوئی۔ انہوں نے انہیں بھی کنونشن میں شرکت کی دعوت دی۔ کنونشن ہوا اور اتنا کامیاب ہوا کہ خضر حیات ٹوانہ کی حکومت ہل گئی۔ قیامِ پاکستان کے حق میں انہوں نے پورے پنجاب میں کنونشن، کانفرنس اور جلسے کرائے مگر ان جلسوں پر خرچ ہوئی رقم ان کی ذاتی تھی۔ وہ اپنی جائداد بیچ کر کارکنوں کی فوج تیار کرتے رہے، اسی فوج نے خضر حیات ٹوانہ کی حکومت کو گرا کے مسلم لیگ کو پنجاب میں مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قیامِ پاکستان تک ان کی آدھی سے زائد جائداد بک چکی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہیں وزیرِ تعلیم کا قلم دان ملا تو انہوں نے پہلا حکم نامہ جاری کیا کہ ایچی سن کالج کی سرکاری گرانٹ بند کی جائے۔ کیونکہ یہ کالج امرا کے بچوں کے لیے ہے اس لیے اخراجات امرا کو دینے چاہئیں۔ اسکول اور کالجز میں طبقاتی فرق مٹانے کے لیے ایک یونیفارم کا اعلام نافذ کیا۔ وزیر ہوتے ہوئے بھی ملکی دوروں اور دوستوں کی مدارات پر خرچ خود کرتے۔ سرکاری رقوم کو عوام کی کمائی کہتے اور اس کے زیاں کو حرام قرار دیتے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ جن دنوں روز ویلٹ جنرل اسمبلی کی صدر تھیں، بھارتی مندوب نے مادام کے اعزاز میں استقبالیہ دینے کی لابنگ شروع کی۔ انہوں نے بھی پاکستان کی جانب سے لابنگ شروع کر دی۔ مہم کامیاب قرار پائی۔ اس استقبالیہ میں اقوامِ متحدہ کے تمام رکن ممالک نے شرکت کی اور یہ ایک کامیاب ترین سیاسی تقریب قرار پائی۔ اس دعوت کے تمام اخراجات انہوں نے اپنی جیب سے ادا کیے۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اخراجات حکومت پاکستان سے لے لیں تو انہوں نے جواب دیا "یہ دعوت میں نے صرف ملک کا وقار بلند کرنے کے لیے اپنے طور پر دی تھی پھر میں عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر ڈاکا کیوں ڈالوں؟" وطن کا یہ سچا خدمت گزار، اعلیٰ سیاست داں، ایک دردمند دل رکھنے والا 1991ء میں اچانک دل کے دورے سے بدوملہی میں اپنی حویلی کی دہلیز پر گرا اور روح عرشِ بریں کی جانب پرواز کر گئی۔ اس اصول پسند سیاست داں کا پورا نام چودھری نصیر احمد عرف لارڈ ملہی تھا۔

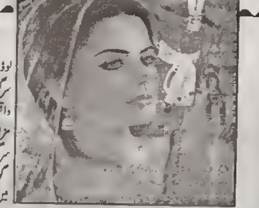

شہر خیال

☒ ایم اے خالق بھٹی کا مکتوب خلوص، اللہ آباد، رحیم یار خان سے ''اداریہ میں لوڈشیڈنگ کا ذکر تھا۔ اب تو لوڈشیڈنگ ہماری زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ مختصر سرگزشت میں مشہور زمانہ قلم کار محمد عمر المعروف شوکت تھانوی کے حالاتِ زندگی سے واقفیت ہوئی۔ بلاشبہ وہ مزاح لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سودیشی ریل جیسی مزاح سے بھرپور کہانی کا جواب آج تک کوئی لکھ نہیں پایا۔ کرشن چندر کی ایک گدھے کی سرگزشت اور سودیشی ریل یہ دو طویل کہانیاں طنز کی دنیا کا اثاثہ ہیں۔ ساجد امجد کی پیش گو میں بھی بنی اسرائیل کے حضرت دانیال علیہ السلام کا ذکر بڑے خوبصورت پیرائے میں پڑھنے کو ملا ہے۔ ابن کبیر کی استنبول کا عاشق پڑھ کر احساس ہوا کہ مسلمان ادیب کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مسلمانوں میں پہلے ادیب ہیں جن کو نوبل پرائز ملا۔ سلیم فاروقی کی جنونِ آزادی پڑھی۔ سلیم فاروقی صاحب سرگزشت میں آپ کی مزید تحریریں پڑھنے کا انتظار رہے گا۔ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے، اس کا ادراک صرف انہیں ہے جو غلام ہیں۔ ہم بھی آزاد ہیں اس لیے آزادی کی قدر نہیں کر رہے۔ کس طرح آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی یہ قابلِ تعریف ہے۔ باربی ڈول کی دوسری و آخری قسط محمد اختر کے قلم سے اختتام پذیر ہوئی۔ انکل علی سفیان آفاقی بھی صحت یاب ہو گئے ہیں ان کی درازی عمر اور صحت کاملہ کے لیے دعا گو ہوں۔ تنویر ریاض کے قلم سے شوبزنس کے معروف رائٹر جاوید اختر کی کتھا مقدر کی بات کے نام سے پڑھی ہے، اچھا لکھا ہے محمد امجد نے سائنٹولوجی کے نام سے ایک نئے مذہب سے متعارف کرایا ہے۔ شہید مرتے نہیں، زین مہدی کا نیک ہستیوں کے بارے میں پڑھا۔ راجا ثاقب نواز ثاقب کرسی صدارت پر جگمگ کرتے نظر آئے۔ سرکار کوششیں جاری رکھیں۔ مسز سدرہ بانو ناگوری اب آپ جیسی خواتین کو چاند بی بی والا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ اعجاز حسین سنخار، آپ کے تبصرے نے دو ماہ کی کسر پوری کر دی۔ سعید احمد چاند، ملک ثاقب شاد تنولی، مونا گل، مجاہد مصطفیٰ کوریہ، رانا شاہد، محمد ایاز راہی، افتخار احمد گمسن، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، معراج الدین، منظر علی خان، رانا حبیب الرحمٰن کے اچھے تبصرے اور معلوماتی تھے۔ رانا محمد ساجد بڑا ہی طویل تبصرہ لکھا ہے جی۔ مسز طاہرہ گلزار، کوئی کسی کو نہیں تھپاتا، بس ایک دوسرے کو سمجھنے کی کمی ہوتی ہے۔ اب دیکھیے ہمارے ملک کی ستر فیصد آبادی ناخواندہ ہے، ان کو بھی تعلیم یافتہ افراد کے برابر ووٹ کا حق حاصل ہے۔ میرے خیال میں ان ناخواندہ افراد کے ووٹوں کی سزا سب بھگتتے چلے آ رہے ہیں۔ سہیل احمد عباسی، جوانی میں نسیان کی بیماری لگ چکی ہے!''

☒ خالد کبیر کا مکتوب، لاہور سے '' کچھ عرصہ سے نجی معروفیات کے باعث بیرونِ ملک تھا، واپسی پر سرگزشت پڑھا۔ میں شہر خیال کے افراد کا مشکور اور ممنون ہوں جنہوں نے میرے سالانہ تجزیہ کو سراہا اور جنہوں نے خامیوں کی طرف نشاندہی کی۔ آیندہ ان خامیوں کو دور کروں گا۔ اس دفعہ کا اداریہ پڑھا جس میں شہر کراچی کی خصوصی اور پاکستان کی عمومی صورتِ حال کے بارے میں پڑھا۔ آپ نے درست لکھا کہ بے روزگاری نے نوجوان نسل کو جرائم کی طرف ڈال دیا ہے۔ لوڈشیڈنگ، مہنگائی اور امن وامان کی صورتِ حال نے پاکستان کے لوگوں کو نفسیاتی مریض بنا دیا۔ ہر کوئی شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ بے یقینی ہر طرف پھیل رہی ہے، کچھ معلوم نہیں کہ آیندہ آنے والا وقت کیسا ہوگا؟ یک ملی سرگزشت میں شوکت تھانوی صاحب کا تعارف ہوا۔ شہرِ خیال میں داخل ہوا تو راجا ثاقب نواز ثاقب کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ تبصرہ خوب لکھا۔ سدرہ بانو ناگوری نے کراچی کی صورتِ حال کے بارے میں لکھا۔ اعجاز حسین سنخار کا خط بہترین لگا۔ سعید احمد چاند، ملک ثاقب شاد تنولی، مونا گل، ایم اے خالق بھٹی، رانا محمد شاہد، محمد ایاز راہی، طاہرہ گلزار، سہیل عباسی، افتخار احمد گمسن، معراج الدین، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی کے خطوط اچھے رہے۔ منظر علی خان، رانا محمد سجاد کے تبصرے خوب رہے۔ ان خطوط میں یہ بات بھی نمایاں رہی کہ اس ملک کا نوجوان باصلاحیت ہے اور ہمیں ان صلاحیتوں کو اُجاگر کر کے اس معاشرے میں بے یقینی کی فضا کو دور کرنا چاہیے۔ اخبارات ان کے انٹرویو شائع کرے۔ درجنوں نجی چینلز ہیں ان کو سامنے لائیں۔ سیاست دانوں کے ٹاک شوز کی جگہ ایسے نوجوانوں کے کارنامے عوام کو دکھائے جائیں تاکہ ان کے نقشِ قدم پر کئی نوجوان چلیں۔ حضرت دانیالؑ کے چند واقعات میں نے بچپن میں اپنے والد صاحب مرحوم ومغفور سے سنے تھے جس میں شیروں کے آگے آپ کو ڈال دیا گیا لیکن شیر آپ کو کچھ نہ کر سکے۔ استنبول کا عاشق میں نوبل انعام یافتہ ادیب کے بارے میں پڑھا۔ ان کا نام تو سن رکھا تھا لیکن

ان کی داستانِ حیات بھی پڑھی۔ شروع میں ناکامیوں سے واسطہ پڑا۔ تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن آخرکار کامیاب ادیب کہلائے۔ ایک استنبول کے عاشق پنجاب کے وزیراعلیٰ صاحب بھی ہیں جو لاہور کو استنبول جیسا شہر بنانے کے شوق میں پُرجوش ہیں۔ چند ماہ قبل استنبول کے مہر بھی لاہور آئے۔ استنبول بنانے کے لیے اس کو مزید بدصورت بنایا جا رہا ہے، کئی جگہ سے سڑکیں توڑ دی گئیں۔ سیوریج کے پائپ سڑکوں کے کنارے پڑے ہیں۔ جانے کب یہ کام مکمل ہوں گے۔ علی سفیان آفاقی ایک عرصے کے بعد فلمی الف لیلہٰ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ جاوید اختر ہندوستانی فلمی صنعت سے وابستہ شاعر اور ادیب کی سرگزشت بھی اس دفعہ پڑھنے کو ملی۔ سائنٹولوجی میں ایک پُراسرار مذہب کا تعارف ہوا۔ حیرت اس بات کی ہوئی کہ کراچی کے چند افراد نے اس کے بانی کا جنم دن منایا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کراچی کے حالات نے لوگوں پر کیسے اثرات مرتب کیے۔ ایک منگیتر نے کس طرح انتقام لیا۔ لیکن اس میں لڑکی کا قصور نظر آتا ہے۔ جب اس نے دولت کی خاطر اپنے شوہر کو چھوڑ دیا جس کا نتیجہ بہت بھیانک نکلا۔ کمبل میں ایسے شخص کا قصہ پڑھا جو محبت کر کے بُری طرح پھنس چکا ہے۔ شاید یہ لڑکی اس کو تب تک نہیں چھوڑے گی جب تک کوئی اور اسامی کو اپنے حسن میں گرفتار نہ کر لے۔''

☒ اعجاز حسین سنخار، نور پور تھل سے لکھتے ہیں'' پرچہ ہاتھ آیا تو لسٹ چیک کی اور برادرم علی سفیان آفاقی کا نام پڑھ کر دل خوش ہو گیا اور سارے سلسلوں کو چھوڑ کر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ مختلف ڈاکٹروں اور حکیموں کے بارے میں پڑھا تو خود کو بیمار محسوس کرنے لگے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ایسی قابلِ قدر شخصیات کے ہنر سے فائدہ اُٹھانے سے محروم رہے جس کی وجہ کم علمی اور لاہور سے دوری ہے۔ مقدر کی بات میں جاوید اختر کے متعلق معلومات مختصر ہیں لیکن جامع اور مکمل ہیں۔ واقعی وہ مقدر کے سکندر ہیں۔ سلیم کے بعد اکیلے بھی کامیابیاں سمیٹیں اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بھی تصویر میں چاق وچوبند نظر آ رہے ہیں۔ جس سے لگتا ہے، وہ ابھی لمبے عرصے تک کام کرتے رہیں گے۔ شہید مرتے نہیں پڑھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ واقعی شہید تاقیامت زندہ رہیں گے۔ سراب کے واقعات میں تسلسل اور روانی عروج پر ہے۔ سچ بیانیوں میں انتقام روایتی اور معاشرتی کہانی ہے۔ وصول بھرا ستاتا نے دہلا کر رکھ دیا ہے۔ انور نے عشق ومحبت کی انتہا کو چھو لیا تھا اس لیے وہ ایسا قدم اُٹھانے پر مجبور ہوا۔ اسے کیا خبر تھی کہ حاصل جنوں اتنا بھیانک ہوگا۔ اب ملک اور انور ایک کشتی کے سوار ہیں، دونوں کا دکھ ایک ہے اور پچھتاوا بھی ہے۔ دونوں سے نادانستگی میں غلطی ہوئی، ملک کے پاس غم غلط کرنے کے سو راستے ہیں لیکن انور کے پاس تنہائی اور سوچنے کے سوا کوئی معروفیت نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس سے بڑھ کر کیا سزا ہوگی۔ دوسری شادی میں ایک عجیب صورتِ حال سامنے آئی ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھاتے پیتے، بے فکرے لوگوں کے چونچلے ہیں ہمارے ہاں تو شوہر بیوی دونوں کے بچے ہوتے ہیں۔ دوسری شادی کے بعد یہ تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اپیل میں محمد سلیم اختر نے صحیح تجزیہ کیا ہے کہ ہم سب محض سمجھے ہیں جو محض پیغام پاس کر کے آگے بھیج رہے ہیں جہاں تک ناظم اور چیئرمین ٹائپ لوگوں کی بات ہے، یہ زوردار بیان دے کر اور فوٹو چھپوا کر خوش ہو جاتے ہیں وگرنہ شروع سے ہی عملی قدم کا ارادہ نہیں ہوتا، یہ سب ہم روزمرہ کے معمولات میں دیکھ سکتے ہیں بلف اور کمبل متاثر نہیں کر سکے۔ پلاٹ انتہائی کمزور ہیں اس لیے بدمزگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ بے گناہ گناہگار سبق آموز کہانی ہے۔ اگر اس کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو کئی جھول ہیں۔ گھرا کتواں میں صرف ایک شخص کے رویّے، کردار اور بدفطرتی نے پورے خاندان میں تماشا بنایا اور آخر تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا۔ وہ جس ماحول میں رہ کر آیا تھا، وہاں سے خباثتیں بھی سمیٹ لایا تھا۔ یہ واقعات خاص طور پر والدین کے لیے آئینہ ہیں، انہیں نئے رشتے جوڑتے ہوئے محض دولت کو بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ شرافت، ایمانداری اور انسانی ہمدردی کے جذبات کو بھی پرکھنا لازمی ہے۔ نوٹے رشتے میں شوہر کے علاج میں کوتاہی الگ جرم ہے جس کی سزا ملے گی کیا خبر نیک نیتی یا کسی نیک عمل کے نتیجے میں چھٹکارا مل جائے لیکن اپنے مرض کو حالات پر چھوڑ دینا زیادتی بلکہ خیانت ہے اس لیے جی جان سے اپنا علاج کرائیے، یہ قدم تو خودکشی کے زمرے میں آتا ہے، یوں گناہوں میں اضافہ نہ کیجیے اور اللہ سے لو لگا کر گناہوں کی بخشش کے ساتھ رحمت طلب کیجیے۔''

☒ محمد طیب کا منچن آباد سے ای میل'' سرگزشت ایک معیاری جریدہ ہے۔ علم وادب کا ایک لازوال خزانہ ہے۔ میری تجویز ہے کہ سرگزشت کے ابتدائی صفحات پر دنیا کی کم عمر مائکروسوفٹ سرٹیفائڈ پروفیشنل عرفہ کریم کی داستانِ حیات تفصیل سے شائع کریں۔ ایک تفصیلی مضمون سیاچن گلیشیر کے حوالے سے بھی شائع کریں۔ وہاں موجود فوجی جوانوں کے شب وروز پر بھی تفصیلی تحریر شائع کریں۔'' (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے)

☒ افتخار احمد گمسن کا خلوص نامہ، لاہور سے '' اس دفعہ شمارے میں مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی کا تعارف ہوا۔ اگرچہ نام سے بہت پہلے ہی واقفیت تھی، جب نصابی کتب میں ان کے مزاحیہ مضامین پڑھتے تھے لیکن اب مختصر تعارف بھی ہو گیا۔ تفصیلی سرگزشت بھی شائع کریں۔ ان کی سودیشی ریل کے بارے میں پہلے بھی پڑھا ہوا ہے (جون 1999ء میں شوکت تھانوی پر بھرپور مضمون آ چکا ہے) شہر خیال میں راجا ثاقب نواز ثاقب ساہیوال سے پہلے نمبر پر آئے۔ تبصرہ بھی خوب لکھا۔ سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سنخار، سعید احمد چاند، ملک ثاقب شاد، مونا گل، ایم اے خالق بھٹی کے خطوط اچھے رہے۔ آج کل کراچی کے حالات پر تمام اہلِ وطن پریشان ہیں اور حیران بھی کہ آخر کب تک کراچی والے اپنے

حالات میں رہیں گے اگر نہیں پریشان تو اہلِ حکومت ہیں جو تماشا دیکھ رہے ہیں، ہر روز کئی گھرانے اُجڑ رہے ہیں۔ اگر اتنے جانور بھی اگر مغرب کے کسی ملک میں روز ہلاک ہوں تو وہاں کے حکمران کو تشویش ہوتی ہے۔ مگر ہمارے یہاں عوام کیڑے مکوڑے سے بھی بدتر ہے، ہر روز اس ملک کے کسی علاقے سے کوئی نہ کوئی خبر ایسی آتی رہتی ہے۔ پیش گو میں حضرت دانیال علیہ السلام کے بارے میں پڑھا، آپ کو تعبیر رویا کا بھی خاص علم دیا گیا تھا۔ نوبل انعام یافتہ ترک ادیب کے بارے میں پڑھا۔ اس پر تنقید بھی ہوئی، تان سین کے بارے میں یہ قصہ بھی پڑھا کہ اس نے کسی کو قتل کر دیا تھا۔ کیسے کیسے قصے تان سین کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ علی سفیان آفاقی صاحب فلمی الف لیلہ کے ساتھ حاضر تھے، یہ دیکھ کر اطمینان ہوا۔ انتقام میں لڑکی کے ساتھ بہت بُرا ہوا، اس نے اپنی محبت ٹھکرا کر دوسرے سے ٹھوکر کھائی۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا سوائے پچھتانے کے۔"

⊠ مدیحہ خان اینڈ ماریہ خان، چک بیلی خان، راولپنڈی سے "ہم پہلی بار محفل شہر خیال میں شرکت کر رہے ہیں (خوش آمدید) جب سے اردو لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ ماہنامہ سرگزشت، پاکیزہ، سسپنس اور جاسوسی، چار شمارے بغیر خرچہ مفت آل سسٹرز فرینڈز مفت پڑھتی ہوں۔ ہمارے انکل مستقل قاری ہیں، چند پُرانے شمارے مطالعہ کے بعد ہماری عاجزانہ فرمائش پر مطالعے کے بعد بھائی کے ہاتھ کبھی خود یا کسی آنے والے کے ہاتھ، کبھی ڈاک سے بڑا پارسل بنا کر بھیج دیتے ہیں، اب جبکہ بفضل خدا مدیحہ خان کی گود بھی ہری ہو چکی ہے، والدین اور سرتاج کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود ہم بھوکے رہ کر بھی سرگزشت و پاکیزہ کی اتنی خوبصورت دلچسپ تحاریر سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں ہم خود نہیں خرید سکتے مگر ہمارے گاؤں میں ملنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ انکل کہتا ہے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک شمارے بہت جلد ملنے کے ساتھ گم نہیں ہوتے۔ مطلوبہ پتے پر خریدار وصول نہ کرے تو واپس آفس چلا جاتا ہے۔ اگر ہم 3 سے 5 سال کا خرچہ خریداری سرگزشت و پاکیزہ کو یکمشت ارسال کر کے پتا دیں تو کیا شمارے بروقت مل جائیں گے تاکہ مطالعہ کے بعد جلد تبصرہ کی محفل میں شرکت کر سکیں۔" (ڈاک کے ذریعے رسالے نہایت آسانی سے آپ گھر بیٹھے حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کا طریقہ اشتہار کی صورت میں آپ کو ہر رسالے میں مل جائے گا اور قیمت بھی لکھی ہوئی ہوگی)

⊠ سعید احمد چاند کا پیام کراچی سے "معراج رسول صاحب نے کنڈا ڈالنے والوں کے لیے لکھا ہے۔ اگر بجلی کے محکمے والے لوگوں کو میٹر دیں تو کسی کو کیا ضرورت ہے کنڈا ڈالنے کی۔ لوگ مجبوری میں کنڈا ڈالتے ہیں، ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اگر سب لوگوں کو جائز طریقے سے بجلی ملے تو سب لوگ بجلی کا بل بھریں تو محکمہ بجلی کبھی خسارے میں نہ جائے۔ مگر یہ کام دیانت دار انسپکٹروں کا ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں نظر رکھیں تاکہ کسی کو جرأت ہی نہ ہو کنڈا ڈالنے کی۔ یک مئی سرگزشت میں شوکت تھانوی کی سرگزشت پڑھی، کچھ تو ہم جانتے ہی تھے، تفصیل سے اب معلوم ہوا۔ شہر خیال میں داخل ہوئے۔ شکر ہے ہم موجود تھے۔ دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، اعجاز حسین ستار، ایم اے خالق بھٹی، رانا محمد شاہد، ملک ثاقب شاد تنولی، طاہرہ گلزار، سہیل احمد عباسی، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، رانا محمد سجاد، رانا حبیب الرحمٰن، منظر علی خان، سدرہ بانو ناگوری کے تبصرے اچھے تھے۔ ڈاکٹر روبی نفیس اس دفعہ پھر غیر حاضر ہیں۔ لگتا ہے انہیں اب شہر خیال سے دلچسپی نہیں رہی۔ آفاقی صاحب کو اللہ نے شفا دی، دل کو اطمینان ہوا۔ ان کی فلمی الف لیلہ اچھی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر کی سراب بھی اچھی جا رہی ہے۔ جو سچ بیانیاں پسند آئیں، وہ یہ ہیں۔ طلعت کا انتقام، انور علی کا ڈھول بھرا ستانا، بانو کراچی کا گہرا کنواں، کوثر زید حسن کے ٹوٹے رشتے باقی زیر مطالعہ ہیں۔ ادارے سے ایک بات پوچھنی تھی، علمی آزمائش نمبر 80 کی 30 مئی میں ابھی ایک مہینا ہے ہو جاتا ہے۔ کیا ہم قریبی تاریخوں میں بھیجیں؟" (ٹوکن آنے کے ساتھ متعلقہ شعبے کو دے دیا جاتا ہے۔ وہ فوراً کمپیوٹر میں فیڈ کر لیتے ہیں)

⊠ جویریہ قاضی کی شکایت، مظفر گڑھ سے "اپریل 2012ء کا سرگزشت ہمیشہ کی طرح زبردست، بہترین اور اعلیٰ ترین تھا۔ اداریے میں انکل بھینس کے آگے بین بجاتے نظر آئے۔ انکل، بھلا بھینس بھی لحن موسیقی کا ذوق رکھتی ہے۔ عشق ناکام نمبر کے تعارفی فقرات نے دل کی دھڑکن تیز کر دی ہے، امید ہے یہ نمبر بہت کامیاب ہوگا۔ پھر عشق ناکام نمبر کے بعد آپ ایک اور نمبر نکالیں گے اور وہ ہوگا...... جی ہاں، وہ ہوگا..... اولیا نمبر۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟ (فی الحال ہم اسلامی موضوعات سے گریز کر رہے ہیں پہلے دیگر عنوانات تکمیل پر پہنچ جائیں) شہر خیال میں اس دفعہ بہت سی نیو اینٹریز تھیں۔ سب بہن بھائیوں کے تبصرے اچھے تھے۔ ملک ثاقب شاد تنولی وکالت کے پیشے سے بہت متنفر نظر آرہے تھے۔ لگتا ہے انہیں یہ پیشہ راس نہیں آیا۔ ورنہ آج کل تو وکیلوں کی بڑی ٹور ہے۔ لوگ تو اس پیشے کے ذریعے حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر لاکھوں کما رہے ہیں۔ یعقوب جمیل کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ اس ماہ بھی بہت سی شاندار تحریریں ہماری منتظر تھیں۔ اس ماہ کی سراب ہمیشہ سے کہیں زیادہ اچھی اور معیاری تھی۔ اس طرح کی ایکشن سے بھرپور تحریریں بسا اوقات یکسانیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مگر کاشف زبیر نے اپنے مشاق اور ماہرانہ قلم سے اسے کبھی یکسانیت اور بوریت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ بدقسمت میں ارنسٹ ہیمنگوے بذاتِ خود بدقسمت نہیں تھا البتہ اپنے ڈپریشن اور نگیٹو اپروچ کی وجہ سے اسے اپنی خوش قسمتی بھی بدقسمتی لگتی تھی۔ ویسے اس طرح کے خاندان کے بارے میں پہلی دفعہ سنا ہے جس کی موروثی بیماری خودکشی ہو۔ عزم کی پیکر میں فخرِ پاکستان شرمین عبید چنائے کی سرگزشت بہت پسند آئی۔ یہ سرگزشت کا خاصہ ہے کہ اس میں ہمیشہ کرنٹ اور ہاٹ ایشوز پر قلم اُٹھایا جاتا ہے۔"

⊠ راجا ثاقب نواز ثاقب کی رتی بھی، ساہیوال سے آمد "اب کی بار ٹائٹل قدرے نہیں بہت ہٹ کے بنایا گیا ہے۔ خاص طور پر اس ماڈل کی مسکراہٹ جو کہ بہت کچھ کہتی محسوس ہو رہی ہے۔ ابتدائی سطور میں معراج رسول جی نے اس قدر خوبصورتی سے ملکی حالات کا تجزیہ اپنے الفاظ میں کیا ہے۔ اب کی بار تو کالم کے آخر میں شعر بھی نظر آیا۔ شوکت تھانوی کے حالاتِ زندگی کو چند سطور میں سمو کر کمال کر دیا گیا۔ اسلامی جی داستان مائش کو نے ایمان تازہ کر دیا۔ نوبل انعام یافتہ اور خان تو پکے استنبولیے ثابت ہوئے۔ جنونِ آزادی میں رابرٹ اور بینا اپنے خاندان سمیت فرار، ویزا اور آسٹریا پہنچ گئے۔ کپتان جیراڈ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر خطرناک مہم کی تکمیل کی۔ راگ کی آگ پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ ہمارے بیشتر پاپ سنگر بھی جس طرح کی بے ہنگم اُچھل کود کرتے نظر آتے ہیں، شاید ان پر بھی دیپک راگ کا سایہ ہے۔ آفاقی صاحب نے اپنی بیماری کی نسبت سے جتنے بھی ڈاکٹروں اور حکیموں کا تذکرہ کیا، انہیں جنت میں پہنچا کر ہی دم لیا۔ مقدر کی بات جاوید نامہ ثابت ہوئی۔ سانحہ لولو جی مختصر ترین رہی مگر ہماری مذہب سے دوری کی نشاندہی بھی کر گئی۔ شہید مرتے نہیں، قرآن ہی کی ایک آیت کی عملی تفسیر ہے۔ پہلی سچ بیتی الانعام، طلعت نے جو بویا، اس کی توقع سے کہیں زیادہ اس کی فصل اس نے کاٹی۔ ڈھول بھرا ستانا میں بھی مکینک انور نے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک بھیانک فیصلہ کیا اور اپنی محبت رمشا کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دوسری شادی کے آخر میں جو سوالات پوچھے گئے ہیں، ان کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قائم ہونے والی بیشتر این جی اوز ڈالرز اور پونڈز اکٹھے کرنے کے لیے ہوتی ہیں، لوگوں کے معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے لیے نہیں۔ اپیل مختصر ترین مگر بہترین ثابت ہوئی۔ بلف میں تو دولت خان صاحب کے ساتھ وہی معاملہ ہوا کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ کمبل میں فرقان اسلم صاحب کو پورے نو عدد کمبلوں نے آن گھیرا ہے۔ بے گناہ میں بابر گنہگار ہوتے ہوئے مکافاتِ عمل کا شکار ہو کر دستِ قدرت سے نہ بچ سکا۔ گہرا کنواں میں اتنے نزدیکی رشتے کا انتہائی گھناؤنا کردار دیکھا۔ تو یں مگر آخری سچ بیانی ٹوٹے رشتے میں زید حسن اپنے نام کے بالکل برعکس انتہائی گھٹیا سوچ کا حامل شخص ثابت ہوا۔"

⊠ حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ، ضلع میانوالی سے لکھتے ہیں "آپ کی گفتگو سے آغاز مطالعہ کیا ہے۔ وطنِ عزیز کے گونا گوں مسائل، لوڈشیڈنگ، بدامنی، دھماکے، دہشت گردی، بے روزگاری سے دل ہول جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وطنِ عزیز کو ان مسائل سے جلد نجات دلائے، آمین۔ سود یش لکھاری شوکت تھانوی ایک چراغ تھے۔ اس دفعہ علی سفیان آفاقی صاحب کی الف لیلہ کے ذریعے واپسی پر خوشگوار حیرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سفیان آفاقی صاحب کو صحت کاملہ اور عمر خضر عطا کرے، آمین۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کے تجربات بیان کرنے کے بعد سابقہ فلمی دنیا کی حکایات بیان کرتے ہوئے ہدایت کار حسن عسکری کی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی پیش گو میں حضرت دانیال علیہ السلام کے واقعات کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ قارئین کے لیے دلچسپ معلومات ہیں۔ سراب کا لہجہ بہتر ہے۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف تو یقیناً یہ سرگزشت کا ایک اچھوتا اور دلچسپ سلسلہ ہے۔ ان کہانیوں میں قارئین کے لیے ایک کافی دلچسپی اور سبق آموز مواد موجود ہوتا ہے۔ طلعت صاحبہ کی انتقام میں یقیناً عارف نے انتقام لیا ہے۔ موصوف کو ایشان کا وفادار رہنا چاہیے تھا۔ شوہر بیوی کے لیے سائبان کا کام دیتا ہے۔ انور علی کی ڈھول بھرا ستانا میں انور علی نے انتقام کی آگ میں اپنی محبوبہ رمشا کو کھو دیا۔ اس لیے غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ دشمن سے انتقام لینا مسائل کا حل نہیں ہوتا۔ اپیل ایک اچھی معاشرتی کہانی ہے۔ ہم لوگ دعوے تو بلند بانگ کرتے ہیں مگر ہم میں قربانی کا مادہ کم ہوتا ہے۔ ایک گمنام دیہاتی نے قربانی دے کر امرا کے منہ پر طمانچہ مارا۔ شہزاد حسن زاہد کی بے گناہ گنہگار نے انتہائی متاثر کیا۔ ناحق قتل کا خون بولتا ہے۔ ٹوٹے رشتے میں عورت کی قربانی جو کہ وہ اولاد کے لیے دیتی ہے، ایک سبق آموز تحریر ہے۔ ہاں ماہنامہ سرگزشت ایک انتہائی دلچسپ ماہنامہ ہے جو کہ اردو ادب کا شاہکار ماہنامہ کہلانے کا مستحق ہے۔ سچ بیانیوں کے لیے میں بھی ایک کہانی بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہوں، امید ہے۔ آخر میں شہر خیال کے دوستوں، راجا ثاقب نواز ثاقب، سدرہ بانو ناگوری، عبدالعزیز جی آ، سعید احمد چاند، مونا گل، ملک ثاقب شاد تنولی، ایم اے خالق بھٹی، طاہرہ گل نواز، ملک جاوید خان سرکانی درانی، افتخار احمد تمسن اور رانا محمد سجاد کے محبت نامے پڑھے، سب کو دلی مبارک باد۔"

⊠ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی بروزئی جھمبھ سے رقم طراز ہیں "آفاقی صاحب کی صحت یابی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی، ساتھ میں تمام قارئین و اراکین ادارہ سے درخواست ہے کہ چھوٹے بھائی اورنگ زیب محمد خان کی شفایابی کے لیے خصوصی دعا فرمائیں کہ شافی مطلق انہیں شفایاب فرمائیں۔ سدرہ بانو، خونِ دل میں قلم ڈبو کر لکھا گیا الم نامہ پڑھا، شہر کراچی جسے کبھی غریب اور مزدور کی ماں کہا جاتا تھا، جو بھی مفلوک الحال اور تنگ دست وہاں جاتا، اس کے حالات بدل جاتے تھے۔ اس شہر مہربان کو وادیِ مرگ بنا دیا گیا ہے۔ سہیل احمد عباسی صاحب، شرمین عبید کو آسکر سے نوازا جانا خالی از شر نہیں، دال میں کچھ کالا ضرور ہے، کچھ زیادہ غور کریں تو ساری دال ہی کالی نظر آئے گی۔ آسکر کے فیصلوں میں یقینی طور پر تعصب کارفرما ہوتا ہے۔ مارچ 2010ء کے فیصلوں پر ہی غور کریں تو سیاسی دخل اندازی اپنے مکروہ چہرے کے ساتھ نظر آجائے گی۔ "اوتار" بنانے پر لگ بھگ 250 ملین ڈالرز رقم خرچ ہوئی تھی اور یہ فلم اتنی پسند کی گئی تھی کہ 106 ملکوں کے 15 ہزار سینما گھروں میں اس کی نمائش کی گئی، مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کئی مہینوں تک تو سینما گھر کھچا کھچ ہی بھرے رہے اور اس فلم کی ابتدائی آمدنی ہی 280 کروڑ ڈالرز تھی۔ ہرٹ لاکر کی تکمیل 11 ملین ڈالرز میں ہوئی صرف 535 سینما گھروں میں نمائش ہوئی اور چند دنوں میں اُتر گئی۔ ہرٹ

لاکر کی ساری کی ساری آمدنی پونے دو کروڑ ڈالرز تھی یعنی ایواٹار کی ابتدائی آمدنی سے بھی 246 کروڑ 25 لاکھ ڈالرز کم۔ 95 فی صد فلمی ناقدین کا فیصلہ یہ تھا کہ ہرٹ لاکر کے مقابلے میں ایواٹار کئی درجے معیاری اور بڑی فلم ہے لیکن غیر یقینی طور پر آسکر ایوارڈ ہرٹ لاکر کو دیا گیا اور یہ فیصلہ سیاسی وجوہات کی بنا پر ہی کیا گیا تھا کیونکہ فلم ہرٹ لاکر عراق میں امریکی جارحیت کے لیے جواز فراہم کرتی ہے جبکہ ایواٹار کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہونے کے باوجود اس لیے محروم کردیا گیا کہ یہ نوآبادیاتی نظام اور عالمی استحصال کے مخالف سوچ پیدا کرتی ہے جو کہ امریکا مخالف سوچ ہے، سعید احمد چاند، طاہرہ گلزار، افتخار احمد کمسن اور سہیل احمد عباسی خط پسند کرنے پر آپ سب کا شکریہ۔ رانا محمد سجاد، آپ جیسے اچھے لوگوں کی محفل میں جگہ ملنا ہی کم اعزاز نہیں، ہم ایسا اچھا تبصرہ کر ہی نہیں پائے کہ اول درجے پر جگہ حاصل کرسکیں جب باوجود بہترین تبصرے کے یہ مقام نہ دیا گیا تو پھر رند صاحب کی طرح شکوہ شکایت کریں گے کہ ایک قاری کی حیثیت سے یہ حق سبھی کو حاصل ہے۔ راگ کی آگ کی فرضی کہانی تاریخی سفید جھوٹ ہے۔ سائکولوجی مختصر مگر معلوماتی مضمون تھا۔ زین مہدی کا مضمون کچھ تفصیل طلب تھا۔ ابن کبیر، سلیم فاروقی، ڈاکٹر بھٹی اور تنویر ریاض بھی بہترین نگارشات لے کر آئے۔ مسعود کھدر پوش جیسی انسان دوستی کی مفصل داستانِ حیات شائع ہونی چاہیے۔ باربی ڈول کے خاتمے پر خوشی ہوئی۔ ذلفی شاہ کی غیر حاضری شدت سے محسوس ہوئی۔"

✉ مظفر علی خان، ٹاؤن شپ لاہور سے لکھتے ہیں "مئی کا شمارہ 28 اپریل کو ملا۔ شہر خیال میں اپنے خیالات کے ساتھ حاضر ہوں۔ پیش گو کے عنوان سے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا تحریر کردہ حضرت دانیال علیہ السلام کا تذکرہ نظر سے گزرا۔ خوب اور بہت خوب تحریر ہے۔ استنبول کا عاشق نوبل انعام یافتہ مسلمان مصنف کے حالات پر مبنی تحریر ہے جو کہ یورپ میں بھی مقبول ہیں۔ کسی نجومی کی پیش گوئی کہ یہ لکھا جاچکا ہے اور پوری دنیا میں اس کے نام کا ڈنکا بجے گا۔ کسی روشن خیال اور جدید معاشرے میں عجیب سی بات لگتی ہے۔ جنونِ آزادی میں رابرٹ کا ایک کمیونسٹ اور جبر پر مبنی معاشرت اور نظام سے فرار انسان کی فطری طور پر آزاد زندگی گزارنے کی خواہش اور جدوجہد کا اظہار ہے۔ مگر کیا یہ سرمایہ دارانہ نظام جس میں مساوات اور برابری کی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل نہیں ہے، یہ بھی بہرحال کوئی مثالی طرزِ زندگی نہیں ہے۔ قلمی الف لیلٰے ہماری قلمی دنیا کے انداز و اطوار پر مبنی دلچسپ تحریر ہے۔ خطرناک مہم میں حب الوطنی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی جان سے گزر جانے کا جذبہ کارفرما ہے۔ راگ کی آگ فنِ موسیقی کے معجزوں پر مبنی کہانی ہے۔ دیپک راگ ملہار راگوں پر یکسو ہو جانے سے مافوق الادراک واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ موسیقی سے گلاس توڑ دینے کا واقعہ بھی کہیں پڑھا تھا۔ منتشر الخیالی کے دور میں شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ کیونکہ خیالات کی یکسوئی اور ارتکاز توجہ سے بہت سے محیر العقول واقعات پیش آسکتے ہیں۔ مقدر کی بات کے عنوان سے جاوید اختر کا تذکرہ خوب ہے۔ منیر نیازی، قتیل شفائی جیسے فلمی شاعروں کے حالات بھی خاصی دلچسپی کے حامل ہوں گے۔ (دونوں کے حالاتِ زندگی شائع ہو چکی ہے) سائنٹولوجی ایک خفیہ مذہب کی کہانی دلچسپ ہے۔ نظامِ فطرت پر یقین رکھنے والا بہت سے نیچری مذہب کے پیروکار موجود ہیں۔ لیکن نیچر کے بارے میں ہر ایک مذہب کی توجیہات الگ الگ ہیں۔ روحانی شعور، مادی جسمانی، ذہنی اور جذباتی شعور سے کہیں زیادہ لطیف اور موثر ہے۔ مادی شہید مرتے نہیں اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ استنبول کے سمندر کے قریب حضرت ابوایوب انصاری اور حذیفہ صحابی کی خواب میں آنے اور ان کے جسد خاکی کی منتقلی کا واقعہ غالباً 1930ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ جسے لاکھوں لوگوں نے دیکھا کہ ان کے جسد مبارک صحیح وسالم موجود تھے۔ شہدا اور صادقین کی تو بات ہی کچھ اور ہے ورنہ فرعون بادشاہ کی لاش کا محفوظ رہنا بھی پچھلی صدیوں کی کہانی ہے۔ سچ بیانیوں میں ڈھول بجا سناٹا، گہرا کنواں اور انتقام توجہ طلب اور بہترین تحریریں تھیں۔"

✉ دلدار احمد چشتہ کا اختصار بھرا خط، حیدر آباد سے "محترم، میں نے کچھ گیت لکھ رکھے ہیں، اس بارے میں محترم علی سفیان آفاقی صاحب سے مدد لینا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم میرے یہ گیت ان تک پہنچا دیں۔ جوابی لفافہ ہمراہ ہے۔ براہِ کرم میری طرف سے ان سے خیال رکھنے کا کہیں اور رائے چاہے کچھ بھی ہو، جواب سے ضرور نوازیں۔" (علی سفیان آفاقی بسترِ علالت پر ہیں، بڑی مشکلوں سے الف لیلٰے لکھ رہے ہیں۔ آپ کے گیت خوبصورت ہیں، بحر میں بھی ہیں)

✉ احمد خان توحیدی کراچی سے رقم طراز ہیں "معراج رسول صاحب عوام کو غلام بنا کر رکھنے کے لیے لوڈشیڈنگ تھری پیس سوٹ والوں کی سازش ہے۔ وطن میں جابجا ڈیم تھرمل پاور ٹربائن بن سکتے ہیں (مگر بنیں گے نہیں) قدرت کا حسین شاہکار و قدرتی وسائل سے مالا مال۔ بلوچستان وشمالی علاقہ جات ہر طرف لہو بکھرا پڑا ہے۔ سوویٹ لکھاری، شوکت تھانوی عرف تسخیر احمد عرف محمد عمر سے ہم لاعلم تھے۔ راجا ثاقب، ساہیوال کرسی صدارت مبارک ہو، تبصرہ گڈ۔ ایم اے خالق بھٹی صاحب نے کھانے پینے، موج اُڑانے کا فرمایا ہے۔ آج 2 مئی تک ہمیں مارچ کی تنخواہ بھی نہیں ملی۔ موج کیسے اُڑائیں۔ سدرہ ناگوری، آپ کی فکر درست خدا جانے کس وقت کیا ہو جائے۔ ڈسکہ کے عظیم بچے نے دنیا میں ریاضی میں ٹاپ کیا۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ مجاہد مصطفیٰ، منظر لاہور، رانا حبیب گوجرہ، سعید احمد چاند کراچی اچھے تبصرے۔ افتخار احمد کمسن آملہ کا شکریہ۔ ظہیر تبسم، کراچی، اول دو سال کے سرگزشت ماہا ایمان، نثار بٹ ڈوک، قمر سی کھوٹہ ابن مقبول پنڈی غائب ہیں۔ ہوں تو بتادیں میں وی پی منگوالوں گا (پُرانے شماروں کے لیے معذرت پھر بھی آپ سرکولیشن سیکشن والوں سے بات کریں، وہ انتظام کرسکتے

ہیں) ایم اے خالق بھٹی رحیم یار خان، معراج رسول صاحب جیسے سرپھرے باضمیر سدا بے ضمیر دشمنانِ ملک وملت کے تعاقب میں رہتے ہیں، راجا ثاقب، شادی مبارک۔ حادثے کا افسوس ہے۔

✉ خالدہ یوسفی، لیہ سے رقم طراز ہیں "گزشتہ پرچے میں بھی شفق، دھنک، روپ سروپ، مہتاب تارے، گھٹائیں، لطیفے، ملہار، ندیم، کلیاں، گلاب کے پھول، جلترنگ، مٹھاس سمیت سب کچھ تھا لیکن ہم جس پر فریفتہ وشیفتہ ہیں وہ نام نظر نہ آیا تو دل کو ملول ہوا اور اک بے نام سی اداسی نے گھر کرلیا۔ جی ہاں، وہ سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری جن کا خاصہ ہے ہم سب کے پیارے آفاقی جی کو پاکر یقین مانیے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ پہلی فرصت میں قلمی الف لیلٰے پڑھی اور جب صفحات ختم ہوئے تو احساس اک تشنگی کا تھا، ارے صاحب لاہور کا ذکر شروع ہوتے ہی قسط ختم ہوئی۔ ابھی تو مزہ آنے لگا تھا خیر میری طرف سے انہیں نیک دعائیں اور صحت وسلامتی سے ہر ماہ نمودار ہونے کی دعا بھی پہنچائیں۔ اداریہ میں معراج رسول صاحب نے جو لکھا اس کے بارے میں یہی کہیں گے کہ نوبت وہ آپہنچی کہ جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔ ہم ایسے بے عمل اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ قارئین کی محفل کا رنگ خوب زوروں پر تھا بھی کو میری طرف سے چاہت بھرا اسلام، مضامین سارے خوب تھے۔"

✉ معراج الدین نے مرجان سے لکھا ہے "اداریے میں سر معراج رسول صاحب کی ملکی حالات پر ایک پُرآشوب تحریر پڑھی۔ لوڈشیڈنگ کے مسئلے کا ملکی صنعت وصرفت کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کے مستقبل یعنی طلبا پر بھی انتہائی بُرے اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ پڑھائی ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ شہر خیال کے راجد ھانی میں راجا ثاقب صاحب تخت صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ ان کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ اعجاز حسین سٹار انکل حسبِ معمول مفصل اور خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ سعید احمد چاند خط پسند کرنے پر شکریہ۔ عجیب بات ہے کراچی میں رہتے ہوئے بھی آپ کو شمارہ لیٹ ملتا ہے۔ ملک ثاقب صاحب ہم ڈھائی میل کی مسافت چار پانچ بار طے کرتے ہیں۔ اب موازنہ کیجیے۔ رانا محمد شاہد صاحب کے بارات کے حادثے کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ شکر خدا ہے کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ زخمیوں کو اللہ صحت دے۔ طاہرہ باجی! ہماری رہائش پشاور میں ہے۔ حصول علم کی خاطر مردان میں مقیم ہوں۔ آپ کا خوبصورت تبصرہ اس بار بھی مزیدار تھا۔

✉ ناصر حسین رند نے بہاولپور سے لکھا ہے "اس دفعہ حضرت دانیال علیہ السلام کا قصہ پیش کو پڑھ کر عجیب سا سحر طاری ہوگیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے اس دفعہ تو کمال کردیا۔ پُراسراریت نمبر سے جو انہوں نے تحریریں شروع کی تھی۔ پہلے ابن مقنع پھر وہ کون، سائرس اعظم اور اب پیش گو لکھ کر...... اپنی پُراسرار تحریروں کی ہیٹرک کرڈالی۔ ویسے پیش گو ایک ایسا موضوع تھا جس پر ایک خاص نمبر نکل سکتا تھا۔ انبیائے کرام میں سے پیش گوئی میں حضرت دانیال علیہ السلام کو جس طرح ملکہ حاصل تھا اس طرح صحابہ کرامؓ میں سے حضرت حذیفہؓ کو بھی قیامت تک ہونے والی پیش گوئیاں اور اسرار پر مہارت حاصل تھی۔ ایسے نیک لوگوں میں شاہ نعمت اللہ ولی، ناسٹرڈیمس جن کی زیست کے بارے میں تو پُراسراریت نمبر شائع ہوا تھا لیکن پیش گوئیاں آپ کے وعدے کے باوجود شائع نہیں ہوسکیں۔ مدر شپٹن بوڑھی ماں کی پیش گوئیاں اور اس طرح اہرام مصر کی دیواروں پر بنی تصویری پیش گوئیاں ...... اس طرح کا ایک خاص نمبر شائع ہو جاتا تو یہ آپ کا ہم پر احسان ہوتا۔ خاص نمبر کا دوسرا ایسی ہستیاں ایک شمارے میں دستیاب ہو جاتی۔ بہرحال حضرت دانیال علیہ السلام 606 ق م میں ایک پیش گوئی کی تھی جو کچھ یوں ہے کہ آخری زمانے میں یروشلم بیت المقدس پر بنی اسرائیل 45 سال تک اپنا قبضہ برقرار رکھ پائے گی 45 سال مکمل ہونے پر آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی امت بنی اسرائیل کی جڑ کاٹ دے گی۔ یہودیوں اور اسرائیل کی ریاست کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حضرت دانیال علیہ السلام کی اس پیش گوئی کا تجزیہ کیا جائے تو 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے اردن پر حملہ کرکے شرقی بیت المقدس سمیت مسجد اقصیٰ پر قبضہ کرلیا تھا۔ جس کے 45 سال 2012 میں مکمل ہورہے ہیں۔ ویسے بھی اسرائیل ایران اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے اور 2012ء کو ایران پر حملے کے امکان واضح ہیں اور پاکستان کے لیے 2012ء اس لیے بھی انتہائی اہمیت کا سال ہے۔ جیسے 1947ء کا سال تھا۔ اس دفعہ پھر 27 رمضان المبارک 14 اگست 2012ء ویسے اکٹھے آرہے ہیں جیسے 1947ء کو یہ دن ملے تھے اور جیسے قربانی ان دنوں دینی پڑی تھی ایسے ہی اب حالات اس طرف اشارہ کررہے ہیں۔ پہلے 1947ء کو ہم برطانیہ سے آزاد ہوئے تھے اب کے انشا اللہ امریکا سے آزاد ہوں گے۔ شہید مرتے نہیں۔ شہیدوں کے بارے میں ایک ایمان افروز واقعہ تھا۔ آج سے کافی سالوں پہلے اس طرح کا ایک واقعہ حضرت حذیفہؓ اور حضرت جابرؓ صدر کے خواب میں آئے اور ان کو اس جگہ سے منتقل کیا گیا تھا جس کا ٹی وی پر براہِ راست اور اس موقع پر لاکھوں لوگوں نے ان صحابا کرام کی زیارت کی تھی۔ اس واقعہ کو پڑھ کر ہمیں وہ واقعہ یاد آگیا۔ (سبحان اللہ) شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

✉ مہوش رفیق نے لانڈھی، کراچی سے لکھا ہے "معراج انکل کے ٹوپک بہت دلچسپ ہوتے ہیں ہمیشہ دل کو ان کی بات لگتی ہے۔ لوڈشیڈنگ نے تو جینا حرام کیا ہوا ہے۔ نہ دن کو سکون ہے نہ رات کو۔ بے چارے لوگ سڑکوں پر آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر کیا فائدہ؟ پورے ملک میں دہشت گردی ہورہی ہے نیوز دیکھنے کا دل بھی چاہتا ہے تو ہٹ جاتی ہوں ٹی وی کے آگے سے کہ کوئی اچھی خبر شاید ہمارے نصیب میں نہیں۔ ہر جگہ دہشت گردی اور عوام کو پیسا جارہا ہے بس عوام کو مضبوط کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والوں اداروں کو اپنا کردار نبھانا ہوگا کیا وہ

اپنا کردار نبھا پائے گے انکل؟ اپریل کا مہینا ہمارے لیے کافی سوگوار تھا۔ ہم نے کتنے اپنوں کو کھویا ہے سیاچن میں برفانی پہاڑی تودے تلے دبے ہوئے سرزمین کے بیٹے ان کا دکھ ہی اتنا بڑا تھا کہ دوسرا دھچکا لگا بھوجا ائر لائن کریش کا۔ آہ...... 127 افراد کوئی بھی نہیں بچا پھر دو دن بعد لاہور اسٹیشن میں بم دھماکا۔ کیا دکھانا چاہ رہے ہیں ہم دوسری قوموں کو کہ قائداعظم نے پاکستان کے لیے محبت، امن کا پیغام نہیں دیا بلکہ دہشت گردی کا دیا تھا۔ اب لیاری آپریشن چل رہا تھا وہ بھی بنا مقصد ختم ہوگیا۔ کیا بنے گا پاکستان کا......؟ اب آتے ہیں شہرِ خیال کے باسیوں کی طرف سب سے پہلے تو تمام شہرِ خیال کو سلام اور یاد کرنے کے لیے شکریہ۔ راجا ثاقب نواز ثاقب کو کرسی صدارت پر براجمان دیکھا ویسے ہمارے نصیب میں یہ کرسی کب آئے گی، پتا نہیں (آپ کوشش کریں) سدرہ بانو ناگوری صاحبہ دل چھوٹا نہ کریں۔ ایک ایسا وقت آئے گا جب سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں جی۔ لگتا ہے اعجاز حسین سیٹھار اور رانا محمد سجاد سے لگاؤ ہے کہ کافی لمبا خط شائع کیا ہے۔ رانا محمد سجاد صاحب آپ کی گزارش نوٹ کرلی ہے۔ جی زندگی نے وفا کی تو باقاعدگی کے ساتھ شہرِ خیال میں حاضری دیں گے۔ رانا حبیب الرحمٰن تبصرے کو جاندار ماننے کے لیے شکریہ۔ سہیل احمد عباسی صاحب سرائیکوں کی تعریف کرنے کا شکریہ مابدولت بھی سرائیکی ہیں۔ جناب! ایم اے خالق بھٹی صاحب پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہمیشہ کی طرح ظہیر احمد تبسم، سعید احمد چاند، ملک ثاقب شاد تنولی، مونا گل، مجاہد مصطفیٰ، رانا محمد شاہد، محمد ایاز راہی، طاہرہ گلزار، سہیل احمد عباسی، افتخار احمد گھمن، معراج الدین، ملک جاوید محمد خان سرکانی، منظر علی خان سب کے تبصرے بہت ہی پسند آئے۔

☒ طاہر الدین بیگ کا میرپور خاص سے تہنیت نامہ "شہرِ خیال میں دخترِ پاکستان کا خط پڑھا۔ یہ خط بڑا ہی دکھوں سے لبریز تھا۔ یہ ایک دخترِ پاکستان کا المیہ نہیں بلکہ یہ ان سب بہن بھائیوں کی آواز ہے جو بڑی ہی تکالیف میں ہیں۔ میری بہن سدرہ بانو ناگوری اب تمہاری آواز سن کر کوئی محمد بن قاسم نہیں آئے گا کیونکہ یہاں کوئی حجاز بن یوسف نہیں بلکہ بھاری مینڈیٹ لیے ہوئے منتخب لوگ ہیں جن کا کام صرف اور صرف بیان بازی کرنا ہے مگر گھبراؤ مت رات چاہے کتنی ہی تاریک ہی کیوں نہ ہو سویرا اتنا ہی روشن اور چمکدار ہوتا ہے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے اور اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ مظلوم کی آہ سے تو عرش بھی کانپ اُٹھتا ہے اور جب اللہ کی لاٹھی چلے گی تو پھر ظالم کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سدرہ بانو ناگوری کو حوصلہ اور ہمت عطا کرے اور ملک خداداد پاکستان پر اپنے نور کی برسات کرے (آمین) پچھلے دنوں سے ملک پاکستان میں جو حالات ہو رہے ہیں۔ لیاری میں آگ اور خون کا دریا بہہ رہا ہے۔ مارنے والا بھی مسلمان اور مرنے والا بھی مسلمان پھر بہن سدرہ کا دکھ بھرا خط...... نہ کچھ پڑھنے کو دل چاہا اور نہ ہی کچھ لکھنے کو۔ اللہ ملک پاکستان کی حفاظت کرے، آمین۔" (بے شک اللہ ہی ہم سب کا حامی و ناصر ہے۔ مطالعہ ہمیشہ جاری رکھیں کیونکہ علم کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ ایک حالیہ ریسرچ کے مطابق دوسروں کی دکھ بھری کہانیاں پڑھنے والوں کے اور ہنسنے والے افراد اپنے غم کو بھول کر اللہ کا زیادہ شکر ادا کرتے ہیں اور دوسروں کے لیے دعا۔ اللہ ہم سب کی دعاؤں سے مملکتِ پاکستان کو استحکام اور امن عطا فرمائے (آمین) اور ساتھ ہی سدرہ بانو کا خط آپ کو ہمت اور عزم بھی یقیناً دلائے گا)

☒ سدرہ بانو ناگوری کا مکتوب کراچی سے "سرگزشت کا شمارہ اس دفعہ بھی 26 تاریخ تک مل گیا۔ حسینہ کے عقب سے نظر آنے والا منظر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا واقعی جب حاکمِ شہر قلم کے بجائے بندوق سے اہلِ شہر کی تقدیر لکھنے پر بضد ہو تو امن کی فاختہ لہولہان کیوں نہ ہو۔ اتنا معنی خیز سرورق سرگزشت ہی کو زیب دیتا ہے، ویلڈن۔ انکل کا اداریہ ایک نئی دعوتِ فکر میں مبتلا کر گیا انکل جی آپ نے جو کلمات بتائے ہیں ان سے بڑی ڈھارس ملی ہے شکریہ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ ایک بار پھر کراچی کے لیے دعاؤں کی طالب کہ مرض بڑھتا ہی جا رہا ہے جوں جوں دوا ہو رہی ہے۔ سراب اس دفعہ ملی جلی رہی وہی سست روی سے آگے بڑھتی ہوئی اور ہر موڑ پر شہباز ملک کو نئے خواب دکھاتی ہوئی کہ جن کی تعبیر ہنوز سراب ہے۔ قلمی الف لیلےنہیں پڑھی مگر اس کے ذریعے انکل آفاقی کی خیریت معلوم ہوئی دل کو بڑی خوشی ہوئی۔ غبارے کے ذریعے فرار بھی دل کی دھڑکنوں کو تیز کرنے میں کامیاب رہی کمبل، انصار حسین کی ہر سطر نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ بے گناہ، گناہ گار شہزاد حسین زاہد پڑھ کر چند برسوں پہلے پڑھی ہوئی ایک بات یاد آ گئی کہ غلطی کی معافی ممکن ہے لیکن گناہ کی معافی کسی صورت بھی ممکن نہیں واقعی اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ شہید مرتے نہیں، زین مہدی نے جو سچا واقعہ بیان کیا ہے اسے پڑھ کر بے اختیار ہی دل سبحان اللہ کہہ اٹھا اگر تاریخ اسلام سے سچے واقعات سرگزشت کا حصہ بنتے رہے تو قارئین کو بہت ہی معلومات سے آگاہی حاصل ہوگی۔"

☒ محمد اشفاق سرائے عالمگیر، گجرات سے رقم طراز ہیں "سرگزشت کی تعریف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ واحد رسالہ ہے جو میں پورا پڑھتا ہوں۔ بہرحال خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اپریل میں ارنسٹ ہیمنگ وے اور اس ماہ یعنی مئی میں فرید احمد خان پالک کی داستان شائع کی گئی۔ کہنا یہ ہے کہ کیا ان دونوں کے ناول اردو زبان میں شائع ہو گئے ہیں۔ پلیز جس مصنف کی بھی داستان شائع کریں اس کے بارے میں یہ ضرور تحریر کریں کہ آیا اس کے ناول اردو زبان میں شائع ہوئے ہیں اور اگر ہوئے ہیں تو کہاں سے مل سکتے ہیں بلکہ اگر آپ مہربانی کر کے ان لوگوں کے ناول اردو میں ترجمہ کروا کر جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر شائع کر دیں تو کیا ہی بات ہوگی (کوشش کریں گے کہ آپ کی خواہش پوری کرسکیں) میرا خیال ہے میں پہلے بھی آپ کو لکھ چکا ہوں یہ بات دسمبر 2010ء کے سرگزشت میں شکیل صدیقی نے کوئن آف سسپنس نامی تحریر

لکھی تھی جو ایک امریکی خاتون ناول نگار کے بارے میں تھی۔ اگر اس کے ناول ترجمہ کر کے جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر دیے جائیں تو ناول پڑھنے والوں پر آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ایک ضروری بات نمبر آپ ضرور نکالیں بلکہ میں شاید پہلے کئی بار جب بھی خط لکھتا تھا تو یہ ضرور لکھتا تھا کہ ہر سال جنوری میں تینوں پرچوں کے خاص نمبر دیے جائیں۔ خاص شمارہ اگر 350 صفحات کا ہو تو پتا چلے کہ واقعی خاص شمارہ ہے۔ عشق ناکام نمبر امید ہے 350 صفحات سے زیادہ کا ہوگا۔ کاشف زبیر صاحب کی سراب بہت اچھی جا رہی ہے۔ کتابی شکل میں کب تک آجائے گی؟"

☒ رانا محمد سجاد نے بورے والا سے لکھا ہے "اپریل کا مہینا اپنے ساتھ بہت سے واقعات، ہنگامے اور انکشافات لیے رخصت ہو چکا ہے۔ اسی ماہ کے دوسرے ہفتے میں گیاری سیکٹر برفانی تودہ گرنے سے پاک فوج کے 139 جوان دب گئے۔ تادمِ تحریر ان کو نکالنے کی کوششیں جاری ہیں۔ خدا کرے کوئی معجزہ ہو جائے امید کی لو مدھم نہیں ہونی چاہیے۔ ابھی کیا پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ بھوجا ائر لائن کے حادثے نے قوم کو اور دکھی کر دیا۔ طیارے حادثے پر وہی وعدے۔ بیان بازی، الزام تراشی۔ گزشتہ دو تین ماہ سے چلنے والے مقدمہ کا اعلیٰ عدلیہ نے فیصلہ سنا دیا اور اس پر ردِعمل نے تو حکمرانوں کی رہی سہی اخلاقیات کو بے نقاب کر دیا۔ انہی حالات میں ماہنامہ سرگزشت موصول ہوا محترم معراج رسول کے خیالات واقعی پریشان کر دینے والے تھے۔ پاکستان مخالف سیاستدانوں اور کوئٹہ کے حوالے سے پریشان کن حالات لیکن حکمرانوں کو تو اپنی ایک حلقہ سے کامیابی منانے سے فرصت نہیں وہ کیوں بھلا اس پر غور کریں گے؟ جاذب قریشی کا شعر بھی بہت برمحل تھا۔ سودیشی ریل اتنے عرصے تک ان کو اس صفحے کے لیے محروم رکھا گیا حیرت ہے۔ شہرِ خیال میں راجا ثاقب نواز سے ملے مختصر تبصرہ، جناب ہمارے لیے صدر کا نام تجویز نہ کریں۔ سدرہ بانو ناگوری کراچی کے واقعات پر اپنے درد کا اظہار کر رہی تھیں۔ کراچی کے حالات تو واقعی انتہائی کشیدہ ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو جلد از اس مشکل وقت سے نکالے (آمین) پوری قوم کی دعائیں آپ کے ہمراہ ہیں۔ طاہرہ گلزار محمد، ایاز راہی خطوط میں کبھی کبھار نظر آتے ہیں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ جو نوجوان ملک چھوڑ کے جا رہے ہیں ان کا بھی قصور نہیں حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں۔ سہیل احمد عباسی خط پسند کرنے کا شکریہ۔ افتخار احمد گھمن آپ کا تبصرہ انتہائی مختصر۔ معراج الدین ملک جاوید سرکانی کے تبصرے بھی پسند آئے۔ مسعود کھدر پوش کا ذکر کیا تو ان کے حوالے سے ایک بات یاد آ رہی ہے کہ سندھ طاس معاہدے پر انہوں نے اپنے تحفظات کا ذکر کیا تھا تو ایوب خان نے ان کو دھمکی دی کہ وہ اسے گولی مار دیں گے۔ دیکھیے ان کی بات آج سچ ثابت ہو رہی ہے۔ منظر علی خان کا تبصرہ متاثر کن تھا۔ رانا حبیب الرحمٰن نو سال کی عمر میں تو اردو پڑھنی نہیں آتی اور آپ ڈائجسٹ پڑھتے تھے وہ بھی سرگزشت، بہت خوب لیکن سرگزشت میں اتنی دیر سے حاضری اس کی شکایت ہے؟ حضرت دانیال کے متعلق ڈاکٹر ساجد امجد کا مضمون کوئی خاص نہیں لگا البتہ یہ بات پہلی بار پتا چلی کہ بخت نصر ایک توحید پرست تھا اور دوسری بات یہ کہ امت محمدیہ کے حوالے سے سبحان اللہ کیا شان ہے اس امت کی تو اس امت کے والی کی کیا شان ہوگی۔ استنبول کا عاشق ابنِ کبیر کی اچھی تحریر تھی۔ جنونِ آزادی جیسی تحریریں سرگزشت میں شروع سے پڑھتے آ رہے ہیں بہرحال اچھی کاوش تھی۔ باربی ڈول کا دوسرا حصہ کافی بہتر رہا لاسٹ سر فلم ایک بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا کوئی خاص نہیں لگی۔ کیٹ ونسلیٹ کو کب سرگزشت کے صفحات پر پیش کر رہے ہیں؟ خطرناک مہم میں ایک شخص کی قربانی نے ہاری ہوئی بازی جتوا دی۔ راگ کی آگ ایک اور خوب صورت تحریر تھی۔ قلمی الف لیلےمیں آفاقی صاحب پھر تشریف لائے۔ خدا کرے اب یہ سلسلہ قائم رہے تا دیر۔ ہمارا اسلام پہنچا دیجیے گا۔ آفاقی صاحب تک جاوید اختر صاحب کی زندگی کے واقعات مختصر تحریر تھی۔ شہید مرتے نہیں عنوان بے حد پسند آیا۔ سائنٹولوجی محمد امجد کی ایک معلوماتی تحریر تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باطل مذاہب سے محفوظ رکھے، آمین۔ سراب کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کتابی شکل میں کب تک آئے گا؟ علمی آزمائش میں نام شامل نہیں تھا حالانکہ جواب بھی ارسال کیا تھا۔ ڈھول بھرا استانا، بے گناہ گناہ گار، گہرا کنواں، ٹوٹے رشتے پسند آئی۔ خصوصاً گہرا کنواں ایک اور بات سرگزشت اب کی بار کوئی خاص رنگ نہیں جما سکا۔ خصوصی نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔"

☒ وحید ریاست بھٹی، راولپنڈی سے رقم طراز ہیں "جناب ایک کہانی ماہنامہ سرگزشت کی انفرادیت کے پیشِ نظر ارسال کر رہا ہوں چونکہ اس کا تعلق میرے ساتھ پیش آمدہ واقعہ سے ہے اور پُراسراریت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے شاید دلچسپی کا سبب بن جائے اور کوئی اس سے سبق حاصل کرے نام اس کا میں نے سیدھی راہ تجویز کیا ہے میں اس کے ساتھ کچھ دستاویزات منسلک کر رہا ہوں تا کہ آپ کے مطلوبہ معیار پر پورا اُتر سکے اگر ہو سکے تو اسے شائع کر دیجیے گا۔ بس گزشتہ 21 سال سے سرگزشت کا قاری ہوں اور یہ اس ماہنامے کی دلچسپی ہے کہ ہمیں اتنے طویل عرصے سے پابند مطالعہ کیا ہوا ہے۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو مزید پُراسرار واقعات کو بھی سپردِ قلم کرنے کی جسارت کروں گا۔" (آپ کی تحریر پڑھنے کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ سرگزشت کے مزاج کی ہے یا نہیں۔ اس شمارے سے فارغ ہو کر ہی دیکھنا ہوگا)

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط

الحاج کرم الٰہی اعوان، لاہور۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ تسیم سحر، راولپنڈی۔ نازش علی، لیہ۔ اکبر علی قریشی، حیدرآباد۔ مائی ملتانی، ملتان۔ زاہد مل بھیو، سجاول۔

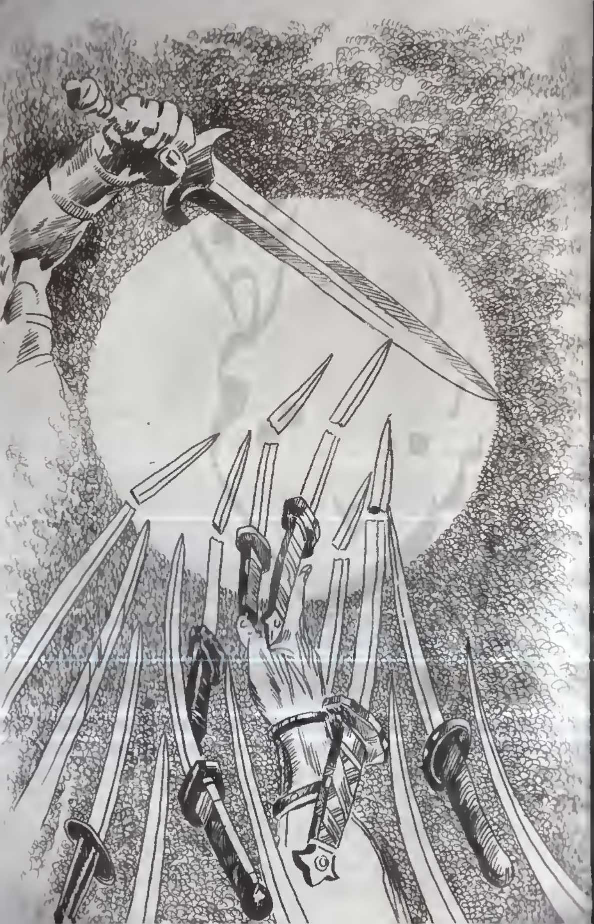

مجاہدِ اعظم

ڈاکٹر ساجد امجد

اس کے دل میں فقط ایک ہی جذبہ بپھرے سمندر کی طرح ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ دل و دماغ میں فقط ایک ہی للک تھی کہ پوری دنیا پر اسلام کا پرچم لہرائے ۔ اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے اس نے اپنی ساری خوشیاں تج دیں ۔ آرام کو خود پر حرام کر لیا اور کبھی مشرق میں تو کبھی مغرب میں وہ دشمنانانِ اسلام کو ان کی اوقات بتانے لگا۔ اس کے نام سے اسلام دشمن طاقتیں لرزہ براندام تھیں ۔ اس کے خلاف پورا یورپ متحدً تھا مگر اسے کسی کا خوف نہ تھا ۔ وہ راہِ حق میں موت کو گلے لگانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ۔ شاید اسی لیے اپنوں کی سازشیں بھی اسے خوفزدہ نہ کر سکیں ۔ اس نے ہر سازش کا مقابلہ کیا، بیخ کنی کی کوشش کی اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک پرچم تلے متحد کرنے کی سعی کی۔

پڑھے جانے، یاد رکھے جانے کے قابل ایک یادگار سرگزشت

سلطان نورالدین زنگی عالم خواب میں بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے میں پھیلی تاریکی میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اسے وہ خواب یاد آنے لگا جسے دیکھنے کے بعد وہ چونک کر اُٹھا تھا۔ خواب اسے یاد آ گیا۔

اس کے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تھے۔ آپ سنہری بالوں والے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے تھے، نورالدین! مجھے ان دونوں سے بچا۔

سلطان اس چراغ کی طرف گیا جس میں وہ اپنے پیسوں سے تیل ڈالتا تھا۔ بیت المال کے پیسوں سے صرف اس کمرے میں چراغ جلتا تھا جہاں بیٹھ کر وہ سرکاری کام کرتا تھا۔

چراغ میں تیل بہت تھوڑا رہ گیا تھا اس لیے کمرے میں بہت کم روشنی ہوئی تھی۔ اس نے اس روشنی میں دیکھا کہ اس کی زوجہ اپنے بستر پر بے خبر سو رہی ہے۔ اسے خیال آیا کہ روشنی سے کہیں اس کی نیند خراب نہ ہو۔ اس نے چراغ پر آستین رکھ دی۔ روشنی چراغ میں دم توڑ گئی۔ وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا باہر نکلا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ نماز ادا کرتا تھا۔ یہاں بھی ایک چراغ رکھا ہوا تھا۔ اس نے چراغ روشن کر دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ مبارک ابھی تک اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ تہجد کی نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

نماز ادا کرنے کے بعد اس نے چراغ گل کیا اور اندھیرے میں راستہ بناتا ہوا اپنے کمرے تک آ گیا۔ اندازے سے اپنا بستر تلاش کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

سلطان نورالدین زنگی سلطان دمشق تھا لیکن درویش صفت انسان تھا۔ خلوت و جلوت ہر جگہ اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اس نے ساری عمر سونا، ریشم اور ہیرے جواہرات استعمال نہیں کیے۔ اپنی رہائش کے لیے چند کمرے منتخب کر رکھے تھے جو ہر قسم کی آرائش اور تکلفات سے عاری تھے۔ نہ ان میں قیمتی قالین تھے اور نہ سونے چاندی کے ظروف۔ اپنے اہل و عیال کے لیے وہ صرف اتنا لیتا تھا جس قدر اسے علماء نے ازروئے شریعت اجازت دی تھی۔ اس کے دسترخوان پر اکثر جو کی روٹیاں یا کبھی کبھی گیہوں کی خمیری روٹیاں اور گوشت ہوتا تھا۔ نماز ادا کرنے کے لیے ہمیشہ مسجد میں جاتا تھا اور ہر شخص سے بے تکلف ملتا تھا۔

چوگان البتہ کھیلتا تھا اور اس کا جواب وہ یہ پیش کرتا تھا کہ ہم دشمنانِ خدا کے قریب رہتے ہیں۔ معلوم نہیں کب

مدافعت یا دھاوا بولنے کی ضرورت پیش آجائے۔ جب ہم یہ کھیلتے ہیں تو ہمارے گھوڑے دشمن کے اچانک حملے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اگر ہم ان کو تھانوں پر باندھ دیں گے تو وہ سست ہو جائیں گے۔ چوگان بازی سے ہمارا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے تاکہ ہم خود اور ہمارے جانور دشمنانِ خدا کے مقابلے کے لیے ہر وقت مستعد رہیں۔

اسے صلیبی جنگوں کا سامنا تھا لہٰذا اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنالیا تھا کہ صلیبی جنونیوں کی گردن ہمیشہ کے لیے توڑ کر رکھ دے یا ان کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو جائے۔ اس کے عظیم کردار نے عام مسلمانوں میں بھی جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی تھی۔ اس نے اس مہیب خطرے کو بھانپ لیا تھا جو صلیبی جنگجوؤں کی صورت میں دنیائے اسلام کو زیر وزبر کرنے کے لیے نہایت سرعت سے بڑھتا چلا آرہا تھا۔

ایسے بے مثل انسان کے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آنا تعجب انگیز نہیں تھا۔ تعجب تو اس پر تھا کہ وہ دونوں اشخاص کون تھے، جن کی طرف حضورؐ نے اشارہ فرمایا تھا اور آپؐ یہ کیوں فرمارہے تھے کہ مجھے ان دونوں سے بچاؤ۔

سلطان نورالدین زنگی اس خواب کے مضمون پر دن بھر غور کرتا رہا تھا۔ دوسری رات آئی اور نیند نے اس کی آنکھیں بند کردیں تو اس نے یہ خواب پھر دیکھا۔

اسے یہ خواب دیکھتے ہوئے مسلسل تین راتیں ہوگئی تھیں۔ سنہری بالوں والے دو افراد سامنے کھڑے تھے اور حضورؐ فرمارہے تھے مجھے ان دونوں سے بچا۔ سلطان نے اپنے وزیر جمال الدین موصلی کو بلایا جو بڑا متقی اور دانش مند تھا اور اس کے سامنے یہ خواب بیان کیا۔

''سلطان مکرم! خواب کی تعبیر تو واضح ہے۔ آپ حضورؐ تو اس دنیا سے پردہ فرما چکے۔ آپ کا روضۂ اطہر ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ کوئی گستاخ اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہے یا آپؐ کا جسد مبارک ہے جسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آپ کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ وہاں جائیں اور تحقیق کریں۔''

سلطان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ ''میرے آقاؐ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میرے آقاؐ نے مجھے طلب کیا ہے۔ میں ضرور جاؤں گا۔''

سلطان اور وزیر جمال الدین ایک بڑے قافلے کے ساتھ مدینہ منورہ جانے کے لیے روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

دو ایسے آدمی جو مراکشی بھیس میں تھے، مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور ایک سرائے میں جا کر ٹھہرے۔ سرائے کے مالک سے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ وہ اندلس کے رہنے والے ہیں۔ وہ روزانہ سرائے سے نکلتے اور مختلف محلوں کو دیکھ بھال کر لوٹ آتے۔ جو مسجد نظر آتی اور نماز کا وقت ہوتا تو مسجد میں جا کر نماز پڑھتے تاکہ لوگ انہیں متقی بھی سمجھیں اور ان سے واقف بھی ہو جائیں حالانکہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ عیسائی تھے اور انہیں عیسائیوں نے ایک خاص منصوبے کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا۔

آخر چند روز کی چھان بین کے بعد انہوں نے روضۂ اطہر کے پاس ایک مکان کرائے پر لیا اور اس میں رہنے لگے۔ خود کو متقی ظاہر کرنے کے لیے باقاعدگی سے مسجد نبوی میں نمازیں ادا کرنے لگے تھے۔ غریبوں اور مسکینوں کے لیے اپنا دسترخوان وسیع کردیا۔ ان کی سخاوت کی ایسی شہرت ہوئی کہ دور دور سے حاجت مند آنے لگے۔ جو آتا، یہ دونوں خاموشی سے اس کی ضرورت پوری کردیتے۔ لوگ انہیں اتنا نیک اور پارسا سمجھنے لگے تھے کہ کسی کو ان کی حرکات وسکنات پر نظر رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے گھر کے ایک کمرے سے ایک سرنگ کھودنا شروع کردی جسے زمین کے اندر اندر روضۂ اطہر تک پہنچانا تھا۔ سرنگ سے جو مٹی نکلتی تھی وہ اس کو اپنے مکان کے کنویں میں ڈالتے رہتے۔ کبھی اس مٹی کو چمڑے کی مشکوں میں بھر کر لے جاتے اور جنت البقیع میں ڈال آتے تھے۔

☆☆☆

ہزار اونٹوں پر مشتمل سلطان زنگی کا قافلہ 12 دن کا سفر طے کرکے مدینہ منورہ پہنچا۔ سلطان مسجد نبوی میں حاضر ہوا اور دوگانہ ادا کرکے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا، کیا جائے؟

وزیر نے اس کی محویت میں دخل دیا ''سلطان مکرم! یہاں تک تو آگئے۔ آپ کے خیال میں اب کیا کرنا چاہیے۔''

''یہی میں سوچ رہا ہوں۔ کام کہاں سے شروع کیا جائے۔ ان دو آدمیوں کی شناخت کیسے ہو جن کو میں نے خواب میں دیکھا ہے۔''

''اگر وہ دونوں آدمی سامنے آگئے تو کیا آپ انہیں پہچان سکیں گے؟''

''میں نے تین مستقل راتوں ان کے چہرے دیکھے ہیں۔ انہیں میں ایک نظر میں پہچان سکتا ہوں۔ ان کے سنہری بال بھی ایک بڑی پہچان ہیں۔''

''آپ کے حکم سے میں مدینہ منورہ کے تمام باشندوں کو بلاتا ہوں۔ وہ ایک ایک کرکے آپ کے سامنے سے گزریں گے۔ یہ بھی مشہور کردیتا ہوں کہ سلطان کی جانب سے خیرات بھی تقسیم کی جائے گی۔ جو خیرات لینا نہ چاہے نہ لے لیکن آئے ضرور۔''

یہ عمل کئی دن جاری رہا۔ ایک محرر سامنے بیٹھ گیا تھا جو ہر آنے والے کا نام لکھتا جارہا تھا۔ جو لوگ آئے ان میں کوئی بھی وہ نہیں تھا جسے سلطان نے خواب میں دیکھا تھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' سلطان نے کہا ''خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ جاؤ معلوم کرو۔ سب آگئے یا کوئی رہ بھی گیا ہے؟''

تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر میں دو لوگ ایسے ہیں جو نہیں آئے اور اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔ انہیں سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی دونوں تھے جنہیں بادشاہ نے خواب میں دیکھا تھا۔

''تم دونوں کیوں نہیں آئے تھے؟'' سلطان نے پوچھا۔

''ہمیں خیرات کی ضرورت نہیں تھی۔''

''یہ بھی تو کہا گیا تھا کہ خیرات لو یا نہ لو، آنا ضروری ہے۔''

''ہم آئے تھے مگر بھیڑ دیکھ کر واپس چلے گئے تھے۔''

''تم یہاں کے باشندے تو نہیں ہو؟''

''ہم مراکش کے رہنے والے ہیں۔''

''مدینہ منورہ میں کیوں آئے تھے؟''

''حج وزیارت کے لیے آئے تھے۔''

سلطان نے ان دونوں کو اپنے آدمیوں کے حوالے کیا اور خود اپنے وزیر کو ساتھ لے کر ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ سلطان نے انہیں پہچان تو لیا تھا لیکن مجرم ثابت کرنے کے لیے کسی ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی۔

گھر کی تلاشی کے دوران بھی کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ دینار ودرہم کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک کونے میں مٹی کا ڈھیر ضرور پڑا تھا۔ کچھ ایسے اوزار تھے جن سے زمین کھودی جاتی ہے۔ چمڑے کے مشکیزے تھے۔ یہ بھی کوئی ثبوت نہیں تھے۔ ناگاہ سلطان کا پاؤں لکڑی کے ایک تختے پر پڑا۔ اس تختے کو ہٹایا تو اس تختے کے نیچے ایک ایسی سرنگ کا راستہ آیا جو حجرہ مطہرہ تک جاتا تھا۔ اب پوری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ ان بدبختوں کا مقصد یہ تھا کہ اس سرنگ کے ذریعے یہ دونوں مزار اقدس تک جائیں اور آقائے نامدار کا جسد مبارک وہاں سے نکال لیں۔

خواب کی تعبیر سامنے تھی۔

یہ ایسا ثبوت تھا جس سے وہ انکار نہیں کرسکتے تھے لیکن

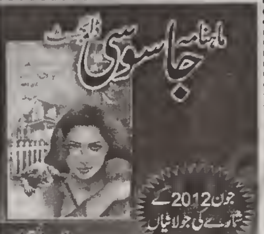

بے ثمر

زندگی کی دل فریبیاں سچائی میں مضمر ہیں... جھوٹ مکر وفریب سے اسے بے ثبات بنا دینے والے بے چہرہ لوگوں کی عکاس محی الدین نواب کی تحریر

مغرب کے نرالے انداز

مغربی ماحول سے درآمد جرم اور محبت کی ناقابلِ فراموش کہانیاں

گرداب

مسلسل ایک نئی منزل کی جانب رواں دواں اسما قادری کی سلسلے وار کہانی

للکار

نت نئے امتحانات سے دوچار تابش اور عمران کے کارنامے طاہر جاوید مغل کا سلسلہ

سرورق کی کہانیاں ..... فریب کار

ایک نوجوان کو پیش آنے والے پے در پے سنسنی خیز واقعات سلیم فاروقی کے جادو قلم سے

اجل شناس

دوستی سے دشمنی کے سفر پر گامزن اجل شناسوں کا عبرت انگیز احوال ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا انداز

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہانیں

پھر بھی انکار کرتے رہے۔

''ہم نے تو یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ ہمیں کیا خبر تھی اس میں ایسی سرنگ کھدی ہوئی ہے۔''

وہ انکار کرتے رہے لیکن جب ان پر کوڑے برسائے گئے تو انہوں نے اقبالِ جرم کرلیا۔ انہوں نے اقرار کیا کہ وہ مراکشی بھیس میں عیسائی ہیں جنہیں ان کے بادشاہ نے کثیر رقم دے کر یہاں بھیجا ہے تاکہ وہ جسد اطہر کو نکال کر اپنے ساتھ لے جائیں۔

دونوں کا جرم ثابت ہوجانے پر سلطان نے انہیں سزائے موت کا حکم دیا اور ان کی نعشوں کو نذر آتش کردیا گیا۔

اس واقعے کے بعد سلطان نورالدین نے حجرۂ مطہرہ کے چاروں طرف ایک خندق کھدوائی اور اس خندق کے اندر سیسہ پگھلوا کر بھروادیا تاکہ آیندہ کوئی شخص دیواریں توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کرسکے۔

☆☆☆

نورالدین زنگی کے والد والی موصل عمادالدین زنگی تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی متعصب عیسائیوں کے خلاف جنگوں میں گزار دی۔

صلیبیوں کی چیرہ دستیاں حد سے تجاوز کرچکی تھیں اور مسلمانوں کو ایک ایسے مردِ مجاہد کی ضرورت تھی جو اتحاد و قیادت کے عناصر فراہم کرکے عالم اسلام کا موثر طور پر دفاع کرسکے۔ مسلمانوں کو ایسا مردِ مجاہد عمادالدین زنگی کی صورت میں مل گیا۔ عمادالدین نے سب سے پہلے تو موصل کے نظم و نسق کو درست کیا۔ اس کے بعد مسلمان امیروں کی نااتفاقیوں کو اتفاق میں بدلا جن کی نااتفاقی کا فائدہ اُٹھا کر صلیبیوں نے طوفانِ بدتمیزی مچا رکھا تھا اور تمام عیسائی فرقے متحد ہوکر مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

عمادالدین نے تمام مسلمانوں کو متحد کیا اور اپنے لشکر کو منظم کرکے موصل سے نکلا اور پھر جہاں پہنچا اپنے اقتدار کا جھنڈا گاڑتا چلا گیا۔ عیسائی دنیا اس کے نام سے کانپتی تھی۔

نورالدین زنگی اسی عمادالدین زنگی کے گھر 13 شوال 511ھ موصل میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش نے آگے چل کر چراغ سے چراغ جلنے کی مثال کو زندہ کیا۔ وہ اپنے باپ کا حقیقی وارث بنا۔

اس کے والد کی خواہش تھی کہ نورالدین علوم دینی سے بہ خوبی واقف ہو اور اس کا شمار عالم اسلام کے بہترین علما میں ہو۔ عجیب بات تھی کہ ایک ایسا شخص جسے ہتھیاروں سے پیار تھا، اپنے بیٹے کو کتابوں کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے نورالدین کو مدرسے میں داخل کرادیا جہاں اسے بہترین اساتذہ میسر آئے۔

نورالدین نے بھی حق شاگردی ادا کردیا۔ شبانہ روز کی محنت سے اس نے مدارس کا مروجہ نصاب مکمل کرلیا اور تمام علوم اسلامیہ مثلاً قرآن و تفسیر، علم حدیث کے علاوہ اصولِ فقہ اور صرف و نحو، ادب و تاریخ و مناظرہ میں مکمل طور پر ید طولیٰ حاصل کیا۔ اس کی ایسی بے مثال ترقی نے اس کے اساتذہ کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ مدرسے کی دیواروں تک محدود رہتا۔ مجاہدانہ فنون کی طرف بھی راغب ہوا۔ قلیل عرصے میں وہ ایک عمدہ قسم کا شمشیر زن، نیزہ باز اور تیر انداز بن گیا۔ گھڑ سواری میں تو کوئی اس کا ثانی ہی نہیں تھا۔

اب وہ سپاہیانہ اقدار میں ایسا کامل ہوگیا تھا کہ باپ کے ساتھ عیسائیوں سے ہونے والے معرکوں میں شریک ہونے لگا۔

ان معرکوں میں اس کی شرکت ہوئی تو اس کی بہادری نے عیسائی مراکز میں کھلبلی مچادی۔ دنیا دیکھ رہی تھی کہ چراغ سے چراغ جل چکا ہے جو پہلے چراغ سے بھی زیادہ روشن ہے۔

نورالدین کے باپ عمادالدین نے جب عیسائیوں کے مرکز و محور ایڈیسہ کو فتح کرکے صلیبی قصر اقتدار کے اہم ستون کو منہدم کردیا تو مسلمانوں کی فتح صاف نظر آنے لگی۔

عمادالدین فتح و ظفر کا پرچم لہراتا ہوا دریائے فرات کے مشرقی علاقے کی طرف بڑھا اور کئی قلعے فتح کرڈالے۔ وہ قلعہ جبر یا جعبر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ نورالدین زنگی بھی اس کے ہمراہ تھا کہ رات کے وقت عمادالدین کے ایک غلام نے اسے سوتے میں شہید کرڈالا۔

اس لشکر میں ایک کردی امیر اسدالدین شیر کوہ بھی تھا جو نورالدین زنگی سے مخلصانہ شفقت رکھتا تھا۔ اس نے یہ خبر سنی تو دوڑتا ہوا نورالدین کے خیمے میں آیا۔

''آپ کو اپنے جاں نثاروں کے ساتھ فوراً حلب چلے جانا چاہیے۔ مرکزِ حکومت موصل وزیر اعظم جمال الدین کے زیر اثر ہے اور چونکہ وزیر اعظم سیف الدین غازی (نورالدین زنگی کا بڑا بھائی) کا ساتھی اور ہم نوا ہے اس لیے آپ کا وہاں جانا ضرر رساں ثابت ہوسکتا ہے۔ آپ حلب جاکر اپنا اقتدار قائم کریں۔''

نورالدین زنگی کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔ اس نے یہ مشورہ قبول کیا اور حلب چلا گیا۔ اس شہر میں اس کا خاطر خواہ استقبال ہوا۔ کسی طرف سے مخالفت کی کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ نورالدین زنگی نے شہر کا انتظام سنبھال لیا۔

اس طرح عمادالدین کی حکومت دونوں بھائیوں میں تقسیم ہوگئی۔ حلب اور اس کے نواحی علاقے نورالدین زنگی کے حصے میں آئے اور موصل پر سیف الدین کا قبضہ ہوگیا۔

دونوں بھائی محض غلط فہمی کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہوگئے تھے لیکن دونوں کو احساس تھا کہ آپس کے اختلاف سے صلیبی حکمران فائدہ اُٹھائیں گے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف جو ''جہادِ مقدس'' (عیسائی صلیبی جنگوں کو اسی نام سے پکارتے تھے) شروع کررکھا ہے اس میں انہیں کامیابی مل جائے گی۔

سیف الدین نے چھوٹے بھائی کو منانے کے لیے کئی خط لکھے لیکن نورالدین موصل آتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ سیف الدین کو شک ہوا کہ نورالدین کہیں بغاوت پر آمادہ نہ ہوگیا ہو۔ اس نے نورالدین کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اپنی فوج کے ہمراہ حلب کی طرف روانہ ہوا اور شہر کے مضافات میں پہنچ کر نورالدین کو اپنے پاس بلایا۔

نورالدین اب بھی خائف تھا۔ اس نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اکیلا سیف الدین کے پاس جائے یا سیف الدین اپنی فوج کے ہمراہ اس سے ملاقات کرے۔ دونوں بھائیوں میں طے ہوا کہ وہ دونوں پانچ پانچ سو سواروں کی معیت میں ملاقات کریں گے۔

نورالدین جب اپنے بھائی کے قریب پہنچا تو بڑے بھائی کو دیکھ کر شہید باپ کی یاد آگئی۔ وہ گھوڑے سے اُتر گیا اور آگے بڑھ کر بھائی کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ کچھ دیر آنسو باتیں کرتے رہے پھر رندھی ہوئی آواز میں سیف الدین نے پوچھا۔

''بے وقوف، تو میرے پاس آنے سے کیوں گریزاں تھا؟''

''میں ڈرتا تھا بھائی۔''

''کس بات سے ڈرتا تھا۔ کیا ہماری تربیت ایسی ہوئی ہے کہ میں تیرے خلاف کوئی قدم اُٹھاؤں گا۔ ارے میں تو تجھے اپنا بازو سمجھتا ہوں۔''

''برادرِ من! بے شک یہ میری غلطی تھی۔''

''وعدہ کر کہ ہم دونوں مل کر دشمنانِ اسلام سے جنگ کریں گے۔ عیسائیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ عمادالدین شہید ہوا ہے لیکن جہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اس کے یہ دونوں بیٹے زندہ ہیں اور یک جان دو قالب ہیں۔''

''بھائی، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''اب تمہارا حلب پر حکومت کرنا ہی مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔ مجھے خود سے دور مت سمجھنا۔ اگر عیسائیوں کی شر انگیزی تمہیں پریشان کرے تو بلا تامل مجھے آواز دینا۔''

دونوں اس خوشگوار ملاقات کے بعد اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہوگئے۔

نورالدین زنگی اس ملاقات کے بعد حلب پہنچا۔ نئے عزائم اس کے ساتھ تھے نیا جوش اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے تمام امرا اور عوام کو جمع کیا اور ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

''دوستو! گواہ رہنا، میں نے حکومت کی ذمے داریاں اس لیے قبول نہیں کی ہیں کہ قیصر و کسریٰ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے عیش و عشرت کی زندگی بسر کروں بلکہ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ اپنی تمام صلاحیتوں کو ان فرنگی طالع آزماؤں کے خلاف بروئے کار لاؤں جو گزشتہ پچاس برسوں سے مسلمانوں کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔

مجھ کو کبھی بادشاہ یا سلطان مت سمجھنا بلکہ قوم و ملک کا ایک خادم تصور کرنا۔ اگر میں کبھی کوئی غلطی کروں تو مجھے متنبہ کردینا یا میری حمایت سے دست کش ہوجانا۔''

عوام اور امرا نے اس کی تائید کی اور نورالدین حکومت کے کاموں میں منہمک ہوگیا۔

☆☆☆

نورالدین کے والد عمادالدین شہید نے جب ایڈیسہ کو فتح کیا تھا تو وہاں کا حکمران جوسلین ثانی فرار ہوکر دریائے فرات کے ایک مغربی شہر میں روپوش ہوگیا تھا۔ اب عمادالدین اس دنیا میں نہیں رہا تو اس کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے ایڈیسہ کے عیسائی باشندوں سے ساز باز کرکے ایڈیسہ پر شب خون مارا اور مسلمان محافظوں کو روندتا ہوا شہر کے اندر داخل ہوگیا لیکن اچھا یہ ہوا کہ قلعے کے مسلمان بروقت خبردار ہوگئے۔ انہوں نے دروازے بند کرلیے اور جوسلین ثانی کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور نورالدین کو مدد کے لیے پکارا۔

نورالدین زنگی کو جونہی خبر ملی وہ دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر ایڈیسہ کی طرف بڑھا اور شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

عیسائی دونوں طرف سے مسلمانوں کی زد میں آگئے۔ قلعے کے اندر سے محصور مسلمان تیروں کی بارش کررہے تھے۔ باہر سے نورالدین کی فوج شمشیر زنی کررہی تھی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والا معاملہ تھا۔ ایک ایک کرکے جوسلین

کے تمام سردار مارے گئے البتہ جوسلین فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ نورالدین کا لشکر شہر کے اندر داخل ہوا۔ ان عیسائیوں کے گھروں کو جی کھول کر لوٹا جنہوں نے جوسلین سے سازباز کی تھی۔

نورالدین نے ایڈیسہ میں چند دن قیام کیا۔ شہر اور قلعے کی حفاظت کے ازسرِنو انتظامات کیے اور باپ کی اس نشانی کو دوبارہ قبضے میں لے کر حلب کی طرف لوٹ آیا۔

جوسلین کی اس شکست نے پورے یورپ کو یاد دلا دیا کہ عمادالدین ابھی مرا نہیں۔ اس کی شکل میں اس کا بیٹا نورالدین موجود ہے۔

ایڈیسہ کے پادریوں کا ایک گروہ رات کی تاریکی میں نکلا اور اپنی فریاد لے کر پوپ یوگینس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی داستان سن کر پوپ نے اعلان کیا ”ارضِ مشرق کے عیسائیوں کی مدد کرنا خداوند یسوع مسیح کے تمام نام لیواؤں کا فرضِ اوّلین ہے۔ اگر وہ اس وقت نہ اُٹھے تو یروشلم کو اپنے ہاتھوں سے گنوادیں گے۔ اُٹھو اور مسلمانوں کے عزائم خاک میں ملادو۔“

پوپ کا یہ بیان گویا دوسری صلیبی جنگ کا آغاز تھا۔

پوپ کی آواز ابھی گونج رہی تھی کہ یورپ میں سینٹ برنارڈ نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف اُبھارنا شروع کیا۔ اس کی دھواں دھار تقریروں نے وہی کیفیت پیدا کر دی جو پہلی صلیبی جنگ میں ہوئی تھی۔ ہر طرف مسلمانوں کے خلاف غیظ وغضب کی آگ بھڑک اُٹھی۔

دنیائے اسلام میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس فتنہ عظیم کا مقابلہ کرتا۔

جگہ جگہ عیسائیوں کے اجتماع ہونے لگے۔ ایسا ہی ایک اجتماع ویزلی (فرانس) کے مقام پر ہوا۔ اس اجتماع کی رونق اور اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی جب عوام کے بے پناہ ہجوم میں طبقہ امرا کے لوگ بھی شامل ہوگئے بادشاہ فرانس لوئی ہفتم بہ نفسِ نفیس اس اجتماع میں شرکت کے لیے آیا تھا۔

سینٹ برنارڈ کی ولولہ انگیز تقریر نے جوش وغضب کی ایسی آندھی چلائی کہ شاہ فرانس نے آگے بڑھ کر سینٹ کے ہاتھوں سے صلیب لی اور اعلان کیا۔ ”میں اس جنگِ مقدس میں ضرور حصہ لوں گا۔“

اس اعلان نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ہر طرف سے صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ”صلیب کی سربلندی کے لیے ہم اپنی جانیں قربان کردیں گے۔“

اس اجتماع کے ختم ہوتے ہی شہر اور گاؤں خالی ہوگئے۔

خالی گھروں میں صرف وہی لوگ رہ گئے جو اپاہج تھے یا بہت بوڑھے تھے یا پھر عورتیں رہ گئی تھیں۔ باقی سب لوگ صلیب برداروں میں شامل ہوگئے۔ بعد میں صلیب بردار عورتوں کی فوج بھی تیار ہوگئی۔

سینٹ برنارڈ فرانس سے فارغ ہوکر جرمنی گیا اور بادشاہ کو جنگِ مقدس (صلیبی جنگ) میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ اس کی تقریروں نے یہاں بھی اثر دکھایا۔ شاہ جرمنی نے بھی جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کردیا۔

جرمنی اور فرانس کے کونے کونے سے صلیبی جنونیوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔

”شاہ فرانس اور شاہ جرمنی نے اپنی سلطنتوں کے انتظام کے لیے نائب مقرر کیے اور خود جرار فوجیں لے کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے۔

شاہ فرانس لوئی ہفتم کے ہمراہ عورتوں کی فوج کے علاوہ ایک لاکھ جنگجو تھے۔ شاہ جرمنی کے ساتھ اس قدر فوج تھی کہ شمار مشکل تھا۔

مورخین کا اندازہ ہے کہ دونوں بادشاہوں کے جھنڈے تلے نو لاکھ جنگجو تھے۔

انسانی سروں کے اس سمندر نے پہلا پڑاؤ قسطنطنیہ میں کیا اور پھر ایشیائے کوچک میں داخل ہوگیا۔ اس کی قیادت جرمنی اور فرانس کے بادشاہان کر رہے تھے۔

ایشیائے کوچک میں سلطان مسعود سلجوق (اوّل) کی حکومت تھی۔ اس نے مقابلے کی تیاری کی اور اپنی فوجوں کو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پھیلا دیا۔ عیسائی لشکر جیسے ہی زد میں آیا، سلجوقی ان پر ٹوٹ پڑے۔ پہاڑوں میں گھرے ہوئے عیسائی ہاتھ پاؤں چلائے بغیر کٹتے رہے۔ پہاڑوں سے نکلے تو ان کے لشکر کے تو حصے مکمل طور پر تباہ ہو چکے تھے صرف ایک حصہ بہ مشکل تمام بچ نکلنے میں کامیاب ہوسکا۔ شہنشاہ جرمنی، بچی کھچی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچا جہاں شاہ فرانس دوسرے راستے سے پہنچ چکا تھا۔

شاہ فرانس اس حملے سے محفوظ رہا تھا۔ دونوں بادشاہ نیقیہ میں ملے تو گلے لگ کر رودیے اور عہد کیا کہ دونوں اکٹھے فلسطین جائیں گے لیکن شہنشاہ جرمنی، اپنی فوج کے تو حصے تباہ کرا چکا تھا۔ اس میں اب مزید حوصلہ نہیں تھا۔ وہ موسم سرما گزارنے کے بہانے قسطنطنیہ چلا گیا۔

شاہ فرانس اکیلا ہی نیقیہ سے نکلا اور لاؤڈیسیا کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے اپنی فوج کے دو حصے کردیے تھے۔ ایک آگے روانہ ہوا، دوسرا اس کے پیچھے۔

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

جون 2012ء کے شمارے کی گرم جوشیاں

عمیرہ احمد

+ عکس

عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

نامید سلطانہ اختر

+ زندگی

زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے روشناس کراتا آپ کی پسندیدہ مصنفہ کے قلم سے لکھا نیا سلسلے وار ناول

اے دل ناداں

ایک لڑکی کی زندگی کے نشیب و فراز جو اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں تھی میمونہ خورشید کی ناقابلِ فراموش تحریر

فیصلوں کا سفر

محبت کہیں زندگی کو رعنائیوں اور رنگوں سے مزین کرتی ہے تو کہیں زندگی کو صحرا بنا دیتی ہے کچھ اسی رنگ میں عالیہ حرا کی تحریر

اس کے علاوہ

اقبال بانو، عطیہ عمر، عقیلہ حق، فرحانہ ناز ملک شمیم فضلِ خالق اور دیگر مصنفات کی دلچسپ و یادگار تحریریں

دیگر مقبول سلسلے

دین کی باتیں، بہنوں کی محفل، روحانی مشورے، میں اکثر گنگناتی ہوں، طبی مشورے، میرا انتخاب، جلترنگ، ہومیو کلینک اور وہ سب جو آپ پڑھنا چاہتی ہیں

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

سلجوقی اب بھی پیچھا کر رہے تھے۔ انہوں نے گھات لگا کر ایسا حملہ کیا کہ آگے روانہ ہونے والی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا لیکن لوئی شاہ فرانس پہاڑی راستوں سے گزرتا ہوا اطالیہ کی بندرگاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں سے وہ سمندر کے راستے انطاکیہ پہنچا جہاں ریمنڈ حکمران تھا جو ملکہ فرانس کا چچا تھا۔ ریمنڈ نے بادشاہ فرانس اور اس کے لشکر کی جو اب ایک چوتھائی رہ گیا تھا، شاہانہ خاطر مدارات کی لیکن جلد ہی ریمنڈ اور لوئی ہفتم میں بدمزگی ہوگئی۔ لوئی ہفتم نے رختِ سفر باندھا اور یروشلم پہنچ گیا۔

یہاں کے عیسائیوں نے اس کے پہنچنے پر خوب خوشی منائی۔ مسرت کا ایک موقع اس وقت میسر آگیا، شہنشاہ جرمنی بھی یروشلم پہنچ گیا۔

یروشلم کا بادشاہ بلڈون ثالث تھا۔ اسے اپنا مفاد نظر آیا کہ جب دو بادشاہ مل گئے ہیں تو ان کی فتوحات کے نتیجے میں یروشلم کی سلطنت میں بھی وسعت ہوگی۔ ملک گیری کی اس ہوس نے اسے بھی اس جنگ میں شامل ہونے پر اکسایا۔ وہ بھی ان بادشاہوں کے ساتھ مل گیا۔ تینوں بادشاہوں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں طے پایا کہ مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کے لیے سب سے پہلے دمشق پر حملہ کیا جائے۔

تینوں بادشاہوں کا متحدہ لشکر طے شدہ منصوبے پر تیزی سے دمشق کی طرف بڑھا۔ شہر کے تین طرف مٹی کی مضبوط فصیل بنی ہوئی تھی اور ایک طرف گنجان باغوں کی اس قدر کثرت تھی کہ کوئی بڑا لشکر ان میں سے بہ آسانی نہ گزر سکتا تھا۔ صلیبیوں نے اسی طرف سے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں کا حاکم امیر مجیرالدین ایک نہایت نااہل تھا۔ اس کا وزیر معین الدین سیاہ سپید کا مالک بنا ہوا تھا۔ معین الدین کئی ماہ تک صلیبی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا رہا۔ جب کامیابی کی کوئی صورت نہیں نکلی تو اس نے مدد کے لیے سطان نورالدین زنگی کو آواز دی۔ نورالدین نے اپنے بھائی سیف الدین کو خط لکھ دیا اور خود ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دمشق کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں اسے سیف الدین بھی مل گیا۔

عیسائیوں پر ان دونوں لشکروں کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ جنگ کی نوبت آنے سے پہلے ہی راتوں رات محاصرہ اُٹھا کر یروشلم کی طرف روانہ ہوگئے۔

اس پسپائی نے سب کی ہمتیں توڑ دیں۔ شہنشاہ جرمنی واپس چلا گیا۔ شاہ فرانس بھی کچھ عرصہ فلسطین میں رہا اور پھر وہ بھی واپس چلا گیا۔

یہ صلیبی جنگ جس جوش وخروش سے شروع ہوئی تھی اتنی ہی سرعت سے ختم ہوگئی۔ یورپ نے اس جنگ میں لاکھوں آدمی کٹوا ڈالے لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔

صلیبی جنگ ختم ہوگئی لیکن عیسائیوں کا غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ صلیبی جنگ نے تعصب کی جو آندھی چلائی تھی اس کے اثرات جگہ جگہ ظاہر ہو رہے تھے۔ شامی مقبوضات میں عیسائیوں نے عام بغاوت کردی۔ جگہ جگہ فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔

اس بغاوت نے اس خیال سے سر اُٹھایا تھا کہ عمادالدین زنگی کے بعد اس کے بیٹے اپنی وسیع سلطنت کو کسی صورت میں نہیں سنبھال سکیں گے۔ نورالدین زنگی نے ان کے اس خیال کو جلد ہی زائل کردیا۔ سلطان نے ان حالات کا نہایت تحمل سے جائزہ لیا اور پھر باغیوں کے مراکز پر ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ باغیوں کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ کچھ مارے گئے، کچھ بھاگ نکلے۔

بھاگے ہوئے باغی کچھ دن چھپے رہے اور پھر وہ بصریٰ کے مقام پر جمع ہوئے اور یہ طے پایا کہ ارضِ شام کے تمام عیسائی متحد ہوکر حلب پر حملہ کردیں۔ اس لڑائی میں اسے اُلجھا لیا جائے اور نصف عیسائی لشکر دوسرے اسلامی مقبوضات پر حملہ کردے۔ نورالدین حلب چھوڑ کر کہیں جاسکے گا۔ اس طرح نورالدین کی قوت کئی حصوں میں بٹ جائے گی۔

سلطان نورالدین کے وقائع نگاروں نے وقت سے پہلے اس سازش کا پتا لگالیا۔ اس سے پہلے کہ عیسائی اس سازش پر عمل پیرا ہوتے، سلطان حلب سے ایک زبردست فوج کے ہمراہ نکلا اور شورش پسندوں کے سر پر جا پہنچا اور شرارت کا آغاز کرنے سے پہلے ہی کچل دیا۔ وہ عیسائی جو شام کے کونے کونے سے یہاں جمع ہوئے تھے، مارے گئے اور باقی فرار ہوگئے۔

سلطان شام میں تھا کہ اسے اپنے بڑے بھائی سیف الدین والی موصل کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر آئی کہ اس کے چھوٹے بھائی قطب الدین نے موصل کی حکومت سنبھال لی ہے۔ نورالدین موصل پر اپنا حق تسلیم کرتا تھا۔ وہ موصل حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ قطب الدین کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنی فوج کو لے کر نکلا۔ دونوں کے درمیان جنگ چھڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وزیر جمال الدین کی فراست کام آئی اور دونوں بھائیوں کے درمیان صلح ہوگئی۔ قطب الدین نے نورالدین کی اطاعت قبول کرلی۔ نورالدین نے اسے اپنی طرف سے موصل کا امیر مقرر کردیا۔

ریمنڈ والی انطاکیہ نے سلطان نورالدین کے مقبوضات پر دست اندازی کرنے کا ارادہ کیا اور پانچ ہزار سواروں کے ساتھ حلب کی طرف بڑھا۔

نورالدین تین ہزار کا لشکر لے کر نکلا اور ایک مقام پر خیمہ زن ہوگیا۔ ریمنڈ کی فوج پہلے ہی اس مقام پر پہنچ چکی تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو نورالدین اور اس کے سپہ سالار اسدالدین شیرکوہ نے اس جنگ میں کمال جواں مردی دکھائی۔ ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ ریمنڈ اس لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد عیسائیوں کے قدم کہاں رک سکتے تھے۔ وہ بے ترتیبی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ریمنڈ کے علاوہ کئی اور سردار بھی مارے گئے تھے۔ نورالدین کے لیے بہت آسان تھا کہ انطاکیہ پر قبضہ کرلیتا' لیکن اس نے کسی مصلحت کے تحت قبضہ نہیں کیا اور لوٹ آیا۔ ریمنڈ نے اپنے پیچھے بوہمینڈ نامی ایک کمسن بچہ چھوڑا تھا جو اس کے بعد تخت نشین ہوا۔

دمشق کے وزیر معین الدین کی وفات ہوگئی۔ دمشق کا نظم و نسق امیر مجیرالدین نے خود سنبھال لیا۔ اس کی نااہلی سب پر واضح تھی۔ عیسائیوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے نواحی علاقوں کو تاراج کرنا شروع کردیا۔ امیر نے کوئی کارروائی نہیں کی تو ان کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ دن دہاڑے مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرکے لے جاتے اور انہیں غلام بنا کر فروخت کر ڈالتے۔ نورالدین زنگی کی حمیت نے جوش مارا۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ عیسائیوں کی سرکوبی کرے گا۔ اس نے والی دمشق سے اس کام میں مدد دینے کے لیے ایک ہزار سوار طلب کیے۔ امیر غیرت وحمیت سے بالکل ہی عاری ہوچکا تھا۔ اس نے مدد دینے کے بجائے عیسائیوں سے ساز باز کرلی اور مدد دینے سے صاف انکار کردیا۔ نورالدین نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کو حزان کی طرف روانہ کیا جہاں عیسائی لوٹ مار میں مصروف تھے اور دوسرے حصے کو اپنے ساتھ لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوا اور دمشق کے قریب جا کر مقیم ہوگیا۔ والی دمشق کو اس کی آمد کی خبر ملی تو ایک گستاخانہ خط سلطان کے پاس بھیجا۔

''بہتر یہی ہے کہ تم واپس چلے جاؤ ورنہ ہماری تلواریں تمہیں واپس بھیجیں گی۔''

سلطان نے اس گستاخی کو نہایت تحمل سے برداشت کیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ خود یہاں آئے اور باہمی گفت وشنید سے معاملات طے کرلے۔ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ یہاں عیسائیوں کی بیخ کنی کے لیے آیا ہے، دمشق پر قبضہ کرنا اس کا مقصود نہیں۔

امیر دمشق پر اس کا بھی اثر نہیں ہوا بلکہ اسے اس نے سلطان کی کمزوری سمجھا اور بہ دستور اپنی ضد پر اڑا رہا کہ سلطان واپس چلا جائے۔

سلطان آپس کی لڑائیوں سے گریزاں رہتا تھا لیکن امیر کے رویے نے اسے مجبور کردیا کہ وہ نواحِ دمشق سے نکلا اور دمشق کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ امیرِ دمشق نے جب سلطان کے یہ تیور دیکھے تو اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ صلح کی درخواست لے کر حاضر ہوگیا۔ معاہدۂ صلح تحریر ہوا جس کے مطابق امیر نے تسلیم کیا کہ جامع دمشق میں خلیفہ بغداد کے بعد خطبوں میں سلطان نورالدین کا نام پڑھا جائے گا۔ تمام فوجی سرداروں کا تقرر نورالدین کی منظوری سے ہوا کرے گا اور اسی کے نام کا سکہ جاری ہوگا۔ مالی معاملات امیر کے پاس رہیں گے۔

سلطان اس صلح کے بعد حلب واپس آگیا۔ اس کی فوج کا دوسرا حصہ بھی عیسائی مفسدوں کی شرانگیزی کا خاتمہ کرکے واپس آچکا تھا۔

نورالدین ایسی قسمت لے کر آیا تھا کہ اسے ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ دمشق سے فرصت ملی تو جوسلین ثانی اس کے سامنے کھڑا تھا جو ایڈیسہ کے معرکے میں نورالدین سے شکست کھا کر بھاگ گیا تھا اور حلب کے شمال میں کچھ علاقوں پر اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ آئے دن اسلامی علاقوں پر چھاپے مارتا رہتا تھا۔ اس کے اُکسانے پر دوسرے علاقوں کے عیسائی بھی اس کے ساتھ شامل ہوجاتے تھے۔

سلطان نورالدین یلغار کرتا ہوا اس کے علاقے میں جا گھسا۔ جوسلین نے انطاکیہ اور شام کے عیسائیوں کو بھی اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔

دو ماہ تک مسلمانوں اور عیسائیوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔

اطراف وجوانب سے عیسائیوں کی تازہ دم فوجیں پہنچتی رہیں۔ کسی مسلمان کی غیرت نے جوش نہیں مارا جو سلطان کی مدد کو پہنچتا۔ عیسائیوں کی فوجیں اس بڑی تعداد میں جمع ہوگئیں کہ دوسری صلیبی جنگ کی یاد تازہ ہوگئی۔ نورالدین کی فوج تعداد میں بہت کم تھی اور اب تو عیسائیوں کے سامنے اس کی کوئی وقعت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ نورالدین کی فوج اس کا ساتھ چھوڑ گئی لیکن وہ خود فرار کا طوق اپنے گلے میں نہ ڈال سکا۔ چند ساتھیوں کو ساتھ لیا اور ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔

عیسائی یہ سمجھ کر بھاگتے ہوئے مسلمانوں کا تعاقب

کررہے تھے کہ سلطان بھی ان کے ہمراہ ہوگا جبکہ سلطان ایک خاص ارادے سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک اونچے ٹیلے پر چھپا ہوا تھا۔

عیسائیوں نے کچھ دور تک مسلمانوں کا تعاقب کیا اور پھر پلٹ آئے۔ جب وہ واپس پلٹ رہے تھے اور اس ٹیلے کے نیچے سے گزر رہے تھے تو سلطان نے ان پر حملہ کردیا لیکن عیسائیوں کی تعداد زیادہ تھی اور پھر وہ فتح کے نشے سے سرشار تھے، انہوں نے سلطان کے مٹھی بھر سپاہیوں کو اپنے نیزوں پر رکھ لیا۔

سلطان کو اپنی اب تک کی زندگی میں پہلی شکست ہوئی۔ وہ پیچ وتاب کھاتا ہوا حلب کی طرف واپس ہوگیا۔

سلطان کو شکست ہوئی تھی، اس کے حوصلے کو نہیں۔ وہ کسی مناسب موقعے کی تلاش میں لگا رہا۔ یہ موقع اسے بہت جلد مل بھی گیا۔ یوں ہوا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے بعد جوسلین ثانی کی توقعات حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ مسلمانوں کو شکست بھی دے سکتا ہے۔ ایڈیسہ اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اس نے سوچا ابھی سلطان نورالدین اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا ہوگا۔ ایڈیسہ میں اس کی معمولی سی فوج ہے جسے زیر کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ ایڈیسہ پر قبضہ کرلیا جائے۔

سلطان نے اسے راستے ہی میں جا دبوچا۔ ایک جرار فوج کے ساتھ اس کے سامنے آ گیا۔ سلطان نے اس مرتبہ ایک جنگی چال چلی اور جوسلین اس کے فریب میں آ گیا۔ سلطان نے خلافِ معمول قلب لشکر کو اپنے سپہ سالار شیرکوہ کے سپرد کیا اور خود میمنہ سنبھال لیا۔ جوسلین نے اپنا سارا زور مسلمانوں کے قلب پر ڈال دیا۔ شیرکوہ نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ یہ عمل سلطان کی ہدایت کے مطابق تھا۔ سلطان نے اپنے میمنہ کے ہمراہ دو کوس کا چکر کاٹا اور عیسائیوں پر پیچھے سے حملہ کردیا۔ عیسائیوں نے اس کے مقابلے کے لیے جونہی پیچھے کا رُخ کیا، شیرکوہ نے ان پر حملہ کردیا۔ اب عیسائی دونوں طرف سے گھر گئے تھے۔ اس افتاد نے ان کی قدم اکھاڑ دیے۔

جوسلین نہایت بے بسی کے عالم میں گرفتار ہوگیا۔ امرا کا اصرار تھا کہ جوسلین جیسے شیطان صفت کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ لیکن سلطان کی نرم گیری نے گوارا نہیں کیا کہ اس کے خون سے ہاتھ رنگے۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اس دشمنِ اسلام کو کھلا چھوڑ دے۔ اس نے حکم دیا کہ جوسلین کو حلب میں قید کردیا جائے۔

جوسلین حلب کے قید خانے میں نو برس تک زندہ رہا۔ اس دوران اس کی بصارت بھی جاتی رہی اور پھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اسی قید خانے میں مرگیا۔

جوسلین کی گرفتاری کے بعد سلطان نورالدین نے ایڈیسہ کے باقی علاقوں کی طرف فاتحانہ شان سے پیش قدمی شروع کردی۔ عیسائیوں کی کئی جماعتیں ان علاقوں کے دفاع کے لیے پہنچیں لیکن نورالدین کی فتوحات کا سیلاب نہ تھم سکا۔ تھوڑے ہی عرصے میں جتنے علاقے عیسائی سرداروں کے قبضے میں تھے، وہ سب فتح کرلیے۔

عیسائیوں کا ایک مضبوط گڑھ ''جلدک'' تھا۔ اس قلعے میں ہزاروں عیسائی جنگجو جمع تھے۔ قلعے کی فصیلیں نہایت مضبوط تھیں لیکن نورالدین کے ارادوں سے زیادہ مضبوط نہیں تھیں۔ مسلسل سنگ باری سے قلعے کی فصیلوں میں شگاف پڑ گئے اور مسلمان نعرہ تکبیر پڑھتے ہوئے قلعے میں داخل ہوگئے۔ عیسائی خفیہ راستوں سے بھاگ نکلے اور ایک دوسرے قلعے ''دلوکا'' میں جا کر پناہ لے لی۔ سلطان ان کا پیچھا کرتے ہوئے ''دلوکا'' پہنچ گیا اور یہاں بھی اپنا پرچم نصب کردیا۔

دلوکا کی فتح کے بعد نورالدین عیسائیوں کے مضبوط ترین قلعہ تل باشر کی طرف متوجہ ہوا۔ تل باشر کے عیسائی مدتوں سے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے، ان کا سر کچلنا لازمی تھا۔

ان لوگوں کو جونہی سلطان کی آمد کا علم ہوا، انہوں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ دلوکا کی فتح کے بعد سلطان کا رعب ان پر ایسا طاری تھا کہ کسی میں لڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ سلطان کی اطاعت قبول کرلی جائے۔ سلطان پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ عیسائیوں کی سفارت اس کے پاس پہنچی تا کہ شرائطِ صلح طے کرلی جائیں۔

''آپ لوگوں کی کیا شرط ہے؟'' سلطان نے پوچھا۔

''ہماری کوئی شرط نہیں۔ آپ جن شرائط پر چاہیں صلح کرلیں۔ ہمیں ہر شرط منظور ہوگی۔''

سلطان نورالدین نے ان کے ساتھ نہایت نرم دلی کا مظاہرہ کیا اور معمولی سے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر ان کو عام شہریوں جیسے حقوق شہریت مرحمت فرمائے۔

ایک طرف یہ عیسائی تھے جو نورالدین سے شرائطِ صلح طے کررہے تھے، دوسری جانب والیٔ دمشق امیر مجیرالدین تھا جس نے بعض شرائط پر نورالدین سے صلح کرلی تھی لیکن وہ اب ان کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ چپکے چپکے عیسائیوں سے ساز باز کررہا تھا۔ عیسائیوں نے بھی اس سے عہد کرلیا تھا کہ وہ نورالدین پر جب

بھی چڑھائی کرے گا، وہ اس کا ساتھ دیں گے۔

سلطان کے وقائع نگار امیرِ دمشق کی حرکات وسکنات سے سلطان کو مسلسل آگاہ کررہے تھے لیکن سلطان ایک مسلمان کے خلاف لشکرکشی سے گریز کررہا تھا لیکن جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو وہ لشکر جرار لے کر حلب سے نکلا اور مضافات دمشق میں ٹھہر گیا۔ یہاں سے اس نے امیرِ دمشق کے نام پیغام بھیجا۔

''میں خدا کے فضل سے مسلمان ہوں اور ہزارہا مسلمانوں کی جانوں کا امین ہوں۔ میں مسلمانوں کی کسی حکومت کا دشمن نہیں ہوں۔ میرا مقصدِ حیات صرف دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ میں نے دمشق پر صرف اس لیے چڑھائی کی ہے کہ تم نے عیسائیوں سے ساز باز کرلی ہے جو مسلمانوں کے دشمن ہیں، اس طرح تم بھی اس جہاد کے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہو جو میں نے شروع کیا ہوا ہے۔ تم اگر میرے ساتھ اس جہاد میں شامل ہوجاؤ تو میرا اور تمہارا کوئی جھگڑا نہیں رہ جاتا۔ میں ابھی محاصرہ اُٹھا کر چلا جاؤں گا ورنہ تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو دشمنانِ اسلام کے ساتھ کرتا ہوں۔''

امیرِ دمشق پر اس پیغام کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ سلطان نے اس کی تیاریوں کو دیکھتے ہوئے دمشق کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کردیا۔

امیرِ دمشق نے یونہی سر نہیں اُٹھایا تھا۔ اس کی مدد کے لیے عیسائیوں کا ایک لشکر بڑھا چلا آرہا تھا۔ سلطان کے امرا نے اس نازک موقعے پر سلطان کو مشورہ دیا کہ پہلے عیسائیوں سے نمٹ لیا جائے۔ سلطان نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ اپنے سپہ سالار شیرکوہ کی سرکردگی میں روانہ کیا اور دوسرے حصے کو لے کر خود روانہ ہوا اور ''قدایا'' کے مقام پر ٹھہر گیا۔

امیرِ دمشق باہر نکلا اور عیسائیوں کے ساتھ مل گیا۔ سلطان قدایا سے نکلا اور دمشق پر زبردست دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

دمشقی فوج سے جھڑپیں شروع ہوگئیں لیکن سلطان مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا تھا اس لیے کسی بڑے حملے سے گریز کررہا تھا۔ وہ ہر شام دمشقی فوج کو پیغام بھیج دیا کرتا تھا۔ میں مسلمانوں کے خلاف طاقت استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ تمہارے آدمی مریں یا ہمارے، خون تو مسلمانوں کا بہے گا۔ تم ہتھیار پھینک دو۔ چند جھڑپوں کے بعد دمشقی فوج حوصلہ ہار بیٹھی۔

امیرِ دمشق ایک مرتبہ پھر صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہوگیا۔ سلطان دو مرتبہ پہلے بھی امیر کو آزما چکا تھا لیکن عیسائیوں کو زیر کرنے میں امیرِ دمشق بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا اسی لیے سلطان اسے بار بار معاف کررہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس شرط پر صلح کرلی کہ عیسائیوں سے جہاد کے وقت والیٔ دمشق کو فوج اور سامانِ حرب سے اس کی مدد کرنی ہوگی۔

دمشق سے واپسی کے بعد بہت دن تک سلطان کو کسی جنگ کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔

وہ امن وامان کے ساتھ حلب میں دن گزار رہا تھا اور رعایا کی فلاح وبہبود کی تدبیروں میں مصروف تھا کہ ایک روز ایک نوجوان کو اس کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس نوجوان کا نام صلاح الدین یوسف تھا جو اپنے باپ نجم الدین ایوب سے رخصت ہوکر اپنے چچا شیرکوہ کے پاس حلب آیا تھا۔ یہی صلاح الدین تھا جو صلاح الدین ایوبی کے نام سے دنیائے اسلام میں حامل شہرت ہوا۔ قدرت خود انتظام کررہی تھی کہ نورالدین کے بعد صلیبیوں سے نمٹنے کے لیے کوئی تو ہو۔ چراغ سے چراغ کسی طرح تو جلے۔

سلطان کی نگاہِ مردم شناس نے صلاح الدین کی غیر معمولی لیاقت اور فہم وفراست کا اندازہ کرلیا۔ اس کو نہ صرف اپنے مصاحبین میں شامل کرلیا بلکہ مختلف شہروں میں کئی جاگیریں بھی عطا کیں۔

والیٔ دمشق نے ایک مرتبہ پھر بدعہدی پر کمر باندھی۔ وہ ایک طرف سلطان کو مطمئن کیے ہوئے تھا، دوسری جانب عیسائیوں سے ساز باز کررہا تھا۔ وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں رہا تھا کہ عیسائی اپنے مفاد کے لیے اس سے تعلق استوار کررہے ہیں۔ ان کا مقصد دمشق پر قبضہ کرنا تھا۔ بالڈون شاہ یروشلم کی نظر میں دمشق اور مصر پر لگی ہوئی تھیں۔ ان دو علاقوں پر قبضہ ہوجانے کے بعد نورالدین کو گھیرے میں لے لینا بہت آسان تھا۔ نورالدین کو شکست دینے کے بعد پھر کوئی طاقت نہیں رہ جاتی تھی جو عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتی۔

سلطان نورالدین عیسائیوں کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ دمشق اور مصر پر عیسائیوں کا قبضہ ہوجائے لیکن والیٔ دمشق کی منافقت سے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ دمشق کے اس منافقانہ رویے کی وجہ سے نہ تو وہ مصر کی طرف بڑھ سکتا تھا اور نہ یروشلم پر ضرب لگا سکتا تھا۔ اب اس نے اس منافق کی طاقت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینک دینے کا تہیہ کرلیا۔ اس نے اپنے سفارت

کار شیر کوہ کو ایک ہزار سواروں کے ہمراہ سفارت کار کے طور پر دمشق روانہ کیا۔ والی دمشق نے یہ موقع بھی ضائع کر دیا۔ اس نے نہ تو شیر کوہ سے ملاقات کی اور نہ اس کی فوج کے لیے رسد کا انتظام کیا۔ وہ دمشق کے قریب ہی خیمہ زن ہو گیا اور سلطان کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ امیر کا یہ رویہ سلطان کی سخت توہین تھی۔ اس نے جانباز لشکر ساتھ لیا اور منزلیں مارتا ہوا دمشق کے مشرقی دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اور امیرِ دمشق کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر حملہ آور ہو گیا۔ دوسری طرف سے شیر کوہ نے طبلِ جنگ بجا دیا۔ دمشقی لشکر نے شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے اور فصیلوں پر سے تیر اور آگ کے گولے برسانے لگے۔ ایک دن اور ایک رات یہی کیفیت رہی لیکن دوسرے دن سلطان کی فوج فصیل کو ایک جگہ سے توڑ کر شہر کے اندر داخل ہو گئی۔ دمشقی فوج پہلے ہی بددل ہو رہی تھی۔ دیوار ٹوٹتے ہی ان کے حوصلے بھی ٹوٹ گئے۔ انہوں نے ہتھیار رکھ دیے۔

سلطان نے اندر داخل ہوتے ہی اپنی فوج کو حکم دیا کہ کسی شہری کی جان اور مال کو نقصان نہ پہنچایا جائے، کسی بھاگتے ہوئے کا تعاقب نہ کیا جائے۔

امیرِ دمشق قلعے میں چھپ گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن سلطان کی خدمت میں پہنچ کر طالب معافی ہوا لیکن اب اس کی جان بخشی نہیں کی جا سکتی تھی، دمشق میں اس کا رہنا مسلمانوں کے لیے خطرناک تھا۔ سلطان نے اسے حمص کا شہر جاگیر میں دے کر ہمیشہ کے لیے دمشق سے رخصت کر دیا۔ نورالدین زنگی دمشق کا وارث بن گیا۔

یہ قبضہ اہم ترین واقعہ تھا۔ اس سے نورالدین کی سلطنت موصل سے حران تک پھیل گئی اور یروشلم تک جانے کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔

دمشق پر قبضہ ہو گیا تو قاعدے کے مطابق دمشق کے تمام مقبوضات پر بھی نورالدین کی سیادت مسلم ہو گئی لیکن قلعہ بعلبک کے حاکم نے قبضہ دینے سے انکار کر دیا لہٰذا نورالدین کو بہ زور طاقت اس قلعے پر قبضہ کرنا پڑا۔

دمشق سے نمٹنے کے بعد نورالدین نے قلعہ "حارم" پر لشکر کشی کا ارادہ کیا۔ عیسائیوں کا یہ مشہور قلعہ حلب کے مغرب میں واقع تھا۔

اس وقت نورالدین زنگی کے لشکر کا شمار نہیں تھا۔ اس کے شوقِ جہاد نے عام مسلمانوں میں بھی روحِ جہاد پھونک دی تھی۔ مسلم نوجوان جوق در جوق اس کے لشکر میں شامل ہو رہے تھے اور اس کے حکم پر سر کٹانے کو تیار تھے۔ اس کے مقبوضات اتنے ہو گئے تھے کہ ہر جگہ فوج کی تعیناتی ضروری تھی۔ وہ اپنے ساتھ بہت تھوڑی فوج رکھتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر قریب ترین مقام سے فوج طلب کر لیا کرتا تھا۔

اس کا لشکر جب سیاہ جھنڈے لہراتا ہوا نکلا، جن پر کلمہ توحید کلابتو سے لکھا ہوا تھا تو اہلِ حارم اس کے خوف سے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک سیاہ آندھی تھی جو قلعے کے سامنے آ کر ٹھہر گئی تھی۔

انطاکیہ کا والی بوہمنڈ ایک لشکر جرار لے کر اہلِ حارم کی مدد کو یہ سوچ کر آیا کہ اہلِ حارم قلعے سے باہر نکل آئیں گے۔ دوسری طرف سے وہ پہنچ جائے گا۔ مسلمان درمیان میں پھنس جائیں گے لیکن محصورین کی اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ قلعے سے نکلتے۔ سلطان کی فوج کا ایک حصہ محاصرے پر ڈٹا رہا، دوسرے حصے نے بوہمنڈ کے حملے کا ایسا جواب دیا کہ اس کا منہ پھیر دیا۔

محصورین جب مایوس ہو گئے تو انہوں نے بوہمنڈ کو پیغام بھیجا کہ نورالدین سے لڑنا فضول ہے۔ وہ محاصرہ اُٹھا کر کبھی نہیں جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ نصف مضافات حارم اسے دے کر صلح کر لو۔ بوہمنڈ بھی اب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ وہ اس جنگ میں کود پڑا تھا۔ اب اسے انطاکیہ کی فکر ہو رہی تھی۔ اس کا باپ سلطان کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کا انجام ابھی بھولا نہیں تھا۔ اہلِ حارم کی رضا ملتے ہی اس نے اسی شرط پر صلح کر کے سلطان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور انطاکیہ کو بچا لیا۔

ابھی وہ صلح نامے پر دستخط کر رہا تھا کہ اس کے وقائع نگاروں نے اطلاع دی کہ کئی چھوٹے چھوٹے عیسائی امرا نے جمع ہو کر حلب پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ دراصل جب بھی سلطان اپنے مرکز سے دور ہوتا تھا، عیسائیوں کا کوئی نہ کوئی گروہ اس موقعے کا فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔

سلطان نے فوراً اپنی فوج کا ایک حصہ ان عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ سلطانی فوج نے ان عیسائیوں کو چند روز میں کچل کر رکھ دیا۔

سلطان بھی حارم کا محاصرہ اُٹھا کر حلب آ گیا۔

☆☆☆

1156ء کا سال تھا کہ ایک ہولناک قیامت نے شام کی سرزمین کا رُخ کر لیا۔ زمین نے کروٹ بدلی اور گاؤں کے گاؤں زمین میں دھنس گئے۔ ایسا وحشت ناک زلزلہ آیا کہ بے دینوں کو بھی خدا یاد آ گیا۔ حلب اور حماۃ کے اکثر دیہات یوں غائب ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ صرف حماۃ میں مرنے والوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ شیزر میں کسی کو اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ گھر سے باہر نکلتا۔ مرنے والوں میں یہاں کا حاکم بھی تھا۔

اس قیامت کا سامنا اہلِ دمشق کو بھی کرنا پڑا۔ قدیم عمارتیں اور یادگاریں زمیں بوس ہو گئیں۔ شاید ہی کوئی شہر یا قصبہ ایسا بچا ہو جس کی شہر پناہ یا فصیل برباد نہ ہو گئی ہو۔

سلطان نورالدین نے اس تباہی کو آبادی میں بدلنے کے لیے آرام خود پر حرام کر لیا۔ خزانے کے منہ کھول دیے۔ اپنی فوج کو ہر طرف پھیلا دیا۔ اپنے محل میں آرام سے نہیں بیٹھا رہا بلکہ خود قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں جا کر نقصانات کا اندازہ کرتا اور حاجت مندوں کی مالی مدد کرتا۔ سرکاری خرچ پر لوگوں کے مکانات کی تعمیر کا حکم دیا۔ قلعوں اور شہروں کی منہدم فصیلیں ہنگامی بنیادوں پر بنوائیں کیونکہ اس نازک وقت میں بھی وہ عیسائیوں کی شرانگیزی سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس موقعے سے کوئی بھی فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔

☆☆☆

عیسائیوں میں ایسی خفیہ تنظیمیں وجود میں آ گئی تھیں جو مسیحی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہوئے دہشت گردی کی طرف مائل تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ جگہ جگہ لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو فوجی گروہوں کی صورت میں منظم کر لیا تھا۔ ان تنظیموں کا بظاہر مقصد تو یہ تھا کہ یروشلم کے عیسائی زائرین کی حفاظت اور خدمت کریں گے لیکن درپردہ اپنی کوششوں کو مسلمانوں کی بستیوں پر چھاپے مارنے پر مرکوز کیا ہوا تھا۔

زلزلے کی تباہ کاریوں سے فرصت پاتے ہی سلطان نے ان "خدائی فوجداروں" کی سرکوبی کے لیے دو لشکر الگ الگ روانہ کیے۔ ایک لشکر حمص اور حماۃ کی طرف گیا، دوسرا حلب کے نواحی علاقوں میں اس طرح گھات لگا کر بیٹھ گیا جیسے چوروں کو پکڑنے کے لیے پولیس بیٹھتی ہے۔

بہت جلد ان لٹیروں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ بڑے بڑے جیالے قتل ہوئے جو قید کر لیے گئے انہیں شہر میں تشہیر کرا کے قتل کر دیا گیا۔

مورخین کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر نورالدین کے ذریعے مسلمانوں پر احسان نہ کرتا تو فرنگی محاصرے اور لڑائی کے بغیر ہی اسلامی ممالک میں گھس جاتے۔

عیسائیوں کی یہ خفیہ تنظیمیں یونہی کام نہیں کر رہی تھیں بلکہ انہیں یروشلم کی پشت پناہی حاصل تھی اور تمام عیسائی ان کی حمایت میں تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ جب سلطان نے ان تنظیموں کے افراد کو قتل کرا دیا تو شامی عیسائیوں نے انتقام لیا اور حمص و حماۃ کے کئی نواحی علاقوں کو روند ڈالا۔ سلطان کو خبر ہوئی تو طوفان بن کر ان پر دوڑ پڑا اور ایک خونریز لڑائی کے بعد ان کا تعاقب کرتا ہوا بانیاس پہنچا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محصور عیسائیوں نے ایسا دلیرانہ مقابلہ کیا کہ سات دن تک ایک مسلمان بھی قلعے کے قریب نہ جا سکا۔

شیر کوہ فصیل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے بارودی سرنگ لگا کر شمالی فصیل کو اُڑا دیا۔ لشکری اندر داخل ہوئے اور ایک برج پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔ محصورین اس عالم میں بھی مقابلہ کرتے رہے لیکن جب جانی نقصان بہت ہو گیا تو "امان امان" کے نعرے بلند کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ایک ہزار سپاہیوں کو گرفتار کر لیا اور مالِ غنیمت کی ایک بڑی مقدار ان کے ہاتھ آئی۔

ابھی وہ پوری طرح فتح کی خوشی سے سرشار بھی ہونے نہیں پایا تھا کہ اسے اطلاع ملی، اس کے چھوٹے بھائی نصرت الدین کی ایک آنکھ شہید ہو گئی ہے۔

اس حادثے کی اطلاع دیتے ہوئے اس کے امیر تذبذب میں تھے لیکن جب اسے خبر سنائی گئی تو اس نے یہ خبر اطمینان سے سنی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ اسی وقت بھائی کو دیکھنے گیا اور اسے تسلی دی۔

بانیاس میں چند روزہ قیام کے بعد سلطان حلب لوٹ آیا تھا لیکن کوئی ایسا مرض ساتھ لگا لایا تھا کہ آتے ہی سخت علیل ہو گیا۔ بیماری نے ایسا طول پکڑا کہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ اسے شہر حلب سے قلعے میں پہنچا دیا گیا۔

سلطان کی حالت روز بہ روز بگڑتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کی سانس اکھڑ جاتی تھی۔ ایک روز کچھ حالت سنبھلی تو اس نے ارا کینِ سلطنت کو مشورے کے لیے طلب کیا۔

"اب مجھے لگتا ہے کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ مجھے یہ افسوس ہمیشہ رہے گا کہ میں عیسائیوں کا پوری طرح قلع قمع نہیں کر سکا لیکن آپ لوگ گواہ ہیں کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ فروغِ اسلام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اب جو خدا کی مرضی۔ آپ لوگوں سے استدعا یہ ہے کہ میرے شروع کیے ہوئے جہاد کو آگے بڑھاتے رہنا۔"

"سلطان مکرم! ہم آپ سے عہد کرتے ہیں کہ اس جہاد کو جاری رکھیں گے۔"

"آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ اگر میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو میرا جانشین کون ہو گا؟"

"ہم میں سے کسی کو شوقِ بادشاہی نہیں۔ ہم تو اسلام کی

خدمت کے لیے آپؑ کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔ آپ جو بھی نام پیش کریں گے، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”میں اپنے بھائی نصرت الدین کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں اور شیرکوہ نصرت الدین کی نیابت کریں گے۔ اگر آپ لوگوں کو اب بھی کوئی اعتراض ہو تو میں اپنی رائے بدلنے کو تیار ہوں۔“

”اگر آپ زیادہ اصرار کرتے تو ہم بھی یہی نام پیش کرتے۔ ہمیں ان ناموں پر کوئی اعتراض نہیں۔“

سلطان نے اسی وقت شیرکوہ کو حکم دیا کہ وہ دمشق چلا جائے۔

”دمشق پر عیسائیوں کے حملے کا خدشہ ہے اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنا قیام دمشق میں رکھیں۔“

”حضور کو اس حال میں چھوڑ کر؟“

”میری عیادت سے زیادہ دمشق کی حفاظت ضروری ہے۔“

شیرکوہ اسی وقت دمشق کے لیے روانہ ہوگیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان انتظامات کے بعد سلطان کی حالت تیزی سے سنبھلنے لگی۔ اس دوران سلطان کی علالت کو دیکھتے ہوئے صلیبی لشکروں نے کئی علاقوں پر حملے کیے جنہیں سلطان کے فوجیوں نے ناکام کردیا۔ ان میں ایک علاقہ شیزر بھی تھا جس پر فرانسیسی فوج نے حملہ کردیا تھا۔ مگر اسمٰعیلیوں نے اطراف وجوانب سے جمع ہوکر فرانسیسیوں کی مزاحمت کی اور انہیں پسپا کردیا۔

سلطان علیل تھا۔ یہ خبریں سن سن کر وہ پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ پھر جب وہ صحت یاب ہوگیا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شیرکوہ کو ایک مضبوط فوج کے ساتھ شیزر کی طرف روانہ کیا۔ یہ قلعہ سلطان کے قبضے میں نہیں تھا لیکن اس کا محل وقوع ایسا تھا کہ اگر وہاں عیسائیوں کا تسلط ہوجاتا تو سلطان کے لیے مستقل دردِ سر بن جاتا۔

یہ قلعہ ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اس کے تین اطراف اونچے اونچے پہاڑ تھے اور چوتھی طرف دریا تھا۔ قلعہ کے باہر ایک گہری خندق تھی۔

اس قلعے کو فتح کرنا بہ ظاہر مشکل معلوم ہو رہا تھا لیکن جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہاں کا حاکم زلزلے میں ہلاک ہوگیا تھا اور اس کا جانشین ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ اس لیے سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ شیرکوہ جیسے ہی شہر کے قریب پہنچا، اہلِ شہر نے باہر نکل کر سلطان کی اطاعت قبول کرلی۔

شیرکوہ نے شہر میں داخل ہوکر شہر پناہ کو ازسرِنو تعمیر کرایا۔ اور وہاں اپنے امیروں میں سے ایک امیر کو سلطان کے حکم سے حاکم بنا کر واپس آگیا۔

قلعہ حارم کے محاصرے کے دوران صلح کرتے ہوئے عیسائیوں نے حارم کے نصف مضافات دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب وہ اپنے قول سے پھر گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ قرب وجوار کے اسلامی علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کردیے تھے۔ ان کی سرکشی کو کچلنا ضروری تھا۔ سلطان نے شیرکوہ کو آگے روانہ کیا اور پھر خود بھی حلب سے حارم کی طرف چل پڑا۔

ابھی سلطان پہنچا بھی نہیں تھا کہ شیرکوہ نے عیسائیوں پر ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ ان کو دوبارہ اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اسی اثنا میں خبر ملی کہ حران اور صیدا میں عیسائیوں نے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ سلطان نے شیرکوہ کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا اور خود دمشق چلا گیا۔

شیرکوہ کی اس مہم میں صلاح الدین ایوبی بھی شامل تھا۔

شیرکوہ نہایت خاموشی سے پیش قدمی کرتا رہا اور پھر عیسائیوں کو مہلت دیے بغیر ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس حملے میں لاتعداد عیسائی مارے گئے، بھاگ گئے یا قیدی بن گئے۔

یہ فتح اتنی اہم تھی کہ سلطان نورالدین نے دمشق سے باہر نکل کر فتح مند لشکر کا استقبال کیا اور انعام واکرام سے نوازا۔

جب سلطان حران وصیدا کے عیسائیوں سے نمٹ چکا تو اس نے یروشلم کی صلیبی ریاست کے حکمران بالڈون ثالث کی طرف توجہ دی کیونکہ تمام مفسدوں کے پیچھے بالعموم اس کا ہاتھ ہوتا تھا۔ اس توجہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ یروشلم کے اندر گھس کر صلیبی شرپسندوں سے دو دو ہاتھ کرے۔ اس نے دمشق سے کوچ کیا اور اپنی سرحد عبور کرکے عیسائی علاقے میں داخل ہوگیا۔

عیسائیوں کو اس حملے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی اور انہوں نے پوری تیاری کرلی تھی۔ عیسائیوں کی سرحد کے چند میل اندر جیش نامی ایک بلند ٹیلہ تھا۔ عیسائیوں نے وہاں بیٹھ کر انتظار کیا تاکہ مسلمانوں کو یروشلم تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لیا جائے۔

عیسائی اتنی تیاری سے آئے تھے کہ چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد انہوں نے مسلمانوں کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔ وہ پیچھے ہٹتے چلے گئے لیکن سلطان اس نازک وقت میں بھی جاں نثاروں کے ایک دستے کے ہمراہ میدان جنگ میں ڈٹا رہا۔ جب عیسائی تین اطراف سے اس پر ٹوٹ پڑے تو جیش کے ... پہنچ گیا اور وہاں سے اس کے سپاہیوں نے عیسائیوں ... مارنے شروع کردیے۔

اس کے سپاہی تیر برسا رہے تھے اور وہ خود سجدے میں گرا ہوا تھا۔

”الٰہی تو نے مجھ بندۂ ناتواں کو اس ملک کی حکومت دی۔ میں نے تیرے شہروں کو آباد کیا اور میں نے ان میں بسنے والوں کو ان کاموں سے روکا جس سے تو نے مجھے روکا۔ بے شک! مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی اور میں تنہا ان کفار کو جو تیرے دین اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ہیں دفع نہیں کرسکتا اور میں اپنے نفس کے سوا اور کسی شے کا مالک نہیں ہوں اور بے شک میں نے اس (نفس) کو تیرے دین کی حفاظت اور تیرے نبی کی حمایت کے لیے ان کے سپرد کردیا ہے۔“

اس نے کچھ دیر کے لیے ٹیلے سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ عیسائی چونکہ نشیب میں تھے اس لیے ان کا بہت نقصان ہو رہا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر پیچھے ہٹنا شروع کردیا تھا۔ وہ سراسیمہ تھے کہ پورے لشکر کو انہوں نے بھگا دیا اور سلطان ایک دستہ فوج کے ساتھ ان کی جان کو عذاب بنا ہوا ہے۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے رات کی تاریکی میں روپوش ہوگئے۔

سلطان کے ساتھ اس وقت بہت تھوڑے آدمی تھے اس لیے دشمن کے علاقے میں مزید پیش قدمی نہیں کی جاسکتی تھی۔ سلطان واپس لوٹ آیا۔

اس معرکے کے بعد سلطان پھر علیل ہوگیا۔ مرض نے ایسی شدت اختیار کی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوگیا۔ غذا بالکل ترک ہوگئی۔ کمزوری اتنی ہوگئی کہ بار بار غشی کے دورے پڑتے تھے۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنی سلطنت کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی گزشتہ علالت کے دوران اپنے بھائی نصرت الدین کو اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ نصرت الدین سے کچھ ایسے اقدامات سرزد ہوئے تھے کہ سلطان اس سے خوش نہیں تھا۔ اب تک اس لیے خاموش تھا کہ اس کی نگرانی کے لیے خود موجود تھا لیکن اس بیماری نے اسے پھر ہوش دلا دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اسے کچھ ہوگیا اور یہی وصیت برقرار رہی تو مسلمانوں کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ اس نے تمام امرا کو جمع کیا اور انہیں اپنی نئی وصیت سے آگاہ کیا۔

”میں نے اپنی گزشتہ علالت میں نصرت الدین کے حق میں وصیت کی تھی اور اسے اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی سیادت عظمیٰ کا اہل ثابت نہیں کیا۔ لہٰذا میں اپنی پہلی وصیت کو منسوخ کرتا ہوں۔ اور تم کو تاکید کرتا ہوں کہ میرے بعد قطب الدین مودود، امیر موصل (سلطان کا ایک اور بھائی) کے ہاتھ پر بیعت کرلینا کیونکہ اس کے اخلاق پسندیدہ ہیں اور اس کے دل میں دشمنانِ دین کے خلاف جہاد کرنے کا جذبہ بھی ہے۔“

تمام امرا نے اس وصیت پر حلف اُٹھایا اور عہد کیا کہ وہ سلطان کی اس وصیت پر عمل کریں گے۔ سلطان نے امرا کی رضامندی دیکھ کر قطب الدین کو دمشق آنے کے لیے خط لکھ دیا۔

ان امرا میں بعض وہ بھی تھے جنہیں یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے خفیہ اجلاس کر رہے تھے اور نصرت الدین کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے طے کیا کہ نصرت الدین کو دمشق پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی جائے اور اسے اپنی حمایت کی ضمانت دی جائے۔ انہوں نے نصرت الدین کے نام ایک خط لکھا اور قاصد کے حوالے کردیا کہ وہ حلب جاکر یہ خط نصرت الدین تک پہنچا دے۔

یہ قاصد حلب پہنچ گیا تھا لیکن اتفاق سے گورنر حلب کے سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ اس کی تلاشی لی گئی تو یہ خط برآمد ہوا جس میں نصرت الدین کو دمشق پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

گورنر نے یہ خط اسی وقت سلطان نورالدین کو بھیج دیا۔ تمام سازشی امرا گرفتار کرلیے گئے۔ سازش پکڑی گئی تھی لیکن یہ سازش اپنا کام دکھا چکی تھی۔ یہ بات نصرت الدین کی سمجھ میں آگئی تھی کہ دمشق پر قبضہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس نے ایک لشکر کو ساتھ لیا اور دریائے فرات عبور کرکے دمشق کی طرف بڑھنے لگا۔

شیرکوہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ نصرت الدین کو روکنے کے لیے دمشق سے چل پڑا۔ نصرت الدین کو معلوم ہوا کہ شیرکوہ حرکت میں آگیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سازش پکڑی گئی ہے تو وہ راستے ہی سے واپس ہوگیا۔ لیکن شہر حران پر قبضہ کرلیا۔

سلطان نے صحت یاب ہوتے ہی بذاتِ خود حران کا رُخ کیا۔ سلطان شہر کے قریب پہنچا تو نصرت الدین اپنے اہل وعیال کو قلعہ میں چھوڑ کر خود تن تنہا فرار ہوگیا۔ سلطان نے اتنی رعایت کی کہ اس کے متعلقین کو اس کے پاس پہنچانے کا حکم دیا اور حران کو اپنے ایک امیر کی جاگیر میں دے کر دمشق واپس آگیا۔

عیسائیوں کے علم میں ابھی تک یہ تھا کہ سلطان بستر علالت پر ہے اور اس کے بھائی جانشینی کے مسئلے پر ایک

دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ قسطنطنیہ اور فرانس کے بادشاہوں نے متحد ہوکر سلطان کے مقبوضات پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ وہ ایک زبردست فوج لے کر حمص اور حماۃ کی طرف بڑھے۔ سلطان اس عرصے میں صحت یاب ہوچکا تھا۔ وہ صلیبیوں کی یلغار کی خبر سن کر ان کے مقابلے کو پہنچ گیا۔ عیسائی اسے اپنے مقابلے پر دیکھ کر حیران رہ گئے اور جنگ سے گریز کی راہیں ڈھونڈنے لگے۔ قسطنطنیہ (روم) کے بادشاہ نے پہل کی اور بادشاہ کو یہ پیغام بھیجا کہ ہمارا یہاں آنے کا مقصد جنگ وجدال نہیں بلکہ ہم ان عیسائی قیدیوں کو چھڑانا چاہتے ہیں جو آپ کی قید میں ہیں۔ ان کے عوض ہم مناسب زرِ فدیہ دینے کے لیے تیار ہیں۔

سلطان ان کی چالاکی کو سمجھ رہا تھا۔ وہ محض یہ پیغام دینے کے لیے تو حماس اور حماۃ تک نہیں آئے تھے۔ یہ کام تو ایک قاصد بھی کرسکتا تھا لیکن سلطان اس وقت تک خونریزی پر آمادہ نہیں ہوتا تھا جب تک دوسرا فریق آمادۂ جنگ نہ ہو۔ ہمیشہ سے اس کا یہی وتیرہ رہا تھا۔ اس نے یہ درخواست قبول کرلی اور تمام عیسائی قیدیوں کو رہا کردیا۔

سلطان کی اعلیٰ ظرفی کا ایک مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب شاہ یروشلم بالڈون کا اچانک انتقال ہوگیا۔ وہ اعلیٰ پائے کا منتظم اور نہایت دلیر بادشاہ تھا۔ اس کی وفات نے یروشلم پر بہت بُرے اثرات چھوڑے۔ یروشلم کا نظم ونسق بگڑ گیا۔ ابتری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سلطان نورالدین کے امرا نے اسے مشورہ دیا کہ یروشلم کی ابتری سے فائدہ اُٹھا کر حملہ کردینا چاہیے۔

"اگر اس وقت یروشلم پر حملہ کردیا جائے تو دفاع کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یروشلم پر بہ آسانی قبضہ ہوجائے گا اور عیسائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوجائیں گے۔"

سلطان نے یہ کہہ کر ان کے مشورے کو رد کردیا۔

"اس وقت عیسائیوں سے ان کا ایک اہم بادشاہ چھن گیا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس وقت جبکہ وہ اس کا سوگ منا رہے ہیں ہم ان پر حملہ کردیں۔ لڑائی کے بہت مواقع آئیں گے۔ یروشلم پر قبضہ بھی ہوجائے گا لیکن اس وقت نہیں۔"

اگر اس وقت سلطان، یروشلم پر حملہ کردیتا تو کامیابی یقینی تھی لیکن سلطان نے اس وقت حملہ کرنا مردانگی سے بعید سمجھا۔

سلطان کی اس اعلیٰ ظرفی پر اس کے امرا دنگ رہ گئے اور یہ کہتے سنے گئے کہ جو شخص اپنے دشمن پر احسان کرسکتا ہے اسے کبھی شکست نہیں ہوسکتی۔ ہم پر بھی لازم ہے کہ ایسے بادشاہ کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں نچھاور کردیں۔

عیسائیوں پر اس احسان کا بدلہ عیسائیوں نے یہ دیا کہ کاؤنٹ ریمنڈ والیٔ طرابلس نے شرارت پر کمر باندھی اور اپنی ریاست کے نواحی مسلم علاقوں کو تاراج کرنا شروع کردیا۔

ان علاقوں کے مسلمانوں نے سلطان کے نام کی دہائی دی۔ سلطان نے اس آواز پر لبیک کہا اور مجاہدوں کا لشکر لے کر طرابلس کی طرف چل دیا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ قلعہ اکراد میں عیسائی جنگجو جمع ہیں اور لڑائی کی تیاری کررہے ہیں۔ سلطان نے اس قلعے کے قریب بقیعہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔

اسے توقع تھی کہ عیسائی اس سے مقابلے کے لیے میدان میں نکلیں گے لیکن عیسائی قلعہ بند ہوگئے تھے۔ سلطان مسلسل پڑاؤ ڈالے ان کے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔ عیسائی بھی اس پر نظر رکھے ہوئے تھے اور مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سلطان کی فوج ہتھیار کھول کر اپنے خیموں میں آرام کررہی تھی۔ سلطان بھی اپنے خیمے میں دھوپ سے بچ کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

محافظوں کی نظریں دور نظر آنے والے پہاڑی پر بنے قلعے پر تھیں جہاں کوئی حرکت نظر نہیں آرہی تھی۔ دور تک خاموشی تھی اور میدان میں پھیلی ہوئی دھوپ تھی۔

قلعے کے اندر اس وقت بڑی پُراسرار سرگرمیاں دیکھی جاسکتی تھیں۔ کئی دن سے مشاہدہ کیا جارہا تھا کہ دوپہر کے وقت سلطانی فوج اپنے خیموں میں آرام کرتی ہے۔ چند پہرے دار ہوتے ہیں جو لشکر کی نگرانی کے لیے جاگ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی نظریں صرف معروف راستوں پر ہوتی ہیں۔ عیسائیوں نے اس دوپہر اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے قلعے کے خفیہ دروازے سے نکل کر باہر آرہے تھے۔ جب سب باہر نکل آئے تو وہ پہاڑوں کو دیوار بنا کر ایسے راستے پر آگئے جو سلطانی لشکر کے محافظوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔

سلطان کے پہرے دار بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے تھے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اچانک ایک شور بلند ہوا۔ عیسائی لشکر حملہ آور ہوگیا تھا۔ یہ ایسا شب خون تھا جو دن کے وقت مارا گیا تھا۔ عیسائی، محافظوں کو قتل کرکے، مختلف خیموں میں گھس گئے۔ مسلمانوں کو اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ ہتھیار سنبھال سکتے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو عیسائیوں نے شہید کرڈالا۔ کچھ عیسائی سلطان کے خیمے کے سامنے جمع ہوگئے۔ سلطان نے بھرپور شجاعت کا

... شیر بدست اُٹھ کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے اس کا ... کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اچک کر اس پر سوار ہوا اور ... دائیں بائیں آگے پیچھے وار کرتا ہوا دور تک پھیلے ہوئے ... کے جتھوں کے درمیان سے نکل گیا۔ نیزوں نے ... تلواریں دیکھتی رہ گئیں۔

سلطان نے گھوڑے کی رفتار میں کمی نہیں آنے دی۔ ... چلا گیا۔ اس نے چھ کوس کا فاصلہ طے کیا اور حمص کے ... بحیرہ قدس کے کنارے ایک جگہ ٹھہر گیا۔ وہ اس وقت ... تھا۔ اس امید پر رک گیا تھا کہ شاید اس کے کچھ فوجی بھی ... ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں۔ پھر سوچا جائے ... کہ اب کیا کرنا ہے؟ کچھ ہی دیر میں وہ مسلمان وہاں پہنچ ... جو عیسائیوں کی تلواروں کا شکار ہونے سے بچ گئے تھے۔

"سلطان مکرم! ہم اس وقت بہت تھوڑے ہیں۔ بے سامان ہیں۔ بہت سے ہتھیار بھی وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ ممکن ہے عیسائی ہمارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں۔ اس کھلی جگہ پڑاؤ ڈالنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ ہم ... کے اندر جاکر قیام کریں۔"

سلطان نے بگڑ کر جواب دیا "میں شہر پناہ میں چھپ کر زندگی گزارنے کے لیے نہیں بنا ہوں۔ اگر میرے ساتھ صرف ایک ہزار سوار رہ جائیں تو بھی جب تک عیسائیوں سے شہید مسلمانوں کا بدلہ نہیں لے لوں گا ہرگز کسی دیوار کے سائے میں نہ بیٹھوں گا اور نرم بچھونے مجھ سے دور رہیں گے۔"

وہ حمص سے صرف چھ کوس کے فاصلے پر تھا لیکن اس نے شہر کے اندر جانا گوارا نہیں کیا اور کھلے میدان میں پڑا رہا۔

اسی وقت دمشق اور حلب سے خیمے، گھوڑے اور آلاتِ حرب (ہتھیار) وغیرہ منگوالیے۔ شہید فوجیوں کے ورثہ کو بھی طلب کرلیا تاکہ ان کے نقصان کا ازالہ کیا جائے۔

لشکریوں کا جو نقصان ہوا تھا اسے پورا کرنے کے لیے اس نے لشکریوں میں دینار تقسیم کرنے شروع کیے۔ ہر شخص اپنا نقصان بتا رہا تھا اور سلطان اتنے دینار اسے دیتا جاتا تھا۔

سلطان کے دیوان نے یہ تقسیم دیکھی تو آگے بڑھ کر سلطان سے عرض کیا "لوگ جس قدر نقصان کا دعویٰ کررہے ہیں، اس پر ان سے حلف لیا جائے کیونکہ بعض لوگ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔"

سلطان نے جواب دیا "کسی سے کوئی حلف نہیں لیا جائے گا۔ میں جو کچھ دے رہا ہوں کا اجروثواب بھی میرے پیشِ نظر ہے۔ اگر کسی کو کچھ زیادہ مل جائے گا تو وہ مجھے دعائیں ... گا۔"

ایک امیر قریب کھڑا تھا، اس نے کہا "آپ کو اجروثواب کا خیال ہے تو آپ کے شہر میں حاجت مند بھی ہیں، صوفیہ اور فقہا بھی، ان کو دیجیے۔"

سلطان کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہوگیا "کیا تم انہیں جو میدانِ جہاد سے دور بیٹھے ہیں اور انہیں جو جہاد کے لیے نرم بچھونوں کو چھوڑ کر تیروں اور تلواروں کے سائے میں شب وروز گزارتے ہیں برابر سمجھتے ہو۔ کیا میں ان کا حق چھین کر دوسروں کو دے دوں؟"

سلطان کا جواب سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سلطان نے دولاکھ دینار سرخ تقسیم کردیے۔

عیسائی چاہتے تھے کہ آگے بڑھ کر حمص پر قبضہ کرلیتے لیکن چھ کوس پرے بیٹھے سلطان نورالدین کا خوف ایسا غالب تھا کہ جارحانہ اقدام کی بجائے اپنے دفاع کی فکر کرنے لگے۔ انہوں نے سلطان کی طرف صلح کا پیغام بھیجا لیکن سلطان کا غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس پیغام کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

عیسائیوں نے سلطان کی سردمہری دیکھی تو انہیں گرمیوں میں سردی لگنے لگی اور وہ اپنے اپنے علاقوں کی طرف منتشر ہوگئے۔

سلطان دمشق لوٹ آیا لیکن اب اس کے شب وروز اسی فکر میں گزرتے تھے کہ کب عیسائیوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

مصر یروشلم سے قریب تر تھا۔ یہاں فاطمی خلافت قائم تھی۔ نورالدین نے مصر پر حکومت قائم کرنا ضروری سمجھا اور اس پر چڑھائی کردی۔ فاطمی اس کے مقابل ٹھہر نہ سکے اور خلیفہ مصر نے شیرکوہ کو مصر کا وزیر اعظم مقرر کرکے سلطان کی حاکمیت تسلیم کرلی۔

ابھی شیرکوہ کو وزیر اعظم ہوئے دو مہینے ہوئے تھے کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اب پھر نئے وزیر اعظم کی ضرورت پیش آئی۔

شیرکوہ کے ساتھ نوجوان صلاح الدین ایوبی بھی مصر آیا تھا۔ بعض امرا کی نگاہِ انتخاب اس پر پڑی لیکن چند امرا کو اختلاف بھی تھا۔ خلیفہ نے انہیں سمجھایا کہ موجودہ نازک حالات میں صلاح الدین ہی کو وزارت کے لیے آگے بڑھانا مناسب ہے کیونکہ وہی مصر کی پیچیدہ سیاست سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔

صلاح الدین ایوبی کو وزارت کے منصب پر فائز کردیا گیا۔

سلطان نورالدین نے صلاح الدین کی وزارت کی

خبر بڑی مسرت کے ساتھ سنی۔ وہ مصر کے مفتوح ہونے کو اپنی کامیابی سمجھتا تھا اور صلاح الدین کو اپنا قابلِ اعتماد نمائندہ تصور کرتا تھا۔

صلاح الدین کی اس کامیابی پر مسلمانوں نے خوشی منائی لیکن عیسائی انگاروں پر لوٹنے لگے۔ مصر پر سلطان کے تسلط کی وجہ سے یروشلم کی ریاست چکی کے دو پاٹوں میں پھنس گئی تھی۔ شاہ یروشلم نے اس خطرے کو بھانپ کر مصر کے ساحلی شہر دمیاط پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس حملے کے لیے شاہ قسطنطنیہ اور سسلی نے بھی یروشلم کا ساتھ دیا۔

صلاح الدین ایوبی نے دفاعی انتظامات کیے لیکن ساتھ ہی سلطان نورالدین کو بھی خط لکھ دیا۔

''میں کش مکش میں پڑ گیا ہوں۔ اگر مصر چھوڑ کر جاتا ہوں تو خدشہ ہے مصری امرا کوئی فتنہ برپا کر دیں گے اور تاخیر کرتا ہوں تو دمیاط ہاتھ سے جاتا ہے۔ دمیاط ہاتھ سے چلے جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دمیاط کو مرکز بنا کر مصر پر بار بار حملے کرتے رہیں گے۔''

سلطان نے خط ملتے ہی جنگجوؤں کے دستے دمیاط کی طرف بھیجنے شروع کر دیے اور خود عیسائی مقبوضات کو تاراج کرنا شروع کر دیا تاکہ عیسائیوں کی توجہ بٹ جائے۔

سلطان کی یہ حکمت عملی سودمند ثابت ہوئی۔ عیسائی پچاس دن کے محاصرے کے بعد حواس باختہ ہو کر اپنے مقبوضات کو بچانے کے لیے دوڑ پڑے۔

سلطان نے بعد میں مصر سے کلی طور پر فاطمی خلافت کا خاتمہ کر دیا اور مصر کو مکمل طور پر اپنے زیرِ اقتدار لے آیا۔ وہاں کا نظم و نسق حسب سابق صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ میں رہا لیکن اب اس کی حیثیت سلطان نورالدین کے ایک گورنر کی تھی۔ مصر میں عباسی خلیفہ اور سلطان نورالدین کے ناموں کا خطبہ پڑھا جانے لگا اور سکوں پر بھی نورالدین کا نام کندہ کرایا گیا۔

مصر پر سلطان نورالدین کے قبضے نے یروشلم کی صلیبی سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

مصر پر تسلط قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ سلطان نورالدین کو عیسائیوں نے پھر لڑائی پر مجبور کر دیا۔ مسلمانوں کی دو تجارتی کشتیاں مصر سے شام کی طرف جا رہی تھیں۔ عیسائیوں نے ان کشتیوں کو پکڑ لیا اور ان پر سوار تمام تاجروں اور ملاحوں کو گرفتار کر لیا۔

سلطان کو اس بزدلانہ حرکت کی خبر ہوئی تو اس نے عیسائیوں کو کشتیاں واپس کرنے کے لیے لکھا۔ عیسائیوں نے اس خط کا خاطر خواہ جواب نہیں دیا تو سلطان برہم ہو گیا۔ اس نے شام، موصل اور جزیرہ کی فوجوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ فوجیں اس کے حکم پر تیار رہا کرتی تھیں۔ حکم پہنچنے کی دیر تھی کہ فوجیں جمع ہو گئیں۔ سلطان نے ان فوجوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ وہ بار بار اپنے امیروں سے کہتا تھا کہ اگر عیسائیوں نے میرے پورے لشکر کو بھی گرفتار کر لیا ہوتا تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا اور سمجھ لیتا کہ انہوں نے مجھ سے کوئی انتقام لیا ہے لیکن تاجر اور ملاح تو بے قصور تھے۔ ان کا قصور اگر تھا تو محض یہ کہ وہ مسلمان تھے۔

اس نے اس لشکر کے ایک حصے کو طرابلس کی طرف بھیجا، دوسرے کو انطاکیہ کی طرف، تیسرے کو قلعہ عریمہ کی طرف اور چوتھے حصے کو اپنے ساتھ لے کر قلعہ عرقہ کی طرف چل پڑا۔

سلطان نے قلعہ عرقہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسی اثنا میں فوج کا وہ حصہ جو قلعہ عریمہ کی طرف گیا تھا، قلعہ فتح کر کے سلطان کے پاس آ گیا۔ اس فوج کے آ جانے سے سلطان کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ صرف چار دن کے محاصرے کے بعد محصورین نے ہتھیار ڈال دیے اور امان کی درخواست کر دی۔ سلطان نے ان سب کو معاف کر دیا لیکن اس شرط پر کہ قلعہ خالی کر کے کہیں چلے جائیں۔

عیسائیوں نے قلعہ خالی کر دیا تو سلطان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ کچھ دن وہاں قیام کیا اور پھر یلغار کرتا ہوا طرابلس پہنچ گیا۔ فوج کا ایک حصہ پہلے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اب اس کی فوج کے چاروں حصے طرابلس میں تھے۔ سلطان بذاتِ خود موجود تھا۔ عیسائیوں کو سلطان کے سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی، لہٰذا انہوں نے صلح کے پیغام بھیجنے شروع کر دیے۔ سلطان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ جن تاجروں کو گرفتار کیا گیا ہے، انہیں واپس کر دیں۔ آخر عیسائیوں نے شرط قبول کر لی اور اسی شرط کے ساتھ صلح نامہ مرتب کر لیا گیا۔

اس کے بعد سلطان نورالدین بہت دن تک خاموش رہا۔ صلاح الدین ایوبی اس کے نمائندے کی حیثیت سے عیسائیوں سے اُلجھا رہا۔ اس نے نورالدین کے حکم سے کئی قلعے فتح کیے۔ ان فتوحات سے عیسائی دنیا میں صلاح الدین کا نام متعارف ہونے لگا۔ انہیں اندازہ ہوا کہ ایک طاقت اُبھر رہی ہے جسے انہیں کچلنا ہوگا۔

اب سلطان نورالدین کی ایک ہی آرزو تھی کہ فتح بیت المقدس کا سہرا اس کے سر بندھے۔ وہ اکثر اپنی اس خواہش کا اظہار ان لفظوں میں کیا کرتا تھا۔

''میں اللہ تعالیٰ سے اس بات کی توفیق چاہتا ہوں کہ وہ

[illegible] کو ہر مقصود تک پہنچا دے۔ مجھے توفیق دے کہ میں [illegible] کے مقدس صحن کو تثلیث پرستوں سے پاک [illegible]''

اس نے یروشلم پر لشکر کشی کے لیے تیاریاں شروع کر دی اور کئی ہزار دینار خرچ کر کے حلب و دمشق کے نامی [illegible] سے ایک منبر تیار کرایا تھا کہ فتح کے بعد اس کو مسجد اقصیٰ میں رکھا جائے گا اور اس پر خطبہ پڑھا جائے گا۔ جہاد کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا اور پوری توجہ فوجوں کی تربیت پر مرکوز رہی تھی۔

1092ء میں عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کر لیا تھا۔ یہ قبضہ اس وقت سے اب تک چلا آ رہا تھا۔

عیدالفطر 1174ء کو سلطان نورالدین نے علی الصباح بیدار ہو کر غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے غربا میں صدقات تقسیم کیے۔

محافظ دستہ تیار کھڑا تھا۔ محل سے دمشق کے مشہور میدان [illegible] اخضر تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر محافظ دستے تھے اور وہ لوگ بھی جو بادشاہ کو گزرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ سلطان کو اسی راستے سے گزر کر نمازِ عید کے لیے جانا تھا۔ سلطان اس طرف سے گزرا تو یہی دیکھنے والے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عیدگاہ تک آئے اور سلطان کے ساتھ نمازِ عید ادا کی۔

خطبے میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا۔

''اے خدا اپنے بندے کی اصلاح کر جو تیری رحمت کا محتاج ہے اور تیری ہیبت سے خائف ہے اور تیری قوت سے وابستہ ہے اور تیری راہ میں جہاد کرنے والا ہے اور تیرے دین کے دشمنوں سے جھگڑنے والا ہے۔''

(وہ کون ہے) ابوالقاسم محمود بن زنگی بن آقسنقر ناصر امیرالمومنین۔

اے اللہ، اس کو حق دکھا، اے اللہ اس کی مدد کر، اے اللہ اسے توفیق دے۔''

اکثر بادشاہ اور سلطان اپنے نام کے ساتھ لمبے چوڑے القاب اور تعریفی الفاظ لکھا کرتے تھے اور خطبوں میں ان کے نام بڑی شان و شوکت سے لیے جاتے تھے لیکن سلطان نورالدین زنگی نے خطبے میں اس سادہ سی دعا کو اپنے لیے تجویز کیا تھا۔

سلطان نورالدین کو چوگان کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ عید کے اس پُرمسرت موقعے پر عید کے دوسرے دن اس نے اپنے امرا کو جمع کیا اور میدان اخضر میں جہاں ایک دن پہلے اس نے نمازِ عید ادا کی تھی، چوگان کھیلنے چلا گیا۔ [illegible] اور پھر امرا کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔

اس کے ایک امیر نے باتوں باتوں میں کہا ''کتنا بابرکت دن ہے کہ آج ہم سب اس میدان میں جمع ہیں لیکن خدا معلوم آئندہ سال ہم میں سے کون یہاں ہوگا۔''

سلطان نے کہا ''سال تو آپ نے بہت زیادہ کہہ دیا۔ ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایک مہینے کے بعد ہم سب یہاں جمع ہو سکیں گے یا نہیں۔''

اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ایک مہینے کی یہ مدت سلطان خود اپنے لیے مقرر کر رہا ہے۔ یہ محفل ہنسی خوشی ختم ہوئی۔ کسی کو یاد بھی نہیں رہا کہ وہاں کیا باتیں ہوئی تھیں۔ یہ باتیں کوئی ایسی انوکھی بھی نہیں کہ جنہیں یاد رکھا جاتا۔

چھ دن نہیں گزرے تھے کہ سلطان نے اپنے گلے میں معمولی سی تکلیف محسوس کی۔ پھر یہ تکلیف بڑھتے بڑھتے ایک مرض ''خناق'' کی صورت اختیار کر گئی۔ اطبا اور معالجین اپنی سی کوشش کر رہے تھے لیکن اس کی آواز اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ بولنے میں سخت دقت ہو رہی تھی۔ قریب بیٹھا ہوا آدمی بھی بڑی مشکل سے اس کی آواز سن سکتا تھا۔ معالجین اس کے اردگرد جمع تھے لیکن اب اسے کسی سے امید نہیں رہی تھی۔

وہ قلعہ دمشق کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک سادہ سے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سلطان جس کے قبضے میں آدھی اسلامی دنیا تھی، اس کی سادگی کا یہ عالم، اس کے معالجین اس تنگ و تاریک کمرے کو دیکھ کر اسے مشورہ دے چکے تھے کہ وہ اپنا کمرا تبدیل کر لے لیکن وہ تیار نہیں ہوتا تھا۔

''سلطان معظم! اس مرض کے علاج کے لیے ضروری ہے کہ فصد لی جائے۔'' اطبا نے متفق ہو کر کہا۔

''کمال کرتے ہو۔ میری عمر ساٹھ کے قریب ہونے والی ہے۔ اس عمر کے آدمی کی فصد نہیں لینی چاہیے۔ کوئی اور علاج تجویز کرو۔''

سلطان نے اس تجویز کو برہمی سے رَد کر دیا۔ دراصل اس کا وقت آخر آ پہنچا تھا۔ ملک الموت اسے کسی تدبیر پر آمادہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اطبا علاج پر علاج تجویز کرتے رہتے تھے لیکن وقت آخر آ پہنچا تھا۔

569ھ مطابق 1174ء کو اسلام کے اس مجاہدِ اعظم نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھاون سال تھی۔ اس نے 28 برس حکومت کی۔

وفات کے وقت اس کی تمام آرزوئیں قریب قریب

پوری ہوچکی تھیں۔ عیسائیوں کو وہ شام سے نکال چکا تھا۔ مصر پر اس کا قبضہ تھا۔ صرف ایک آرزو وہ اپنے ساتھ لے کر جارہا تھا۔ بیت المقدس کی فتح اس کی تشنہ آرزو تھی۔ بیت المقدس کی فتح صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں لکھی تھی جو بعد میں پوری ہوئی۔

سلطان کی وفات کی خبر جونہی قلعہ دمشق سے باہر آئی تو دمشق آہوں اور سسکیوں سے گونج اُٹھا۔ دمشق کا چپہ چپہ شورِ محشر کا نمونہ پیش کررہا تھا۔

اس خبر کو شہر پناہ سے باہر نکلتے دیر نہیں لگی۔ خلیفہ بغداد کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔ صلاح الدین دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، شعرا نے مرثیے لکھے۔

"ملک العادل کی رحلت پر ملک اور عدل ماتم کناں ہیں۔ تمام عالم پر تاریکی چھا گئی ہے۔ نہ آفتاب ہے اور نہ سایہ ہے اور جب نورالدین ہم سے رخصت ہوگیا تو محفل تاریک ہوگئی اور تازگی اور نیکی زائل ہوگئی اور شر وفجط بڑھ گیا۔ لڑائی اور سخاوت اور بخشش کی موت آگئی اور ناامیدی اور بخل زندہ ہوگئے۔ بے کمالی کو غلبہ حاصل ہوا۔ اہلِ فضل وکمال اور خود صاحبِ کمال دب کررہ گئے اور اہلِ علم کیا کرسکتے ہیں جب جہالت کا زور بڑھ گیا ہے اور نورالدین کا نام نہ رہ جاتا اگر اس کے مثل اس کی اولاد نہ ہوتی۔"

اس کی تعزیت اور ماتم سے فرصت کب ملنے والی تھی۔ یہ رونا تو عمر بھر کا تھا۔ اس سے زیادہ تو یہ ضروری تھا کہ اس کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا جائے۔

میت کو علما اور صلحا نے غسل دیا۔ پاک کپڑے میں دفنایا۔ جنازہ اُٹھایا گیا تو نالہ وشیون کی آوازیں آسمان تک پہنچیں۔

اس کا جنازہ اسی میدان اخضر میں لے جایا گیا جہاں وہ نمازِ عید ادا کرتا تھا، جہاں چوگان کھیلتا تھا اور جہاں ابھی کچھ دن پہلے اپنے امرا کے ساتھ بیٹھ کر کہا تھا "ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایک مہینے کے بعد ہم سب یہاں جمع ہوسکیں گے یا نہیں۔"

اب سب تھے، وہی نہیں تھا۔

لوگوں کی بھیڑ تھی کہ چھٹنے میں نہیں آتی تھی۔ میدان میں اتنی جگہ ہی نہیں تھی کہ تمام لوگ ایک ساتھ سماسکیں۔ لوگ انبوہ در انبوہ آتے تھے۔ نماز جنازہ پڑھتے اور دوسرے دروازے سے نکل جاتے۔ ان کی جگہ دوسرے آجاتے۔ اس طرح کئی مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ پھر میت کو مدرسہ نوریہ میں لایا گیا۔ یہ مدرسہ اس نے سفرِ آخرت سے پہلے اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ یہیں سلطان کی آخری آرام گاہ تیار کی گئی۔

سلطان کو اسی خاک مقدسہ میں سپردخاک کردیا گیا۔

قبر پر ایک سادہ سی لوح نصب کی گئی تھی جس پ
عبارت درج ہے۔

"یہ شہید نورالدین کی قبر ہے۔"

سلطان کا مزار آج بھی دمشق میں "مرقد نورالد
شہید" کے نام سے مشہور ہے اور لوگوں میں عقیدت واحت
کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دمشق کا قلعہ جس میں سلطان کا انتقال ہوا تھا ایک و
مسجد میں تبدیل کردیا گیا ہے۔

سلطان نے اولادیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ
تھی۔ لڑکے کا نام الملک الصالح اسماعیل تھا اور لڑکی کا نام شم
النساء تھا۔

سلطان کی رحلت کے وقت ملک الصالح کی عمر صرف
گیارہ برس تھی۔ سلطان نے اپنی پہلی وصیت میں اپنے بھا
قطب الدین مودود کو اپنا جانشین مقرر کردیا تھا لیکن قطب
الدین کا انتقال سلطان کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا۔ اس لے
تمام امیروں اور سرداروں نے سلطان کے گیارہ سالہ بے
ملک الصالح کو اتفاق رائے سے سلطان کا جانشین مقرر کیا او
اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔

مرحوم سلطان کا نائب بااثر اور طاقتور سردار صلاح
الدین ایوبی والی مصر تھا۔ مخالفت کا امکان اس کی طرف سے
ہوسکتا تھا، لیکن اس نے بھی بلا جھجک اس کی اطاعت قبول
کرلی۔ مصر میں اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکّہ بھی اسی
کے نام کا مضروب کرایا۔

صلاح الدین ایوبی نے نہ صرف ملک اسماعیل کو جانشین
تسلیم کیا بلکہ تعزیت نامہ بھی تحریر کیا۔

"مولانا نورالدین کی وصیت سے ہم مطلع ہوگئے ہیں
کہ اس کا فرزند اس کا جانشین ہے۔ اگر وصیت کے مطابق
سب حاضر وغائب نے اس کی اطاعت قبول کرلی ہے تو ہمار
مقصد برآیا ورنہ جو شخص مولائی الملک الصالح کی مخالفت کرے
گا، ہماری تلوار اس کے خلاف نیام سے باہر آجائے گی۔ اگر
برخوردار موصوف اور اس کے باپ کے وزرا اور امرا کے
درمیان اتفاق اور اتحاد رہا تو میرا دلی مدعا پورا ہوجائے گا۔
خدا سے ڈرتے رہو اور اپنے اندر کسی قسم کے اختلاف ک
نہ گھسنے دو کہ اس سے دشمن کو فائدہ پہنچے گا۔"

ماخذ: نورالدین زنگی، تاریخ کے آئینے میں
تحقیق وترتیب: کامران اعظم سوہدروی

لرزیدہ یورپ

مریم کے خان

وہ بگولوں کی طرح اٹھے اور سارے یورپ پر چھا گئے۔ حیوانیت ان کے سامنے ہیچ تھی۔ درندگی بھی ان سے شرما جاتی تھی۔ وہ جنونیت کے آخری پائیدان پر تھے۔ روم ان کے خوف سے لرزتا تھا تو مسیحت کا مرکز ویٹی کن سٹی دہلتا تھا کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ سرزمینِ یورپ پر صرف ان کا حق ہے۔ مگر وہ جس تیزی سے ابھرے تھے، اسی تیزی سے غائب ہو گئے۔ ان کی نسل کہاں گئی، اب وہ لوگ کہاں ہیں، کسی کو پتا نہیں مگر ان کے ظلم و جبر کے قصّے آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔

[illegible]

خزاں آتی ہے پتے جھڑتے ہیں اور درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ یہی پتے فرش پر بچھ جاتے ہیں ان پر برف گرتی ہے اور یہ زمین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ زمین کی گرمی اور برف کی یخ ان کو گلا دیتی ہے اور آنے والے بہار میں جب برف پگھلتی ہے تو یہ پتے زمین کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں بعد میں یہ درختوں کی خوراک بن کر دوبارہ شاخوں پر پتّوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہ قدرت کا چکر ہے، جو وہ زمین پر زندگی کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے چلاتی رہتی ہے درخت پودے اور جانور قدرت کے اسی چکر کے تابع ہیں۔ انسان ان سے مختلف تخلوق ہے جسے قدرت نے عقل اور فیصلے کی قوت دی ہے۔ لیکن وہ بھی قدرت کے قوانین سے بالاتر نہیں... بلکہ نامحسوس طریقے سے یہ بھی قدرت کے اسی چکر کا اسیر ہے۔

انسانوں کے خاندان بنتے ہیں اور خاندانوں سے قبیلے وجود میں آتے ہیں۔ یہ قبیلے زمین اور خوراک کے لیے آپس میں لڑتے ہیں۔ ان میں سے کچھ فنا ہو جاتے ہیں اور

کچھ دوسروں میں ضم ہو جاتے ہیں۔یوں انسانوں میں بھی فنا و بقا کا ایک چکر چلتا رہتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے جب انسان نے منظم ہو کر رہنا سیکھا تو قبیلوں اور نسلوں کی فنا و بقا کا چکر بھی شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔دنیا میں تین براہ اعظم ہیں جنہیں انسانیت کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ ایشیا، یورپ اور افریقا۔ان میں ایشیا کو انسانوں کا اوّلین گہوارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔کیونکہ اس وسیع و عریض براہ اعظم میں انسان سب سے پہلے آباد ہوا اور یہیں منظم آبادیاں وجود میں آئیں۔بے شمار نسلوں اور قبیلوں نے یہاں جنم لیا بڑھے، چھائے اور بالآخر مٹ گئے۔

آثاریات کے ماہرین وسطِ ایشیا کے میدانوں کو انسانوں کی اوّلین پرورش گاہ قرار دیتے ہیں کیونکہ انسان پہلے چرواہا تھا۔لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہموار اور سرسبز میدان مویشی پالنے والوں کے لیے موزوں ترین تھے۔یہاں سے اُٹھنے والے آریاؤں نے ایشیا اور یورپ کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔خاص طور سے یورپ میں آباد سفید فام اقوام آریا نسل سے ہیں۔یہ وسطِ ایشیا میں ترک، ایران میں ایرانی اور برصغیر میں راجپوت اور باہر سے آنے والی دوسری نسلوں کی صورت میں آباد ہیں۔افغانی اور چین میں آباد ترکستانی بھی آریا نسلی سے ہیں۔ان کے بعد دوسری اہم نسل زرد اقوام ہیں۔ان میں مشرق بعید کی تمام اقوام شامل ہیں جو منگولیا سے لے کر انڈونیشیا تک میں آباد ہیں۔تیسرے سامی ہیں ان میں عرب ممالک کی قومیں شامل ہیں۔

وسطِ ایشیا کو اگرچہ آریاؤں کا گھر کہا جاتا ہے لیکن اس کے بعید کناروں پر کچھ ایسے قبائل بھی آباد تھے جو آریا نہیں تھے۔ان کے بارے میں ماہرین کہتے ہیں کہ یہ آریا اور زرد نسلوں سے مل جل وجود میں آئے ہیں۔شاید یہ کسی وجہ سے دونوں نسلوں سے فرار پا نکالے ہوئے لوگ یا قبیلے تھے جو شمال کی سخت موسموں والے خطوں میں جا کر آباد ہوئے اور آپس میں میل ملاپ سے نئی نسل وجود میں آئی۔یہ بنیادی طور پر چرواہے اور شکاری تھے۔گرمیوں میں یہ شکار کر کے اس پر گزارہ کرتے تھے اور اپنے جانوروں کو چرا کر موٹا تازہ کر لیتے تھے اور طویل سرما میں ان جانوروں کے گوشت پر گزارہ کرتے تھے۔اون، بالوں اور کھالوں سے یہ خیمے بناتے تھے اور اپنے لیے لباس بھی تیار کرتے تھے۔شکار اور سفر کے لیے یہ گھوڑے استعمال کرتے تھے۔گدھے اور بیل ان کی گاڑیاں کھینچتے تھے۔ان میں سے بعض قبائل گاڑیوں پر ہی گھر بنا کر رہتے تھے اور ان میں ہی سفر کرتے تھے۔سفر اور شکار یہی ان کی زندگی تھی۔

ان قبائل میں سب سے مشہور صحرائے گوبی کے اُس پار اُٹھنے والے منگول قبائل تھے جنہوں نے ایک زمانے میں ایشیا اور یورپ کے بڑے حصے کو تہ و بالا کر دیا تھا لیکن جلد زوال پذیر ہو کر واپس لوٹ گئے اور مفتوح علاقوں میں رہ جانے والے مقامی نسلوں میں ضم ہو گئے۔ان کے علاوہ یورپ کے شمال میں آباد قبائل تھے۔جو شاید پہلے تو مختلف ناموں سے جانے جاتے تھے۔لیکن جب انہوں نے یورپ کے متمدن علاقوں کی طرف پیش قدمی شروع کی تو انہیں متفقہ طور پر ہن کا لقب دے دیا گیا تھا۔یہ شکاری اور چرواہے تھے۔منگولوں کی طرح حملہ آور جنگجو اور لوٹ مار و قتل و غارت گری کے ماہر تھے۔یہ خیموں میں رہتے تھے اور کبھی اپنا تمدن نہیں چھوڑتے تھے۔ جہاں سے گزرتے وہاں صرف تباہی اور بربادی کے نشانات چھوڑ جاتے تھے۔رحم نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھے۔

ماہرین آج بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ چوتھی صدی عیسوی میں یورپ میں قہر بن کر نازل ہونے والے ہن قبائل کا وطن اصل میں کہاں تھا؟ کیونکہ پہلے پہل یہ بحیرہ اسود کے شمالی ساحلوں کے ساتھ موجودہ یوکرائن اور رشین فیڈریشن کے علاقوں میں نمودار ہوئے اور پھر یونان کے اوپر سے ہوتے ہوئے مشرقی یورپ اور بالآخر مغربی یورپ تک جا پہنچے تھے۔بحیرہ اسود سے اوپر یہ کہاں سے آئے؟ اس کا حتمی تعین آج بھی مشکل ہے کیونکہ مشرق اور جنوب میں موجود اقوام ان خطوں میں تین ہزار سال سے زیادہ عرصے سے آباد ہیں اور ہن قبائل کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا، ان میں سے زیادہ تر قبائل شمال مغرب سے آنے والے وائی کنگ تھے۔جرمن، گاتھک اور دوسرے مغربی یورپ میں بسنے والے قبائل اصل میں وائی کنگ نسل سے ہیں۔مشرقی یورپ میں آباد سلاو نسل بھی ان سے مختلف ہے اور پہلے پہل یہ سویڈن، فن لینڈ اور ناروے کے آس پاس آباد تھے۔

اگر یہ وسطِ ایشیا کے اوپر سائبریا کے کسی علاقے سے آئے تھے تو ان کو یورپ تک پہنچنے کے لیے نہ صرف بہت طویل سفر کرنا پڑتا بلکہ راستے میں آباد بے شمار طاقتور قبائل سے بھی نمٹنا پڑتا جو بہ ظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ماہرین کے مطابق اب ایک ہی علاقہ بچتا ہے۔کوہ یورال سے، اس طرف قطب شمالی کا نزدیکی علاقہ ہمیشہ سے سخت موسم اور سخت ترین زندگی کے لیے مشہور رہا ہے۔یہاں سال کے آٹھ مہینے برف جمی رہتی ہے اور صرف چار مہینے کے لیے گرمیاں آتی ہیں۔آج بھی یہاں رہنا

ممکن نہیں ہے۔یہ ماہرین اسی خطے کو ہن قبائل کی پیدائش گاہ قرار دیتے ہیں۔یہاں سے اُٹھ کر یہ سخت جان قبائل یورپ تک جا پہنچے تھے۔ایک زمانے میں ان کی وجہ سے رومن سلطنت کی بقا کا مسئلہ لاحق ہو گیا تھا۔لیکن اٹیلا نا گہانی مرگ کا شکار ہو گیا تھا اور اگر ہن قبائل منتشر نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ رومن سلطنت چوتھی صدی عیسوی میں قصہ پارینہ بن کر رہ جاتی۔

☆☆☆

وہ ننھا خانہ بدوش اپنی دادی سے اپنے آبا و اجداد کی کہانیاں غور سے سنتا تھا جن میں ان کی ہمت و بہادری کی داستانیں ہوتی تھیں کہ وہ کتنے بہادر اور کتنے بڑے شکاری تھے۔وہ دوسروں کی سرزمین پر گھس کر شکار کھیلتے تھے۔ بچّہ بول گیا اس نے دادی سے کہا۔ ’’آج ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ہم بارہ سینگھے کا پیچھا کر رہے تھے وہ دوسرے قبیلے کی حد میں چلا گیا مگر ہم نے وہاں بھی اس کا پیچھا کر کے اسے مار ڈالا۔اسے میرے تیر نے ہلاک کیا تھا مجھے شکار کرنا آ گیا ہے۔‘‘ کہتے ہوئے بچّے کے لہجے میں فخر آ گیا۔وہ شفاف آنکھوں اور کھڑے نقوش والا مضبوط لڑکا تھا جس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔دادی نے محبت سے اپنے اس اکلوتے پوتے کو دیکھا۔

’’میرے بچّے یہ صرف ایک شکار ہے اس سے تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔‘‘

’’تمہاری دادی ٹھیک کہہ رہی ہے۔‘‘ بچّے کے باپ مانسک نے خیمے کے اندر آتے ہوئے کہا۔’’ابھی تم ایک چھوٹے بچّے ہو لیکن کل تمہیں بڑا ہونا ہے اور اپنے قبیلے کا سردار بننا ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے آبا و اجداد کیا کرتے تھے۔تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ہزاروں میل کا سفر کر کے اس جگہ آئے ہیں جہاں ایک طرف ہمارے دشمن جرمن قبائل ہیں اور دوسری طرف رومن سلطنت بھی ہماری دوست نہیں ہے۔حتیٰ کہ خود دوسرے ہن قبائل بھی دوست نہیں ہیں۔‘‘

’’تب ہمارا دوست کون ہے؟‘‘ بچّے نے سوال کیا۔

’’یہ۔‘‘ مانسک نے اپنی تلوار نکال کر اس کے سامنے کی۔’’یہ ہماری واحد دوست ہے اور ہمیں ہمیشہ اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔‘‘

ننھا لڑکا دلچسپی اور حیرت سے تلوار دیکھ رہا تھا۔وہ تیر اندازی کا ماہر تھا لیکن اس کے پاس کوئی تلوار نہیں تھی۔اس کی دادی نے اپنے بیٹے سے کہا۔’’ممکن ہے میرا پوتا ہی وہ شخص

خدارا ◉ خدارا
شوگر کے مریض
ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP، وی پی شوگر نجات کورس منگوا لیں۔اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0308-6627979
0547-521787
آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

ہو جو بکھرے ہن قبائل کو جمع کرے گا اور مارس کی تلوار کا مطالبہ کرے گا۔"

یہ ایک اساطیری داستان تھی۔ جو ہن قبائل میں صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ اس پیش گوئی کے مطابق آنے والے دنوں میں ایک شخص ہن قبائل کو رومنوں کے خلاف جمع کرے گا اور بادشاہ بننے سے پہلے وہ مارس کی تلوار حاصل کرے گا۔ مارس پُرانے زمانے میں ہنوں کا ایک بڑا سردار تھا جس کی بہادری اور تیغ زنی کی دھوم تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی تلوار غائب ہو گئی تھی۔ مانسک اپنے اس چھوٹے سے قافلے کا سردار تھا۔ یہ اصل قبیلے سے الگ ہو کر شمالی اٹلی سے پرے یورپ کے میدانوں میں خیمہ زن تھا۔ یہ پورا علاقہ ہنوں کے چھوٹے چھوٹے قبائل میں بٹا ہوا تھا۔ وہ ایک جگہ رہائش رکھتے تھے لیکن ان کی رہائش آج بھی خیموں میں تھی اور ان کا طرزِ زندگی ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ مانسک کے پاس جوان کم تھے لیکن وہ سب بہت بہادر اور لڑاکا تھے۔

"اب تم سو جاؤ۔" مانسک نے بچے کو حکم دیا تو وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا اور اس کی دادی نے اسے اون سے بُنا ہوا کمبل اوڑھا دیا۔

صبح وہ حسبِ معمول روشنی ہوتے ہی اُٹھ گیا تھا۔ سورج نکلنے والا تھا اور اس کے قبیلے والے بیدار ہو کر معمولاتِ زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ بچے کے ذمے صبح جانوروں کو چارا دینا تھا اس نے چارے والا تھیلا اُٹھایا اور اپنا کام کرنے لگا۔ ابھی وہ جانوروں کو چارا دے رہا تھا کہ اس نے مشرق سے سورج کے ساتھ اُبھرتے سایوں کو دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سائے کئی گھڑ سواروں میں بدل گئے۔ بچے نے تھیلا پھینک دیا اور چلّا کر اپنے لوگوں کو خبردار کیا۔ اس کا باپ اور دوسرے مرد اپنے خیموں سے مسلح ہو کر نکل آئے اور حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئے۔ مگر آنے والے تعداد میں ان سے زیادہ اور تیز گھوڑوں پر سوار تھے انہوں نے بستی میں گھستے ہی قتل و غارت گری شروع کر دی اور جو سامنے آیا اسے بلا امتیاز بوڑھا، بچہ اور عورت قتل کرنے لگے۔ وہ چالاکی سے کام لیتے ہوئے جنگجو مردوں کو دور سے تیروں کا نشانہ بنا رہے تھے جبکہ کمزوروں کو ہاتھ سے قتل کر رہے تھے۔

بچہ یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس کا چہرہ غصے اور جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے پاس پڑی ایک کلہاڑی اُٹھائی اور ایک حملہ آور کی طرف بھاگا تھا جو ایک عورت کو پکڑے ہوئے تھا لیکن اس تک جانے سے پہلے کسی نے اسے جکڑ لیا۔ یہ اس کی دادی تھی وہ اسے کھینچ کر ایک گاڑی تلے لے آئی اور اس کے نیچے دھکیل کر کہا۔ "یہاں بیٹھے رہو خبردار باہر مت نکلنا۔"

بچہ گاڑی تلے دبک گیا اس کے سامنے اس کا باپ کئی حملہ آوروں میں گھرا ہوا لڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے مانسک کو قابو کر لیا اور پھر ایک نے تلوار سے کئی وار کر کے مانسک کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ نصف گھنٹے سے بھی کم وقت میں حملہ آور تمام قبیلے کو موت کے گھاٹ اُتار چکے تھے اور کچھ عورتوں کو زندہ پکڑ لیا تھا۔ اب وہ سامان کی تلاشی لے پھر رہے تھے۔ بچے نے خطرہ محسوس کیا تو گاڑی سے نکل کر بھاگا مگر فوراً ہی دو گھڑ سوار اس کے پیچھے آئے اور اسے گھیر لیا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھا اس نے سبز آنکھوں والے حملہ آور سردار کو دیکھا۔ "میری دادی کہاں ہے؟"

"وہ مر چکی ہے۔" سبز آنکھوں والے نے بے رحمی سے کہا۔ "تمہارا باپ اور اس کے ساتھی بھی مر چکے ہیں۔ یہ کل ہمارے علاقے میں گھس کر شکار کھیلنے کا صلہ ہے۔ تم زندہ رہ سکتے ہو میرے غلام بن کر....."

"گھٹنوں کے بل جھک جاؤ۔" سردار کے ساتھی نے حکم دیا۔ لیکن جب بچے نے اس کا حکم نہیں مانا تو اس نے کمان سے تیر مارا جو بچے کے پیروں کے پاس زمین میں گڑ گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ "جھک جاؤ۔"

بچے نے ایک نظر اسے دیکھا اور جھکتے ہوئے اچانک زمین سے تیر کھینچ کر نکالا اور اسے سردار کے ساتھی کی ران میں گاڑ دیا۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ گھوڑے سے گرا۔ دوسرے ہی لمحے بچہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایڑ لگائی۔ گھوڑا بھاگا، سردار اور اس کے ساتھی بھی بھاگے۔ انہوں نے تیر برسائے لیکن بچہ نکلتا چلا گیا۔ بہت دیر بعد جب وہ خطرے سے باہر آگیا تو اس نے گھوڑا روکا۔ ایک تیر پیچھے زین میں اٹک گیا تھا۔ یہ تھوڑا سا بھی آگے ہوتا تو اس کی پشت میں اُتر جاتا۔ وہ پہلے کبھی اس علاقے میں نہیں آیا تھا۔ یہ ویران جگہ تھی جہاں سردی تھی اور کھانے یا پینے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ دو دن آگ جلا کر اس ویرانے میں بیٹھا رہا۔ واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اسے معلوم تھا کہ وہاں اسے کچھ نہیں ملے گا سوائے لاشوں اور راکھ کے۔ تیسرے دن اس نے بھوک اور پیاس سے بیتاب ہو کر گھوڑے کی گردن میں تیر مار کر خون نکالا اور اسے پینے لگا۔ یہ شمال کے تمام خانہ بدوشوں کی مشترک عادت تھی۔ جب انہیں کہیں غیر متوقع بھوک پیاس سے واسطہ پڑتا تھا تو وہ اپنے گھوڑے کا تھوڑا سا خون پی لیا کرتے تھے اس سے ان کی بھوک پیاس کا مداوا ہو جاتا تھا۔ ابھی وہ خون پی رہا تھا کہ عقب سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا گروہ تھا اور ان کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔ ان کی قیادت ایک گنجے سر والا شخص کر رہا تھا۔ وہ بچے کے پاس آکر رکا اور اس نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"اٹیلا....." بچے نے جواب دیا۔ "مانسک کا بیٹا اٹیلا۔"

گنجے آدمی نے سر ہلایا۔ "مجھے پہچانا؟"

بچے نے نفی میں سر ہلایا۔ گنجے آدمی نے کہا۔ "میں ایمبر دوا ہوں مانسک کا بھائی۔"

"میرا باپ، دادی اور سارا قبیلہ مر چکا ہے۔" اٹیلا نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے اور اب میں قاتلوں کی تلاش میں ہوں۔ میرے ساتھ آؤ اب تم میری ذمّے داری ہو۔" ایمبر دوا نے کہا اور گھوڑا موڑ کر واپس جانے لگا۔ اٹیلا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر وہ بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے چچا اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے چل پڑا تھا۔ اٹیلا کو معلوم تھا کہ اس کا ایک چچا ہے جو اصل میں اس کے قبیلے کا سربراہ ہے اور اس کا باپ کسی اختلاف کی وجہ سے اس سے الگ ہو کر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان میدانوں میں چلا آیا تھا۔ اب اس کا باپ باقی نہیں رہا تھا تو اس کا چچا ہی اس کا سہارا تھا۔ ایمبر دوا اسے کچھ مسافت پر موجود اپنے قبیلے میں لے آیا۔ یہاں اس کے ساتھ بہت سارے لوگ تھے۔ اٹیلا نے محسوس کیا کہ اس کا اصل قبیلہ یہی ہے۔ وہاں سب نے اسے خوش آمدید کہا تھا سوائے ایک شخص کے اور یہ اس کا سب سے بڑا چچا زاد بھائی گیلو تھا۔ وہ چینی نقوش رکھتا تھا کیونکہ اس کی ماں کا تعلق انتہائی شمال میں بسنے والے خانہ بدوش قبائل سے تھا۔ وہ بچپن میں اپنے قبیلے سے اغوا کر لی گئی تھی اور مختلف ہاتھوں سے ہوتی ایمبر دوا کے ہاتھ آگئی تھی جس نے اسے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ گیلو عمر میں اٹیلا سے چار سال بڑا تھا اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اس کی جانشینی میں رکاوٹ بنے گا۔ اس کا یہ خدشہ بعد میں درست ثابت ہوا تھا۔

ایمبر دوا ایک زیرک اور طاقتور حکمران تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کب دشمن پر حملہ کرنا چاہیے اور کب پسپا ہو جانا چاہیے، لیکن اپنی ماں اور بھائی کی موت وہ فراموش نہیں کر سکا تھا۔ اس کے آدمیوں نے جلد اس قبیلے کو تلاش کر لیا جس نے اٹیلا کے خاندان پر حملہ کیا تھا۔ قتل و غارت گری کے بعد زندہ بچنے والے افراد کو ایمبر دوا کے آدمی زندہ گرفتار کر لائے تھے۔ ان میں وہ سبز آنکھوں والا سردار اور اس کے ساتھی بھی تھے جنہوں نے اٹیلا کے خاندان پر حملہ کیا تھا۔ ایمبر دوا نے ان کی قسمت کا فیصلہ اٹیلا کے سپرد کر دیا۔ سب کا خیال تھا کہ ننھا اٹیلا ان کی موت کا فیصلہ کرے گا اس نے اپنا تیر کمان اُٹھایا اور ان کے سامنے آکھڑا ہوا اس نے سبز آنکھوں والے سردار سے کہا۔

"گھٹنوں کے بل جھک جاؤ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

سبز آنکھوں والے سردار نے اٹیلا کے انداز میں اپنے لیے قطعی فیصلہ محسوس کر لیا تھا اور وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اس نے اٹیلا کی حاکمیت قبول کر لی۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے ساتھی بھی جھک گئے تھے۔ اب وہ سب اٹیلا کے غلام تھے۔ اٹیلا نے تیر کمان ایک طرف پھینک دیا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ ایمبر دوا اس کا طرزِ عمل دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اٹیلا کے اندر صرف ایک جنگجو نہیں ہے، ایک لیڈر بھی ہے۔ اسے انسانوں پر حکومت کرنا آتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے موقع دے گا اور اٹیلا اس کی طاقت میں اضافہ کرے گا۔

چند سالوں میں اٹیلا نوعمر لڑکے سے طاقتور جنگجو جوان میں بدل چکا تھا۔ وہ صرف پندرہ برس کی عمر سے جنگی مہمات پر جانے لگا تھا۔ ہن قبائل بڑی تیزی سے وسطی یورپ میں قدم جمانے کے بعد اب جرمنی، گال (موجودہ فرانس و اسپین) اور سلطنت روما کے مغربی بازو کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہاں بے پناہ دولت تھی اور بے شمار حسین ترین عورتیں بھی جن سے وہ اپنی افزائشِ نسل کا کام لے سکتے تھے۔ ایمبر دوا کی کامیاب مہمات کی وجہ سے دوسرے قبائل کے جنگجو بھی اس کے ساتھ شامل ہوتے جا رہے تھے اور وہ ان کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ بیس سال کا اٹیلا ان کا کمانڈر تھا۔ ایمبر دوا بہت ہوشیاری سے اپنے جوانوں کو محفوظ رکھتے ہوئے باہر سے آئے جنگجوؤں کو اپنی مہمات میں استعمال کرتا تھا۔ اٹیلا ان کے ساتھ سلطنت روما کی سرحدوں پر آباد کاشت کاروں اور چرواہوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائی کرنے لگا۔ وہ دولت، اناج اور عورتوں کے ساتھ ایسے جوان بھی لا رہا تھا جو بعد میں اس کی فوج کا ایک حصہ بن جاتے۔ جلد ایمبر دوا کا قبیلہ ہنوں کا سب سے طاقتور قبیلہ بن چکا تھا۔

☆☆☆

جس وقت ہن قبائل روم کے لیے خطرہ بننے کی تیاری کر رہے تھے اس وقت خود مغربی سلطنت کا یہ حال تھا کہ سوائے گال اور کسی قدر جرمنی کے تمام مقبوضات روم کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ افریقا کی سرزمین رومنوں کے لیے اجنبی ہو گئی تھی۔ وہ وہاں فوجی مہمات انجام دے سکتے تھے لیکن وہاں مستقل قبضہ کر کے نہیں بیٹھ سکتے تھے کیونکہ اس کے بعد انہیں مقامی افریقی قبائل کی چھاپہ مار کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان سے نمٹنے میں انہیں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ سلطنت کی یہ حالت تھی کہ خزانہ خالی تھا اور فوجی مہم کا خرچ رومن سرداروں کو برداشت کرنا پڑتا تھا یا پھر فوج جہاں سے گزرتی لوٹ مار کر کے اپنے اخراجات پورے کرتی تھی۔

نکمے اور نااہل سردار زادے فوج کے جنرل تھے اور ان میں سے اکثر کو جنگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مشرقی سلطنت کے پاس محاصل کی فراوانی تھی لیکن اس کے پاس مغربی سلطنت جیسے تجربے کار سپاہی نہیں تھے۔ بحیرہ اسود کے شمالی ساحل پر نمودار ہونے والے ہن قبائل پہلے مشرقی سلطنت کے لیے خطرہ بنے تھے لیکن مشرقی سلطنت کے حکمران تھیوڈوسیس اوّل نے نہایت ہوشیاری سے پہلے انہیں یورپ کی طرف دھکیلا اور پھر ان کا سالانہ خراج باندھ کر ایک طرح سے صلح کر لی۔ اگرچہ وہ اسے مدد کا نام دیتے تھے لیکن یہ ایک طرح کا خراج ہی تھا۔ سالانہ دس ہزار ٹیلنٹ (سونے کا سکہ) دے کر مشرقی رومن سلطنت کو وحشی ہنوں سے محفوظ کر لینا یقیناً ایک قابلِ تعریف قدم تھا جو ایک سپاہی ضائع کیے بغیر حاصل کیا گیا تھا۔

روم کا حکمران ویلینٹائنین سوم ایک نااہل، عیاش اور دماغی لحاظ سے پسماندہ شخص تھا۔ اس کی تمام باگ ڈور اس کی ماں ملکہ میریا اور اس کے مشیر آکٹس کے ہاتھ میں تھی۔ روم کا قابل ترین جنرل آئی ٹیس قید میں پڑا تھا کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے مادر ملکہ اقتدار پر اپنا قبضہ مضبوط نہیں سمجھتی تھی۔ آکٹس بھی اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اس کے حکم پر قید خانے میں اس بہترین جنرل کے ساتھ تیسرے درجے کے قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ اسی آئی ٹیس نے زوال کے آخری دنوں میں گال اور جرمنوں کے خلاف کامیاب مہمات سے روم کا گرتا وقار کسی قدر سنبھالا تھا۔ وہ ان چند رومنوں میں سے تھا جو روم کی عظمت کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ بعض مورخین اسے ''آخری رومنوں'' میں شمار کرتے ہیں۔ آخری رومن ان قابلِ ذکر رومنوں کو کہا جاتا ہے جن کی خدمات ہمیشہ روم کی خاطر ہوتی تھیں۔

جب ہنوں نے اٹلی کے شمال میں تاخت و تاراج شروع کی۔ باج گزار کسانوں اور حلیف قبائل کے لٹے پٹے قافلے روم پہنچنا شروع ہوئے تو ویلینٹائنین اور ملکہ میریا کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ سرحدی علاقوں میں قلعہ بند رومی فوج کھلے میدان میں ان وحشیوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔ کسی رومی جنرل میں اتنی استعداد نہیں تھی کہ وہ ہنوں کے خلاف منظم کارروائی کر سکتا۔ ایسے میں آکٹس نے ملکہ میریا کو مشورہ دیا کہ وہ آئی ٹیس کو قید خانے سے نکال کر اسے دوبارہ رومن فوجوں کا کمانڈر ان چیف اور شاہ روم کا جنگی مشیر بنا دے۔ ملکہ میریا آئی ٹیس سے خوف زدہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک بار آئی ٹیس بااختیار ہو گیا تو اسے دوبارہ بے اختیار کرنا بہت مشکل ہو گا لیکن آکٹس کا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس نے ملکہ میریا سے کہا۔ ''آئی ٹیس روم کا وفادار ہے اور وہ کسی ذاتی مفاد کے لیے کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھائے گا جس سے زوال پذیر روم خانہ جنگی کا شکار ہو جائے۔ ہم اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔''

ویلینٹائنین میں اتنی عقل کہاں تھی کہ وہ آئی ٹیس کے بارے میں کوئی مشورہ دے سکتا۔ ملکہ میریا نے آکٹس کے اصرار پر خود قید خانے میں جا کر آئی ٹیس سے ملاقات کی اور اسے روم کی فوجوں کی سپہ سالاری کی پیش کش کی۔ مگر آئی ٹیس نے اس کی پیش کش مسترد کر دی۔ اس نے کہا۔ ''میں تم لوگوں کے لیے کوئی خدمت انجام دینے کو تیار نہیں ہوں۔''

''کیا تم روم کے لیے بھی کچھ نہیں کرو گے۔'' ملکہ میریا نے عیاری سے کہا۔ ''ہن بہت بڑا خطرہ بن رہے ہیں۔''

''روم میرے لیے اس قید خانے کا نام ہے۔'' آئی ٹیس نے بے نیازی سے کہا۔ ''مسئلہ تمہارا، ویلینٹائنین اور آکٹس کا ہے۔''

ملکہ میریا سمجھ گئی کہ آئی ٹیس اپنی شرائط منوانا چاہتا ہے۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں گال اور تمام مقبوضات میں موجود رومن فوجوں کا کمانڈر اِن چیف بننا چاہتا ہوں۔ ویلینٹائنین میرے مشورے کے بغیر کوئی جنگی قدم نہیں اُٹھائے گا میں اپنے معاملات میں مکمل طور پر خود مختار ہوں گا۔'' آئی ٹیس نے واضح الفاظ میں اپنی شرائط پیش کر دیں۔ ملکہ میریا اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ ان شرائط کو مان کر وہ آئی ٹیس کو وہ اختیارات دے دے گی جس کے بعد اسے بے دست و پا کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ اس پر برس پڑی تھی۔ آئی ٹیس نے اس کی باتوں کا اثر لیے بغیر کہا۔ ''اگر تمہیں یہ شرائط قبول نہیں ہیں تو تم جا سکتی ہو اور اپنے کم عقل بیٹے کو ہنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیج سکتی ہو۔''

آئی ٹیس کی بات نے ملکہ میریا کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بٹھا دیا تھا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکائے قید خانے سے نکلی اور قید خانے کے نگران اوسیٹر سے کہا۔ ''اسے رہا کر دو اب یہ تمہارا کمانڈر ان چیف ہے۔''

آنے والے وقت سے خوف زدہ اوسیٹر نے دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو کر آئی ٹیس کو فوجی سلام کیا تھا۔ اس نے آکٹس کے حکم پر آئی ٹیس کی تذلیل میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ مگر شریف آئی ٹیس نے اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اگلے دن اس نے سینٹ سے توثیق شدہ احکامات ملنے کے بعد باقاعدہ طور پر رومن فوجوں کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ سنبھال لیا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ روم ہنوں کے سب سے بڑے سردار ایمبر دو سے معاہدہ کرنے جا رہا ہے جس کا مقصد جرمنوں کے خلاف مشترکہ محاذ بنانا تھا۔ ملکہ میریا کا خیال تھا کہ آئی ٹیس اس معاہدے کی مخالفت کرے گا لیکن خلافِ توقع اس نے اس معاہدے کی حمایت کی اور پیش کش کی کہ وہ خود جا کر ہن سردار ایمبر دو سے بات کرے گا۔ ملکہ میریا نے فوراً اسے یہ ذمے داری سونپ دی۔

☆☆☆

نوجوان اٹیلا ایک بے رحم جنگجو بھی تھا۔ رحم کرنا ویسے بھی ہنوں کی سرشت میں شامل نہیں ہوتا ہے وہ جب کہیں حملہ کرتے تھے تو اپنے پیچھے کوئی چیز سلامت نہیں چھوڑتے تھے اور کسی انسان کو جیتا چھوڑ کر نہیں جاتے تھے۔ ہاں وہی انسان زندہ بچتے تھے جنہیں غلام بنا کر ساتھ لے جاتے تھے۔ لیکن اٹیلا کچھ زیادہ ہی بے رحم تھا۔ وہ جس بستی پر حملہ کرتا اس کے تمام افراد کو قتل کرا دیتا تھا۔ وہ بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ ایک بستی پر حملہ کر کے اس کے آدمیوں نے سب کو قیدی بنا لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بستی کے ہر فرد کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے آدمی بے بس قیدیوں کے گلے کاٹ رہے تھے کہ اٹیلا کی نظر ایک سرخ بالوں والی لڑکی پر پڑی۔ وہ پختہ عمر تھی اور اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات بتا رہے تھے کہ وہ اس کے آدمیوں سے لڑتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ ایک ہن اس کے گلے پر چاقو چلانے جا رہا تھا کہ اٹیلا نے اسے روک دیا۔ لڑکی کا نام آکارا تھا اور وہ شادی شدہ تھی لیکن اس جنگ میں اس کا شوہر مارا گیا تھا۔ اٹیلا نے اسے غلام بنا کر ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔

جب وہ واپس اپنی بستی پہنچا اور اس نے کامیابی کی خبر کے ساتھ لایا گیا سامان اور قیدی ایمبر دو کی خدمت میں پیش کیے تو وہ اپنے بھتیجے کی اس کاوش سے خوش ہوا تھا۔ مگر جب قیدیوں کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو خلافِ توقع گیلو نے بغیر ایمبر دو سے پوچھے آکارا پر قبضہ کر کے اسے اپنی بیوی بنانے کا اعلان کر دیا جبکہ اٹیلا اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ مگر گیلو کے اس اعلان کے بعد اس کے پاس سوائے صبر کے گھونٹ پینے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ کیونکہ اگر وہ آکارا پر حق جتاتا تو پھر فیصلہ تلوار کرتی۔ اٹیلا محسوس کرتا تھا کہ ابھی وہ اتنا طاقتور نہیں ہوا ہے کہ گیلو کو چیلنج کر سکے۔ حکمرانی کی خواہش اس کے اندر بچپن سے تھی وہ اپنے آبا و اجداد کی طرح بااختیار حکمران بننا چاہتا تھا۔ مگر اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

ان ہی دنوں روم کے جنرل آئی ٹیس کی ایک بڑی ٹکڑی کے ساتھ قاصد کی ہنوں کے علاقے میں آمد نے سنسنی پھیلا دی تھی۔ ہن آئی ٹیس کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے لیکن وہ اس کے عزائم سے بے خبر تھے، اگر وہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے آیا تھا تو یہ اچھا شگون نہیں تھا۔ ایمبر دو نے ایک بار اٹیلا سے کہا تھا۔ ''مجھے کسی رومن سے اتنا خطرہ محسوس نہیں ہوتا جتنا جنرل آئی ٹیس سے محسوس ہوتا ہے۔ اگر کبھی ہن اس علاقے سے بے دخل ہوئے تو اس کی وجہ یہی شخص ہو گا۔''

اب یہی شخص ایمبر دو سے اس کی بستی میں ملاقات کرنے کا خواہش مند تھا اس کے قاصد کا انداز مہذبانہ اور دوستانہ تھا۔ ایمبر دو نے اس ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی اور آئی ٹیس نے اس ملاقات میں ہنوں سے مل کر جرمنوں اور وحشی گاتھوں کے خلاف کارروائی کا منصوبہ دیا۔ ایمبر دو کو بھی ان قبائل کی طاقت توڑنے سے دلچسپی تھی۔ اگرچہ گاتھوں اور جرمنوں نے کبھی ہنوں کے خلاف کوئی بڑی کارروائی نہیں کی اور محدود جنگوں میں وہ ہمیشہ پسپا ہوئے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ دونوں اقوام بھی خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ ہنوں اور ان میں صرف ایک فرق تھا کہ ہن ان کے مقابلے کہیں زیادہ وحشی اور جنگجو تھے۔

شمال مشرق کی طرف سے ان کی آمد جنگی گھوڑوں پر ہوئی تھی اور ہنوں میں بغیر گھوڑے کے جنگ کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن جب وہ اٹلی سے اوپر ڈینوب کے آس پاس ہنگری کے وسیع میدانوں میں آباد ہوئے تو ان کی آبادی تیزی سے بڑھی اور ان کے پاس جنگی گھوڑوں کی کمی ہو گئی کیونکہ اس نسل کے

گھوڑے یورپ کے موسم میں افزائش نسل نہیں کر پاتے تھے۔ تب ہنوں نے پیدل فوجی دستے بھی تشکیل دینے شروع کیے۔ ان کو یہاں کا ماحول اور موسم راس آیا تھا۔ ان کے جانوروں کے لیے یہاں چراگاہوں میں بہت گھاس تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی آمد کے نصف صدی کے اندر ہن ڈینوب کے اس پار تقریباً گال تک پھیل چکے تھے اور انہوں نے جرمنی کا خاصا بڑا حصہ قبضے میں کرلیا تھا۔ البتہ انہوں نے براہِ راست روم میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہنوں کی اس ہچکچاہٹ کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ اوّل تو وہ متفرق قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی قوت بے پناہ مگر منتشر تھی۔ دوسرے انہیں احساس تھا کہ زوال کے دنوں میں بھی رومن بہت بڑی جنگی قوت رکھتے تھے اور ہنوں کا حملہ مشرقی اور مغربی دونوں سلطنتوں کو ان کے خلاف متحد کردیتا اور وہ اس متحدہ قوت کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ ان کے خوف کی ایک اور وجہ اپنے وطن سے بہت زیادہ دوری تھی۔ وہ اتنے آگے آچکے تھے کہ اب واپسی کا سفر ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ یورپ کی سرزمین پر قابض ضرور ہوئے تھے لیکن ابھی تک اس سرزمین کو پوری طرح اپنا نہیں سکے تھے۔ وہ اجنبیت محسوس کرتے تھے اور شاید یہی ان کی ہچکچاہٹ کی بڑی وجہ تھی۔ مگر سب سے بڑی وجہ مرکزی قیادت کی عدم موجودگی تھی جس نے طاقتور ہنوں کو کمزور کیا ہوا تھا۔

آئی ٹیس ہنوں کی ان کمزوریوں سے واقف تھا لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک قابل شخص کی قیادت میسر آتے ہی ہن طاقتور ہوجائیں گے اور اس کے بعد انہیں جنوب کی طرف پیش قدمی سے روکنا بہت مشکل ہوجائے گا۔ ایمبر دو سے ملاقات کے دوران نوجوان اٹیلا اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس نوجوان میں کوئی خاص بات ہے۔ اس لے ایمبر دو سے درخواست کی اتحادی کی حیثیت سے وہ جرمنوں کے خلاف جو فوج سپرد کرے گا اس کا سربراہ اٹیلا کو بنا کر اس کے ساتھ کیا جائے وہ اس کی تربیت بھی کرے گا۔ ایمبر دو نے یہ بات مان لی اور اٹیلا کو آئی ٹیس کے سپرد کردیا گیا۔ اٹیلا خود بھی اس مشہور جنرل کے ساتھ رہنا اور اس سے سیکھنا چاہتا تھا۔

یورپ میں صدیوں سے سوائے رومنوں کے اور کوئی طاقت موجود نہیں تھی لیکن رومن سلطنت کا دردِسر ہمیشہ سے جرمن قبائل رہے تھے۔ یوں تو یورپ میں گاتھک، وائی کنگ، وینڈل اور ایگر سمیت بے شمار قبائل آباد تھے جو اکثر رومنوں کے خلاف لڑتے رہے لیکن ان میں سب سے زیادہ مزاحمت سفید بالوں والے جرمن قبائل نے کی تھی۔ خاص طور سے جب تھیوڈورک اوّل ان کا بادشاہ بنا تو جرمن قبائل بڑی طاقت بن گئے۔ آئی ٹیس نے نوجوانی میں تھیوڈورک کے خلاف کامیاب جنگیں لڑی تھیں۔ اس کے دل میں جرمن شاہ کے خلاف ذاتی عناد بھی تھا کیونکہ وہ جس عورت سے محبت کرتا تھا اسے جرمن شاہ لے اُڑا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قید سے آزاد ہوتے ہی آئی ٹیس نے سب سے پہلے تھیوڈورک کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا۔

اس جنگ سے پہلے بھی یورپ میں عام تاثر یہی تھا کہ ہن رومنوں کے چھپے حلیف ہیں کیونکہ ان کے حملوں کا نشانہ زیادہ تر رومن کے دشمن قبائل بنتے ہیں اور انہوں نے کبھی روم کے اندر یا اس کے مقبوضہ جات میں پیش قدمی کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہن رومنوں کے شانہ بشانہ لڑنے جارہے تھے۔ یہ مشترک لشکر جرمن قبائل کی حدود میں داخل ہوا تو اس نے تھیوڈورک کو اپنے لشکر کے ساتھ منتظر پایا۔ امن کی ایک دہائی میں اس نے اپنی فوجی قوت میں خوب اضافہ کیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی تک جرمن قبائل بت پرست ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ عیسائی مبلغوں نے ان میں عیسائیت کا پرچار کرنا شروع کیا اور چوتھی صدی عیسوی تک جرمن قبائل کا بڑا حصہ عیسائیت قبول کرچکا تھا۔ دوسری رومن سلطنت تیسری صدی میں ہی عیسائیت کے زیرِاثر آگئی تھی اور اب ویٹی کن میں بیٹھا پوپ بھی امورِ سلطنت میں دخل اندازی کرتا تھا۔ مگر مشترکہ مذہب نے جرمنوں اور رومنوں کی دشمنی پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ مزے کی بات تھی کہ ویٹی کن نے بھی ان کی دشمنی ختم کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو مغربی سلطنت کا سابق رومی رسم و رواج پر قائم رہنا تھا۔ وہ مذہب اور ویٹی کن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دوسرے ویٹی کن کے کرتا دھرتاؤں نے محسوس کرلیا تھا کہ جب تک وہ اس خطے کو چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں تبدیل نہیں کردیتے.... ان کی اجارہ داری قائم ہونا مشکل ہے اس لیے وہ خانہ جنگیوں کی حمایت کرتے تھے۔

مشرقی سلطنت پہلے ہی عیسائیت کے زیرِاثر آچکی تھی اور وہاں کا حکمران قیصر کلیسا کا خادم کہلاتا تھا۔ فلسطین اور خاص طور سے بیت المقدس پر مشرقی سلطنت کا قبضہ تھا۔ اس لیے مذہبی معاملات میں مشرقی سلطنت کی اہمیت نمایاں تھی اور اسے کلیسا کی پوری حمایت حاصل تھی۔ دوسری طرف کلیسا کا اقتدار اصل میں ویٹی کن میں تھا اور یہ مغربی سلطنت میں واقع تھا۔ اس لیے اب کلیسا کی کوشش تھی کہ مغربی سلطنت کو

مں اپنا زیرِ سایہ لائے یا اسے نیست و نابود کردے۔ تاکہ [illegible] میں حکومتی امور بھی اس کی مرضی سے طے کیے جائیں۔ بعد میں ویٹی کن اپنی کوششوں میں کامیاب رہا۔ نہ [illegible] اٹلی بلکہ پورا وسطی یورپ اور خاص طور سے میڈی [illegible] کا خطہ چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں بٹ گیا جو اپنے وجود کے لیے ویٹی کن کی منظوری کی محتاج تھیں۔ صرف فرانس، جرمنی اور انگلینڈ بڑے ممالک کے طور پر قائم رہے اور یہی ممالک بعد میں سیکولرازم کا گڑھ بنے۔ کیونکہ یہ [illegible] کی مکمل گرفت سے آزاد رہے تھے۔

اس جنگ میں تھیوڈورک کے لشکر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ تقریباً تباہ ہوگیا۔ اب آئی ٹیس اور اٹیلا کے لشکر کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا لیکن اس موقع پر چالاک تھیوڈورک نے صلح کی درخواست کی اور آئی ٹیس نے جو شرائط پیش کیں وہ بے چون چرا کیے قبول کرلیں۔ رومن اور ہن لشکر یہیں سے واپس ہوگیا۔ اس جنگ میں اٹیلا نے پہلی بار رومنوں کے طرزِ جنگ کا مشاہدہ کیا۔ آئی ٹیس نے بھی اٹیلا کا جائزہ لیا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس شخص کو چھوٹ دی گئی تو آنے والے دنوں میں وہ روم کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن جائے گا۔ مگر فی الحال وہ ان کا حلیف تھا۔ اس کے باوجود آئی ٹیس نے اسے اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور ہن لشکر کو ہنگری کی سرحد پر چھوڑ کر آئی ٹیس گال چلا گیا اور اس نے وہاں کے معاملات درست کیے۔ نااہل کمانڈروں کو ہٹا کر اہل لوگ تعینات کیے۔ سرحدی قلعوں کو مستحکم کیا جہاں سے وحشی قبائل کے خلاف کارروائی کی جاتی تھی اور سڑکوں کا نظام بہتر کیا۔ اس نے اٹیلا سے کہا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرے وہ اسے واپسی میں روم لے جائے گا جو ایک جہان میں انتخاب ہے۔

جب آئی ٹیس فاتحانہ انداز میں روم واپس آیا تو اس کے ساتھ اٹیلا بھی تھا۔ ویلینٹائنین، دوسرے ارکانِ حکومت اور شہریوں نے فاتح لشکر کا والہانہ استقبال کیا۔ مالِ غنیمت اور غلاموں کے ساتھ واپس آکر آئی ٹیس نے اپنی وہ ساکھ بحال کرلی تھی جو برسوں کی قید نے دھندلا دی تھی۔ اس نے ثابت کیا کہ وہی روم کا اصلی محافظ ہے۔ ملکہ میریا اور آکٹس کے لیے اس کی کامیابی ضروری لیکن ناقابلِ برداشت تھی۔ آئی ٹیس جانتا تھا کہ اب اس کے خلاف سازشوں کا پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ اس لیے اس نے پہلے ہی جوابی سازش تیار کرلی۔ اس نے محسوس کیا کہ کم عقل ویلینٹائنین کو قابو میں رکھنا آسان ہوگا اگر وہ ملکہ میریا، شہزادی ہنوریا اور آکٹس کو راستے سے ہٹا دے۔ اس نے قید خانے کے نگران اوسیٹر کو استعمال کیا اور اسے ملکہ کا نیکلس دے کر راضی کیا کہ وہ شاہی محل کے باغ میں داخل ہوکر ویلینٹائنین کو قتل کردے۔ اس نے اسے سوٹیلنٹ دینے کا وعدہ کیا۔

مگر جب اوسیٹر نیکلس دکھا کر باغ میں داخل ہوا اور وہاں ٹہلتے ویلینٹائنین پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو عین موقع پر آئی ٹیس نے وہاں پہنچ کر اوسیٹر کو قتل کردیا اور پھر ویلینٹائنین نے اوسیٹر کے پاس سے اپنی ماں کا نیکلس برآمد کیا۔ اس کے بعد آئی ٹیس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ شاہ کو اس کی ماں کے خلاف بھڑکا دے لیکن ساتھ ہی اس نے ویلینٹائنین کو مشورہ دیا کہ وہ ابھی اپنی ماں پر کچھ ظاہر نہ کرے اور خود اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے۔ آئی ٹیس جانتا تھا کہ ملکہ، شہزادی اور آکٹس تینوں اس سے شدید نفرت کرتے تھے۔ وہ ان کی طرف سے ویلینٹائنین کو برگشتہ کرنا چاہتا تھا۔ اٹیلا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ روم اس کی توقع کے خلاف ثابت ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا یہاں اسے ہر طرف فوجی تیاریاں نظر آئیں گی مگر یہاں تو جنس، دولت اور سازشوں کی ایسی جنگ جاری تھی جس سے اٹیلا جیسے خانہ بدوش بے خبر تھے۔

کہتے ہیں کہ آکٹس نے سازش کرکے آئی ٹیس اور اٹیلا دونوں کو بیک وقت قتل کرانے کی کوشش کی، لیکن خوش قسمتی سے جس وقت وہ دونوں زہریلے جام پینے جارہے تھے آئی ٹیس کی بیٹی لیوٹو ویلیا نے اسے ایک سرکاری خط لاکر دیا جس میں ہن سردار ایمبر دو کی موت کی اطلاع تھی۔ جب آئی ٹیس نے یہ خبر اٹیلا کو دی تو وہ فوراً واپس جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس کا جام وہیں رہ گیا تھا جسے ایک خادم پی گیا اور جب آئی ٹیس واپس آیا تو اس نے خادم کو ایڑیاں رگڑتے دیکھا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے آئی ٹیس نے مناسب سمجھا کہ کچھ دنوں کے لیے روم سے باہر چلا جائے۔ اس نے ویلینٹائنین کو مشورہ دیا کہ مشرقی سلطنت کے حکمران تھیوڈوسیس دوم سے بات کی جائے اور دونوں سلطنتوں کو اپنے دشمنوں کے خلاف مشترکہ کارروائی کے لیے اتحادی بنایا جائے۔ اس کی تجویز مان لی گئی اور آئی ٹیس کو اس وفد کا سربراہ بنا کر تھیوڈوسیس دوم کے پاس بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر عین روانگی کے وقت وفد کو روک لیا گیا۔

☆☆☆

ہن قبائل میں عام طور سے سب سے طاقتور ہی حکمران بنتا تھا لیکن ایمبر دو کی موت کے بعد گیلو کو چیلنج کرنے والا کوئی

نہیں تھا اس لیے حکمرانی کا تاج گیلو کے سر پر رکھا جانے والا تھا۔ مگر عین تاج پوشی کے وقت اٹیلا وہاں پہنچ گیا اور اس نے گیلو کو چیلنج کر دیا کہ وہ اس تاج کا مستحق نہیں ہے۔ گیلو نے مقابلے سے بچنے کے لیے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اٹیلا کو گرفتار کر لیں لیکن ابھی وہ باضابطہ حکمران نہیں بنا تھا اس لیے کسی نے بھی اس کے حکم کی تعمیل کی کوشش نہیں کی۔ اٹیلا نے گیلو سے کہا کہ اسے اپنی سرداری ثابت کرنے کے لیے اس سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ مجبوراً گیلو کو اس کا چیلنج قبول کرنا پڑا۔ ایک دن بعد دونوں میدان میں آمنے سامنے تھے۔ اس مقابلے میں اٹیلا خود شدید زخمی ہوا تھا مگر بالآخر اس نے گیلو کو شکست دے کر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا اور اس کے بعد تمام قبیلے نے متفق ہو کر اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا۔

ایمبر دو کی وراثت کے ساتھ گیلو کی تمام دولت اور اس کی بیویاں بھی اٹیلا کے حصے میں آئی تھیں مگر اٹیلا نے اس کی تمام بیویوں کو آزاد کر دیا اور صرف آکارا کو اپنی بیوی کے طور پر منتخب کیا تھا۔ آکارا اس اعزاز پر بہت خوش تھی اور وہ بھول گئی تھی کہ یہی اٹیلا اس کے تمام قبیلے اور خاندان والوں کی موت کا ذمے دار تھا۔ اسے صرف یہ یاد رہا کہ اٹیلا اس سے محبت کرتا ہے اور اس نے تمام عورتوں اور دوشیزاؤں کو چھوڑ کر اسے اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ کیا تھا وہ اس پر بہت خوش اور راضی تھی۔ وہ سچ مچ اٹیلا سے محبت کرنے لگی تھی۔ شادی کے بعد اس نے اٹیلا کو اکسایا کہ وہ اب ہنوں کا بادشاہ بننے کی کوشش کرے۔ چاہے اس کام کے لیے اسے خون کی ندیاں کیوں نہ بہانی پڑیں۔

حکمران بنتے ہی اٹیلا نے ایمبر دو کی سکون پسندی کی پالیسی کو خیر باد کہا اور آس پاس کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ جس بستی کے لوگ بنا کسی مقابلے کے اس کی اطاعت تسلیم کر لیتے تھے انہیں امان مل جاتی تھی۔ ان سے صرف خراج لیا جاتا اور اس کے جوان اٹیلا کی فوج میں بھرتی کر لیے جاتے تھے۔ لیکن جس بستی سے مزاحمت کی جاتی تھی وہ اٹیلا کی دہشت کا شکار ہو جاتی، اس کے تمام باشندوں کو قتل کر دیا جاتا اور بچنے والوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ بستی کو مکمل طور پر لوٹ کر جلا دیا جاتا تھا۔ مرنے والوں کی کھوپڑیاں بانسوں پر لگا دی جاتی تھیں اور بستی کے پاس سے گزرنے والے اس منظر کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتے تھے۔ مختصر عرصے میں اٹیلا کا نام دہشت کا نشان بن گیا تھا۔ لوگ صرف اس کا نام سن کر تھرا جاتے تھے۔ اس کا لشکر جس بستی کا رُخ کرتا تھا گر اس کے باشندے اطاعت پر تیار نہیں ہوتے تھے تو بستی سے نکل بھاگنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ اٹیلا سے مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اسے خدا کا قہر کہنے لگے تھے۔

اٹیلا نے بچپن میں جو خواب دیکھا تھا وہ اس کی تعبیر کا ایک حصہ حاصل کر چکا تھا۔ مگر وہ ہنوں کا بادشاہ بننا چاہتا تھا اور یہ خواب مارس کی تلوار حاصل کیے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تلوار غائب تھی اور کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اٹیلا کی فوجی مہمات کی وجہ سے آس پاس کے تمام علاقے اس کے زیرِ نگیں آ چکے تھے۔ ڈینوب کے وسیع میدانوں میں اب اس سے زیادہ طاقتور حکمران اور کوئی نہیں تھا۔ اس کے پاس ایسا لشکر جمع ہو گیا تھا جس میں دو لاکھ کے قریب جنگجو اس کے ایک اشارے کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اٹیلا روم کی شان و شوکت دیکھ کر آیا تھا اور اس کے ذہن میں ویسا ہی ایک محل بسانے کا خیال تھا۔ شاہی محل میں ایک محفل طرب و نشاط کے دوران اس کی ملاقات شہزادی ہنوریا سے ہوئی اور شہزادی اسے محل کے خاص حصے میں لے گئی۔ یہاں ایک شاندار زیرِ زمین نہانے کا تالاب تھا جس میں گرم پانی آ رہا تھا اور اس سے خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ اٹیلا کو شہزادی کے حسن نے اتنا متاثر نہیں کیا تھا جتنا اس تالاب کی خوب صورتی نے کیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ بادشاہ بنا تو ایسا ہی عالی شان محل اور اس میں تالاب بنوائے گا۔

ہنوریا سے اس کے تعلقات بس اس ایک رات تک محدود رہے تھے لیکن وہ تالاب اس کے ذہن میں بس گیا تھا اور جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے اپنے لیے ویسا ہی تالاب بنانے کا حکم دیا تھا۔ ہنوں میں مکان بنانے کا تصور نہیں تھا چہ جائیکہ سنگ مرمر کا تالاب بنانا۔ بڑی مشکل سے پکڑے جانے والے غلاموں کی مدد سے یہ تالاب بنایا گیا۔ پھر اٹیلا نے اپنے لیے محل بنانے کا حکم دیا۔ اب تک اس کی بستی خیموں پر مشتمل تھی لیکن اٹیلا کی دیکھا دیکھی اس کے سرداروں نے بھی پتھر اور لکڑی کے پکے مکانات بنانا شروع کر دیے۔ عام ہن اب بھی خیموں میں رہتے تھے مگر آبادی کے لحاظ سے اٹیلا کا دارالحکومت بہت وسعت اختیار کر گیا تھا۔ اگر اسے ترقی کا موقع ملتا تو شاید آنے والے دنوں میں یہ سچ مچ کا شہر بن جاتا۔

اٹیلا نے محسوس کیا کہ مارس کی تلوار حاصل کیے بغیر وہ اپنا خواب پورا نہیں کر سکتا ہے۔ ہن اسے طاقتور سردار تو مانتے تھے لیکن تمام ہنوں کا بادشاہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان ہی دنوں آکارا اس کے بیٹے کو جنم دینے کے دوران انتقال کر گئی۔ اٹیلا کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا کیونکہ وہ آکارا سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس کی موجودگی میں اس نے کوئی کنیز تک

رکھی تھی اور خود کو صرف آکارا تک محدود رکھا تھا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ ہنوں میں کثیر الازدواجی عام بات تھی۔ معمولی قبیلوں کے سردار بھی کئی کئی بیویاں رکھتے تھے۔ آکارا کی جدائی میں غم سے دیوانہ اٹیلا اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں چلا گیا اور جب تک اس کے محافظ اور سردار اس کے پیچھے جاتے وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اٹیلا کئی دن غائب رہا اور جب اس کے آدمی سمجھ رہے تھے کہ وہ کسی دشمن کے ہاتھوں اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے تو واپس آ گیا اور اس کے پاس ایک تلوار تھی جس کے بارے میں اس نے دعویٰ کیا کہ وہ مارس کی تلوار ہے اور اس نے آکارا کی روح کے ایک الوہی اشارے کے تحت اسے تلاش کیا ہے۔

دعویٰ کرنے والا اٹیلا تھا اس لیے کسی میں اتنی جراٗت نہیں تھی کہ اسے جھٹلا سکے۔ یوں اٹیلا کے بادشاہ بننے کی راہ ہموار ہو گئی اور اس نے ہنوں کے بادشاہ کا تاج سر پر رکھ لیا اور اس کے ایلچی آس پاس ہنوں کے تمام قبائل میں پھیل گئے۔ اس نے سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ خود آ کر اس کی بادشاہت تسلیم کر لیں' دوسری صورت میں اس کا لشکر حرکت میں آ جائے گا اور پھر تلوار سردار کا فیصلہ کرے گی۔ نوّے فیصد ہن سرداروں نے اٹیلا کی بادشاہت تسلیم کرنے میں عافیت جانی تھی اور صرف دس فیصد باغی رہے۔ مگر اٹیلا نے ان کے قبیلوں کو تباہ کرنے کے بجائے صرف ان سرداروں کو سزا دی اور انہیں قتل کر کے ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو سردار بنا دیا۔ یوں چند سال کے اندر ہنوں کے تمام قبائل اس کے جھنڈے تلے جمع ہو چکے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت یورپ میں جنگجو ہنوں کی تعداد چھ سے سات لاکھ کے درمیان تھی اور یہ تمام کے تمام اٹیلا کی قیادت میں تھے۔ اتنی بڑی فوجی قوت کبھی رومنوں کے پاس بھی نہیں رہی تھی۔ یہ قوت ایسی نہیں تھی جسے آس پاس کے رہنے والے نظر انداز کر سکتے۔ وہ سب دہل کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

سب سے زیادہ خوف زدہ مغربی رومن سلطنت کے حکمران تھے۔ کیونکہ ہن ان کے سروں پر بیٹھے تھے اور اب انہیں اٹیلا جیسا حکمران مل گیا تھا۔ آئی ٹیس کو مشرقی سلطنت کے پاس بھیجنے کا فیصلہ التوا کا شکار تھا اور آئی ٹیس کی کئی بار کی درخواست کے باوجود اسے روانہ نہیں کیا گیا تھا اس کے پس پشت ملکہ میریا اور آکٹس کا ہاتھ تھا۔ لیکن جیسے ہی اٹیلا کا خطرہ کھل کر سامنے آیا۔ ملکہ میریا اور آکٹس کا خیال بدل گیا اور انہوں نے آئی ٹیس کو مشرقی سلطنت کے ساتھ معاہدے کے لیے بھیجنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اگرچہ آئی ٹیس کے خیال میں ان لوگوں نے بہت دیر کر دی تھی۔ اس کام کے لیے بہترین وقت وہ تھا جب مشرقی سلطنت نے اٹیلا کو خراج دینے سے انکار کر دیا تھا اور اسے اپنے مغربی بازو کی مدد کی ضرورت تھی۔

ان ہی دنوں کسی وجہ سے شاہ ویلینٹائین اپنی بہن ہنوریا سے برگشتہ ہو گیا اور اس نے اس پر اپنے خادم کے ساتھ ملوث ہونے کا الزام لگایا اور اسے قید کر دیا۔ ملازم محبوب کو قتل کر دیا گیا تھا اور ہنوریا کو آئی ٹیس کے سپرد کیا کہ وہ اسے مشرقی سلطنت میں واقع مسیحیوں کی سب سے بڑی خانقاہ پہنچا دے جہاں ہنوریا تمام عمر نن بن کر رہے گی۔ حالانکہ اس وقت وہ امید سے تھی اور اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ یقیناً اس کے خادم محبوب کا تھا۔ آئی ٹیس خوش ہوا کہ روم میں اس کا ایک مخالف کم ہو گیا اور وہ ہنوریا کو لے کر مشرقی سلطنت کے دارالحکومت روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں مشرقی سلطنت میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ تھیوڈ وسیس دوم گھڑ سواری کے دوران گرنے سے ہلاک ہو گیا تھا اور اس کے جانشین مارسین نے ہنوں سے کیے تمام معاہدے ختم کر دیے تھے اور ان کو خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کھلی جنگ۔ ایسے میں مشرقی سلطنت کو بھی مغربی سلطنت کی ضرورت تھی۔ آئی ٹیس اور اس کے وفد کے وہاں پہنچنے سے پہلے خبریں مارسین تک پہنچ گئی تھیں اور وہ آئی ٹیس کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ ذاتی طور پر آئی ٹیس کا مداح تھا اور اس کے خیال میں مغربی سلطنت ابھی تک آئی ٹیس جیسے وفاداروں کی وجہ سے قائم تھی۔ اس نے آئی ٹیس کے لیے اپنا دربار لگایا اور اسے ایک سربراہ مملکت کا پروٹوکول دیا تھا لیکن شہزادی ہنوریا کو اسی دوران خانقاہ سے آنے والی ننوں کے سپرد کر دیا گیا تھا جو اسے کھینچتی ہوئی زبردستی وہاں سے لے گئی تھیں۔ ہنوریا کسی صورت نہیں جانا چاہتی تھی لیکن ان طاقتور ننوں کے مقابلے میں اس کی ایک نہ چلی۔

مارسین ادھیڑ عمر کا چہرے سے چالاک اور عیار نظر آنے والا شخص تھا۔ رومن ہونے کے باوجود وہ حلیے سے کوئی مشرقی بادشاہ نظر آتا تھا اور اس کے محل کی شان و شوکت اور خوب صورتی روم کے شاہی محل سے کہیں زیادہ تھی۔ آئی ٹیس کو یہاں کہیں زیادہ نفیس اور شاندار ساز و سامان دکھائی دیا تھا۔ مارسین نے دربار کے بعد اس کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دعوت میں آئی ٹیس ایک سرخ بالوں والی خادمہ کو بار بار دیکھ رہا تھا مارسین سمجھا کہ وہ اسے پسند آ گئی ہے۔ اس نے کہا۔ ”جنرل آئی ٹیس اگر تمہیں یہ

خادمہ پسند ہے تو یہ آج سے تمہاری ہے۔"

"میں اس تحفے کے لیے شہنشاہ کا شکرگزار ہوں۔" آئی ٹیس نے اپنا جام اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"کاش کہ تم میری فوج میں جنرل ہوتے۔ یقین کرو تم اس سے کہیں زیادہ مرتبہ پاتے۔" مارسین نے ترغیب آمیز لہجے میں کہا۔

"شہنشاہ میں روم کا خدمت گزار ہوں اس طرح سے میں آپ کا بھی خادم ہوں، یہ بھی ایک طرح سے روم ہی ہے۔"

مارسین جانتا تھا کہ آئی ٹیس صحیح معنوں میں روم کا خدمت گار ہے۔ دعوت کے بعد وہ سنجیدہ موضوعات کی طرف آئے جن میں سرِفہرست اٹیلا تھا۔ آئی ٹیس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹیلا کو ایک سخت ترین دشمن قرار دے دیا۔ "شہنشاہ معظم! اس کی فوجی قوت روم کے مشرقی اور مغربی بازوؤں سے کہیں زیادہ ہے اور اس کے سپاہی رومن سپاہیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ میں ان کو لڑتے دیکھ چکا ہوں اور ان کی بے جگری کا معترف ہوں۔"

"اس صورت میں ہمیں اٹیلا سے نمٹنے کے لیے کیا حکمتِ عملی اپنانی چاہیے؟"

"سازش۔" آئی ٹیس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہن بہت طاقتور ہیں لیکن اٹیلا سے پہلے ان کی حیثیت بھیڑیوں کے الگ الگ گروہوں جیسی تھی۔ اب اٹیلا کی وجہ سے وہ ایک ہوگئے ہیں۔"

مارسین نے آئی ٹیس کی بات پر غور کیا۔ "یعنی ہمارا اصل نشانہ اٹیلا ہونا چاہیے؟"

"بالکل شہنشاہ، اگر اٹیلا نہ رہا تو ہن دوبارہ پہلے کی طرح منتشر ہوجائیں گے اور ہم ان سے آرام سے نمٹ سکیں گے۔"

"کیا تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے؟"

"ہاں، لیکن وہ ابھی واضح نہیں ہے۔" آئی ٹیس نے جواب دیا۔ "کیا آپ کے پاس ایسا کوئی آدمی ہے جو رومن نہ ہو اور ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہو۔ وہ آپ کا اتنا وفادار ہو کہ آپ کے حکم پر آگ کے دریا میں کود جائے اور اپنی جان کی پروا نہ کرے۔"

"بالکل ایسا ایک آدمی ہے۔ وہ اتنا ماہر خنجر باز ہے کہ آنکھ بند کرکے صرف آواز پر نشانہ لگا سکتا ہے۔" مارسین نے کہا اور اپنے اس غلام کو طلب کیا۔

گوڈین نامی یہ شخص شامی نژاد عرب تھا اور برسوں سے مارسین کا خاص خادم تھا۔ وہ اس سے بہت خاص کام لیتا تھا۔ گوڈین سے مل کر اس کے کمالات دیکھ کر جب آئی ٹیس اپنی خواب گاہ میں پہنچا تو سرخ بالوں والی لڑکی پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ آئی ٹیس نے اس کا نام پوچھا اس نے جواب دیا۔

"اولڈوکا۔"

"تمہارا تعلق کس جگہ سے ہے۔"

"ہنگری کے میدانوں میں آباد ایک قبیلے سے۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔ "میرے قبیلے پر اٹیلا نے حملہ کیا اور میرے باپ اور بھائیوں سمیت تمام قبیلے والوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ صرف مجھ جیسی جوان عورتوں اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑا۔ ہمیں غلام بنا کر بیچا گیا۔ میں کئی ہاتھوں سے ہوتی ہوئی ... یہاں شہنشاہ کے پاس آئی ہوں۔ میری حیثیت محل کی خادماؤں کی سی ہے۔"

"اٹیلا کے لیے تمہارے دل میں کیا جذبات ہیں؟"

اولڈوکا نے اس سوال پر چونک کر آئی ٹیس کی طرف دیکھا۔ "میں سمجھی نہیں معزز جنرل؟"

"اگر تمہیں موقع ملے تو کیا تم اٹیلا سے بدلہ لینا پسند کرو گی؟"

اولڈوکا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ جنرل اس سے مذاق کررہا ہے مگر جب آئی ٹیس سنجیدہ رہا تو اس نے جواب دیا۔ "ہاں میں اس سے بدلہ لینا پسند کروں گی۔"

"اگر تمہیں اس کے لیے اپنی جان دینا پڑے تب....؟"

"تب بھی میں اٹیلا کو مارنا پسند کروں گی چاہے اس کے بعد مجھے دنیا کا بدترین عذاب دے کر مارا جائے۔"

آئی ٹیس اس کے الفاظ تول رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ لڑکی واقعی اٹیلا سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ جب آئی ٹیس ایمر ود سے ملنے گیا تھا تب ہی اس کی زیرک نگاہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ گیلو کی بیوی آکارا اور اٹیلا کے درمیان پسند کا رشتہ ہے۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا بعد میں اٹیلا نے اسی عورت سے شادی کی اور وہ اس کے بیٹے کو جنم دیتے ہوئے مرگئی تھی۔ اب اس نے اولڈوکا کو دیکھا تو اسے لگا جیسے آکارا دوسرا جنم لے کر اس کے سامنے آگئی ہو، وہ ہو بہو آکارا تھی۔ اسی وجہ سے وہ دورانِ دعوت بار بار اولڈوکا کو دیکھ رہا تھا اور مارسین اس کی توجہ سے کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ آئی ٹیس نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں موقع دوں گا اور جب تم اٹیلا کے پاس جانے میں کامیاب ہوگی تب تمہیں اس پر یقینی وار کرنا ہوگا یاد رکھنا وہ بچ نہ سکے۔"

"آپ فکر نہ کریں ایک بار مجھے موقع مل گیا تو اٹیلا بچ

نہیں سکے گا۔" اولڈوکا نے پورے یقین سے کہا تھا۔

اس دوران میں اٹیلا اپنے زیرِ نگیں علاقوں میں مضبوط اور مستحکم چوکیاں بنوا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اگر کسی علاقے پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا ہے تو مضبوط قلعوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے وہ کسی قلعے پر قبضہ کرتا تو اسے تباہ کرنے سے گریز کرتا تھا البتہ اس کی پوری آبادی کو ضرور تہ تیغ کردیتا تھا اور بچ جانے والوں کو غلام بنا کر لے جاتا تھا۔ وہ تمام ہنوں کو اپنے ماتحت لے آیا تھا اور اس نے پندرہ سال سے پچاس برس تک کے ہر ہن مرد پر فوجی خدمت لازمی قرار دے دی تھی۔ اب انہیں اپنے جانوروں کی دیکھ بھال اور کھیتوں میں کام کرنے کے لیے غلاموں کی ضرورت تھی۔ اس لیے کسی آبادی پر حملے کے بعد وہاں بچ جانے والے ہر جوان مرد اور عورت کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ البتہ بوڑھوں اور بعض اوقات بچوں کو اٹیلا قتل کرادیتا تھا۔ اس کے نزدیک بوڑھے اور بچے بوجھ ہوتے تھے اور ان کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

رومن سلطنت کی طرف بڑھنے سے پہلے اٹیلا نے یورپ کے دوسرے قبائل کو اپنا مطیع بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ان تمام سرداروں کو طلب کیا جن کے قبائل اس کے علاقے کے آس پاس موجود تھے۔ طلب کرنے کے ساتھ اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ جو سردار حاضر نہیں ہوا سمجھا جائے گا وہ اٹیلا سے جنگ پر آمادہ ہے۔ اس دھمکی کے بعد کسی سردار کے لیے اٹیلا کی طلبی کو نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ وہ ایک ایک کرکے اٹیلا کے زیرِ تعمیر دارالحکومت میں حاضر ہوکر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلانے لگے۔ جواب میں اٹیلا ان سے اس کی استعداد کے مطابق خراج طلب کرکے انہیں امن وامان کی یقین دہانی کرادیتا تھا۔ ان میں سے اکثر قبائل کی دوسرے قبائل سے دشمنی تھی اور مناسب خراج کے بدلے اٹیلا کے تحفظ کی چھتری ان کے خیال میں بُرا سودا نہیں تھا۔

اپنے ماتحت علاقوں میں امن قائم رکھنے کے لیے اٹیلا نے باقاعدہ قوانین نافذ کردیے جس کے تحت اس کے مقرر کیے ہوئے اعمال لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کرتے تھے اور معاملہ دو قبیلوں کے درمیان ہوتا تو اسے براہِ راست اٹیلا کے سامنے پیش کردیا جاتا تھا۔ یوں اٹیلا سچ بچ بادشاہ کی حیثیت اختیار کرگیا تھا۔ چاروں طرف سے خراج کا اناج، سونا چاندی، ہتھیار، غلام اور گھوڑے چلے آرہے تھے۔ اس خزانے سے اٹیلا نے نئی فوج تیار کرنا شروع کردی تھی۔ اس کی نظریں اب روم پر تھیں۔ بادشاہ بننے کے بعد قسمت اس پر مہربان تھی اور اسے واحد دھچکا مشرقی بازنطینی سلطنت کے حکمران مارسین کی طرف سے لگا تھا جس نے خراج کی رقم دینے سے انکار کردیا تھا اور اپنے سرحدی قلعوں کو ہنوں کے خلاف مضبوط کرنے لگا تھا۔

مگر چالاک اٹیلا نے اس کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا۔ اوّل تو بازنطینی سلطنت اس کے علاقے سے فاصلے پر تھی اور وہاں فوج کشی کرنے کے لیے اسے بہت بڑے لشکر کی ضرورت پڑتی اور پھر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اسی حساب سے نہ صرف رسد لے جانی پڑتی بلکہ رسد کے راستوں کی حفاظت کی فکر بھی لازمی تھی۔ اس کے بعد اسے تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ اس کے مقابلے میں روم کی مغربی سلطنت نہ صرف نزدیک تھی بلکہ وہ کمزور بھی تھی اور اٹیلا اس کی کمزوریوں سے بھی واقف تھا اس لیے اس نے اسے اپنے نشانے کے طور پر منتخب کرلیا۔ مگر ابھی روم کی طرف بڑھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

اٹیلا جانتا تھا کہ روم کی اصل طاقت اس کے مقبوضات ہیں۔ گال اور اسپین سے روم کو خراج آتا تھا اور اسی رقم سے روم کی فوجی طاقت برقرار رکھی جاتی تھی۔ اگر روم سے گال کا صوبہ اور اسپین چھن جاتے تو چند سالوں میں اس کی فوجی قوت ختم ہوسکتی تھی۔ افریقی مقبوضات اور شام ومصر اس سے پہلے ہی چھن چکے تھے۔ خاص طور سے مصر جو اناج اور رقم کی ضرورت پوری کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا ان مشرقی بازنطینی سلطنت کے ماتحت تھا اور وہاں کے حکمران صدیوں پہلے روم سے محکومی کا رشتہ توڑ چکے تھے۔ حد یہ کہ سسلی اور قبرص کے صوبے بھی روم کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ میڈی ٹرینین میں چھوٹی چھوٹی مملکتیں بحری قوت کے بل بوتے پر سر اُٹھا رہی تھیں۔ روم کی بحری قوت ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔ البتہ اٹلی کی حد تک رومی سلطنت پہلے کی طرح طاقتور تھی۔

اٹیلا نے اپنی حکمت عملی پر عمل شروع کیا اور گال کے علاقے میں اس کے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے حرکت کرنے لگے۔ وہ گاؤں دیہات پر حملہ کرتے۔ لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے بعد وہ بچ جانے والوں کو غلام بنا کر گاؤں کو نذرِ آتش کردیا کرتے۔ اس سے پہلے ہنوں نے اکا دکا حملے کیے تھے اور رومن دستوں نے انہیں بہ آسانی مار بھگایا تھا لیکن اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔ ہن فوجی دستے نہایت تیز رفتاری سے حملہ کرتے تھے اور اس سے پہلے کہ رومی دستے علاقے میں آتے وہ سامان اور غلاموں سمیت اپنے علاقے میں واپس لوٹ جاتے تھے۔ سرحدی قلعوں کے محافظ پہلے اپنی حفاظت کی تدبیر کرتے تھے پھر اپنے باج گزاروں کی مدد

کی کوشش کرتے لیکن اتنی دیر میں وہ بے چارے ہر مدد سے بے نیاز ہو چکے ہوتے تھے۔

یہ مقامی لوگ رومی نہیں تھے بلکہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ہاں ان کا رومنوں سے مشترک رشتہ مذہب کا تھا۔ پادریوں کی کوشش سے ان میں سے بیشتر قبائل عیسائیت قبول کر چکے تھے لیکن بد قسمتی سے رومنوں کے خیال میں مذہب سے زیادہ نسل کا رشتہ اہم تھا اور وہ رومنوں کے ماتحت اور باج گزار تھے۔ان کی زندگی اور موت کا روم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔وہ پہلے بھی انہیں فوجی طاقت کے بل بوتے پر دباتے آئے تھے اور ان کے خیال میں آنے والے وقت میں بھی وہ فوجی قوت سے فرمانبردار رہ سکتے تھے اور رومنوں کا یہ خیال کسی حد تک درست بھی تھا۔اگر رومن طاقتور نہ ہوتے تو یہی قبائل کبھی اس کی اطاعت قبول نہ کرتے۔

اٹیلا روم کی ان ہی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ دوسرے قبائل سے تعلق رکھنے والے اٹیلا کے جاسوس اپنے ہم نسل قبائل میں اس کا پیغام پھیلا رہے تھے۔وہ ان قبائل کو رومنوں کے خلاف اُکساتے تھے، جو قبائل رومنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔وہ اٹیلا کے جاسوسوں کے اُکسانے میں آکر روم کو خراج دینے سے انکار کر دیتے تھے۔جو قبائل ان جاسوسوں کے بہکاوے میں نہیں آتے تھے ان پر اٹیلا کے چھاپہ مار دستے قہر بن کر گرتے تھے اور انہیں اپنے غیظ و غضب کی آگ میں جلا کر خاکستر کر دیتے تھے۔اس لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے اٹیلا ایک طرف تو روم کی رسد کے راستے روک رہا تھا دوسرے وہ محکوم قبائل کو رومنوں کے خلاف اُکسا رہا تھا جو ہنوں کے سامنے ان کی حفاظت کرنے سے قاصر تھے۔اس لیے قبائل میں بغاوت پھیل رہی تھی اور یہی اٹیلا چاہتا تھا کہ جب وہ گال پر حملہ کرے تو مقامی قبائل رومنوں کا ساتھ دینے سے گریز کریں۔اٹیلا پورے گال اور اسپین پر قبضہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس صورت میں اسے بہت زیادہ فوج ان علاقوں میں استعمال کرنی پڑتی جبکہ وہ اپنی فوجی قوت روم پر حملے کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ایک بار روم پر اس کا قبضہ ہو جاتا تو مقبوضات خود بہ خود اس کے ہاتھ آجاتے۔

اٹیلا کا اصل منصوبہ روم اور گال و اسپین کے درمیانی راستوں پر قبضہ کرنا تھا تاکہ مقبوضات میں رومن فوج پھنس جائے۔ایک طرف تو روم سے رابطہ کٹنے سے رسد اور مدد کے راستے بند ہونے سے رومن فوج کا مورال گرتا دوسرے ان کے مخالف مقامی قبائل کا حوصلہ بلند ہوتا اور وہ رومنوں پر حملے شروع کر دیتے۔دوسری طرف رومی سلطنت اپنی ساکھ بحال رکھنے کے لیے اٹیلا سے زیرِ قبضہ علاقے چھڑانے کے لیے فوج بھیجتی اور اٹیلا کے چھاپہ مار دستے اس فوج کو راستے میں تباہ کرنا شروع کر دیتے۔اٹیلا کا یہ منصوبہ اس کے ذہن اور اس کے چند معتمد ساتھیوں کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں تھا۔اگر رومنوں کو اس منصوبے کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ پہل کرتے ہوئے اٹیلا کی سلطنت اور گال کے درمیانی علاقوں پر قابض ہو جاتے اور اٹیلا کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔

لیکن یہ منصوبہ بناتے ہوئے اٹیلا ایک شخص کو فراموش کر بیٹھا تھا یہ ایک طرح سے اس کا استاد آئی ٹیس تھا۔جس وقت اٹیلا اپنے دارالحکومت میں بیٹھا اپنے منصوبے کے ابتدائی حصوں پر عمل کر رہا تھا عین اس وقت چاروں طرف سے امنڈ کر آنے والے حلیف قبائل کی بھیڑ میں بھیس بدل کر آئی ٹیس اپنے چند ساتھیوں اور اولڈوکا کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا تھا۔وہاں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے اولڈوکا کو خود سے الگ کیا اور اسے دارالحکومت کی تعمیر میں کام کرنے والے کارکنوں میں شامل کر دیا۔اولڈوکا نے اپنے سپروائزر کو بتایا کہ وہ لاوارث ہے اور اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔دوسری عورتوں کی طرح اولڈوکا کو بھی ہلکے کاموں پر لگا دیا گیا اور وہ کام کرنے والے مزدوروں کو پانی پلانے کا کام کرنے لگی۔

آئی ٹیس کی اس حکمت عملی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اٹیلا سے اچھی طرح واقف تھا اور اسے معلوم تھا کہ اٹیلا اپنے دارالحکومت میں آنے والے ہر فرد کی نگرانی کراتا ہوگا وہ جلد یا بدیر اس کے آدمیوں کی نظر میں آجائے گا اور ایسے وقت اولڈوکا کا اس سے دور رہنا ضروری تھا۔اگر اس کا تعلق آئی ٹیس سے نکل آتا تو اٹیلا چوکنا ہو جاتا اور پھر اولڈوکا اسے بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی۔اس کے بعد آئی ٹیس سکون سے انتظار کرنے لگا کہ کب اٹیلا کے آدمی اس کی موجودگی سے واقف ہوتے ہیں اور اسے لے جا کر اس کے حضور پیش کرتے ہیں۔آئی ٹیس اٹیلا سے ملاقات کر کے اس کے عزائم کا اندازہ لگانا چاہتا تھا کیونکہ اسے خاصی حد تک یقین تھا اٹیلا جتنا طاقتور ہو گیا تھا اس کے بعد وہ لازماً روم پر حملہ کرنے کا سوچتا۔مگر اس سے پہلے وہ کیا کرنا چاہتا تھا آئی ٹیس اس بارے میں فکر مند تھا۔

آئی ٹیس کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ایک رات جب وہ اپنے خیمے میں موجود تھا اٹیلا کا معتمد خاص اور اس کا سپہ سالار اینگس چند سپاہیوں کے ہمراہ آیا اور آئی ٹیس کو گرفتار کر کے اٹیلا کے پاس لے گیا۔یہ بہت خوفناک وقت تھا۔آئی ٹیس نے اٹیلا کی جو کہانیاں بعد میں سنی تھیں وہ اسے

بہت ہلاک انسان ثابت کرتی تھیں۔اس کا امکان بھی تھا کہ وہ آئی ٹیس کی بات سنے بغیر اسے جلاد کے حوالے کر دے اور اگلے دن اس کا سر کسی بانس پر ٹنگا ہو۔اس کا بھی امکان تھا کہ اٹیلا اس سے بات تو کرتا لیکن اس کے بعد ہمیشہ کے لیے اسے کسی قید خانے میں ڈلوا دیتا۔اگر اٹیلا کی جگہ خود آئی ٹیس ہوتا تو کم سے کم یہ کام تو کر گزرتا۔مگر آئی ٹیس نے ایک چانس لیا تھا۔وہ اٹیلا کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔اٹیلا جتنا بڑا بادشاہ تھا اس کا دفتر اتنا ہی سادہ سا تھا وہاں معمولی سے فرنیچر اور پینے پلانے کے لوازمات کے سوا کچھ نہیں تھا۔اٹیلا نے خلافِ توقع بغیر کسی طنز اور الزام کے اس کا استقبال کیا۔اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔"ہمیں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔"

اینگس اس کے حق میں نہیں تھا لیکن اٹیلا کا حکم تھا وہ سر جھکا کر اپنے ساتھیوں سمیت رخصت ہو گیا۔ان کے جاتے ہی اٹیلا مسکرایا۔"مجھے روم کے عظیم جنرل کو اس سادہ لباس اور اپنے دارالحکومت میں دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی۔"

"مجھے معلوم ہے کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

اٹیلا نے اپنے اور اس کے لیے جام نکالا اور اسے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ جب آئی ٹیس بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"عظیم اٹیلا سے ملنے جو کہ ہنوں کا بادشاہ ہے۔"

اٹیلا نے اس کی بات پر غور کیا۔"آئی ٹیس میرا خیال ہے تم اس قابل ہو کہ روم کے حکمران بن سکو۔"

"میں روم کا خادم بن کر بھی خوش ہوں۔" آئی ٹیس نے محتاط انداز میں کہا۔

"ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ روم چلوں اور وہاں کے عجائبات دیکھوں۔" اٹیلا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ہاں لیکن یہ بات اب پُرانی ہو چکی ہے۔" آئی ٹیس سپاٹ لہجے میں بولا۔وہ اٹیلا کی بات میں چھپا مفہوم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

"مگر میں پھر بھی جانا چاہوں؟"

"تب تمہیں ہر راستے پر آئی ٹیس ملے گا۔" آئی ٹیس نے صاف گوئی سے کہا۔اٹیلا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

"کیا میں اس کا یہ مطلب لوں کہ عظیم آئی ٹیس مجھ سے اب میدان جنگ میں ملاقات کرنا چاہتا ہے۔"

"اگر عظیم اٹیلا روم کی طرف جانا چاہے گا تو یقیناً ایسا ہی ہوگا۔"

"اگر میں روم کے علاوہ کہیں اور جانا چاہوں تو؟"

"تب آئی ٹیس اسی وقت حرکت میں آئے گا جب اسے ایسا کرنے کا حکم دیا جائے۔"

"کیا مارسین نے معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

اٹیلا کی اس بات سے آئی ٹیس کو جھٹکا لگا تھا اس کا نہیں خیال تھا کہ اٹیلا کے جاسوس اتنے تیز ہوں گے۔اسے علم تھا کہ آئی ٹیس مارسین کے پاس سے آیا ہے۔

"اگر اس سے معاہدہ ہو جاتا تو مجھے تمہارے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مارسین نے روم سے معاہدہ کیوں نہیں کیا جبکہ وہ ہنوں سے تمام معاہدے ختم کر چکا ہے اور خراج دینے سے بھی انکار کر رہا ہے۔"

"اس کی وجہ تم ہو اٹیلا دی ہن۔" آئی ٹیس نے جواب دیا۔"خراج دینے سے مشرقی سلطنت نے انکار کیا ہے لیکن تم جارحانہ نقل و حرکت مغربی سلطنت کے خلاف کر رہے ہو۔ہمارے مقبوضات میں حملے کر رہے ہو۔"

"مقبوضات روم کے نہیں ہیں۔" اٹیلا نے چالاکی سے کہا۔"جو ان پر قابض ہو جائے یہ اس کے ہوتے ہیں۔"

آئی ٹیس کے خیال میں بات ختم ہو گئی تھی اٹیلا کے عزائم اس کے سامنے تھے اس نے پوچھا۔"اب میرے ساتھ کیا ہوگا؟"

اٹیلا مسکرایا۔"عظیم آئی ٹیس کو پورے عزت و احترام کے ساتھ واپس روم بھیج دیا جائے گا۔"

دو دن پہلے رات سوتے وقت اٹیلا پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن وہ بچ گیا اور اس نے حملہ کرنے والے کو پکڑ لیا تھا بعد میں وہ مارسین کے خصوصی خادم گوڈین کی حیثیت سے شناخت کیا گیا تھا لیکن اٹیلا نے اسے سزا دینے کے بجائے واپس مارسین کو بھجوا دیا تھا۔آئی ٹیس نے سکون کا سانس لیا جب اٹیلا نے اس سے گوڈین کے بارے میں نہیں پوچھا۔ورنہ اس کا خیال تھا کہ اس کی گرفتاری اسی سلسلے میں کی گئی ہے۔اگلے دن اٹیلا نے اسے ایک فوجی دستے کے ساتھ واپس روم بھیج دیا۔ جاتے وقت آئی ٹیس فکر مند تھا اسے اٹیلا کے عزائم ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اس نے روم کے بارے میں کوئی واضح بات کرنے سے گریز کیا تھا اس کا مطلب تھا وہ روم کے لیے بھی عزائم رکھتا ہے۔اگرچہ اس کا مقبوضات کے بارے میں بیان ہی واضح تھا اور آئی ٹیس سے بہتر کون جانتا تھا کہ گال اور اسپین روم کے لیے ناگزیر ہیں ان کے بغیر روم اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔

واپس پہنچتے ہی آئی ٹیس نے شاہ روم سے ملاقات کی اور اسے اپنے سفر کا احوال سنایا لیکن اسے اٹیلا سے ملاقات کے بارے میں بے خبر رکھا۔ اس نے جو کیا تھا یہ اس کی ذاتی کاوش تھی۔ وہ اس بارے میں کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ البتہ اس نے اٹیلا کے عزائم سے باخبر کر دیا۔ اس نے اٹیلا سے مارسین کے بارے میں جھوٹ نہیں کہا تھا اس نے جس معاہدے کی پیش کش کی تھی اس کے مطابق اگر اٹیلا یا کوئی اور شمالی طاقت مشرقی سلطنت پر حملہ کرے تو روم اس کی مدد کرے گا لیکن جواب میں مشرقی سلطنت صرف مالی مدد کی پابند ہوتی۔ روم کو جتنی مالی مدد کی ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ اسے افرادی قوت درکار تھی۔ آئی ٹیس کی نظروں میں اٹیلا کو اس کی حد میں رکھنے کا ایک طریقہ اور بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے ملکہ، ویلینٹائین اور آکٹس کے سامنے تجویز پیش کی۔

''اگر ہم پوپ کی مدد حاصل کریں تو....''

''پوپ کی مدد حاصل کرنے کا مطلب ہوگا ہم کلیسا کا جُوا اپنی گردن میں ڈال لیں۔'' آکٹس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اس وقت خطرہ اٹیلا ہے۔'' آئی ٹیس نے کہا۔ ''ہمیں سب سے بڑا خطرہ اٹیلا اور جرمنوں کے اتحاد کا ہے اور اس اتحاد کو صرف پوپ روک سکتا ہے۔ تم جانتے ہو تھیوڈورک سے کیا گیا معاہدہ ختم ہونے والا ہے اور اس کے بعد وہ کسی کا بھی حلیف بننے کے لیے آزاد ہوگا۔''

''اس کی وجہ بھی تم ہو۔'' آکٹس کا لہجہ الزام دینے والا تھا۔ ''صرف تم سے مخاصمت کی وجہ سے تھیوڈورک روم کا دشمن بنا ہے۔''

''یہ غلط ہے جرمن کبھی ہمارے حلیف نہیں تھے۔''

ملکہ میریا معاملے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہنوریا کو جلاوطن کر کے خانقاہ بھیجنے کے بعد سے اس کے بیٹے سے تعلقات کشیدہ چلے آرہے تھے اور سوائے ضروری امور کے ان کے درمیان بات چیت بھی کم رہ گئی تھی۔ ملکہ میریا چاہتی تھی کہ ہنوریا کو واپس بلا لیا جائے مگر ویلینٹائین اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر اب ملک اور اقتدار کی بقا کا معاملہ تھا اس لیے وہ اپنے اختلافات بھلا کر ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ خلافِ توقع ملکہ میریا نے آئی ٹیس کی تائید کی۔ ''جنرل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں پوپ کی مدد حاصل کرنی چاہیے اگر وہ تھیوڈورک اور اٹیلا کا اتحاد روک دے تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہوگی۔''

''اٹیلا کو مقبوضات میں داخلے سے روکنے کے لیے ہمیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔'' آئی ٹیس نے زور دے کر کہا۔

''پوپ سے بات کون کرے گا؟''

''میرا خیال ہے اس کام کے لیے روم کا لاٹ پادری موزوں شخص ہے۔'' آئی ٹیس نے تجویز پیش کی۔

بحث کے بعد طے پا گیا کہ لاٹ پادری کو پوپ کے پاس بھیجا جائے اور وہ اس سے درخواست کرے کہ وہ تھیوڈورک پر دباؤ ڈالے کہ وہ اٹیلا سے اتحاد کرنے کے بجائے اس کے خلاف روم کا ساتھ دے۔ اٹیلا کافر تھا جبکہ روم اور جرمن دونوں عیسائی تھے...... اس وقت پوپ لیو اوّل ویٹی کن میں موجود تھا۔ اس نے شاہ روم کی درخواست مان لی اور تھیوڈورک کے پاس ایک وفد بھیجا جس نے اسے قائل کر لیا کہ اسے کافر اٹیلا کے بجائے عیسائی ویلینٹائین کا ساتھ دینا چاہیے۔ جرمن نئے نئے عیسائی ہوئے تھے اور ان میں دینی جذبہ کہیں زیادہ تھا۔ تھیوڈورک خود میں اتنی جرأت نہیں پاتا تھا کہ پوپ کا حکم رَد کر سکے۔ کہتے ہیں یورپ کی سیاست میں یہ ویٹی کن کی پہلی دخل اندازی تھی جو آنے والے دنوں بڑھتی ہی چلی گئی۔

دوسری طرف اٹیلا بھی غافل نہیں تھا۔ اس کے جاسوس اسے پل پل کی خبریں دے رہے تھے۔ جیسے ہی تھیوڈورک نے پوپ کے حکم پر اس کے خلاف روم کا اتحادی بننے کا فیصلہ کیا، اٹیلا نے ان جرمن قبائل سے روابط شروع کر دیے جو ابھی عیسائی نہیں ہوئے تھے اور اپنے قدیم مذہب پر قائم تھے۔ ان میں سے اکثر نے اٹیلا کے رابطے کا مثبت جواب دیا۔ روم کی سفارت کاری کا اس سے موثر جواب اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اٹیلا نے اپنی فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ ان فوجوں کا بیشتر اجتماع گال کی حد میں ہو رہا تھا۔ اٹیلا نے تمام اتحادیوں کو رومن حدود میں جمع ہونے کا حکم دیا تھا۔ اس کی فوج کی آمد تک وہ وہاں تباہی و بربادی پھیلا کر رومنوں کے لیے مزید مشکلات کھڑی کر سکتے تھے۔

جس وقت اٹیلا فوجی دستے تیار کر کے دارالحکومت سے گال کی طرف روانہ کر رہا تھا ان دنوں اسے اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ اپنی بیویوں اور بچّوں کی طرف توجہ دے سکتا۔ آکارا کے بعد اس نے کئی شادیاں کیں اور اس کے درجن سے بھی زیادہ بچّے تھے لیکن جو مقام آکارا اور اس سے پیدا ہونے والے بیٹے کا تھا وہ کسی کا نہیں تھا۔ اٹیلا اپنے سب سے بڑے بیٹے آٹیلوس (اٹیلا کا بیٹا) کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا لیکن وہ اسے جنگی مہمات میں لے جانے سے گریز کرتا تھا۔ اب وہ پندرہ سال کا بھرپور نوجوان تھا لیکن اس کی پرورش

زیادہ تر محل میں عورتوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ اٹیلا اپنے دارالحکومت میں اکیلے ہی گھومتا رہتا تھا اور اس کے ساتھ عام طور سے ایک دو محافظوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا تھا اپنی حفاظت کے بارے میں اٹیلا کا کہنا تھا کہ جو حکمران اپنی حفاظت نہ کر سکے وہ اپنے لوگوں کی حفاظت کیسے کرے گا؟

ایک دن وہ کھڑا ہو کر اپنے لوگوں کو سرگرمی سے جنگ کی تیاری کرتے دیکھ رہا تھا تب اس کی نظر مزدوروں کو پانی پلاتی اس خوب صورت لڑکی پر پڑی جس کے بال سرخ تھے اور وہ حیرت انگیز حد تک آکارا سے مشابہہ لگ رہی تھی۔ اس نے اینکس سے لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''غلام ہے۔'' اینکس نے جواب دیا۔ ''یہاں مزدوروں کو پانی پلانے کا کام کرتی ہے۔''

''معلوم کرو اس کا نام کیا ہے اور اس کا تعلق کہاں سے ہے؟ پھر اسے شاہی محل پہنچا دو۔''

''حکم کی تعمیل ہوگی۔'' اینکس نے سر جھکا کر کہا۔

کچھ دیر بعد ہی اٹیلا کو علم ہو گیا کہ لڑکی کا نام اولڈوکا تھا اور اس کا تعلق ہنگری کے میدانوں میں آباد ایک چھوٹے قبیلے سے تھا۔ یہ قبیلہ اٹیلا کی فوجوں کا نشانہ بنا تھا اور اس کے بیشتر افراد مارے گئے تھے معدودے چند بچنے والوں کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ قیدیوں سے کام لینے والوں نے اسے اس خدمت پر لگا دیا تھا۔ لڑکی کو اٹیلا کے محل میں منتقل کر دیا گیا تھا لیکن ابھی اٹیلا نے اس سے ملاقات نہیں کی تھی۔ گال کی طرف پیش قدمی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور اٹیلا نے فیصلہ کیا کہ وہ وہاں سے واپسی پر اولڈوکا سے ملاقات کرے گا۔ چند دن بعد وہ اپنے خاص ہُن دستوں کے ساتھ گال کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی بڑی فوج پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور مشرقی گال کو تباہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

اٹیلا کی پیش قدمی کی خبر نے ملکہ میریا، شاہ روم اور وزیر آکٹس تینوں کے ہوش اُڑا دیے تھے۔ مگر آئی ٹیس پریشان نہیں تھا۔ اس نے ان تینوں کو تسلی دی۔ ''بے شک روم زوال پذیر ہے لیکن ابھی اتنا کمزور بھی نہیں ہوا ہے کہ خانہ بدوشوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔''

''خانہ بدوش۔'' ویلینٹائین نے تقریباً رو دینے والے انداز میں کہا۔ ''اس کے ساتھ کم سے کم چار لاکھ کی فوج ہے اور جنگ کی اطلاع پا کر ہمارے دشمن قبائل بھی اس کے ساتھ مل سکتے ہیں۔''

''جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' آئی ٹیس نے سکون سے جواب دیا۔ ''لیکن جنگ میں فیصلہ تعداد نہیں بلکہ حوصلہ اور حکمت عملی کرتی ہے۔''

''آئی ٹیس تم فوراً فوج لے کر روانہ ہو جاؤ۔'' شاہ ویلینٹائین نے فیصلہ صادر کیا۔ ''مجھے امید ہے تم فتح کی خبر لاؤ گے۔''

آئی ٹیس چند دن پہلے اپنی جاگیر کی طرف جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ تمام رومن فوجوں کا کمانڈر ان چیف تھا لیکن ابھی تک وہ اپنی جاگیر اور اس پر موجود رہنے والی ذاتی فوج بحال نہیں کر سکا تھا۔ اسے فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ کسی کڑے وقت میں یہی ذاتی فوج اس کے کام آ سکتی تھی۔ جنگ ایک بار پھر اس کے عزائم کے آڑے آئی تھی اس کا سامان تک تیار ہو گیا تھا۔ وہ واپس گھر آیا تو اس کی بیٹی لیوٹو ویلیا بہت خوش تھی۔ اس نے آئی ٹیس سے کہا۔ ''پاپا میں کسی کو پسند کرنے لگی ہوں۔''

''مجھے خوشی ہے تم کسی کو پسند کرنے لگی ہو لیکن ابھی ہم گال جا رہے ہیں۔''

''کیوں....؟'' لیوٹو ویلیا سراپا احتجاج بن گئی تھی۔

''کیونکہ اٹیلا وہاں پیش قدمی کرنے والا ہے۔''

لیوٹو ویلیا یہ سن کر سنجیدہ ہو گئی اس نے کہا۔ ''تب مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہوگا۔''

آئی ٹیس نے غور سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ''ہاں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

آئی ٹیس نے اپنی آمد سے پہلے گال میں موجود فوجی دستوں کو حکم دیا کہ وہ قلعوں کو مستحکم کر لیں اور رسد جمع کر لیں تاکہ انہیں طویل محاصرے کی صورت میں مشکل نہ ہو۔ رومنوں کی اصل فوج گال میں موجود تھی آئی ٹیس اپنے ساتھ صرف مخصوص جنگجو دستے لے کر گیا تھا۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ اٹیلا نے کئی رومی قلعوں کو روند ڈالا ہے اور اب گال کے وسطی حصے کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ آئی ٹیس نے رومی کمانڈروں کو حکم بھیجا کہ اٹیلا کے سامنے مزاحمت کرنے کے بجائے اسے راستہ دیتے رہیں اور عقب میں اس کی رسد کی لائن کو کاٹتے رہیں۔ آئی ٹیس کا مقصد یہی تھا کہ فیصلہ کن جنگ سے پہلے اٹیلا اپنے مرکز سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جائے۔ آئی ٹیس نے شمال کی طرف جانے کے بجائے مغرب کی طرف سے چکر کاٹا اور براہِ راست گال کے صوبے میں داخل ہو گیا۔ موجودہ فرانس اور اسپین کے مقام پر اس کی فوجیں کہیں جمع ہو رہی تھیں۔

آئی ٹیس وہاں پہنچا تو جرمن شاہ تھیوڈورک وہاں پہلے

سے موجود تھا۔ اس جنگ میں وہ رومنوں کا اتحادی تھا۔ مگر یہ اتحاد اس کی مجبوری تھا اگر پوپ لیو اول اسے خود حکم نہ دیتا تو کبھی رومنوں کا اتحادی نہ بنتا۔ پہلی ملاقات میں اس نے آئی ٹیس پر واضح کر دیا کہ یہ اتحاد صرف اس جنگ کی حد تک ہے اور اس کے بعد اس کا روم سے دشمنی کا رشتہ ہوگا۔ پھر اس نے آئی ٹیس سے ایک غیر متوقع مطالبہ کر دیا۔ ''مجھے لیوٹو ویلیا چاہیے جو میری بیٹی ہے اور تم اسے میرے پاس سے لے گئے تھے۔''

''وہ روم میں ایک اچھی زندگی گزار رہی ہے۔'' آئی ٹیس نے کہا۔

''روم میں اچھی زندگی گزارنے کے لیے روم کا باقی رہنا ضروری ہے۔'' تھیوڈورک نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھے میری بیٹی واپس نہ ملی تو روم باقی نہیں رہے گا۔''

آئی ٹیس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تھیوڈورک اس موقع پر یہ مسئلہ اُٹھائے گا اس کا خیال تھا کہ وہ شاید اپنی بیٹی کو بھول چکا ہے۔ لیکن تھیوڈورک بھولا نہیں تھا۔ لیوٹو ویلیا اسی عورت کی بیٹی تھی جس سے آئی ٹیس محبت کرتا تھا لیکن اسے تھیوڈورک نے ہتھیا لیا تھا اور جواب میں آئی ٹیس اس کی بیٹی لے اُڑا تھا۔ آج تھیوڈورک کے پاس موقع آیا تھا کہ وہ حساب برابر کر سکے۔ آئی ٹیس کی زندگی میں اس سے مشکل وقت پہلے نہیں آیا تھا وہ سچ مچ لیوٹو ویلیا سے بیٹی کی طرح محبت کرتا تھا۔ مگر اب اسے بیٹی یا روم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ آئی ٹیس نے بیٹی کی محبت کا گلا گھونٹتے ہوئے روم کا انتخاب کیا اور تھیوڈورک سے کہا۔

''ٹھیک ہے اگر تم لیوٹو ویلیا کے بدلے اس جنگ میں ہمارا ساتھ دو گے تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔''

کچھ دیر بعد تھیوڈورک اپنے سپاہیوں کے ہمراہ آئی ٹیس کے خیمے میں پہنچا اور سپاہی اس کے سامنے لیوٹو ویلیا کو بازوؤں سے جکڑ کر لے گئے اور وہ ''پاپا.... پاپا'' چلاتی رہ گئی۔ تھیوڈورک نے فاتحانہ نظروں سے آئی ٹیس کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔ آئی ٹیس دانت پیستا رہ گیا۔

اٹیلا میدانِ جنگ میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس تہ در تہ پہاڑی علاقے میں رومنوں کی فوج پہاڑوں پر موجود ہے اور تھیوڈورک نے اپنی فوج جنگلوں میں رکھی تھی۔ جرمن جنگ کے دوران جنگل میں رہنے کے عادی تھے کیونکہ وہ کھلے مقام کے بجائے جنگلوں میں لڑنے کے زیادہ ماہر تھے اس لیے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ دشمن کو کھینچ کر جنگل میں لے آئیں۔ وہ ہنوں کی طرح بے قاعدہ جنگ کے عادی تھے۔ اور کسی بے ترتیب ہجوم کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔ ان کے ہتھیار بھی مخصوص نہیں تھے۔ وہ تیر کمان، تلوار، نیزے اور فولادی زنجیروں سے لے کر کلہاڑی تک ہر ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ دست بہ دست جنگ میں ان کا پسندیدہ ہتھیار چاقو تھا تقریباً یہی سب ہتھیار ہن بھی استعمال کرتے تھے لیکن ہن ذاتی حفاظت کے لیے کوئی چیز نہیں پہنتے تھے جیسے خُود یا زرہ بکتر وغیرہ۔

آئی ٹیس اس جنگ کا کمانڈر اِن چیف تھا اس لیے منصوبہ اس کا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے ہنوں کو حملہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس نے اپنے کیمپ کے آس پاس پہاڑیوں کے دامن میں چھپی خندقیں کھدوا دی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ ہن گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑنے کے ماہر ہوتے ہیں لیکن انہیں پیدل جنگ میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس نے اس تہ در تہ پہاڑی علاقے کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کہ یہاں ہن اور ان کے اتحادیوں کے بڑے بے قاعدہ ہجوم حرکت کرنے میں دشواری محسوس کرتے۔ اٹیلا نے بھی یہ حکمت عملی بھانپ لی اور اس نے اپنی ساری فوج کو ایک جگہ جمع کرنے کے بجائے پورے علاقے میں پھیلا دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ پہاڑوں پر موجود رومن فوجوں کو نیچے نہ آنے دیں اور پہلے جرمنوں سے نمٹ لیا جائے۔ جرمنوں سے لڑنے کے لیے اس نے اپنے جرمن حلیفوں کو سامنے رکھا تھا۔ وہ جنگل کے اندر پیش قدمی کر کے جرمنوں کا صفایا کرتے اور اگر جرمن جنگلوں سے باہر آتے تو ان کے استقبال کے لیے ہن دستے موجود ہوتے۔

جنگ کا آغاز اٹیلا نے اپنے خاص دستے کے ہمراہ کیا اور وہ اس پہاڑی کی طرف بڑھا جس پر آئی ٹیس کا کیمپ تھا۔ لیکن ان کے گھوڑے چھپی خندقوں میں پھنس کر گرنے لگے۔ اٹیلا اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اُتر آئے اور پیدل ہی پہاڑیوں پر چڑھنے لگے لیکن یہ کام آسان نہیں تھا ان کی جو توانائی جنگ میں استعمال ہونا تھی وہ پہاڑیوں پر چڑھتے ہوئے ضائع ہو گئی اور رومن دستوں نے نہایت آرام سے انہیں واپس دھکیل دیا۔ اس جھڑپ میں رومنوں کا پلہ بھاری رہا تھا اور اٹیلا اپنے بے شمار فوجیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسے پسپا ہونا پڑا اور نیچے آتے ہی تھیوڈورک کے دستے اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس جنگ میں بھی اٹیلا کی فوجوں کو زبردست نقصان اُٹھانا پڑا تھا لیکن اس کے پاس ابھی فوج کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔

اٹیلا کی فوج عارضی طور پر پسپا ہوئی اور اس کے اشارے ... پر اس کے جرمن اور باربیرین حلیف حرکت میں آگئے۔ انہوں نے ایک طرف تو رومنوں کو نیچے آنے سے ... دیا اور دوسرے طرف وہ جنگلوں میں چھپے تھیوڈورک ... دستوں کا صفایا کرنے لگے۔ اس دوران .... اٹیلا اور اس ... ہن دستے آرام کر رہے تھے۔ آئی ٹیس پہاڑی کے اوپر ... دیکھ رہا تھا اور اس کے کمانڈر بے چین تھے کہ وہ کب انہیں حرکت میں آنے کا حکم دیتا ہے۔ مگر آئی ٹیس خاموش تھا۔ دوپہر تک اٹیلا کی فوج تھیوڈورک کی بیشتر فوج کا صفایا کر چکی تھی اور اب شکست کے آثار نمایاں لگ رہے تھے۔ رومن ... ہوں کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ اٹیلا کی عظیم فوج کا مقابلہ کر سکتی اور اب بہ ظاہر اس جنگ میں رومنوں کی شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ جس وقت اٹیلا اور اس کے ساتھی پسپا ہو رہے تھے آئی ٹیس نے ان پر حملہ کرنے کا سنہری موقع گنوا دیا تھا۔ اب ہن سنبھل گئے تھے اور ان پر حملہ کرنا خودکشی کے مترادف تھا لیکن آئی ٹیس نے اس وقت حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا اور اس نے اپنے ایک کمانڈر کو حکم دیا۔

''جنگ کا جو بھی انجام ہو لیکن تھیوڈورک کو میدان جنگ سے زندہ واپس نہیں جانا چاہیے۔''

اس کے ساتھ ہی رومن فوج پہاڑیوں سے اُترنے لگی اور ہنوں کے ساتھ جنگ مغلوبہ لڑتی جرمن فوج کی مدد کو پہنچ گئی۔ اگرچہ اب خاصی دیر ہو چکی تھی۔ رومی کمانڈر چھپتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں سے وہ تھیوڈورک کو نشانہ بنا سکتا تھا اور اس نے عقب سے تیر مار کر جرمن شاہ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ جرمن سمجھے کہ ان کے شاہ کو کسی ہن تیر انداز نے نشانہ بنایا ہے کیونکہ وہ تیر اندازی میں ماہر سمجھے جاتے تھے اس پر وہ غضب ناک ہو کر اٹیلا کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ اٹیلا کے لیے پسپا ہوتے جرمنوں کا یہ حملہ نہایت سخت تھا۔ اس کے بے شمار سپاہی اس حملے میں مارے گئے۔ اوپر سے رومن فوجی دستے بھی آ گئے اور وہ جنگ جس کے بارے اٹیلا کیا اس کے دشمنوں کو بھی یقین تھا کہ وہ جیت چکا ہے شام ہوتے ہوتے وہ دوبارہ برابری کی سطح پر پہنچ گئی تھی۔ جب رات کی تاریکی میں دونوں فوجیں اپنے اپنے کیمپوں کی طرف واپس لوٹیں تو جتنی تعداد میں رومن اور ان کے حلیفوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں بکھری پڑی تھیں اس سے زیادہ تعداد میں اٹیلا اور اس کے حلیف اپنے سپاہیوں سے محروم ہو چکے تھے۔

آئی ٹیس کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا اس نے تھیوڈورک کو مروایا اور اس قدم کا نتیجہ بھی اس کے حق میں ... تھا۔ تھیوڈورک کا بیٹا مائی سین اس کا جانشین تھا۔ وہ اٹیلا سے اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن جب دوسری صبح طلوع ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ اٹیلا کی فوج اپنا سامان باندھ کر وہاں سے رخصت ہو رہی تھی۔ آئی ٹیس یا اور کوئی نہیں جان سکا کہ اٹیلا نے اچانک جنگ سے ہاتھ کیوں اُٹھا لیا تھا؟ مورخین کا خیال ہے کہ اس جنگ کے دوران اٹیلا زخمی ہو گیا تھا اور اس وجہ سے فوج کی قیادت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اس لیے اس نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ ممکن ہے اٹیلا کے خیال میں اس کی قیادت کے بغیر اس کی فوج پورے دل سے نہیں لڑتی اور ممکن ہے وہ ایک اچھی پوزیشن سے جنگ ہار جاتا اس لیے اس نے باعزت پسپائی بہتر سمجھی۔

دوسری طرف آئی ٹیس نے یہ کیا کہ پسپا ہوتے اٹیلا اور اس کی فوج کو جانے کا راستہ دے دیا۔ اسے روکنے یا اس پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹیلا بغیر کسی مزید نقصان کے واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ آئی ٹیس کے لیے یہ بہترین موقع تھا اس نے تھیوڈورک کا خاتمہ کر کے لیوٹو ویلیا کو واپس حاصل کر لیا تھا۔ اس نے گال کے سرحدی علاقوں میں برباد ہونے والی چوکیوں کو ازسرِنو بحال کیا اور وہاں تازہ دم رومن دستے تعینات کیے۔ جو گاؤں اُجڑ گئے تھے انہیں بہ طور جاگیر رومن سرداروں کے حوالے کر دیا تا کہ وہ انہیں آباد کریں اور یہاں سے روم کو اناج کے ساتھ خراج بھی حاصل ہو سکے۔

مگر جب آئی ٹیس اس فتح کے ساتھ واپس روم آیا تو خلافِ توقع اس کا استقبال الزامات کے ساتھ کیا گیا۔ عوام میں وہ ہیرو تھا جس نے اٹیلا جیسے خطرے کا منہ موڑ دیا تھا لیکن آئی ٹیس سے خوف زدہ اقتدار کی بیگمات اسے ہیرو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سب سے پہلے اس پر الزام آیا کہ اس نے جنگ کے دوران تھیوڈورک کے دستوں کی مدد نہ کر کے فتح کا موقع گنوا دیا۔ اس الزام میں کسی حد تک حقیقت تھی۔ دوسرا الزام یہ تھا کہ جب اٹیلا کسی وجہ سے پسپا ہو رہا تھا تو آئی ٹیس نے اسے بغیر کسی مزاحمت کے جانے دیا۔ ملکہ میریا نے اجلاس کے دوران کھل کر کہا۔

''تم نے روم کے سب سے بڑے دشمن کو جانے کا موقع دیا۔ تا کہ تم اپنی اہمیت برقرار رکھو۔''

''یہ الزام ہے۔'' آئی ٹیس نے سکون سے کہا۔ ''اگر میں اٹیلا کو چھیڑتا تو ممکن ہے وہ پلٹ کر سخت حملہ کرتا۔ اس شکست کے باوجود اس کے پاس فوج کی تعداد ہم سے کہیں زیادہ تھی۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ اسے جانے دوں اور اپنے علاقوں میں اپنی پوزیشن بہتر بناؤں۔''

''اس سانپ کو نکل جانے کا موقع ملا ہے' اب ...

دوبارہ پلٹ کر حملہ کرے گا۔''

''جب وہ حملہ کرے گا تو ہم اس کے لیے تیار ہوں گے۔ مشرقی سلطنت سے بہت بڑا خزانہ جلد یہاں پہنچ جائے گا اور اس کی مدد سے ہم نئی فوج تیار کر سکیں گے۔''

''جب تک تمہاری نئی فوج تیار ہوگی اٹیلا کی فوج روم تک پہنچ جائے گی۔'' آکٹس نے حقارت سے کہا۔

آئی ٹیس نے ان تینوں کو دیکھا اور بولا۔''میں نہیں جانتا کہ تم تینوں کے دل میں کیا ہے لیکن میں روم کا خادم ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں اٹیلا یہاں نہیں پہنچ سکتا۔''

آئی ٹیس بے خبر تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں روم میں کیا تبدیلی آئی تھی۔ ملکہ میریا نے کوشش کر کے ہنوریا کو واپس بلا لیا تھا لیکن ویلینٹائنین نے اسے معافی دینے سے انکار کرتے ہوئے نظر بند کرنے کا حکم دیا اس پر ملکہ میریا اور شاہ کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور تب ویلینٹائنین نے ماں سے کہا کہ اس نے اسے قتل کرانے کی کوشش کی اور اس کا نیکلس اسے دکھایا۔ ملکہ میریا نے بیٹے کو بتایا کہ یہ نیکلس اس سے آئی ٹیس نے مانگا تھا اور پھر اسے واپس نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف ہنوریا نے بتایا کہ آئی ٹیس چھپ کر اٹیلا کے پاس گیا تھا اور کسی کو نہیں معلوم کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا؟ آئی ٹیس کے خلاف شبہات پنپ رہے تھے اور اس کا خادمِ روم ہونے کا تاثر دھندلا رہا تھا۔

☆☆☆

اٹیلا واپس دارالحکومت پہنچا۔ ہنوں کے لیے پسپائی کوئی انوکھی چیز نہیں تھی وہ اسے جنگ کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک زندہ رہنا زیادہ اہم تھا کیونکہ زندہ انسان ہی کچھ کر سکتا ہے۔ ان کا طریقہ جنگ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ کبھی وہ اچھا خاصا لڑتے لڑتے بھاگ کھڑے ہوتے اور جب دشمن ان کا پیچھا کرتا تو وہ اسے گھیرے میں لے کر اچانک ہی پلٹ کر اسے تلوار کی دھار پر رکھ لیتے تھے۔ اس لیے ہنوں نے اس پسپائی کو سرے سے شکست تسلیم نہیں کیا۔ اٹیلا اگر جنگ میں زخمی ہوا بھی تھا تو اس کے زخم راستے میں بھر گئے تھے اور اب وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا شاہی محل ایک عمارت پر مشتمل نہیں تھا بلکہ متعدد مختلف کاموں کے لیے مخصوص عمارتوں پر مشتمل تھا۔ ان دنوں وہ اپنے لیے ایک نئی خواب گاہ بنوا رہا تھا۔ اس کی بیویوں کے لیے ایک بڑی محل نما عمارت مخصوص تھی اور اولڈوکا وہیں موجود تھی۔ ایک صبح اٹیلا چہل قدمی کے لیے اپنے محل کے پاس جنگل کی طرف گیا اور اس نے اولڈوکا کو وہیں طلب کر لیا۔

اولڈوکا کو لانے والے اسے وہاں پہنچا کر چلے گئے اور اولڈوکا نے پہلی بار اس باجبروت بادشاہ کو سامنے سے دیکھا جس کی آنکھوں میں بڑے بڑے سردار جھانکتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اولڈوکا بھی گھبرا رہی تھی اسے ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس کا پول تو نہیں کھل گیا.... اور اس ویرانے میں اٹیلا اس کو فردِ جرم سنا کر اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اُتار دے گا لیکن اٹیلا کے تاثرات نرم تھے اس نے نرم ہی لہجے میں کہا۔''تیرا نام اولڈوکا ہے؟''

''جی شاہِ اعظم!''

''تیرا تعلق ہنگری کے ایک گاؤں سے ہے جسے میری فوجوں نے تباہ کر دیا تھا اور سب کو مار ڈالا تھا۔''

''جی شاہِ اعظم لیکن یہ پُرانی بات ہے۔'' اولڈوکا سہم کر بولی۔''مجھے تو اب یاد بھی نہیں ہے کہ وہاں کیا ہوا تھا؟''

''لیکن مجھے افسوس ہے۔'' اٹیلا نے کہا۔''تمہیں اندازہ ہے میں نے اپنے محل میں کیوں بلایا تھا؟''

''شاید.... میں شاہِ اعظم کو پسند آ گئی ہوں۔''

اٹیلا مسکرانے لگا۔''یہ درست ہے کیا تم میری ملکہ بننا پسند کرو گی؟''

اولڈوکا دنگ رہ گئی تھی وہ سزا کی منتظر تھی اور اٹیلا اسے اتنی بڑی پیش کش کر رہا تھا۔ اٹیلا کی بیویاں تو کئی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو اس کی بیوی بننے کا اعزاز حاصل نہیں تھا۔''شاہِ اعظم مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا۔''

''ابھی نہیں آ رہا ہے لیکن جلد آ جائے گا۔'' اٹیلا نے کہا۔

اس جنگ سے واپسی پر جسے مورخین چالوس کی جنگ کہتے ہیں اٹیلا ایک نئے جذبے کے ساتھ فوجی تیاریوں میں لگ گیا تھا اور ایسا لگ رہا جیسے اس بار وہ براہِ راست روم کی طرف پیش قدمی کرے گا۔ چالوس کی جنگ میں اسے بہت بڑا جانی نقصان ہوا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کے ایک لاکھ سے زیادہ جنگجو اس جنگ میں ہلاک ہوئے تھے بعد میں جن مورخین نے اس علاقے کو دیکھا جہاں جنگ ہوئی تھی تو وہاں میلوں تک زمین سے انسانی ہڈیاں جھانک رہی تھیں۔ مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ اس خونریز جنگ نے جو دو قوموں کے درمیان لڑی گئی تھی، اس نے یورپ کی سیاست کا رُخ بدل دیا اور رومن سلطنت کی قسمت پر مہر ثبت کر دی۔

مگر مورخین بھول جاتے ہیں کہ ابھی اٹیلا زندہ تھا اور وہ پہلے سے زیادہ تیاریوں اور فوج کے ساتھ روم پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا اس لیے چالوس کی جنگ خونریز تو بہت تھی لیکن

اس نے کسی فریق کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا تھا۔ اٹیلا کو اس جنگ میں زخم لگے تھے جن کی وجہ سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوا لیکن اس سے اس کے عزائم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس کے جوش و جذبے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور یہ اس حد تک زیادہ تھا کہ اس نے اولڈوکا کو پرپوز کرنے کے باوجود اس سے شادی اپنی اگلی فوجی مہم کے بعد تک کے لیے ملتوی کر دی تھی۔ اٹیلا نے اپنے تمام حلیفوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی تمام فوجیں لے کر اس کے پاس آ جائیں۔ جلد ہی چاروں طرف سے فوجی دستے دارالحکومت پہنچنے لگے۔

تیاری مکمل کرتے ہی اٹیلا شمالی اٹلی کی طرف بڑھا۔ ہنگری کے میدانوں کے سامنے کوہِ ایلپس کا پہاڑی سلسلہ تھا، یہ سلسلہ کئی ملکوں کے درمیان حائل تھا۔ لیکن اٹیلا اس کی بلندیوں سے کترا کر اس کی وادیوں سے گزرا اور اٹلی کے اوپر ایڈریاٹک کے دہانے پر پہنچ گیا۔ 452 عیسوی میں اٹیلا نے روم کے خلاف دوسری مہم شروع کی اور اس کا پہلا نشانہ شمالی اٹلی میں روم کا اہم شہر آکیولیا بنا۔ یہ بہت بڑی فوجی چھاؤنی بھی تھا اور اٹیلا نے اسے اس طرح برباد کیا کہ یہ زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ اس کے تمام ہی باشندوں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا۔ صرف آکیولیا ہی نہیں بلکہ راستے میں آنے والے تمام ہی گاؤں دیہات قصبے اٹیلا کی فوجوں کا نشانہ بنے اور ان میں بسنے والے کسی ایک انسان کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا ہاں جو فرار ہونے میں کامیاب رہے وہی بچے تھے۔ دوسرے بڑے شہر جو نشانہ بنے ان میں وینس (یہ وہ وینس نہیں ہے جو بعد میں سمندر کے کنارے آباد ہوا اور آج بھی آباد ہے بلکہ یہ شمالی اٹلی کا کوئی چھوٹا شہر تھا) میلان، ویرونا اور پاڈوا نامی شہر بھی برباد ہوئے اور ان کی ساری آبادی قتل کر دی گئی۔ اٹیلا کی سفاکی اس مہم میں کہیں زیادہ سامنے آئی تھی ایسا لگ رہا تھا وہ اٹلی کے خطے میں بسنے والے کسی انسان کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

رومی افواج کسی بھی مقام پر اٹیلا کا مقابلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اب اٹیلا کو روم تک جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا کہ اچانک ہی اٹیلا نے پیش قدمی روک دی اور پھر وہ واپس ہنگری کے میدانوں کی طرف چلا گیا۔ مورخین آج بھی حیران ہیں کہ بغیر کسی ٹھوس وجہ کے اٹیلا نے اپنی فاتحانہ یلغار کیوں روک دی تھی؟ وہ واپس کیوں چلا گیا؟ آج ہمارے پاس اس بارے میں صرف کہانیاں ہیں۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اٹیلا شدید بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ لیکن یہ بات ہضم نہیں ہوتی.... کیونکہ کوئی فاتح کسی بیماری کی وجہ سے اپنی مہم ترک کر کے واپس نہیں جاتا.... اگر وہ بیمار تھا تو رک کر آرام کر سکتا تھا اور علاج کرا کے صحت یاب ہو سکتا تھا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ بیمار تھا تب بھی یہ بیماری شدید نوعیت کی نہیں تھی کیونکہ وہ واپس دارالحکومت پہنچا تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور آتے ہی اس نے اولڈوکا سے شادی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس لیے بیماری والی کہانی درست نہیں لگتی۔

دوسری کہانی یہ ہے کہ اس مہم کے دوران اٹیلا سے لڑتے ہوئے وہ تاریخی تلوار ٹوٹ گئی جس کے بل بوتے پر اس نے ہنوں کا بادشاہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور اس تلوار کو وہ اپنی بادشاہت کی علامت سمجھتا تھا اور اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ جب تک یہ تلوار اس کے پاس ہے دنیا کی کوئی طاقت اسے شکست نہیں دے سکتی ہے اس تلوار کے ٹوٹنے سے اٹیلا کے حوصلے پر بہت بُرا اثر پڑا تھا اور اس نے روم کی مہم ترک کرتے ہوئے فوری واپسی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے سپہ سالار ایڈیکس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اٹیلا اب کسی صورت لڑنے کو تیار نہیں تھا۔ مگر سنجیدہ مورخین میں سے کوئی بھی اس بات کی تصدیق نہیں کرتا۔

ایک تیسری کہانی یہ ہے شمالی اٹلی میں پوپ لیو اوّل نے اٹیلا سے ملاقات کی۔ پوپ کی ملاقات کا مقصد اٹیلا کو روم کی طرف پیش قدمی سے روکنا تھا۔ اس نے اٹیلا سے کہا کہ اگر اس نے اپنی مہم ترک نہ کی تو جلد وہ خدا کے عذاب کا شکار ہو جائے گا۔ اس کہانی میں مزید رنگ آمیزی اس طرح کی گئی کہ اس ملاقات کے فوراً بعد سینٹ پال اور سینٹ پیٹر اٹیلا کو خواب میں آئے اور اسے دھمکی دی اگر اس نے پوپ کی درخواست نہ مانی تو اسے بُرے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے اٹیلا نے طرف زدہ کر پوپ کی بات مان لی اور اپنی فوج لے کر واپس چلا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پوپ لیو اوّل نے اٹیلا سے ملاقات کی تھی لیکن اس کا مقصد یقیناً روم سے زیادہ ویٹی کن کا تحفظ ہوگا جو اٹلی کی حد میں واقع ہے۔

مگر ان کہانیوں سے قطع نظر مورخین کو اٹیلا کی واپسی میں کئی دوسرے عوامل نظر آتے ہیں، ایک تو اٹلی میں اٹیلا کی فوجوں کو رسد کی کمی کا سامنا تھا۔ شمالی اٹلی نہایت دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہے جہاں بہت بڑی فوج کو لازمی بہت زیادہ رسد کے ساتھ سفر کرنا نہایت دشوار ہوگا۔ دوسرے ان ہی دنوں اٹلی میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور یہ وبا اٹیلا کی فوج میں بھی آ گئی تھی۔ لیکن واپسی میں سب سے اہم وجہ مشرقی سلطنت کے حکمران مارسین کی طرف سے ایک فوجی مہم بھیجنا

تھی جس نے دریائے ڈینوب پار کیا اور براہِ راست اٹیلا کی سرزمین پر حملہ کیا تھا۔ اٹیلا اپنی ساری فوج ساتھ لے آیا تھا اور پیچھے ملک کی حفاظت کے لیے کوئی فوج باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے اٹیلا نے فوری واپسی کا فیصلہ کیا کیونکہ مارسین کا حملہ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس بارے میں اس کے جاسوس مکمل معلومات نہیں رکھتے تھے۔

اٹیلا یقیناً یہ سوچ کر واپس آیا تھا کہ وہ جلد واپس جائے گا اور اپنی اُدھوری مہم مکمل کرے گا۔ اس نے ڈینوب کے کھلے میدانوں میں دُر آنے والی مارسین کی فوج کو مار بھگانے کے لیے اپنی فوج روانہ کی اور خود دارالحکومت آ گیا۔ یہاں اس نے اولڈوکا سے شادی کا اعلان کیا اور پھر ایک شاندار تقریب میں نہایت دھوم دھام کے ساتھ اٹیلا اور اولڈوکا رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ شب سہاگ منانے سے پہلے اٹیلا اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ہمراہ رات دیر گئے ناچتا اور شراب پیتا رہا۔ اس نے شراب اتنی زیادہ پی تھی کہ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ اولڈوکا کے شانوں کا سہارا لے کر اپنی نئی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ یہ چاروں طرف سے الگ ایک گول عمارت تھی۔

اگلی صبح جب اٹیلا دیر تک اندر سے برآمد نہیں ہوا تو اینکس نے خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی اور جواب نہ ملنے پر وہ اندر داخل ہو گیا۔ اٹیلا کی طرف سے اسے اجازت تھی کہ وہ کسی بھی وقت اس کے پاس آ سکتا تھا۔ اسی اجازت کے سہارے اینکس اندر داخل ہوا اور اس نے اٹیلا کو بستر پر اس حالت میں مردہ پایا کہ اس کی ناک سے کچھ خون نکلا ہوا تھا۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ کسرتِ شراب نوشی سے اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی تھی اور وہ مر گیا۔ مگر بستر پر ایک طرف بیٹھی اولڈوکا نے اعترافِ جرم کر لیا کہ اس نے اٹیلا کو زہر دے کر ہلاک کیا ہے کیونکہ وہ اس کے قبیلے اور خاندان کی تباہی کا ذمے دار تھا۔ اینکس نے اولڈوکا کو اسی وقت ہلاک کر دیا تھا۔

لیکن کیا واقعی ایسا ہی ہوا تھا؟ یہ حقیقت تاریخ کے پُراسرار دھندلکے میں غائب ہے کہ اٹیلا کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی۔ بادشاہوں کی پُراسرار اموات کوئی انوکھی بات نہیں ہے بلکہ اکثر اقتدار کے نشے میں لوگوں سے کھلونوں کی طرح کھیلنے والے ان افراد کا انجام دردناک ہوا ہے اور وہ عموماً اس وقت فنا سے دوچار ہوئے جب ان کے دماغوں میں مستقبل کے حوالے سے بڑے بڑے منصوبے پل رہے تھے۔ اٹیلا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ صرف چالیس سال کی عمر میں وہ دنیا سے اچانک رخصت ہوا اور اپنے پیچھے بھیڑوں کی طرح لاوارث ہن قبائل چھوڑ گیا جنہیں پہلی بار ایک بہترین رہنما ملا تھا۔ اس کے مرتے ہی ہن چند دہائیوں میں یورپ کے اُفق سے یوں غائب ہوئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی یورپ میں ان کا مقابلہ کرنے والی کوئی قوت باقی نہیں تھی۔ اٹیلوس کو اٹیلا کا جانشین بنایا گیا تھا لیکن اس سے بھیڑیوں کا یہ گلہ سنبھالا نہ گیا۔

اٹیلا کی موت ایسی بات نہیں تھی جو چھپ جاتی۔ ایک ہفتے بعد ایک قاصد مارسین کے دربار میں داخل ہوا اور اس نے ایک سر بہ مہر لفافہ شہنشاہ کو پیش کیا اور اس نے بے تابی سے اسے چاک کیا جیسے ہی اس کی نظر خط کے متن پر گئی اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ جب آئی ٹیس کو یہ اطلاع ملی تو اس نے قہقہہ نہیں لگایا تھا صرف افسردگی سے سر ہلایا تھا۔ اٹیلا اس کا نہیں روم کا دشمن تھا۔ بلکہ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اٹیلا اس کا محسن تھا۔ اسی کی وجہ سے آئی ٹیس کو قید خانے سے نکال کر رومی افواج کا کمانڈر اِن چیف بنایا گیا تھا اور اب اٹیلا باقی نہیں رہا تھا تو اَب اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ ابھی آئی ٹیس اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ روم سے اس کا بلاوا آ گیا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے جانا تھا۔

دربار میں شاہ ویلینٹائنین، ملکہ میریا اور آکٹش آئی ٹیس کے منتظر تھے۔ آئی ٹیس نے اٹیلا کی موت کی اطلاع دی لیکن یہ روم تک پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اقتدار کی تکون پر قابض ان ہوس پرست لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اٹیلا کی موت آئی ٹیس کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے اور اس نے روم کو وحشی ہنوں سے بچا لیا ہے۔ اس کی خدمت کا صلہ یوں دیا گیا کہ شاہ ویلینٹائنین نے اپنے ہاتھ سے آئی ٹیس کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا کیونکہ اب اسے آئی ٹیس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس واقعہ پر شاہ کے ایک مشیر نے اس سے کہا۔

''آپ نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کو کاٹ دیا ہے۔''

مشیر غالباً بھول گیا تھا کہ جب آدمی کے دماغ میں حکمرانی کا خناس سوار ہوتا ہے تو صحیح اور غلط کی صرف ایک تشریح کرتا ہے جو وہ کہتا ہے اور کرتا ہے وہی صحیح ہے باقی سب غلط ہے۔ صرف دو سال بعد آئی ٹیس کے دو دوستوں نے شاہ ویلینٹائن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور اس کی دو دہائیوں کے بعد مغربی سلطنت روم کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

قاتل ہیرو

مختار آزاد

اس کی شہرت چہار سو پھیلی تھی، وہ ماہر علوم فلسفہ تھا۔ اس کی روداد زندگی پر شاعری کی گئی، ناول لکھے گئے اور ڈرامے پیش کیے گئے۔ یہ بھی ایک کمال تھا کہ اس کی زندگی پر کھیلے جانے والے ڈرامے کئی کئی سال چلتے تھے، اس پر لکھے گئے ناول کے بیس بیس ایڈیشن شائع ہوتے...... مگر پھر بھی اس پر قتل کا جرم تھوپ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ساتھ ہی منصف نے حکم صادر کر دیا کہ لاش کو پھندے سے نیچے نہیں اتارا جائے گا، گوشت گل سڑ کر خود ہی گریں گے، ہڈیاں کھل کھل کر زمین پر آئیں گی۔

بہیمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتاری جانے والی ایک اہم شخصیت کی روداد

برطانیہ کے عہدِ وکٹوریہ کے مشہور رومانی ادب میں ایک نام کا بہت چرچا رہا ہے۔ یہ چرچا اُس کی موت کے بعد بھی ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے تک بر زبانِ خاص و عام رہا۔ دنیا سے چلے جانے کے بعد اسے ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ شاعری، ادب اور مشہور ترین تھیٹر ڈرامے اُس کی یاد تازہ کرتے رہے۔ وہ دانشور اور اُستاد تھا مگر لوگوں میں اُس کی یاد، ادب اور ڈراموں میں اُس کا کردار زندہ رہنے کی وجہ اُس کی بدقسمتی تھی۔ موت کے بعد صدیوں تک انگلستان کے رومانی ادب اور پرفارمنگ آرٹ کے منظرنامے پر زندہ رہنے والا یہ دانشور اور ماہرِ علوم فلسفہ یوگن ایرم تھا۔

1829ء میں شاعر تھامس ہُڈ نے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم تھی 'یوگن ایرم کا خواب' یہ نظم بہت زیادہ مشہور ہوئی۔ اتنی مشہور کہ عرصے تک اس کے بول راہ چلتے لوگ گنگناتے رہے۔

جہاں آتشدان کے سامنے ڈرائنگ روم کی چھت تلے.....
لوگ اکٹھے بیٹھتے گفتگو کا رُخ.... اُس کی طرف مڑ جاتا تھا۔

موضوع ہوتا تھا 'یوگن ایرم کا خواب' مگر باتیں اس سے بھی آگے تک چلی جاتی تھیں۔ وہ باتیں جس میں عظیم برطانوی دانشور کے پُراسرار قتل کے پسِ پردہ حقائق جاننے کی جستجو نظر آتی تھی۔ مگر یہ جستجو آج تک صرف ایک جستجو ہی ہے۔

تھامس ہُڈ کی اس مشہور نظم پر ابھی وقت کی دھول کے چند ذرّے بھی جمنے نہ پائے تھے کہ 1831ء میں برطانوی کہانی کار بیل ورلیٹن کا ناول 'یوگن آرم' شائع ہوگیا۔ اس ناول نے اور بھی زیادہ دھوم مچائی۔ مختصر مدت میں صرف برطانیہ میں اس ناول کے بیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ اُس وقت یہ ناول ہاتھوں ہاتھ بک رہا تھا۔ اس ناول کے ذریعے یوگن کی شہرت برطانیہ سے نکل کر یورپ کے کچھ اور حصوں تک بھی پہنچ گئی۔ ناول کی اشاعت کے ایک دہائی بعد فرنچ اور جرمن میں اس کا ترجمہ ہوا اور بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اگلے چند سالوں میں اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کی گئی اور پھر لندن کے ہر بڑے تھیٹر میں یہ ڈراما کئی سالوں تک کامیابی سے چلتا رہا۔ یہ ڈراما اتنا طویل عرصے اُس تھیٹر میں چلا کہ بعض لوگ ازراہِ مذاق سرے تھیٹر کو 'ایرم تھیٹر' کہنے لگے تھے۔

1873ء میں یوگن ایرم ناول پر مبنی ڈراما چلتے ہوئے چالیس سال گزر چکے تھے لیکن اس کے باوجود یہ لندن کے باکس آفس پر سرِفہرست تھا۔ اس سال یہ ڈراما لندن کے لاسیم تھیٹر میں شروع ہوا۔ برطانیہ کے مشہور اداکار سر ہنری اِرونگ نے اس ڈرامے میں یوگن کا مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

جنوری 1902ء میں یوگن ایرم پر ایک اور نیا ڈراما لکھا گیا۔ اس ڈرامے کا نام تھا آخر کار After all یہ ڈراما لندن کے ہی ایوینیو تھیٹر میں پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے کا مرکزی کردار معروف اداکار مارٹن ہاروے تھا۔ اس ڈرامے میں بھی لوگوں کا جمِ غفیر ہوا... کرتا تھا اور یوگن ایرم پر مبنی دیگر ڈراموں کی طرح اس کے ٹکٹوں کی بھی مہینوں پہلے بکنگ ہو جاتی تھی۔

ابھی یہ ڈراما چل ہی رہا تھا کہ موسمِ گرما کے آخری دنوں میں لندن کی رائل اکیڈمی میں نہایت خوبصورتی سے بنائے گئے مصوری کے فن پاروں کی نمائش شروع ہوئی۔ یہ نمائش منتظمین کی توقع سے بڑھ کر کامیاب ہوئی۔ کئی ہفتوں تک بڑی تعداد میں شائقین ان فن پاروں کو دیکھنے کے لیے گیلری کا رخ کرتے رہے۔ یہ فن پارے غیر ملکی مصور ایرم گستاوڈور نے تخلیق کیے تھے۔ 1829ء میں تھامس ہُڈ نے یوگن ایرم پر جو مشہور نظم لکھی تھی، اس کا اضافت شدہ ایڈیشن 1872ء میں شائع ہوا تھا۔ مصور نے اضافت شدہ نظم کو موضوع بنا کر، ایرم کے کردار کو عکسی شکل میں اُجاگر کرنے کے لیے یہ فن پارے تخلیق کیے تھے۔

یوگن ایرم کی برطانیہ میں افسانوی شہرت کی یہ معمولی سی جھلک تھی لیکن اس سے ایک بات اچھی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اُس کی اہمیت، زندگی یا پھر جو کچھ اُس سے ہوا ہوا تھا، وہ انیسویں صدی سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک برطانوی ادب، ڈرامے اور عمومی زندگی کو افسانوی انداز میں اپنی طرف متوجہ کرتا رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یوگن ایرم ایک جیتا جاگتا کردار تھا یا کسی ادیب کا تخیل۔ اگر وہ ایک انسان تھا تو پھر وہ کون تھا اور اسے ایسے کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا کہ جن کی وجہ سے وہ برطانیہ کا افسانوی ہیرو بن گیا؟

وکٹوریہ عہد کی تاریخی دستاویزات میں لکھا ہے کہ "یوگن ایرم بے تکان لکھنے اور سوچنے والا دانشور تھا۔ وہ ایک اُستاد تھا۔ زبان پر اس کو بہت زیادہ عبور حاصل تھا۔ وہ مختلف زبانوں کے فلسفے کا ماہر تھا۔ الفاظ کا وسیع ذخیرہ اس کے دماغ میں پوشیدہ تھا، جس کا استعمال وہ اپنی تحریر میں بے دریغ کرتا تھا۔ وہ فلسفے کے اچھوتے خیالوں کو عالمانہ چابک دستی سے نت نئے معانی عطا کرتا تھا۔ اس کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ انہی شاگردوں میں لندن کے طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ایک مالدار شخص کی حسین وجمیل اور نازک اندام جواں سال بیٹی بھی شامل تھی۔ یوگن اس پر بُری طرح مرمٹا تھا۔"

جہاں یوگن کی یہ تعریفیں بیان کی گئی ہیں وہیں اٹھارویں صدی کی برطانوی دستاویزات میں یہ دردناک حقیقت بھی رقم ہے کہ اسے قتل کے جرم میں 6 اگست 1759ء کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ یوگن ایرم کو جس مقام پر پھانسی دی گئی تھی وہ جگہ آج برطانیہ کے علاقے یارک شائر میں واقع ریس کورس میدان ہے۔ پھانسی کے بعد مدتوں اس کی لاش ویران جنگل کے سرے پر لگے پھندے پر جھولتی رہی۔

☆☆☆

یوگن ایرم 2 اکتوبر 1704ء کو یارک شائر کے ایک نواحی گاؤں رامس گِل میں پیدا ہوا۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے عیسائی تھا۔ اس کا باپ پیٹر ایرم یارک شائر کا معروف باغبان ... شاعر تھا۔ یوگن جب چھ برس کا تھا تب اس کے ... والدین نے رامس گِل کو چھوڑ کر کچھ میل دور واقع نیو بے ہال میں سر ایڈورڈ بلیکٹ کے محل نما گھر میں سکونت اختیار کی تھی۔ یہاں سر ایڈورڈ کی زمینوں کو ہموار کر کے اس پر باغ لگانے کے لیے آیا تھا۔ وہ سارا دن زمینوں کو ہموار کرنے میں جُتا رہتا ... یوگن سر ایڈورڈ کے پاس بیٹھ کر علمِ نباتات پڑھا کرتا تھا۔ ... وہ علم نباتات کے بہت بڑے ماہر بھی تھے۔ اس کے ساتھ ہی ... ایڈورڈ اُسے لکھنا اور پڑھنا بھی سکھاتے جا رہے تھے۔

یوگن بچپن سے ہی بہت ذہین تھا اور جس طرح وہ الفاظ ... یادداشت میں ذخیرہ کر لیتا تھا، اس سے سر ایڈورڈ کو یقین تھا کہ اس چھوٹے بچے میں ذہانت اور یادداشت کا عنصر غیر معمولی ہے۔ سر ایڈورڈ کی زیرِ نگرانی یوگن نے بہت تھوڑے عرصے میں اچھی طرح لکھنے اور پڑھنے پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ سر ایڈورڈ خود بھی ادب دوست تھے۔ پڑھنے لکھنے سے انہیں بہت شغف تھا۔ ان کی وسیع وعریض لائبریری تھی۔ جیسے جیسے یوگن بڑا ہوتا گیا، اس کی دلچسپی لائبریری میں بڑھتی گئی۔ سر ایڈورڈ نے بھی اسے لائبریری سے استفادے کی کھلی اجازت دے رکھی تھی۔ بہت جلد اس نے بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ ادب، فلسفہ، معیشت، جغرافیہ، شاعری...... غرضیکہ جو کچھ اسے ملتا رہا، وہ پڑھتا رہا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ حیرت انگیز یادداشت کے باعث وہ جو کچھ ایک مرتبہ پڑھ لیتا، وہ اس کے دماغ کے اوراق پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا تھا۔

1718ء میں سر ایڈورڈ کی موت واقع ہو گئی۔ اُن کی موت تک وہ جوان ہو چکا تھا۔ اب تک پیٹر خاندان اسی محل کی ... میں مقیم تھا۔ سر ایڈورڈ کو بھی اس خاندان سے اُنسیت ... تھی۔ ویسے بھی وہ یوگن کی قابلیت کے معترف تھے۔ یہ بات اُن کا سارا خاندان جانتا تھا۔ سر ایڈورڈ کی موت کے بعد ہی ان کے ورثا نے اس خاندان کو اپنے پاس ہی رکھا لیکن یوگن کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے اسے لندن بھیج دیا۔ ویسے بھی یوگن اس خاندان کے لیے نہایت قابلِ بھروسا تھا۔ ورثا نے ... کہ لڑکا ذہین اور قابل ہے۔ اس لیے آگے بڑھنے کے لیے اسے لندن میں رہ کر اپنی شناخت بنانی چاہیے۔ لندن میں یوگن کو سر ایڈورڈ کی جائداد اور دیگر مالیاتی وسیاسی امور کی نگرانی کے لیے قائم دفتر میں کام کاج کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

لندن میں رہ کر جہاں ایک طرف وہ مرحوم سر ایڈورڈ کے ... کے انتظامی امور میں ہاتھ بٹاتا رہا، وہیں اس نے اپنی مزید ... تعلیم پر توجہ دی۔ اسے علمِ ریاضی کا بہت شوق تھا۔ اس نے ... کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ... تو اس میں بھی ...

مشاہیرِ عالم کی نظر میں اسلام
حضور پُرنورؐ کی شخصیت

ایڈمنڈ برک:

قانون محمدیؐ کا اطلاق تاجداروں پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح رعایا کے ایک معمولی فرد پر۔ اس کے دامن میں فقہ کا جو انتہائی حکیمانہ، عالمانہ اور روشن خیالی پر مبنی نظام موجود ہے، اس کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔

منٹگمری واٹ:

آپؐ کا اپنے عقائد کی خاطر ہر قسم کے ظلم وتشدد کا سامنا کرنے پر تیار رہنا، آپؐ پر ایمان لانے اور آپؐ کی قیادت قبول کرنے والوں کا اعلیٰ اخلاقی کردار اور حصول مقاصد میں آپؐ کی عظیم کامرانی، آپؐ کی دیانت وامانت کے بین ثبوت ہیں۔

برٹرینڈ رسل:

699ء سے 1000ء تک کے دور کے لیے ازمنہ مظلمہ کی اصطلاح کا استعمال مغربی یورپ پر ہمارے غیر ضروری فکری ارتکاز کا غماز ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان سے ہسپانیہ تک اسلام کی تابناک تہذیب فروغ پا رہی تھی۔ اس دور میں مسیحی دنیا کی محرومی سے تہذیب انسانی کی محرومی تعبیر کرنا درست نہیں، حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔

لی کونٹ ڈی بولین ولیئر:

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی شریعت کو اس طرح قائم کیا کہ وہ آپؐ کے ہم وطنوں کے جذبات سے ہم آہنگ، ان کی عقل وفہم کے لیے موزوں اور ملکی رسم ورواج کے مطابق ہو اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ بنی نوع انسان کے عام تصورات سے اتنی متناسب تھی کہ نصف سے زیادہ انسان اس دین میں شامل ہو گئے اور وہ بھی چالیس برس سے کم مدت میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عقیدے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس پر کان دھرا جاتا اور ذہن اسے قبول کر لیتا۔

انتخاب: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

اور یادداشت بھی بہت اچھی تھی۔ لہٰذا بہت تھوڑے عرصے میں اُس نے ریاضی کے مضمون میں اعلیٰ سند حاصل کرلی۔ اس کی یہ تعلیمی سند آگے چل کر اُس کے پیشے میں مددگار بننے والی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یونانی اور لاطینی زبان کی تعلیم بھی حاصل کرتا رہا اور بہت جلد اس نے ان دونوں زبانوں پر عبور حاصل کرلیا۔

لندن میں کئی سال گزارنے اور تعلیم مکمل کر لینے کے بعد اسے یہاں مزید رہنے کا کوئی جواز نظر نہیں آیا۔ دفتر کے انتظامی امور پر اگرچہ اب اس کی اچھی خاصی گرفت قائم ہو چکی تھی لیکن اس کے خیال میں یہ وہ کام تھا جو کوئی اور بھی کرسکتا تھا۔ خود اسے پڑھنے پڑھانے سے شغف تھا۔ اس لیے وہ لندن چھوڑ کر ریپن چلا آیا۔ لندن سے کافی دور واقع اس علاقے میں اب اس کا خاندان مقیم تھا۔ اس کا باپ پیٹر ایرم سر ایڈورڈ کی موت کے کچھ سال بعد یہاں چلا آیا تھا اور اب وہ سر جان اِنگل بے کی زمینوں کو ہموار کر کے باغ لگانے میں مصروف تھا۔ لندن کے مقابلے میں یہ علاقہ خاصا پُرسکون تھا۔ یوگن کو امید تھی یہاں اس کی تخلیقی صلاحتیں اور زیادہ اچھی طرح اُجاگر ہوسکیں گی۔

یوگن ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا گو کہ ان کی گزربسر اچھی طرح ہو رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ پُرسکون زندگی اور تخلیقی کاموں کے لیے اُس کا برسرِ روزگار ہونا ضروری ہے۔ ریاضی اور لسانیات کی تعلیمی اسناد تو اُس کے پاس ہی تھیں۔ اس لیے بہت جلد اُسے ریپن کے ایک معروف اسکول میں ریاضی کے اُستاد کی نوکری مل گئی۔

وہ دس برس تک گوتھ ویٹ ہال اسکول میں پڑھاتا رہا۔ ریپن میں واقع یہ اسکول اُس کی جائے پیدائش رامس گل سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اسکول کی ملازمت کے دوران وہ ایسے شخص کے روپ میں سامنے آیا جو ڈسپلن کے معاملے میں شاگردوں پر خاصی سختی برتتا تھا مگر اس سخت گیری کے باوجود اس کی شہرت دوسرے اساتذہ سے زیادہ تھی۔ وہ اُستاد سے زیادہ اسکالر کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے شاگرد سخت گیر رویے کے باوجود اس سے پیار کرتے تھے اور وہ بھی کوشش کرتا تھا کہ اپنے شاگردوں کے ذہن میں اٹھنے والے ہر سوال کا جواب اس طرح دے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہو جائیں۔ اسکول میں ہی نہیں، اطراف کے دیگر علاقوں کے سماجی حلقوں میں بھی اس کی علمیت کے پیشِ نظر اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ اب تک یوگن ایرم غیر شادی شدہ تھا۔ آخر اسے شادی کا خیال آیا اور پھر 1731ء میں اُنتیس کی عمر میں اس نے ایک مقامی لڑکی سے شادی کرلی۔ اس کا نام اینا اسپنس تھا۔ شادی کے تین برس تک تو یہ جوڑا ریپن ہی رہا۔ اب تک وہ اُسی اسکول میں پڑھا رہا تھا لیکن پھر ایک دن اس نے ملازمت چھوڑ کر یہاں سے نقل مکانی کا فیصلہ کیا۔ وہ ریپن سے چوبیس کلومیٹر دور واقع ایک بڑے قصبے کیرس بوروگ منتقل ہو گئے۔ یہ قصبہ نارتھ یارک شائر میں دریا کے کنارے واقع تھا۔ کیرس بوروگ میں یوگن کو مالی لحاظ سے اسے زیادہ پُرکشش مواقع نظر آئے۔ اس نے بھی ایک عقلمند انسان کی طرح ان مواقعوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنا اسکول کھول لیا۔ لندن میں سر ایڈورڈ کے دفتر میں سیکھے انتظامی امور اور گوتھ ہال اسکول میں تیرہ برس تک پڑھانے کا تجربہ، یہاں یہ دونوں چیزیں اُس کے کام آئیں۔ اس نے نہایت کامیابی سے اسکول شروع کردیا۔ وہ براہِ راست انتظامی اور تعلیمی سلسلے پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ ڈسپلن کی پابندی کے حوالے سے اس کا رویہ تو پہلے ہی سخت گیر تھا۔ یوں اس کی جملہ ذاتی خصوصیات نے اسکول کو بہت جلد پورے قصبے میں مشہور کردیا۔ لوگ اب خواہش کرتے تھے کہ اُن کے بچے یوگن کے اسکول میں تعلیم حاصل کریں۔ یہی وجہ تھی کہ پورے قصبے کے عام اور خواص، دونوں میں اسے نہایت قابلِ احترام نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ چند سال کے اندر اندر یوگن کیرس بوروگ کے سماج میں ایک اہم ستون کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ یہی نہیں، اس کی شہرت آس پاس کے دیگر بڑے بڑے قصبوں اور شہروں تک بھی پھیل چکی تھی۔

کیرس بوروگ میں یوگن کا سماجی مقام کیا تھا، اس بات کو سمجھنے کے لیے اُس پمفلٹ کی تحریر ہی کافی ہے، جو اُس کی پھانسی کے خلاف احتجاجاً قصبے کے باشندوں نے شائع کر کے تقسیم کیا تھا:

"وہ اس قصبے میں مدتوں رہا لیکن اس کے کسی بھی قول، فعل یا عمل سے کوئی خرابی یا بُرائی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ وہ مہذب شخص کی حیثیت سے ادب آداب سے بھرپور زندگی بسر کرتا رہا۔ اس نے لین دین میں کبھی کوئی ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔ یہاں کی قابلِ احترام اور ہر دلعزیز شخصیت تھا۔ ایسی شخصیت جس کے کردار پر آج تک کسی کو اُنگلی اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ ہم سب کے لیے نہایت ہی قابلِ احترام انسان، اُستاد اور عالم ہے۔ وہ ہم سب سے بہت زیادہ اچھا انسان ہے۔ اس نے اپنے کردار سے قصبے میں یہ عزت پائی ہے۔ عزت، جسے ذلت سے دی گئی یہ موت کی سزا بھی کبھی کم نہیں کر سکے گی۔ وہ ہمیشہ ہماری نظروں میں وقار کے ساتھ زندہ رہے گا۔"

اگرچہ اس پمفلٹ سے یوگن کی سزا موخر نہیں ہوئی، لیکن مگر اس کی شہرت، عزت و وقار میں مزید اضافہ ہوا۔

اسکول کے ذریعے حاصل کی گئی مالی آسودگی مطمئن زندگی بسر کرنے کے لیے کافی تھی۔ ایک باغبان کا بیٹا ہو کر بھی وہ خوش حال زندگی گزار رہا تھا مگر باہر کے مقابلے میں اُس کی گھریلو زندگی آسودہ نہیں تھی۔ اینا اسپنس کے بطن سے یوگن کے آٹھ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے دو کم عمری میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ بعد میں اکثر وہ اپنی بیوی کو ان بچوں کی موت کا ذمہ دار قرار دیتا تھا۔ ان کے درمیان لڑائی جھگڑے معمول کی بات تھی۔ خود یوگن بھی سمجھتا تھا کہ بیوی نے اس کی زندگی کو جہنم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ خود اینا اُسے طعنے دیتی تھی کہ وہ اسے شوہر کا وہ پیار نہیں دے سکا جو بطور بیوی اس کا حق تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ نا آسودہ جذباتی زندگی کے شاکی تھے اور ایک دوسرے کو ذمے دار ٹھہراتے تھے۔ گھریلو زندگی میں شوہر کی محبت نہ ملنے کی شاکی اینا نے جذباتی آسودگی کے لیے آخر ایک راہ منتخب کرلی۔ اُس وقت وہ آٹھ بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

اینا ..... نے قصبے کے ایک جوتا ساز ڈینئل کلارک سے دوستی کرلی۔ ان کی دوستی بہت جلد گہری دوست میں تبدیل ہو گئی۔ وہ جوتا ساز بہت غریب اور غیر شادی شدہ تھا۔ دراصل وہ نا آسودہ جذباتی زندگی بسر کرنے والی شادی شدہ مگر مالدار عورتوں سے دوستیاں کر کے ان سے رقم بٹورتا رہتا تھا۔ اینا تن من دھن سے اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ سمجھتی کہ اگر اس کی زندگی میں یوگن کے بجائے ڈینئل ہو تو وہ زیادہ خوشیوں بھری زندگی بسر کر سکے گی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی خواہش کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے کچھ کرتی وہ دغاباز اپنے اصل روپ میں سامنے آگیا۔

ڈینئل کلارک نے قصبے کی ایک خوش حال بیوہ سے شادی کرلی تھی، وہ بھی صرف اس لالچ میں کہ شادی پر وہ اسے تین سو پاؤنڈ نقد دے گی۔ سواری کے لیے اُسے گھوڑا خرید وائے گی اور اس کے لیے ایک اصطبل بھی بنوادے گی۔ غریب جوتا ساز کے دل میں مدت سے ذاتی سواری کے لیے گھوڑا خریدنے کی خواہش تھی اور یہاں تو کہی اور ان کہی خواہشوں کو بھی پورا کرنے کا موقع مل رہا تھا، سو اس نے فوراً فائدہ اٹھایا اور اینا دیکھتی رہ گئی۔

مختلف شواہد سے پتا چلا ہے کہ عمر کے اُس حصے میں جب اینا جوتا ساز سے عشق لڑا رہی تھی، تب یوگن میں ہم جنس پرستی کے میلانات ابھر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک کم عمر نوخیز لڑکے کو تنہائی میں عورتوں کا لباس پہنا کر کہا کرتا تھا کہ وہ خود کو اینا سمجھے اور ایک لڑکی کی طرح اُس سے اظہارِ عشق کرے۔ اب وہ اکثر شراب بھی پینے لگا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ مقامی طور پر تیار کی گئی ایک گھٹیا شراب پینے لگا تھا۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ کیرس بوروگ میں تیار کردہ 'کراؤن کیس یورگ' نامی یہ سستی شراب صرف ایک ہی میخانے میں دستیاب تھی۔ وہ میخانہ بھی سستی شراب کی طرح نہایت ہی گھٹیا درجے کا تھا لیکن یوگن ان دونوں کا رسیا ہو چکا تھا۔ اکثر رات کی تاریکی میں وہ دوسروں کی نگاہوں سے چھپتا چھپاتا اُس میخانے کا رخ کرتا تھا۔ یہیں اس کی دوستی میخانے کے مالک ہنری ٹیری سے ہو گئی۔ وہ مشکوک کردار کا انسان تھا۔ علاقے میں اس کی شہرت بھی خراب تھی مگر یوگن ان تمام باتوں سے لاپروا ہو چکا تھا۔ شاید یہ اینا کے اس معاشقے کا سبب ہو جو اُس نے جوتا ساز سے کیا۔ اینا سمجھتی تھی کہ یوگن اس راز سے واقف نہیں۔ ویسے بھی اس نے کبھی بیوی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس کے خفیہ عشق کے بارے میں جان چکا ہے لیکن اس جیسے نفیس کردار کے مالک کی زندگی کا بیوی کے معاشقے کے بعد جو رُخ سامنے آیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ کسی شدید جذباتی صدمے نے اس کی زندگی کو اندر سے اُلٹ پلٹ دیا تھا۔ یوگن کے ساتھ ساتھ وہاں ایک اور گاہک بھی باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ اُس کا نام فرانسز تھا۔ اس کے بارے میں افواہیں تھیں کہ وہ جرائم پیشہ ہے اور چوروں سے چوری کا مال خریدتا ہے۔ میخانے کا ایک اور باقاعدہ گاہک رچرڈ ہاؤس مین تھا۔ وہ اون کا معمولی سا تاجر تھا اور مدتوں سے قصبے میں ہی رہ رہا تھا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے، اس زمانے میں اون کو برطانیہ میں نہایت قیمتی جنس سمجھا جاتا تھا۔

وہ سردیوں کا موسم تھا۔ ٹھنڈ بہت زیادہ تھی۔ کیرس بوروگ میں زندگی سرِ شام ہی گھروں میں سمٹ جاتی تھی اور رات وقت سے بہت پہلے قصبے پر اُتر آتی تھی۔ وہ سات فروری 1745ء کی ایسی ہی ایک سرد رات تھی۔ آسمان پر بادل کا نام و نشان تک نہ تھا اور چڑھتے چاند کی چاندنی میں پورا قصبہ نہایا ہوا تھا۔ وہ رات کا پہلا پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد نظر آرہا تھا۔ راستے اور گلیاں بالکل سنسان تھے۔

رات کے تین بج رہے تھے جب یوگن کے ایک ہمسائے نے اپنے گھر کی کھڑکی سے اتفاقی طور پر گلی میں ڈینئل کلارک

کو دیکھا۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی اور کھڑکی پر پڑے موٹے پردے برابر کر کے پھر بستر پر آ گیا۔

رات کے اُس پہر ڈینئل کی موجودگی اچنبھے کی بات تھی۔ اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دوسری صبح وہ اپنے گھر سے غائب تھا۔ جب سے اس نے شادی کی اور گھوڑا خریدا تھا، تب سے وہ گھوڑے کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا مگر اُس صبح گھوڑا تو اصطبل میں اپنے تھان پر بندھا کھڑا تھا مگر ڈینئل کلارک پُراسرار طور پر غائب ہو چکا تھا۔ وہ کہاں چلا گیا؟ اس سوال کی بازگشت اگلے کئی ہفتوں تک قصبے کے کوچہ و بازار میں سنائی دیتی رہی۔

ڈینئل کلارک لمبے قد، چھریرے بدن، نیلی آنکھوں، بھورے گھنگریالے بال اور چھریرے بدن کا پُرکشش نوجوان تھا۔ گمشدگی کے وقت اس کی عمر صرف تیئس سال تھی۔ ایک ماہ ہونے کو آ گیا مگر اس کی گمشدگی بدستور معمائی ہوئی تھی۔ کسی کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لاپتا ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ آخر ایک ماہ بعد مقامی رسالے York Courant نے پہلی بار ڈینئل کی گمشدگی کے حوالے سے ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی، جس میں صحافی کے بقول اُس کی گمشدگی نہ سمجھ میں آنے والی اصل وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ رسالے نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:

”ڈینئل کلارک متعدد لوگوں سے دھوکا دہی، نوسر بازی اور قرض لینے جیسی کارروائیوں میں ملوث تھا۔ اس نے دھوکے سے متعدد لوگوں کی قیمتی چیزیں ہتھیائی تھیں۔ ڈینئل نے گمشدگی سے پہلے جو چیزیں ہتھیائی ہیں اُن میں قیمتی گھریلو اور آرائشی سامان، نقدی، سونے چاندی کے سکے، ہیرے، قیمتی قلمی کتابیں، نوادرات، انگوٹھیاں، سونے سے بنے، ہیرے اور قیمتی موتی جڑے بیش قیمت زیورات، قیمتی گھڑیاں اور بہت سارا دیگر سامان شامل ہے۔ اس نے گمشدگی سے پہلے دھوکے سے حاصل کیا گیا یا چوری سے جو سامان ہتھیایا تھا، اس میں تیار چمڑے کی ایک گانٹھ بھی شامل ہے، جس کی مالیت پینتالیس برطانوی پاؤنڈ تھی۔ علاوہ ازیں، جن اشیا کی مالیت اب تک طے کی جا چکی ہے وہ مجموعی طور پر ڈیڑھ سو برطانوی پاؤنڈ ہے۔ اتنی مالیت کے ساتھ وہ اب تک بدستور لاپتا ہے۔“

رسالے نے اپنی رپورٹ کے آخر میں ایک چونکا دینے والا انکشاف بھی کیا تھا۔ خبر میں کہا گیا تھا:

”ڈینئل کی بیوی نے انکشاف کیا ہے کہ جب شوہر کی گمشدگی کے بعد اس نے گھر کی تجوری میں رکھی رقم دیکھی تو وہاں سے دو سو پاؤنڈ کی نقدی غائب تھی۔ اس کے علاوہ گھر سے ایک قیمتی نادر طشتری بھی چوری ہو چکی تھی۔ یہ طشتری خالص سونے کی بنی ہوئی تھی۔“

ایک جانب ڈینئل اور اب اس کے ساتھ بھاری مالیت سامان غائب ہو جانے کی خبریں سرگرم تھیں تو دوسری طرف اس عرصے میں یوگن ایرم حیران کن انداز میں دولتمند ہو [illegible] تھا۔ اگرچہ وہ قصبے میں معتبر حیثیت کا حامل تھا اور اب تک نہایت شریفانہ انداز میں زندگی بسر کر رہا تھا لیکن مالی فراغت اسے میسر نہیں تھی۔ اس کا گھر رہن رکھا ہوا تھا۔ اس پر کئی ساہوکاروں کا قرض بھی واجب الادا تھا، جنہیں وہ باقاعدگی سے قسطوں میں ادا کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ ہوا، جس سے اس کے قرض داروں اور قصبے [illegible] اس کے قریبی جاننے والوں کو اندازہ ہوا کہ اس کے پاس اچانک کہیں سے اچھی خاصی دولت آ گئی ہے۔

ہوا یہ کہ اس کے ایک قرض دار نے مقامی عدالت میں قرض کی ادائیگی کے لیے یوگن کے خلاف ایک درخواست پیش کر دی۔ جج کے حکم پر اسے قرض نادہندہ کی حیثیت [illegible] پولیس نے گرفتار کر کے عدالت کے روبرو پیش کر دیا۔ قرض دینے والا بھی وہیں موجود تھا۔ جج نے اُس پر لگایا گیا الزام پڑھ کر سنایا۔ یوگن نے قرض دار ہونے کا اعتراف کیا اور پیشکش کی کہ وہ فوری طور پر درخواست گزار قرض دار کا سارا قرضہ ادا کرتا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے کوٹ کے نیچے پہنی ہوئی اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب سے سرخ مخمل کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور جج کے سامنے ہی سونے کے سکوں سے بھری اس تھیلی میں سے گن کر سو سکے نکالے اور قرض دار کے حوالے کر کے رسید حاصل کر لی۔ قرض ادا ہو جانے کے بعد جج کے پاس اس کی رہائی کا حکم دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، سو اُس نے ایسا ہی کیا مگر یوگن کو جاننے والوں کی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ اُس زمانے کے حساب سے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ جب یوگن کو گرفتار کیا گیا تو اس کے دوستوں کو خدشہ تھا کہ وہ کمزور مالی حیثیت کے باعث ادائیگی نہیں کر سکے گا اور جج اسے جیل بھیج دے گا مگر اب وہی دوست اور جاننے والے سب سے زیادہ پریشان تھے کہ اس کے پاس اتنی دولت اچانک کہاں سے آ گئی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، صرف قیاس آرائیاں تھیں جو زبانِ زدِ دوستاں تھیں۔

یوگن ایرم نے اپنے گھر کو بھی بھاری قرض کے عوض رہن رکھا ہوا تھا۔ عدالت میں قرض کی ادائیگی کا واقعہ ابھی [illegible] ہی تھا کہ اس نے رہن کی پوری رقم بمع سود کے ادا کر کے گھر آزاد کروا لیا۔ یہ ایسا دوسرا بڑا واقعہ تھا کہ جس نے لوگوں

ایک نئی اور چونکا دینے والی قسط وار کہانی

مسافر

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر

لیکن اس داستان کے مسافر کا سفر طویل، سنسنی خیز اور دلچسپ ہے

حساس اور نرم دل کرداروں کا سفاک و سنگ دل حریفوں سے تصادم

رنگین و سنگین واقعات جو نازک جذبوں اور دل گداز لمحوں میں پروان چڑھتے ہیں

ان کے لیے جو اچھی کہانیوں کے رسیا ہیں

سطر سطر اپنی گرفت میں رکھنے والی اس یادگار سلسلے وار کہانی

آخری اترن، تماشائے عشق، مزاج آشنا اور جنت

کے تخلیق کار **ناصر ملک** کے قلم سے

سسپنس کے تازہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

یقین دلا دیا کہ اس کے پاس اچانک بہت بڑی دولت کسی خفیہ طریقے سے آچکی ہے۔ یہ خیال تیزی سے قصبے کے لوگوں میں افواہ بن کر پھیل گیا۔

دوسری طرف ڈینئل کلارک کے ہاتھوں لٹنے والے سرگرمی سے اس کی تلاش میں تھے کہ اینٹھ جانے والا مال و متاع حاصل کرسکیں۔ جب یہ افواہ پھیلی تو وہ بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگئے۔ انہیں اب یہ شک ہوا کہ کہیں وہ سارا مال ڈینئل کے ذریعے کوئی خفیہ گٹھ جوڑ کر کے یوگن نے تو نہیں ہتھیالیا ہے۔ کافی سوچ و بچار کے بعد آخر ایک روز ڈینئل کے متاثرین نے یوگن کے گھر کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس پر تیار نہیں تھا مگر قصبے کی انتظامیہ کے آگے بے بس ہوگیا اور پھر تلاشی کا عمل شروع ہوا۔ اس تلاشی کے دوران ڈینئل کے متاثرین نے کچھ مسروقہ سامان برآمد کرلیا۔ یہ مخمل اور اون کی وہ کچھ گانٹھیں تھیں جنہیں چھپانے کے لیے گھر کے باغیچے میں بڑی احتیاط سے دفن کردیا گیا تھا۔ پولیس نے فوری طور پر یوگن کو مال مسروقہ گھر میں رکھنے کے جرم میں گرفتار کرلیا۔

عدالت میں یوگن نے اعتراف کیا کہ مخمل اور اون کی گانٹھیں بس باغیچے سے ملی ہیں، وہ اس کی ملکیت ہیں لیکن اس نے اس سامان سے مکمل لاتعلقی ظاہر کی۔ اس کا موقف تھا کہ گھر کی چار دیواری کے باہر کا یہ وسیع رقبہ بالکل کھلا ہوا ہے۔ یہاں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں جو کسی بھی شخص کو یہاں داخل ہونے سے روک سکے۔ نیز، یہ کہ باغیچہ مدت سے اُجاڑ پڑا ہوا ہے۔ وہاں خودرو جھاڑیاں ہیں اور اس نے کسی مالی کو بھی ملازم نہیں رکھا ہوا ہے۔ گھر کا کوئی فرد شاید ہی مہینے میں ایک بار وہاں کا رخ کرتا ہو۔ اس لیے اُسے یقین ہے کہ یہ سامان ڈینئل یا پھر جس نے بھی اسے چرایا تھا، وہاں اسے دفن کر کے گیا تھا تاکہ مناسب وقت پر نکال سکے۔

مجسٹریٹ نے اس کے موقف سے اتفاق کیا۔ یوگن کے خلاف دریافت مال کے دعویدار کوئی اور ٹھوس ثبوت پیش نہ کرسکے جبکہ مجسٹریٹ کے سامنے اُس کا شفاف ماضی بھی تھا۔ یوں اسے چوری کے الزام سے باعزت طور پر بری کردیا گیا۔

عدالت سے بری ہونے کے بعد ایک دو ہی ایسے واقعات ہوئے جن پر ایک بار پھر لوگ سوچنے لگے کہ اس کے پاس بہت زیادہ دولت آچکی ہے مگر کہاں سے؟ عدالت سے بری ہونے کے بعد اکثر ایسے خیال کے حامی لوگوں کا ماننا تھا کہ اس کے پاس موجود دولت کو شاید غیر قانونی ثابت کرنا بہت ہی مشکل ہوگا۔ اس لیے یہ خیال صرف چہ میگوئیوں کی حد تک ہی محدود رہا۔ دوسری جانب ڈینئل بدستور لاپتا تھا۔ جب یوگن کے گھر سے مسروقہ مال برآمد ہوا، تب لوگوں کو یقی[ن] آگیا کہ اس مال کے ذریعے خود یوگن انہیں ڈینئل ک[ا] بتادے گا مگر اس کی بریت کے ساتھ ہی یہ موہوم امید بھی توڑ گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈینئل کہاں ہے۔ ڈینئل گمشدگی قصبے میں گفتگو کا مرکزی موضوع تھی۔ آس پڑوس قصبے والے بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔

مقامی رسالہ York Courant ڈینئل [کے] حوالے سے قصبے والوں کے لیے تازہ ترین معلومات کا دا[حد] ذریعہ تھا۔ رسالے کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ جب سے گمشد[گی] کی خبریں چھپ رہی ہیں، اس کی اشاعت بھی بڑھ گئی ہے۔ رسالے کا ایڈیٹر اور مالک اس صورت حال سے فائدہ اٹھا[نے] کے چکر میں تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یوگن عدال[ت] سے باعزت بری ہوگیا ہے تو انہوں نے یہ واقعہ تازہ ر[کھنے] کے لیے اپنے رسالے میں نمایاں انداز میں اشتہار شائع [کیا] کہ ڈینئل کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دینے وا[لے کو] پندرہ پاؤنڈ بطور انعام دیے جائیں گے۔ اس اعلان [نے] لوگوں میں تجسس پیدا کردیا تھا۔ کنگلے اور فارغ لوگوں کے [لیے] اس اشتہار میں خاصی کشش تھی۔ کئی لوگ اس بھاری رقم حاصل کرنے میں جُت گئے تھے۔

اپریل 1745ء کے دن تھے۔ ڈینئل کا قصہ اب ....دھندلاتا جارہا تھا۔ ویسے بھی اس واقعے کو یہ تیسرا [سال] تھا۔ لوگوں کی یہ چہ میگوئیاں بھی دم توڑ چکی تھیں کہ یو[گن] اچانک کیسے دولتمند ہوگیا تھا؟

ماہ اپریل کے اُس موسم بہار کی ایک صبح یوگن نے سامان اور کپڑے وغیرہ ایک تھیلے میں ڈالے اور بیوی بچ[وں] سے یہ کہہ کر چل دیا کہ وہ چند روز کے لیے اپنے کسی رشتے [دار] سے ملنے کے لیے ٹونگھم جارہا ہے۔ اُس کی بیوی ٹونگھم [میں] رہنے والے شوہر کے کسی ایسے رشتے دار کو نہیں جانتی تھی جہاں جانے کا کہہ رہا تھا اور نہ ہی اُس نے رشتے دار کا نام پتا اور لو[ٹ] آنے کا وقت بتایا تھا۔ ایک صبح جو وہ اُس گھر سے نکلا تو پھر بھی لاپتا ہوگیا۔ اگلے تیرہ برس نہ تو وہ لوٹا اور نہ ہی اس کے [گھر] والوں کو اس کی کوئی خبر ملی۔

☆☆☆

یوگن ایرم قصبے میں اپنے گھر سے نکل کر ٹونگھم میں [کسی] رشتے دار کے ہاں نہیں گیا تھا بلکہ اُس کی موت کے بعد چھان بین ہوئی تب پتا چلا کہ وہ لندن پہنچ گیا تھا۔ لندن [میں] اس نے پکاڈلے کی ایک اکیڈمی میں نوکری کرلی اور پڑ[ھنے] پڑھانے میں مشغول ہوگیا۔ لندن میں اپنے مطالعے [کے دوران]

اس نے محسوس کیا کہ عبرانی اور کیلٹی زبان میں فلسفے کا ذخیرہ موجود ہے لیکن ان دونوں زبانوں سے لاعلمی [کی وجہ] سے وہ اس کا مطالعہ نہیں کرسکتا۔ اس خیال کے آتے ہی [اس نے] ان دونوں زبانوں کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور جلد ان زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنے پر قادر ہوگیا۔ [لند]ن میں بارہ برس تک پڑھنے اور پڑھانے میں معروف [رہا]۔

مارچ 1757ء میں کرسمس سے کچھ پہلے لندن کے ایک [اخب]ار میں شائع شدہ ایک اشتہار اس کی نظروں سے گزرا۔ یہ [اشت]ہار نارفاک کے کنگز لائن گرامر اسکول کی انتظامیہ کی طرف [سے دی]ا گیا تھا۔ انہیں ایک ماہر استاد کی ضرورت تھی۔ انہوں [نے] امیدوار میں جس قابلیت اور خوبیوں کو لازمی قرار دیا تھا، [یوگ]ن ان پر پورا اُترتا تھا۔ ویسے بھی اب ایک بار پھر اُس کا دل [لند]ن سے اُچاٹ ہوگیا تھا۔ اسے ایک بار پھر پُرسکون جگہ کی [تلا]ش تھی۔ اسے یہ اشتہار لندن سے فرار کا ذریعہ محسوس ہوا۔ [اس] نے وقت ضائع کیے بغیر درخواست بھیج دی اور قسمت کی [یاور]ی کہ اس کا انتخاب بھی کرلیا گیا۔

نارفاک کے اسکول میں ابھی اس نے چند مہینے ہی پڑھایا [تھا] کہ شاگردوں میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ طالب علم اسے [پسن]د کرنے لگے تھے۔ وہ بہت جلد اسکول کے بچوں میں [پسندی]دہ استاد کا درجہ حاصل کرگیا۔ وہ یہاں پر کئی اور مضامین کے ساتھ ساتھ علم نباتات بھی پڑھاتا تھا۔ یوگن دیگر اساتذہ کے مقابلے میں صرف کتابی علم پر ہی انحصار نہیں کرتا تھا۔ وہ [بچ]وں کو گھمانے پھرانے کے لیے جنگلوں میں لے جاتا اور پھر انہیں نباتات کی عملی تعلیم دیتا تھا۔ وہ انہیں پودوں، درختوں، [پھ]لوں، پتیوں اور جڑی بوٹیوں کی پہچان کرواتا، اُن کے [خو]اص بتاتا اور انہیں وہاں موجود کیڑے مکوڑوں کے حیاتیاتی [نظ]ام اور انسانوں کے لیے اُن کے فوائد سمجھاتا تھا۔ اس کا یہ [طر]یقہ تعلیم بچوں کے لیے دلچسپ اور مزیدار تھا۔ کھیل اور [تفر]یح کے ساتھ ساتھ بچے وہ سب کچھ بہت کم وقت میں سیکھ جاتے تھے جو کتاب کی مدد سے انہیں مہینوں میں بھی اچھی طرح [سمج]ھ نہیں آتا تھا۔

نارفاک اسکول میں اُس وقت ان کے شاگردوں میں [ای]ک بچہ جیمز برنی بھی تھا۔ جیمز نے بڑا ہونے پر برطانیہ کے [شا]ہی بحری بیڑے میں ملازمت اختیار کی اور ریئر ایڈمرل کے [اع]لیٰ ترین عہدے تک پہنچا۔ جیمز نے یوگن کے حوالے سے [اسکو]ل کے زمانے کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا:

''ایک دن انہیں لے کر باغ میں گھوم رہے تھے کہ اچانک انہیں ایک کیچوا رینگتا ہوا نظر آیا۔ انہوں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑلیا اور ہماری آنکھوں کے سامنے لٹکاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''یہ دیکھو...... یہ کاٹتا نہیں ہے۔'' اس سے پہلے صرف مجھے ہی نہیں، کئی اور بچوں کو بھی کیچوؤں سے بہت ڈر لگتا تھا لیکن یہ دیکھ کر ہمارا ڈر کسی حد تک ختم ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں بتایا کہ کیچوا نباتات کی صحت کے لیے کتنا اہم ہے۔ انہوں نے اس موقع پر کہا تھا کہ کوئی بھی کیڑا مکوڑا احتیاط سے پکڑا جائے تو چاہے وہ ڈنک بھی رکھتا ہو، تب بھی ڈنک نہیں مار سکے گا۔ یہ بات میرے دل پر اثر کرگئی۔ اس کے بعد میں پھر کبھی کسی کیڑے مکوڑے یا جنگلی جانور سے خوف زدہ نہیں ہوا۔''

جیمز نے ایک اور دلچسپ بات بتائی۔ ان کا کہنا تھا:

''ایک دن ہم سب ایک باغ میں دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یوگن نے وقت گزاری کے لیے ایک لڑکے کو مختصر سا کتابچہ دے کر اس میں لکھی ہوئی کہانی پڑھنے کو کہا۔ اس کتابچے کا نام تھا 'خفیہ قتل کی دریافت' یہ کتابچہ ناروچ کے ڈبلیو چیس نے شائع کیا تھا۔''

اب یہ شاید ایک اتفاق تھا کہ جس وقت وہ بچہ یوگن کے دیے ہوئے کتابچے میں خفیہ قتل کے انکشاف کا قصہ پڑھ رہا تھا، اُس وقت یہاں سے بہت دور کیرس بورگ قصبے کے نواح میں ایک ایسی لاش کی باقیات مل رہی تھیں جو آنے والے وقت میں اُس قصبے کے اِس اُستاد کی زندگی میں فیصلہ کن موڑ لے کر آنے والی تھیں۔

☆☆☆

یہ یکم اگست 1758ء کا دن تھا۔ کیرس بورگ قصبے کی نواحی پہاڑیوں میں سے ایک پر مزدور پتھر توڑنے کے کام میں مصروف تھے۔ یہ علاقہ سائنٹ رابرٹ غار کے نام سے مشہور تھا۔ چند مزدور زمین میں گڑے پتھروں کو باہر نکال کر زمین ہموار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ غار کے دہانے کے سامنے کام کررہے تھے۔ اچانک بیلچے کے ساتھ مٹی اور کچھ ایسی شے بھی باہر آئی جو اُن سب کو چونکا گئی۔ یہ انسانی ہڈیاں تھیں۔ ہڈیوں کے ملنے سے صاف ظاہر تھا کہ اس جگہ پر کسی انسان کو دفن کیا گیا ہے۔ وہ اسے قتل قرار دے رہے تھے۔ یہ خیال اس لیے مضبوط تھا کہ یہاں کا قبرستان کافی دور واقع تھا اور ویسے بھی میت کو باقاعدہ تابوت میں دفن کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی گہرائی میں مگر یہاں تو ایک فٹ گہرا گڑھا کھودنے پر ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ وہاں موجود مزدور کافی دیر تک کشمکش و پیچ میں مبتلا رہے۔ آخرِ کار سب نے باہمی صلاح مشورے

آئڈل، روزبڈ، پرل، روبی یا مولی فانچر؟

10 مئی 1864ء کو بروک لین کے علاقے میں ایک سولہ سالہ لڑکی Mollie Fancher گھوڑے کی پشت سے سر کے بَل گر پڑی۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور دماغ بھی متاثر ہوا، ڈاکٹروں کی کوششوں سے وہ صحت یاب ہوگئی مگر اگلے برس جون کی 8 تاریخ کو اس بدقسمت کا دوبارہ حادثہ ہوگیا، اس مرتبہ اسے گاڑی سے ٹکر لگی تھی۔ کسی کو اس کے بچنے کی امید نہیں تھی مگر ڈاکٹروں کی کوششوں سے وہ ایک بار پھر ٹھیک ہوگئی۔ 3 فروری 1866ء کو ایک شام ڈاکٹر رابرٹ اسپائر نے مولی فانچر کو دیکھتے ہوئے قریب کھڑی مولی کی خالہ سوسن کو کہا کہ لڑکی کی حالت اب بہتر ہو رہی ہے۔ ابھی ڈاکٹر نے یہ بات کہی ہی تھی کہ مولی کا بدن ایک دم لرز گیا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ پورے ایک ماہ بعد جب وہ ہوش میں آئی تو اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کا تعارف اس کے عزیز و اقارب اور خالہ سوسن سے کرایا گیا۔

اس نئی زندگی کا آغاز اس نے بڑے حوصلے سے کیا۔ اس زمانے میں اس نے چھ ہزار کے قریب خطوط تحریر کیے۔ نئے دوست بنائے اور کشیدہ کاری کے بہت سے نمونے تیار کرلیے۔ اس نئی زندگی کو 9 برس ہونے کو آئے کہ مولی ایک بار پھر بے خود ہوگئی۔ اس کی اصل شخصیت واپس آ گئی تھی مگر اسے 9 برس کے درمیان کی کوئی بات یاد نہیں تھی۔ جب اسے 9 برس کے دوران اس کے اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ نمونے اور اسی کے تحریر کردہ خطوط دکھائے گئے تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے، یہ کسی فوت شدہ عورت کا کام ہے۔ اس کے بعد مولی نت نئے تماشے دکھانے لگی۔ اس کی آنکھیں مدھم ہوتے ہوتے بالکل بے نور ہوگئیں مگر اس کا کہنا تھا کہ اسے اب بھی دکھائی دیتا ہے اور وہ ماتھے سے چیزوں کو دیکھ سکتی ہے، وہ ایک انتر جامی بن چکی تھی۔ ایک روز فلکیات دان ہنری پارکھسٹ (Henry Parkhust) مولی سے ملنے آیا ... جاننے کے لیے کہ یہ لڑکی کسی قسم کی جعلسازی کر رہی ہے یا پھر حقیقتاً غیر معمولی طاقتوں کی مالک ہے، وہ خط لکھ کر لفافے ... بند کر دیتا مگر مولی اسے بتا دیا کرتی کہ بند لفافے میں کاغذ پر کیا لکھا ہے۔ مولی کو مشاہدات کی صلاحیت بھی حاصل ہو چکی ... 1877ء کی ایک رات اس کی چیخیں سن کر خالہ سوسن بیدار ہوگئی، مولی کہہ رہی تھی وہاں خون ہی خون ہے۔ ٹرین کا ... حادثہ ہوا ہے اور اس کا چھوٹا بھائی ہلاک ہو چکا ہے۔ بعد ازاں اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ اس کا بیان تھا کہ وہ اکثر ... ملک بھر میں گھوم پھر کر دیکھتی ہے حالانکہ اس کا بدن بستر پر دراز ہوتا ہے۔ 1878ء میں ایک رات مولی ایک بوڑھے ... ڈاکٹر جارج سارجنٹ سے محوِ گفتگو تھی کہ اس نے آنکھیں موند لیں اور گویا نیند میں چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں اس نے کراہ کر ... آنکھیں کھول لیں اب وہ ڈاکٹر سارجنٹ کو عجیب سی اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، ڈاکٹر نے سنا، مولی کے منہ سے ایک نئی ... آواز آ رہی تھی۔ مولی کی شخصیت تبدیل ہو چکی تھی۔ نئی مولی فانچر نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ اسے آئڈل کہا جائے کیونکہ ... اس کا اصل نام آئڈل ہے۔ آئڈل نے اِدھر اُدھر کمرے میں مولی کی تیار کردہ کشیدہ کاری دیکھی تو حسد کے مارے سب ... بکھیر کے رکھ دیا۔ کچھ مدت بعد آئڈل واپس مولی کی جون میں آ گئی۔ اب کہ اسے حیرت ہوئی کہ اس کی غیر موجودگی میں ... اس کی کشیدہ کاری کو کون خراب کر رہا ہے۔ اگلے برس اور بھی تماشے ہوئے، ایک رات مولی کے اندر ایک چھ سالہ بچی روزبڈ ... کی شخصیت نمودار ہوئی معاً اس کی آواز تبدیل ہو کر بچے جیسی ہوگئی اور بچپنا پیدا ہوگیا۔ روزبڈ کے بعد اس نے ایک بار روبی ... نامی عورت کا روپ دھارا۔ مولی فانچر۔ آئڈل، روزبڈ، پرل یا روبی میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ اس حیرت ... انگیز شخصیت کا انتقال 11 فروری 1916ء کو ہوا کوئی نہ جان سکا کہ یہ کون مرا ہے آئڈل، روزبڈ، پرل، روبی یا پھر بذات خود ... مولی فانچر، اس کی قبر کے کتبے پر لکھا گیا ہے۔ مولی فانچر...... زندگی کے اسرار سے آگاہ تھی۔

اقتباس: ''قدرت کے اَن کھلے راز'' از ڈاکٹر قاضی محمد سلیمان

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

سے مزید کھدائی کا فیصلہ کیا۔ کچھ ہی دیر میں مکمل انسانی ڈھانچا زمین سے باہر نکل آیا۔ اس پُراسرار ڈھانچے کا ملنا تھا کہ پورے قصبے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مقامی لوگ سخت خوف زدہ تھے۔

ڈھانچا ملنے کے بعد اُس جگہ پر ہر طرح کی سرگرمیاں روک دی گئیں ــ ایک طرف قصبے کی پولیس اس کی تفتیش کر رہی تھی تو دوسری طرف ڈھانچا ملنے کے ایک ہفتے کے اندر مجسٹریٹ نے دوبار پولیس اور دیگر حکام کو بُلا کر واقعے کے بارے میں بازپُرس کی تھی۔ ان کے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ ڈھانچے کا اصل معاملہ کیا ہے۔ دو ڈاکٹروں نے بھی ڈھانچے کا معائنہ کیا، تاہم ان کے ذریعے بھی کوئی خاص بات پتا نہ چل سکی۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ جس کا بھی ڈھانچا ہے اس کی عمر کم تھی غالباً وہ لڑکپن کی عمر میں تھا۔ دوسری طرف ڈینئل کی عمر لاپتا ہونے کے وقت تیئس برس تھی۔ اب پولیس اور مجسٹریٹ بھی مخمصے کا شکار تھا۔

ڈھانچا ملنے کے بعد قصبے میں سرگوشیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اب بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ لوگ سرِ عام کہہ رہے تھے کہ جس لاش کا ڈھانچا ملا ہے، وہ کئی برس پہلے لاپتا ہونے والے ڈینئل کلارک کا ہے۔ جسے قتل کرنے کے بعد نامعلوم قاتل نے اپنا جرم چھپانے کے لیے یہاں دفن کر دیا تھا۔ اس بات میں وزن بھی تھا۔

اول تو یہ کہ گزشتہ دو دہائیوں میں وہی ایک شخص ایسا تھا جو لاپتا ہوا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس پر الزام تھا کہ وہ بھاری مالیت کا قیمتی ساز و سامان لے کر غائب ہوا تھا۔ اس لیے سب کو یقین تھا کہ ڈینئل نے جو کچھ کیا، اس پورے قضیے میں کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ جس نے مالِ مسروقہ کو اپنے قبضے میں لیا اور ڈینئل کو مار ڈالا۔ اس طرح اُس نامعلوم اور چالاک مجرم نے نہ صرف پورے مال پر ہاتھ صاف کرلیا بلکہ اسے قتل کرنے کے بعد اپنے جرم کا ہر ثبوت مٹا ڈالا۔

آہستہ آہستہ پولیس نے شک کا دائرہ قصبے کے جرائم پیشہ اور ناپسندیدہ شخص رچرڈ ہاؤس مین اور فرانسز تک بڑھا دیا تھا۔ ساتھ ہی پولیس ہنری ٹیری پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ وہ لاپتا ہونے والے شخص کے بارے میں کچھ ضرور جانتا تھا جس سے قاتل کو بے نقاب کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا اُن تینوں کو قصبے کے مجسٹریٹ نے پوچھ گچھ کے لیے طلب کرلیا۔

مجسٹریٹ نے سب سے پہلے رچرڈ کے سامنے ... والے ڈھانچے کی پنڈلی کی لمبی ہڈی رکھی اور سنجیدگی سے پوچھا۔ ''بتا سکتے ہو یہ کس کی ہڈی ہے؟'' بس یہی وہ لمحہ تھا جب اس سے ایک سنگین غلطی سرزد ہوگئی۔

''ہاں......'' رچرڈ نے ایک نظر ہڈی پر ڈالی اور پھر مجسٹریٹ سے کہا۔ ''اگر یہ ڈینئل کلارک کی ہڈی نہیں ہے تو پھر کسی کی بھی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا اور پھر سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''بھلا بتاؤ، میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہڈی کس کی ہو سکتی ہے۔'' اُس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

مجسٹریٹ کے سامنے ہونے والی اس تفتیش کے دوران اس نے ایک حیرت انگیز انکشاف بھی کیا تھا۔ رچرڈ کا کہنا تھا کہ لاپتا ہونے کے کچھ عرصے بعد ڈینئل کو قصبے سے باہر جانے والی سڑک کے ایک ویران مقام پر اُس کے ایک واقف کار نے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور پینترا بدلا۔ اس نے مجسٹریٹ سے کہا ''میں نے سُنا ہے کہ سینٹ رابرٹ غار سے ایک اور انسانی ڈھانچا ملا ہے۔''

مجسٹریٹ کا نام ولیم تھورنٹن تھا۔ یہ سن کر اسے شک گزرا۔ وہ سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ 1745ء میں باغیوں کی ... کے لیے 'یارک شائر بلیوز' کے نام سے فوجیوں کی ایک ... تیار کی گئی تھی۔ اس نے مشتبہ مجرموں کو حراست میں لینے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی یارک شائر بلیوز کی مدد سے اُس غار کی تلاشی لینے کا حکم دیا، جس کے دہانے کے قریب سے ڈھانچا ملا تھا۔ فوجی سپاہیوں نے فوراً غار کا رخ کیا اور پھر کچھ اندر جانے کے بعد انہیں ایک جگہ پر شک گزرا اور جب وہاں کھدائی کی گئی تو ایک انسانی ڈھانچا ملا۔ اس کا قد بھی لمبا تھا۔ ڈھانچے کی کھوپڑی صحیح سلامت تھی لیکن جب بغور معائنہ کیا گیا تو پتا چلا کہ کھوپڑی کا پچھلا حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ صاف لگ رہا تھا اسے سر کے عقبی حصے پر شدید ضرب پہنچا کر موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا۔

دوسرے ڈھانچے کی دریافت کے ساتھ ہی پورے قصبے میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ اُس وقت یہ سنسنی خیزی اور بڑھ گئی جب یوگن ایرم کی بیوی اینا ایرم مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئی۔ اُس کا شوہر بھی کئی سالوں سے لاپتا تھا۔ اُس نے مجسٹریٹ کے سامنے پہنچ کر بیان دیا کہ ''غار کے اندر سے ملنے والا دوسرا ڈھانچا اُس کے لاپتا شوہر کا ہو سکتا ہے۔'' یہاں تک تو اس نے جو کچھ کہا وہ سمجھ میں آنے والا تھا مگر اس کے آگے اُس نے جو کچھ مجسٹریٹ سے کہا وہ نہایت ہی حیران کر دینے والا انکشاف تھا۔

اینا نے مجسٹریٹ کو بتایا کہ یوگن نے رچرڈ اور ایک نامعلوم شخص کی مدد سے ڈینئل کو اُسی رات قتل کر دیا تھا جس صبح

سے اُس کی گمشدگی کی خبر پھیلی تھی۔ اینا کا کہنا تھا کہ اُس رات اس نے اپنے شوہر کو ان چاروں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اینا نے مزید بتایا کہ جس رات یہ واقعہ پیش آیا، اُس رات خاصی دیر کے بعد یوگن، رچرڈ اور وہ تیسرا نامعلوم شخص خاصی رات کو میرے گھر پلٹے۔ وہ سیدھے باورچی خانے میں گئے۔ یوگن نے مجھے حکم دیا کہ فوراً آتشدان میں آگ جلاؤ۔ میں نے آگ جلادی تو یوگن نے اس میں اور زیادہ لکڑیاں ڈال دیں۔ جب شعلے تیزی سے بھڑکنے لگے تب یوگن نے اسے باہر جانے کو کہا۔ اینا کے مطابق اسے یقین تھا کہ انہوں نے آگ میں تمام ثبوت مثلاً خون آلود کپڑے اور ایسی ہی دیگر چیزیں نذرِ آتش کردی تھیں جن کا تعلق قتل کی واردات سے تھا۔ اینا کا دعویٰ تھا کہ دوسرے دن صبح جب وہ آتشدان روشن کررہی تھی تب اس نے وہاں کپڑے کے چند ایسے ٹکڑے دیکھے تھے جن پر خون لگا ہوا تھا اور وہ جلنے سے بچ گئے تھے۔ اینا نے دعویٰ کیا کہ رچرڈ کے سر کے سارے بال جھڑ چکے تھے اور وہ وگ استعمال کرتا ہے۔ جس رات یہ واردات ہوئی، اُس شام وہ سورج غروب ہونے پر ان کے گھر آیا۔ اس نے وگ نہیں پہنی ہوئی تھی۔ اس نے اینا سے ایک بڑا رومال مانگا تاکہ ٹھنڈ سے بچنے کے لیے برہنہ سر پر رومال باندھ سکے۔ اینا کا کہنا تھا کہ جب آدھی رات کو وہ لوگ پلٹے اور یہ اُن کے لیے آتشدان روشن کررہی تھی، تب اس کی نظر اُس کے سر پر بندھے رومال پر پڑی۔ اُس پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔

مجسٹریٹ کے لیے اینا کا بیان نہایت خوفناک تھا تاہم وہ اس بات سے متفق نہیں تھا کہ دوسرا ڈھانچا اس کے شوہر کا ہوسکتا ہے۔ اب یہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ اس سے کیوں متفق نہیں تھا۔ ایک اور بات حیران کن تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مجسٹریٹ جانتا تھا کہ یوگن ایرم نہ صرف زندہ ہے بلکہ وہ نارفاک میں موجود ہے۔ یہ بات اگلے روز ظاہر ہوئی۔

اینا کے بیان کے اگلے روز 18 اگست کو مجسٹریٹ نے رچرڈ اور یوگن ایرم کو باضابطہ طور پر ڈینئل قتل کیس میں قاتل قرار دے دیا۔ رچرڈ پہلے ہی پولیس کی تحویل میں تھا تاہم اس نے دو پولیس کانسٹیبل شمال کی طرف روانہ کیے تاکہ وہ یوگن ایرم کو گرفتار کرکے اُس کے سامنے پیش کرسکیں۔ تھامس ہڈ نے یوگن ایرم کے بارے میں لکھی گئی اپنی شہرۂ آفاق نظم میں ان سپاہیوں کے ہاتھوں اُس کی گرفتاری اور قصبے روانگی کا احوال کچھ یوں بیان کیا ہے:

دو سخت گیر درشت چہرے والے لائن سے روانہ ہوئے
راہ میں سخت سردی اور بھاری دھند تھی
یوگن ایرم ان دونوں کے درمیان اس طرح چل رہا تھا
کہ اُس کی دونوں کلائی میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی

کچھ ہی دنوں بعد نارفاک کے کنگز لائن اسکول سے گرفتار کیے گئے یوگن ایرم کو مجسٹریٹ ولیم تھورنٹن کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ نے الزام پڑھ کر سنائے تو وہ بے تاثر اور سپاٹ لہجے کے ساتھ فردِ جرم سنتا رہا۔ مجسٹریٹ خاموش ہوا تو اسے بولنے کی اجازت دی گئی۔

"جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے، میں اسے تسلیم کرنے سے صاف انکار کرتا ہوں۔" یوگن نے سرد لہجے، گمبھیر آواز اور بے تاثر چہرے کے ساتھ صفائی پیش کرنا شروع کی۔ عدالت میں اس وقت قصبے کے لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ سب سچ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔

"میں ڈینئل کلارک کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ اتنا ہی جتنا کہ قصبے کے کئی لوگ یہاں رہنے والے بہت سارے دوسرے لوگوں کے بارے میں جانتے ہوں گے، بالکل سرسری سا۔" چند لمحوں کے وقفے کے بعد ایک بار پھر اس نے اپنا بیانِ صفائی شروع کیا۔ "مجھے قطعی یاد نہیں پڑتا کہ آج سے پہلے میں نے کبھی اُس کے قتل کی کوئی خبر سنی ہو۔ میرے لیے تو ڈینئل کلارک اتنا پرانا ماضی ہے کہ اب تو مجھے اس کا چہرہ بھی ٹھیک سے یاد نہیں اور یاد رہتا بھی کیوں؟ میرا تو اس سے کوئی جذباتی یا عمومی قسم کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔"

جب مجسٹریٹ نے سوال کیا "تم پر الزام ہے کہ جس رات اُس کا قتل ہوا، تم اُس کے ساتھ تھے؟"

یوگن ایرم نے یہ سن کر مجسٹریٹ کے چہرے کو بغور دیکھا اور پھر مجمع پر نظر کی۔ وہاں اس کی بیوی اینا بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ یوگن پر ڈینئل کے ساتھ ہونے کا بیانِ حلفی خود اس کی بیوی نے دیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں کچھ خاموشی کے بعد ایرم نے سر جھکا کر شاعرانہ لہجے میں فقط ایک ہی جملہ کہا۔ "میں اب اس سے زیادہ مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

ستمبر کے اوائل میں مجسٹریٹ نے رچرڈ، یوگن اور ہنری ٹیری کو یارک شائر کی جیل بھجوادیا۔ ہنری اُس شراب خانے کا مالک تھا، جہاں وہ کبھی جایا کرتا تھا۔ ہنری پر الزام تھا کہ اس نے وہ مال خریدا تھا جو چوری اور دھوکا دہی کے ذریعے ڈینئل نے حاصل کیا اور پھر اُس کے قتل کے بعد، اس نے وہ قیمتی سامان قاتل سے اونے پونے داموں خرید لیا تھا۔ یہ تینوں ایک برس تک اس جیل میں قید رہے۔

مارچ 1759ء میں رچرڈ ہاؤس مین جیل کی صعوبتوں سے گھبرا کر ہمت ہار بیٹھا۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر مجسٹریٹ

اس کی جاں بخشی کردے تو وہ اس مقدمے میں سلطانی گواہ بننے کو تیار ہے۔ مجسٹریٹ نے اس کی پیشکش قبول کرلی اور پھر یوں ایک نیا پہلو سامنے آیا۔

اس نے مجسٹریٹ کے سامنے بطور سلطانی گواہ بیان دیا "جس رات ڈینئل غائب ہوا تھا، اُس رات میں یوگن، ہنری اور فرانسز کے ساتھ اُس سے ملا تھا۔ ہم نے اس سے اس مال کے بارے میں پوچھا جو اس نے مختلف حیلے بہانوں، قرض اور دھوکا دہی کے ذریعے اب تک حاصل کیا تھا۔ ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس نے وہ سارا مال کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ دھونس اور دھمکانے پر آخر اس نے ہمیں بتا دیا۔ پہلے تو مال کو آپس میں بانٹنے کی بات ہوئی لیکن یوگن کے دل میں لالچ آگیا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر ہمیں بھی بتا دیا کہ کیا کرنا ہے۔ ہم ڈینئل کو لے کر سینٹ رابرٹ غار پہنچے۔ پھر یوگن نے ایک بڑے پتھر سے اس کے سر پر پیچھے سے چوٹ ماری۔ وہ پہلے ہی وار میں نیچے گرا اور ختم ہوگیا۔ ہم اس کی لاش کو کھینچتے ہوئے غار کے اندر لے گئے اور چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں ڈال دی۔ اس کے بعد ہم باہر آئے اور قریب بہنے والے نالے کے پانی سے اپنے خون آلود ہاتھ منہ دھوئے۔" رچرڈ کا کہنا تھا کہ اصل کیا دھرا یوگن کا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس بارے میں کبھی اپنی زبان کھولی تو وہ مجھے بھی قتل کردے گا۔

رچرڈ کے بیان کے بعد گمشدگی کا معاملہ حل ہوچکا تھا۔ قتل کا سارا الزام یوگن ایرم کے سر ڈال دیا گیا تھا۔ مجسٹریٹ نے اس بیان کی تفتیش مکمل ہونے کے بعد مقدمہ چلانے کے لیے اسے بڑی عدالت میں بھجوادیا۔

تین اگست 1959 کو جسٹس نوئل نے اس مقدمے کی کارروائی شروع کی جس کا چرچا لندن کے تمام بڑے بڑے اخبارات میں ہورہا تھا۔ اس مقدمے کی وجۂ شہرت یوگن کو بطور قاتل نامزد کیا جانا تھا۔ یوگن ایرم کا شمار لندن کی علمی شخصیات میں ہوتا تھا۔ اس کے علمی مقام کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے والوں میں کئی بڑے لوگ شامل تھے۔ یہی نہیں، اس علمی مقام کے باعث اس سے حسد رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ وہ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ مقدمے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اخبارات میں اس مقدمے کا جتنا چرچا اور لندن کی نجی محفلوں میں اس پر جتنی باتیں ہورہی تھیں اس بنا پر جسٹس نوئل کو بھی کسی طرح اندازہ تھا کہ یہ عام مقدمہ قتل نہیں ہے۔ انہیں عوام میں اس کی حساسیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

مقدمے میں بطور وکیلِ جرح فلیچر نارٹن کو نامزد کیا گیا تھا۔ اس کا تعلق طبقۂ اُمرا سے تھا۔ وہ 'سر' کا خطاب یافتہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ قانونی حلقوں میں اس کی شہرت بہت خراب تھی۔ اُسے انصاف سے زیادہ پیسوں کی فکر ہوتی تھی۔ پیسوں کے لیے وہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگادیتا تھا۔ لندن کے قانونی حلقوں میں اسے طنزاً 'سر بُل فیس۔ ڈبل فیس' کہا جاتا تھا۔ یعنی بیل کے چہرے والا۔ دُگنی فیس۔'

فلیچر اپنے معاصرین ہوریس ویل پول اور جان ویکیز سے دلی طور پر شدید نفرت کرتا تھا۔ جب مقدمے میں اسے سرکار کی طرف سے وکیل جراح کے طور پر لیا گیا تب لندن کے معروف قانون داں لارڈ مینسفیلڈ نے کہا تھا کہ "مجھے خدشہ ہے کہ وہ جیوری کے ارکان کو گمراہ کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ جس نے بھی اس کے ساتھ کسی عدالت میں مقدمہ لڑا ہے، وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی کے ساتھ ہونے والی عدالتی بے انصافی کو روکنا بہت ہی مشکل ہے۔"

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو یوگن کو جج کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس وقت وہ کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اگر سماعت کے دوران مجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہوجائے جو عدالت کے آداب کے خلاف ہو تو یہ سمجھ کر مجھے معاف کردیا جائے کہ میں پہلی بار کسی عدالت کے روبرو پیش ہورہا ہوں۔ مجھے عدالت کے آداب کا کچھ علم نہیں ہے۔" اس کے بعد وہ کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "جنابِ والا...... میں یہاں تنہا ہوں، میرا کوئی معاون نہیں، میرا کوئی وکیل نہیں اور قانون کے معاملے میں میرا علم بہت ہی محدود اور واجبی سا ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ شاید یہ میرے اپنے ہی دفاع میں میرے دلائل ثابت ہوں۔" جج نے اسے کہنے کی اجازت دے دی۔

"جنابِ والا......" اجازت ملنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ کمرۂ عدالت مقدمے کی کارروائی سننے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب یوگن نے بولنا شروع کیا تو ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔

یوگن نے سب سے پہلے اپنے سماجی و علمی مرتبے، مہذب اور قابلِ عزت زندگی بسر کرنے کے حوالے سے تفصیلی تذکرہ کیا۔ اس موقع پر اُس نے کیرس بوروگ، لندن اور پھر نارفاک کے حوالے دیے اور بتایا کہ ان تینوں مقامات پر اُس نے اب تک کی پوری زندگی بسر کی ہے لیکن کوئی بھی شخص اس کے ذاتی کردار پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ "میری پوری زندگی شائستگی اور علم سے عبارت ہے۔ مجھے خوشحالی بھی حاصل ہوئی۔

لوگ مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میری کوئی ایسی مجبوری نہیں تھی کہ جس کی وجہ سے میں ایک غلط کام کر کے اپنی پوری زندگی، کردار اور عزت کو داؤ پر لگا دوں۔"

دوسری اہم بات جو اس نے کی وہ یہ تھی۔ "اس طرح کا جرم کسی اشد ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے یا پھر آسائش حاصل کرنے کے لیے مگر اس جرم کے سرزد ہونے کے وقت نہ تو میں بہت ہی مجبور تھا اور نہ ہی سخت پریشان۔ رہی بات یہ کہ اگر یہ جرم میں نے کیا تھا تو پھر جو رقم ملی، اس سے مجھے فوراً آسائشیں حاصل کرنا چاہیے تھیں مگر میں اب تک نہایت سادہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں ملازمت کر کے اپنی گزر بسر کر رہا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اگر جرم میں نے کیا تو پھر وہ دولت کہاں چلی گئی؟"

بیرسٹر نوریسن اُنیسویں صدی میں برطانیہ کے نہایت اہم قانون داں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "قانون کی کتابوں میں یوگن کا مفصل بیان موجود ہے۔ میں نے بھی اسے تفصیل سے پڑھا ہے۔ وہ وکیل نہیں تھا لیکن جس طرح اس نے عدالت کو مخاطب کر کے نہایت سادگی سے مگر جامع انداز میں اپنی بات کہی، وہ دفاع کے لیے کسی بھی تجربہ کار قانون داں کے بہترین دلائل سے کم نہیں تھے۔ اس بیان سے اُس کی علمیت اور ذہانت صاف جھلکتی ہے۔"

یوگن ایرم سے جج نے سوال کیا کہ "ڈینئل کلارک کی گمشدگی اور ان ڈھانچوں کے ظاہر ہونے کے بعد اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اُسے قتل کیا جا چکا ہے۔ وہ غائب ہو کر کہیں خاموش زندگی نہیں گزار رہا بلکہ اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔"

یوگن نے جج کے اس سوال کو مسترد کر دیا۔ اس نے کہا۔ "کسی ڈھانچے کے مل جانے سے کہیں پر بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ڈینئل کلارک نامی اُس مرد کا ہے جو برسوں پہلے پُراسرار طور پر لاپتا ہو گیا تھا۔" اس نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔ "ایک ڈھانچا ملا ہے۔ اس ڈھانچے کو دیکھ کر بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے انسان کا ڈھانچا ہے جسے مرنے کے بعد اُسے اُس مقام پر دفن کر دیا گیا تھا جہاں سے یہ ملا ہے مگر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مرد کا ہی ڈھانچا ہے۔ کسی انسانی ڈھانچے کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لینا کہ وہ کسی مرد یا عورت کا ہے اور پھر اسے کسی لاپتا مرد یا عورت کا ڈھانچا فرض کر کے اس کی موت تسلیم کر لینا اور اس جرم میں کسی کو گرفتار کر لینا ناانصافی ہے۔"

یوگن کا یہ نکتہ بہت اہم تھا۔ کسی ڈھانچے کو دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ مرد یا عورت کا ہے۔ بیسویں صدی میں طبّی سائنس نے یہ استعداد حاصل کر لی تھی کہ ڈھانچے سے اُس کی جنس کا پتا چلایا جا سکتا ہے مگر اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں اس طرح کی طبّی سائنس کا سرے سے ہی کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ یوگن کے اس نکتے کے حامی اکثر قانون دانوں کا ماننا ہے کہ یہ وہ نکتہ ہے جس پر مقدمہ خارج اور یوگن کو بری کیا جا سکتا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ عدالت نے اس نکتے پر توجہ مرکوز نہیں کی۔ وکیلِ جرح بدستور اس بات پر مصر تھا کہ ڈھانچا لاپتا ڈینئل کا ہی ہے اور یوگن اُس کا قاتل ......اور بس!

آگے کی سماعتوں میں یوگن نے سات یا آٹھ ایسی مثالیں پیش کیں جب سینٹ رابرٹ کی اُس غار نما خانقاہ سے انسانی ہڈیوں کے ملنے کے واقعات سامنے آئے تھے۔ یوگن کی دلیل تھی کہ وہ غار ایک راہب کی غار تھی، جس کی وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ اگر مرنے کے بعد وہ اس غار میں دفن ہوں گے تو اُن کی روحوں کو ابدی سکون حاصل ہوگا۔ ممکن ہے کہ بہت پہلے اس خیال سے کئی لوگ وہاں دفن ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جن کے مرنے اور وہاں دفن کیے جانے کے بارے میں آج قصبے کے لوگ لاعلم ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سو برس پہلے کا واقعہ ہو۔ ممکن ہے کہ پچاس سال پہلے۔ ممکن ہے کہ جو ڈھانچا اس وقت ڈینئل کا قرار دیا جا رہا ہے، وہ وہاں دفن ہونے والے کسی ایسے شخص کا ہو جو سینٹ راہب کا معتقد اور پیروکار تھا۔ "کوئی بھی بات ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی خیال ناممکن نہیں۔" یہ یوگن کے اس دلائل کا آخری جملہ تھا۔

اس موقع پر جج نے یوگن سے کہا کہ "غار سے ملنے والے ڈھانچے کے سر کے عقبی حصے پر شدید چوٹ کا نشان تھا، کسی بھاری چیز کو مار کر اسے قتل کیا گیا تھا۔ جس کا ثبوت کھوپڑی کی ٹوٹی ہوئی ہڈی ہے۔"

"ٹوٹی ہوئی کھوپڑی سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کیا گیا تھا۔" یوگن نے یہ نکتہ بھی مسترد کر دیا تھا۔ اس نے ٹوٹی ہڈی کی وضاحت کرنے کے لیے ایک نظیر پیش کی۔ "1683ء میں یارک شائر کے آرچ بشپ کی میت کو دوسرے مقام پر بوجوہ دفن کیا جا رہا تھا۔ ان کا تابوت مدفین کے مدتوں بعد قبر سے باہر نکال کر کھولا گیا تو ان کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی پائی گئی تھیں مگر انہیں تو تشدد کر کے قتل نہیں کیا گیا تھا پھر ہڈیاں کیسے ٹوٹی تھیں؟"

یوگن نے وکیل کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ وکیل نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے اپنا دفاع خود کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جج کا ایسا کوئی ریمارکس یا سوال نہیں تھا جس کا وہ

انداز میں جواب نہ دیتا ہو۔ سب کو اندازہ تھا کہ یوگن الزام سے بری ہو جائے گا لیکن لندن کی اشرافیہ کا ایک طبقہ تھا جسے اس کی رہائی پسند نہ تھی۔ وہ ہر حال میں اسے سزا دلوانا چاہتے تھے۔ البتہ سنجیدہ لوگوں کا ایک طبقہ ایسا تھا جسے یقین تھا کہ اگر انصاف کے تقاضے پورے ہوئے تو یوگن الزام سے بری ہو جائے گا۔ مقدمے کی کارروائی کا تفصیلی احوال لندن کے اخبارات میں تواتر سے شہ سرخیوں شائع ہو رہا تھا۔ عام لوگوں کی دلچسپی بھی اس مقدمے میں بڑھ گئی تھی۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ اُس دور کا نہایت سنسنی خیز مقدمہ سمجھا گیا تھا۔

جرح ور دفاع کے درمیان سوال و جواب کا ایک طویل سلسلہ چلا جس کے بعد آخری بار جج نے یوگن کو کچھ کہنے کا موقع دیا۔

"میں ایک سال سے قید میں ہوں اور اب اپنے دفاع میں آخری بار کچھ کہنے کو کہا گیا ہے۔" یوگن نے سرد لہجے اور گمبھیر آواز میں بولنا شروع کیا۔ سب دم بخود بیٹھے ہوئے تھے۔ "میں نے خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب یہی میرے مستقبل کا فیصلہ کرے گی...... میرے مستقبل کا فیصلہ عدالت، جیوری کے ارکان کو کرنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمرۂ عدالت میں بیٹھے لوگوں کی طرف مڑا۔ "میرے ہم وطنو...... مجھ پر لگائے گئے الزام کا ایک فیصلہ عدالت اور جیوری کرے گی۔ دوسرا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ عدالت کے فیصلہ سنائے جانے کے بعد آپ میرے مقدمے کی جیوری ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور پھر کچھ دیر بعد کہنے لگا۔ "آپ یا آپ کی آنے والی نسل فیصلہ کرے گی کہ میں مجرم تھا یا بے قصور۔" یہ اس مشہور مقدمے کے 'مرکزی ملزم' یوگن ایرم کے آخری الفاظ تھے۔ اُس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ یوگن کے الفاظ تاثیر سے بھرپور، اپنے دفاع میں دیے گئے دلائل ٹھوس اور لہجہ بے گناہ انسان کا تھا مگر اس وقت جج اور جیوری کے ارکان نے اس پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔

وکیل جرح 'سر نیل فیس۔ ڈبل فیس' نے طرح طرح کے پینترے بدلے۔ وہ ہر ممکن طور پر جج اور جیوری کو یہ باور کروانے میں لگا رہا کہ وہ اپنی علمیت، ذہانت اور چرب زبانی کے باعث عدالت کا وقت خراب کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ جیوری کے ارکان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا "قتل اسی نے کیا تھا اور اب بچنے کے لیے دلیل کو ہتھیار بنا کر خود کو بچا رہا ہے۔"

"کیا آپ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم نہیں ہوتی کہ بھارت کے بعض اخبار جو پاکستان کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے، زبان کے سوال پر آپ کے حقوق کے خودساختہ محافظ بن گئے ہیں۔ کیا یہ بات معنی خیز نہیں ہے کہ وہی لوگ جو قیامِ پاکستان کے خلاف لڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کے بنیادی حقِ خودارادیت کی مخالفت کرتے رہے ہیں، یکایک آپ کے حقوق کے حامی بن گئے ہیں اور آپ لوگوں کو زبان کے سوال پر حکومت سے ٹکر لینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں آپ لوگوں کو اس پانچویں کالم سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کی سرکاری زبان کے سوال پر اپنے خیالات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ جہاں تک صوبے کی سرکاری زبان کا تعلق ہے صوبے کے لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ فیصلہ اس صوبے کے نمائندوں کے اور صرف ان کے منشا کے مطابق ٹھنڈے دل سے غور اور سوچ بچار کے بعد کیا جائے گا۔ لیکن پورے ملک کے لیے سرکاری زبان یعنی وہ زبان جو مختلف صوبوں کے درمیان تبادلۂ خیال کا ذریعہ بن سکے۔ ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی' لہٰذا پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔ یہی وہ زبان ہے جسے اس برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں نے پالا پوسا ہے جو پورے پاکستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس کی خاص اہمیت یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کے دوسرے ملکوں کی زبانوں کے بہت قریب ہے اور اسی زبان میں اسلامی کلچر اور روایات کا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے جو لوگ زبان کے سوال پر ایجی ٹیشن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں انہیں یہ تمام بخوبی معلوم لیکن ان کا مقصد اس ملک کے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا اور غیر بنگالی مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصب کی آگ بھڑکانا ہے۔"

اقتباس: قائداعظم کی معرکۃ الآرا تقریر، 24 مارچ 1948ء۔ ڈھاکا کنونشن

مرسلہ: فریحہ چنگیزی، کوئٹہ

برطانوی قانون دانوں نے بہت بعد میں اعتراف کیا کہ یوگن کا دفاع مضبوط تھا۔ وہ خود کو بے قصور ثابت کر چکا تھا۔ اس کے دلائل بہت عمدہ اور موثر تھے لیکن ان سب کے باوجود وہ اُس وقت جج اور جیوری کی رتی بھر ہمدردی بھی حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

دلائل ختم ہوئے تو جیوری کا صلاح ومشورہ شروع ہوگیا۔ جیوری ارکان بھی طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آخر جج نے فیصلہ دے دیا۔ اسے موت کی سزا سنا دی گئی۔ ایک ہفتے بعد اگلے سوموار کو اسے کیوس مائز کے جنگل کے برابر والے میدان میں کھلے عام پھانسی دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ جب یہ فیصلہ سنایا گیا، تب وہ ثابت قدمی سے عدالت میں کھڑا تھا۔

سزا سنائے جانے کے بعد دو تین سپاہی آگے بڑھے اور اُس وقت کے مروج برطانوی طریقے کے مطابق اسے کینوس کی بڑی سے چادر میں لپیٹ کر، رسیوں سے اچھی طرح باندھ کر جیل لے گئے۔ موت کی سزا پر عمل درآمد ہونے سے پہلے اسے ایک ہفتہ کال کوٹھڑی میں تنہائی کا عذاب جھیلنا تھا۔

یہ ہفتہ اس نے لکھنے پڑھنے میں گزارا۔ وہ دن رات لکھنے پڑھنے میں محو رہتا تھا۔ وہ اس کام میں اتنا منہمک تھا کہ کھانا پینا بھی بھول چکا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے چند قریبی دوستوں کو خط لکھے۔ اس خط میں اس نے یونانی، لاطینی، عبرانی اور کلیٹ زبان میں لکھے گئے فلسفے کے حوالے سے چند وہ اہم اصلاحات ونکات تفصیل سے بیان کیے جو اس کے ذہن رسا کی پیداوار تھے۔ اس کی یہ سرگرمیاں موت سے کچھ دیر پہلے تک جاری رہیں۔

سوموار کی صبح تھی۔ یوگن اپنی کال کوٹھڑی میں بدستور جاگ رہا تھا۔ اسے بھی وقت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کاغذات سنبھال کر ایک تھیلے میں رکھ رہا تھا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کا یہ سارا سامان اس کے مرنے کے بعد لندن میں اُس کے ایک جرمن دوست کو بھیج دیا جائے۔ قانونی طور پر وہ ایسا کرنے کے پابند تھے۔ بعد میں انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد پادری نے کچھ دیر تک اسے بائبل کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ موت اور زندگی پر کچھ باتیں کیں مگر وہ سب سے لاتعلق بیٹھا رہا۔ آخر میں جیل افسر نے ساتھ آنے والے سرجن کو اس کا طبی معائنہ کرنے کو کہا۔ یوگن نے بنا کچھ کہے فوراً اپنی کلائی اس کی طرف بڑھا دی۔ ڈاکٹر نے نبض چیک کی۔ ''سب کچھ ٹھیک ہے۔'' چند لمحوں بعد ڈاکٹر نے جیل افسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے، یوگن سمجھ گیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں چلنے کو تیار ہوں۔'' اگلے ہی لمحے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے جا رہے تھے۔

یہ 6 اگست 1959ء کی صبح تھی۔ اسے یارک شائر ایک گھنے جنگل کے سرے پر لکڑی کے لمبے ستون پر لٹکا پھانسی دے دی گئی۔ پھندے پر لاش کافی دیر تک جھولتی رہی آخر پولیس سرجن کو حکم دیا گیا کہ وہ طبی معائنہ کرے کہ آیا مر چکا ہے یا ابھی زندگی کے آثار باقی ہیں۔''

''کسی پتھر کی طرح بے جان اور سرد۔'' سرجن نے لاش کے معائنے کے بعد کہا اور سپاہی لاش کو پھندے پر جھو چھوڑ کر چل دیے۔

جج نے حکم دیا تھا کہ پھانسی کے بعد لاش کی تدفین نہ ہوگی بلکہ وہ پھندے پر اُس وقت تک جھولتی رہے گی، جب تک اس کا جسم سڑ گل کر ہڈیوں کے پنجر میں تبدیل نہیں ہو اور یہ ہڈیاں بھی ایک ایک کر کے اس کے جسم سے علیحدہ زمین پر نہ آگریں۔

قانونی طور پر اس کی لاش، باقیات یا تدفین کو جرم قر دے دیا گیا تھا۔ اس لیے لوگوں نے یارک شائر کے اس جنگل کے قریب سے بھی گزرنا چھوڑ دیا جہاں پھندے یوگن کی گلتی سڑتی لاش لٹک رہی تھی۔

بیس سال گزر گئے۔ یوگن کی لاش بدستور پھندے ہڈیوں کا ڈھانچا بنی جھولتی رہی۔ کہتے ہیں کہ کسی کو ہمت کہ اس بات پر احتجاج کرتا البتہ یوگن کی سب سے چھوٹی دوسروں سے بہت مختلف نکلی۔ بیس سال میں وہ جوان ہو تھی۔ وہ چوری چھپے ایک دو ہفتے بعد اُس طرف جاتی ج لاش پھندے سے لٹک رہی تھی۔ وہ نیچے گرنے والی ہڈیو نئے رومال پر رکھ کر بڑی احتیاط سے قبرستان لا کر دفن کر رہی۔ آخر ایک دن کھوپڑی بھی زمین پر آگری۔ پھندا ہوگیا اور کھوپڑی قبرستان کے اسی گڑھے میں ایک نئے رو میں لپٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹی میں مل گئی، جہاں اس سب سے چھوٹی اور چہیتی بیٹی نے باپ کی دیگر باقیات دفن تھیں۔

☆☆☆

رچرڈ تو یوگن ایرم کے خلاف سلطانی گواہ بن گیا تھا لیے اس کی جاں بخشی ہوگئی۔ ہنری ٹیری کو عدالت نے کر دیا تھا۔ فرانسز بھی رہا ہو گیا تھا۔ جس دن یوگن کو پھانسی گئی، اس دن کیرس بوروگ کے مشتعل باشندوں نے کے شراب خانے پر دھاوا بول دیا۔ اس کے گھر اور شر خانے کو نذرِ آتش کر دیا۔ رچرڈ اور فرانسز لوگوں کے خوف

کہیں روپوش ہوگئے تھے۔ کئی روز تک مشتعل ہجوم انہیں تلاش کرتا رہا مگر وہ ہاتھ نہ چڑھے۔ ہفتوں بعد لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہونے پر واپس قصبے کو لوٹے۔ رچرڈ ہاؤس مین 1777ء کو انتقال کر گیا۔ اس خوف سے اس کی میت قصبے کے قبرستان میں نہیں دفنائی گئی کہ کہیں اس سے نفرت کرنے والے مرنے کے بعد اس کی لاش قبر سے نکال کر اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ اسے کہاں دفن کیا گیا تھا؟ یہ بات قصبے کے صرف اُن چند معتبرین کو ہی معلوم تھی جو معتدل مزاج اور تشدد کو ناپسند کرنے والے تھے۔

☆☆☆

جیل میں سرانجام دیا گیا یوگن کا علمی کام بظاہر دوسرے کے لیے مشقت لاحاصل رہی ہوگی لیکن اس کا یہ علمی کام اس کے ایک دوست کے ذریعے دنیا تک پہنچ گیا۔ وہ کہتا تھا کہ میں ایک اسکالر ہوں مگر اس کی یہ بات کسی نے نہ مانی مگر پھر 1784ء میں اس کا ایک مفصل سوانحی خاکہ شائع ہوا۔ یہ جرمنی سے شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا Kippis's Biographica Britannica جس میں اعتراف کیا گیا تھا کہ ''یوگن ایرم یونانی، عبرانی، لاطینی اور کلیٹ زبانوں کے قدیم فلسفے کا ایک بہترین اسکالر تھا۔ ایسا اسکالر جس کا ہم عصر اُس وقت تک شاید ہی پورے برطانیہ میں کوئی ہو۔'' یہ ایک بہت بڑا اور پہلا اعتراف تھا اس کی علمی خدمات کا۔ کمرائے عدالت میں یوگن کے آخری الفاظ تھے: ''آپ یا آپ کی آنے والی نسل فیصلہ کرے گی کہ میں مجرم تھا یا بے قصور۔'' فیصلہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

برطانیہ کے عہد وکٹوریہ کی تاریخ، عموی دستاویزات ادب اور شاعری میں یوگن ایرم پر بہت کچھ لکھا ہوا ملتا ہے لیکن اس کی موت کے بعد بھی کئی سوالات ایسے ہیں جن کے جوابات اب تک کسی کو نہیں مل پائے اور نہ ہی توقع ہے کہ ان سوالوں کی تشنگی کبھی دور ہو سکے گی۔

کیا یوگن نے قتل کیا تھا؟

کہنے والے کہتے ہیں کہ اس کے دلائل گواہ تھے کہ وہ قاتل نہیں تھا۔ یہ درست ہے تو جیوری نے اسے کن وجوہات کی بنا پر قاتل قرار دیا تھا۔

جیوری اشرافیہ پر مشتمل تھی۔ وکٹوریہ عہد کی سرکاری یادداشتوں میں درج ہے کہ لندن میں، اس کی شاگردوں میں طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ایک مالدار شخص کی حسین و جمیل اور نازک اندام جواں سال بیٹی بھی شامل تھی۔ جس پر وہ

ہم میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو احساس کمتری کے زیرِ اثر قومی زبان کے استعمال میں شرم اور ہتک محسوس کرتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو بزعم خود، اردوئے معلّٰی کا وارث بنا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ ''اردوئے محلّہ'' کا زمانہ ہے۔ خود ہم سے بسا اوقات اس ضمن میں حماقت سرزد ہو جاتی ہے۔ دو چار روز پہلے کی بات ہے۔ ہم صبح اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلے اور سڑک پر ایک ٹیکسی رکوائی۔

''کہاں جانا ہے؟''

ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔ ہم نے بتایا ''بلدیہ عظمٰی!'' حیرت سے ہمیں گھورتے ہوئے بولا ''کراچی میں ہے؟''

ہم نے جھنجلا کر کہا ''نہیں، گھوٹکی میں ہے۔''

کہنے لگا ''صاحب! کیوں مذاق کرتے ہو، صحیح صحیح بتاؤ کہاں جانا ہے؟''

ہم نے کہا ''اور کس طرح بتائیں میرے بھائی! بندر روڈ پر لائٹ ہاؤس سینما کے پاس ہی تو ہے۔ سرخ پتھر سے تعمیر شدہ بلدیہ عظمٰی کی عمارت۔''

دروازہ کھول کر ہمیں اندر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑبڑایا ''سیدھی سادی اردو میں نہیں کہتے، کے ایم سی بلڈنگ!''

آپ نے دلاور فگار کا یہ قطعہ ضرور سنا ہوگا:

اک یونیورسٹی میں کسی سوٹ پوش سے
میں نے کہا کہ آپ ہیں کیا کوئی سارجنٹ
کہنے لگے کہ آپ سے مسٹیک ہوگئی
آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈیپارٹمنٹ

(ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کے مضمون سے اقتباس)

مرسلہ: عثمان قریشی، گھوٹکی

بری طرح فریفتہ ہوگیا تھا مگر یہ بات کہیں پر بھی لکھی ہوئی نہیں ملتی کہ اس مالدار شخص کا نام کیا تھا، اس لڑکی کا نام کیا تھا اور کیا اس عشق میں لڑکی بھی شریک تھی یا یہ یک طرفہ عشق تھا۔ آخر اس عشق کا انجام کیا ہوا تھا۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یوگن کو عبرت کی مثال بنانے میں طبقۂ اشرافیہ کے اس گمنام شخص کا ہاتھ تھا جو ایک غریب اُستاد کو اپنی بیٹی سے عشق کے جرم کی سزا دینا چاہتا تھا۔ ویسے جیوری بھی طبقۂ اشرافیہ پر مشتمل تھی۔ جیوری نے یوگن کے موثر دلائل کو کس کی ایما پر اہمیت نہیں دی تھی...... یہ سب حقائق کسی تاریک سرنگ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ایک سوال یہ بھی ہے......

اگر یوگن بے قصور تھا تو اس کی بیوی اینا نے مجسٹریٹ کے سامنے اپنا بیان حلفی کیوں دیا تھا؟ کیا وہ حقیقت جانتی تھی یا پھر اسے وہ موقع ملا تھا کہ جب اپنے لاپتا شوہر سے انتقام لے سکتی۔

شادی سے پہلے ڈینئل نے اس سے قریبی روابط قائم کر رکھے تھے۔ کیا اُس کی شادی کے بعد بھی اینا سے اس کے یہ تعلقات برقرار تھے۔

کیا وہ اپنے شوہر کی موت سے ڈینئل کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

کیا اینا جانتی تھی کہ یوگن زندہ ہے اور کبھی بھی لوٹ کر آسکتا ہے۔ کیا وہ چاہتی تھی کہ یوگن کبھی نہ لوٹے۔

وہ شدید جذباتی عورت تھی۔ کیا اس نے ڈینئل کی بے وفائی اور شوہر کی گمشدگی کے باعث رچرڈ، ہنری یا فرانسز میں سے کسی ایک سے یا پھر ان تینوں سے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ اگر یوگن لوٹ آتا تو یہ تعلقات برقرار نہ رہ پاتے......

تو کیا اس وجہ سے اینا نے اپنے شوہر کا کانٹا راہ سے صاف کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔

ایک اور اہم سوال یہ بھی ہے......

مجسٹریٹ کے سامنے اینا نے ایک ڈھانچے کو ڈینئل کے بجائے اپنے لاپتا شوہر کا قرار دیا تھا مگر مجسٹریٹ نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس نے دو سپاہی یوگن کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجے اور وہ کچھ روز میں ہی اسے گرفتار کر کے لے آئے تھے۔ اس وقت یوگن نارفاک کے علاقے کنگز لائن میں مقیم تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا مجسٹریٹ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ وہ اُس وقت کہاں ہے یا اگر وہ نہیں جانتا تھا تو پھر اسے کس نے بتایا کہ وہ کہاں رہ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے سپاہیوں کو ٹھیک اُس مقام پر اسے پکڑنے کے لیے بھیجا جہاں وہ مقیم تھا۔

سینٹ رابرٹ کی غار سے ملنے والے دو ڈھانچوں میں سے ایک کو تو ڈینئل کا قرار دیا گیا مگر وہ دوسرا کس کا تھا۔ جس ڈھانچے کو ڈینئل کا قرار دیا گیا تھا، اس کی حقیقت بھی سامنے نہ آسکی کہ آیا یہ واقعی ڈینئل کا ڈھانچا تھا۔

ڈینئل کلارک غریب جوتا ساز تھا۔ یوگن کی بیوی نے جذباتی تشنگی دور کرنے کے لیے اس کا سہارا لیا اور پھر یہ قصہ شروع ہوا جو برطانیہ کی تاریخ، قانون، علم اور ادب کا ایک اہم باب بن گیا مگر نہ تو کبھی ڈینئل کا کچھ پتا چلا، نہ وہ کبھی لوٹا اور نہ وہ سامان مل سکا جو اس نے ہتھیایا تھا۔

رچرڈ یوگن کے خلاف سلطانی گواہ بنا مگر نہ تو اس نے نہ ہی فرانسز اور نہ ہی ہنری نے یہ بتایا کہ اُس مال کا کیا ہوا جو ڈینئل کے پاس تھا۔

لاتعداد تشنہ سوالوں کی موجودگی کے باوجود جدید برطانیہ کے ابتدائی ایام کے ایک فلسفی اور اُستاد کو عبرت ناک سزائے موت دے کر یقیناً کچھ لوگوں کی تشفی ہوگئی ہوگی مگر انصاف کے پردے میں ہونے والی ناانصافی کی یہ عبرت ناک مثال ڈیڑھ صدی تک برطانیہ کے لوگوں کے لیے شدید شرمندگی کا باعث بنی رہی تھی۔ آج بھی برطانیہ کی عدالتی تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ موجود ہے۔

ایک برطانوی قانون داں ہنری ایڈورڈ کہتا ہے:

"ہم عدالت کے فیصلوں میں نظیر تلاش کرتے ہیں مگر یوگن کیس کے فیصلے کی نظیر کبھی کسی نے، کسی بھی عدالت کے سامنے پیش نہیں کی۔ سب اسے بُودا اور سوچی سمجھی سازش پر مبنی فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ یوگن کیس کے فیصلے کا ذرہ بھر احترام نہیں مگر یوگن کے دیے ہوئے بیان کو برطانوی قانون کی تاریخ کے طالب علم نہ صرف اہم سبق کے طور پر پڑھتے ہیں بلکہ اسے کلاسیکی درجہ حاصل ہو چکا ہے۔"

یوگن ایرم جنگِ عظیم اول تک برطانیہ کی افسانوی ہستی سمجھا جاتا تھا۔ اکیسویں صدی میں یہ برطانیہ کی کلاسیکی شخصیت کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اسے ایک ہیرو کا درجہ دیا جاتا ہے۔ موت کے ڈیڑھ صدی بعد تک وہ اپنے ملک میں شہرت کی بلندیوں پر موجود تھا۔ اسے علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے ذریعے ہیرو کا درجہ دیا گیا۔ اس کی بے گناہی ثابت کردی گئی مگر بے گناہ کے قتل کے پیچھے پوشیدہ اسرار بدستور گہری اور طویل تاریک سُرنگ کا حصہ ہیں۔ جو راز دو، سوا دو سو سال میں منکشف نہ ہوسکے۔ اب ان کے ظاہر ہونے کی امید بھی باقی نہیں رہی۔

عقل مند

سید احتشام

وہ جرائم کی بیخ کنی کے لیے بلوایا گیا تھا کیونکہ اس شہر کے محکمہ پولیس میں جتنے بھی اہل کار تھے سب کے سب نا اہل تھے، اس نے اپنی آمد کا اعلان عجب انداز میں کیا، ہائی وے پر پولیس موبائل کو روکا اور پستول تان لیا مگر جب ٹریگر دبایا تو پانی کی پھوار سپاہی کے چہرے کو بھگو گئی۔ اس کے اقدام عجیب و غریب ہوتے مگر جب نتیجہ سامنے آتا تو اس سے نفرت کرنے والے بھی موم ہوجاتے۔

سپر ہائی وے کے اس پار، ایک تختی نصب تھی جس پر یہ عبارت درج تھی "راکی بیچ۔ ایک میل!"

ڈان نے اپنی سیڈان لہرا کر اسی جانب موڑ دی اور ایک ہی لمحے کے بعد اسے شہر کی پہلی جھلک دکھائی دی۔ مکانات کی رنگ برنگ کی چھتیں، صبح کی نودمیدہ کرنوں میں چمک رہی تھیں اور ان کے سروں پر یوکلپٹس کے لاتعداد بلند و بالا اشجار نسیم صبح گاہی میں شرابیوں کی مانند ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ اس کے پس منظر میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس غبار میں جا بہ جا کشتیوں کے سفید بادبانوں کے مثلث اَن گنت نقطوں کی مانند نظر آرہے تھے۔

یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ اتنا حسین شہر لاقانونیت اور طوائف الملوکی کا شکار ہوگا لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ ڈان کے یہاں آنے کا سبب یہی تھا۔ اس کی عمر 38 سال تھی اور وہ اب تک بے شمار مشکلات اور ہنگاموں پر قابو پا چکا تھا۔ ہرچند کہ اس کے بالوں میں چاندی کے تار جھلکنے لگے تھے تاہم وہ حیرت انگیز طور پر تندرست اور صحت مند تھا۔ وہ درمیانہ قد اور ٹھوس جسم کا مالک تھا۔ اس کا منہ جس میں ہر وقت ایک بجھا ہوا سگار دبا رہتا، توانائی کا سرچشمہ لگتا تھا۔ آنکھوں سے نرمی

لیکن ساتھ ہی اضطراب اور غیر مصالحانہ تاثرات جھلکتے تھے۔ وہ پچھلے سترہ سال محکمۂ پولیس سے وابستہ تھا اور سخت گیر تصور کیا جاتا تھا۔

معاً اس کی نگاہ ایک اور تختی پر پڑی جس پر درج تھا۔ ''رفتار کی حد 35 میل فی گھنٹا'' اس کے عقب میں ایک پولیس کار خراماں خراماں شہر کی جانب رواں تھی۔ یہ پچھلے پہر کی گشتی کار تھی اور اب اپنے آخری گشت کے بعد واپس جا رہی تھی۔ ان دونوں کاروں کے سوا سڑک بالکل سنسان تھی۔

''یہ انہیں آزمانے کا ایک اچھا موقع ہے۔'' ڈان نے سوچا اور اپنی بغلی سیٹ پر رکھا ہوا ایک پستول اُٹھا لیا، جو ایسے ہی موقعوں کے لیے تھا۔ اس نے پستول کو ڈیش بورڈ پر رکھا اور کار کی رفتار میں اچانک اضافہ کر دیا۔ کار پچاس میل کی رفتار سے اس گشتی کار کے قریب سے گزر گئی۔ گشتی کار کی سرخ بتیاں فوراً روشن ہو گئیں اور وہ اس کا تعاقب کرنے لگی۔ ڈان نے انہیں چند لمحے تک تعاقب کرنے کا موقع دیا اور پھر اپنی کار روک لی۔ گشتی کار بھی رک گئی اور اس سے ایک پولیس آفیسر اُتر کر اس کے قریب آیا۔

''اتنی عجلت کا ہے کی ہے دوست!'' اس نے پوچھا۔

ڈان نے پلک جھپکتے اپنا وہ پستول اُٹھا لیا اور سیدھا کر کے ٹریگر دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول کی نال سے پانی کا فوارہ ایک لکیر کی صورت میں نکل کر پولیس آفیسر کو تر کر گیا۔ آفیسر اس غیر متوقع افتاد سے گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے ترچہرے پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''یہ...... کیا...... تم......!'' اس کے منہ سے بے ربط جملہ نکلا اور پھر اس کی نگاہ ڈان کے مبتسم چہرے اور ہاتھ میں موجود پستول پر پڑی اور اس کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا لیکن اس کیفیت میں الجھن کے تاثرات بھی شامل تھے۔

''میں ڈان ہوں۔'' ڈان نے کہا ''را کی بیچ کا نیا پولیس چیف۔ آج سے چارج سنبھال رہا ہوں اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے ...... اگر میرے پاس سچ مچ کا پستول ہوتا تو ٹھنڈے پانی کے بجائے تمہارا چہرہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔'' اس نے اپنا پرس نکال کر اس سپاہی کے ہاتھ میں دے دیا ''یہ رہا میرا ڈرائیونگ لائسنس۔''

سپاہی نے پرس لے لیا۔ ڈان نے اس سے پرس چھین لیا ''کوئی مشکوک پرس کبھی مت لیا کرو۔'' وہ بولا ''خود اسے اپنے پرس میں سے لائسنس نکال کر تمہارے حوالے کرنے دو اور اپنے ساتھی کو بلاؤ۔ ایسے موقعوں پر کسی سپاہی کو تنہا نہیں ہونا چاہیے۔''

چند ہی سیکنڈ کے بعد اس سپاہی کا ساتھی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ دونوں نوجوان اور ناتجربہ کار تھے۔ ڈان انہیں بُری طرح لتاڑنے لگا۔ ''ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والی کار کی جانب بڑھتے ہوئے بھی ہمیشہ محتاط رہو۔ بہت ممکن ہے، وہ کوئی لٹیرا ہو اور کسی پیٹرول پمپ کو لوٹ کر فرار ہو رہا ہو۔ وہ سمجھے گا کہ تم اسے وہ واردات کرنے کی بنا پر روک رہے ہو، لہٰذا کبھی ایسی حماقت مت کرنا۔''

دونوں خاموشی سے سنتے رہے لیکن ان کی آنکھوں سے برہمی جھلک رہی تھی۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ڈان کی پانی کے پستول والی حرکت خاصی گھٹیا تھی لیکن یہ پیشہ ہی گھٹیا تھا۔ یہ حرکت پولیس ٹریننگ کا ایک بہت ہی پُرانا حربہ تھی۔ ممکن ہے وہ سپاہی جس کا نام بٹلر تھا، اس سے نفرت کرنے لگتا لیکن آیندہ کے لیے اسے ایک اچھا سبق مل گیا تھا۔

''اچھا بچو!'' ڈان نے کہا ''میں تمہارے ساتھ پولیس اسٹیشن چل رہا ہوں۔''

صاف وشفاف اور خوبصورت سڑک پر ان کے ساتھ بڑھتے ہوئے ڈان کو ٹی فورس کے کیپٹن لوگان کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ''ڈان، را کی بیچ کی پولیس فورس کے ایک بھی جوان نے اکیڈمی کی شکل نہیں دیکھی ہے۔'' اس نے آگاہ کیا تھا ''وہ تو بس، کسی کو بیج اور ریوالور تھما دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جاؤ، شہر کو کنٹرول کرو۔ آج سے دو ہفتے قبل چند شریر نوجوانوں نے ایک گشتی سپاہی کو بُری طرح زدوکوب کیا اور پولیس چیف نے دباؤ میں آ کر استعفیٰ دے دیا۔ لیفٹیننٹ اسمتھ وہاں کا جونیئر آفیسر تھا اور کوریا کی جنگ کا ہیرو تسلیم کیا جاتا تھا۔ ائرفورس میں تھا۔ جنگ سے واپس آ کر اس نے بینک کے صدر کی بھتیجی سے شادی کر لی، اسے پولیس چیف کا عہدہ چاہیے تھا۔ آدمی اچھا تھا اس کے بے شمار دوست احباب تھے لیکن اسے صرف ایک شے کی کمی تھی اور وہ تھی پولیس کا دس سالہ تجربہ۔ اس نے بہت سے کونسلرز کو خرید لیا لیکن خوش قسمتی سے وہاں کے کمشنر ہارپر نے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور اس بات پر آمادہ کر لیا کہ باہر سے مدد طلب کرنی چاہیے۔ ہم نے تمہاری سفارش کی ہے۔ وہ لوگ تین ماہ کے لیے تمہیں مستعار لینا چاہتے ہیں۔''

''تین ماہ!'' ڈان نے کہا ''اس مدت میں تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ بہتر ہے، مجھے قبول ہے۔''

''وہاں خوش اسلوبی سے اپنا فرض نبھانا اور لوگوں کو اپنا دوست بنانا۔'' لوگان نے کہا ''تمہاری زندگی بن جائے گی۔''

''میں کوشش کروں گا۔'' اس نے جواب دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ خوش اسلوبی سے فرض نبھانا اور ساتھ ہی لوگوں کو اپنا دوست بنانا تقریباً ناممکن تھا۔

اس خیال کے آتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے ان دونوں سپاہیوں بٹلر اور فرینک کو دوست کے بجائے دشمن بنا لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی کار پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ یہ چھوٹے شہروں کے پولیس اسٹیشنوں جیسا ایک عام سا پولیس اسٹیشن تھا۔ وہ کار سے اُتر کر ان کے ساتھ چلتا ہوا ایک بغلی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ یہاں ایک کاؤنٹر تھا جس کے عقب میں ڈیسک سارجنٹ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طرف سلاخوں والا دروازہ تھا جو جیل کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔ دوسرا دروازہ اسکواڈ روم اور تیسرا فوٹو اور پرنٹ لیبارٹری میں کھلتا تھا۔ کاؤنٹر کی دوسری طرف آفس تھے جن پر ایک کے آگے چیف اور دوسرے کے آگے واچ آفیسر کی تختی لگی ہوئی تھی۔

ڈان نے سارجنٹ سے اپنا تعارف کرایا۔ سارجنٹ نے اس سے مصافحہ کیا اور مخاطب ہوا ''چیف، ہم آپ کے منتظر تھے۔ کیا میں سب لڑکوں کو بلاؤں؟''

ڈان نے اثبات میں سر ہلایا۔ سارجنٹ نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ فوراً بٹلر اور فرینک، اسکواڈ روم سے برآمد ہوئے۔ ان کے پیچھے چار مسلح سپاہی تھے۔ پھر واچ آفیسر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لیفٹیننٹ نمودار ہوا۔ ڈان، ڈیسک سے ٹیک لگا کر ان کا جائزہ لینے لگا اور وہ سب اسے متجسس نظروں سے گھورنے لگے۔ پھر خوردجوان العمر لیفٹیننٹ آگے بڑھا۔ وہ لگ بھگ تیس سال کا تھا۔ اس کے بال سنہرے تھے۔ ''ڈان گاربو؟'' اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔ اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔

ڈان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، اپنا کارڈ اس کے حوالے کر دیا۔ لیفٹیننٹ نے کارڈ پڑھا۔ پھر مصافحہ کیا ''مجھے اسمتھ کہتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''یہ لڑکے......!''

''ایک منٹ، لیفٹیننٹ!'' ڈان نے اسے روک دیا ''میں بے شک ان لڑکوں سے ملنا چاہتا ہوں لیکن پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ ایمرجنسی گاڑی کا رُخ باہر کی سمت کر دیا جائے۔ آیندہ میں انہیں عمارت کے رُخ کھڑی دیکھنا نہیں چاہتا۔''

اعضا کی تبدیلی (ٹرانس پلانٹ) کا ہنر سیکھنے کے بعد زندہ انسانوں میں اپنے اعضا فروخت کرنے کی رسم کا آغاز ہوا۔ اس وقت سے سائنس داں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طریقے سے انسانی اعضا تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک تصور یہ بھی پیدا ہوا کہ کیوں نہ جانوروں کے اندر اس طرح کی تبدیلی کی جائے کہ ان کے کچھ مطلوبہ اعضا انسانی جسم سے مطابقت پیدا کر لیں۔

سائنس دانوں نے پہلی مرتبہ جینیاتی عمل کے ذریعے بھیڑ اور انسان کی پیوند کاری کر کے ایک ایسا جانور تیار کیا جس کا جسم تو بھیڑ کی طرح کا ہے لیکن اس کے کئی اندرونی اعضا کافی حد تک انسانی اعضا کی مانند ہیں۔ اس مسئلے کو لے کر دنیا بھر میں ایک اور بحث بھی چھڑ گئی، کچھ لوگ اس کام کو غلط قرار دے رہے ہیں، ان کا موقف ہے کہ یہ انسان کی توہین ہے۔ جبکہ درست قرار دینے والوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ انسانوں کی بھلائی کے لیے کیا جا رہا ہے اور اس عمل سے مستقبل میں انسانی زندگیوں کو بچایا جا سکے گا۔

اقتباس: سائنس کے کرشمے از عاطف عزیز

مرسلہ: نہال احمد، کوٹ ادو

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر کئی سپاہیوں کے قدم دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آ کر بڑے ہی غیر دوستانہ انداز میں دیوار کے پاس اکٹھا ہو گئے۔ ڈان نے لیفٹیننٹ اسمتھ کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت اُڑی ہوئی تھی۔

''شکریہ، دوستو!'' ڈان نے کہا اور آگے بڑھ کر ہر فرد سے ہاتھ ملانے لگا لیکن ان لوگوں کے چہرے سے سردمہری ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے یقیناً اسے ناپسند کیا تھا لیکن اتنا نہیں جتنا کرنا چاہیے تھا۔ یہ محض ناپسندیدگی کی ابتدا تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

پچھلے پہر کے گشتی سپاہی گھر چلے گئے اور دن والے اپنی

ڈیوٹی پر آگئے۔ ''اپنا کام معمولی کے مطابق جاری رکھو۔'' ڈان نے لیفٹیننٹ اسمتھ سے کہا ''لیکن سب سے پہلے فائلیں کھول لو۔''

☆☆☆

نئے دفتر میں دن کا بیشتر حصہ ریکارڈ کی چھان بین میں گزر گیا۔ صورتِ حال کیپٹن لوگان کے بیان سے کہیں بدتر تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا تو ذکر ہی کیا، وہاں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں پستول تک پکڑنا نہیں آتا تھا۔ لہٰذا اگر کونسل متفکر ہوگئی تھی تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس پُرسکون شہر کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگ مختلف جگہوں سے آ کر وہاں آباد ہو رہے تھے لہٰذا اسے جلد از جلد اس محکمے کو اچھی شکل وصورت میں لانا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔

دن کے دو بجے چھریرے جسم اور سنہرے بالوں کا مالک کمشنر ہارپر، جو ایک بہت بڑے ہارڈ ویئر اسٹور کا مالک بھی تھا، تین افراد کے ساتھ وارد ہوا۔ ان میں سے ایک میئر تھا اور دو کونسل کے ممبر تھے۔ ہارپر ایک خوش مزاج شخص تھا۔ ڈان کو وہ پہلی ہی نگاہ میں پسند آیا۔ کونسل کے ممبران نے تجویز پیش کی کہ اس موقعے پر ایک گروپ فوٹو اُتروایا جائے تاکہ اخبار میں شائع کیا جاسکے لہٰذا وہ سب لان میں چلے گئے۔ وہاں تصویر اُتروائی اور پھر ڈان اپنے دفتر میں واپس آ کر فائلوں میں کھو گیا۔

تین بجے وہ اُٹھ کر بس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کی بیوی جینیٹ پہنچنے والی تھی۔ وہ سامان باندھنے کے لیے شہر میں رک گئی تھی۔ وہ دمہ کی مریض تھی۔ حال ہی میں اس پر دمے کے شدید حملے ہو چکے تھے۔ ڈان اس کی صحت کی طرف سے بے حد متفکر اور پریشان رہتا تھا۔ جب وہ بس سے اُتری تو ڈان اس کی شوخ بھوری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھ کر رنجیدہ ہوگیا۔ انہوں نے وہیں ایک ریستوران میں کافی پی اور پھر اپارٹمنٹ کی تلاش میں نکل پڑے۔

''کتنا حسین شہر ہے۔'' جینیٹ نے پُرمسرت لہجے میں تبصرہ کیا ''اور ہوا کتنی صاف اور لطیف ہے۔ مجھے یہ جگہ بے حد پسند آئی۔''

''لیکن تمہیں زیادہ تر تنہا رہنا پڑے گا۔'' ڈان نے نرمی سے اس کا بازو چھو کر کہا ''لہٰذا، آؤ سمندر کے کنارے کسی خوبصورت مقام پر اپارٹمنٹ تلاش کرتے ہیں۔''

''جہاں سے سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہو۔'' وہ خوش ہو کر بیچ ہی میں بول پڑی لیکن دوسرے ہی لمحے افسردہ ہوگئی ''نہیں ڈان! اس کا کرایہ بہت ہوگا۔''

''فکر مت کرو۔'' ڈان نے اصرار کیا اور دونوں نے ساحل پر ایک اچھا سا اپارٹمنٹ ڈھونڈ نکالا۔ پھر اس کے مالک سے کرایہ طے کیا اور اسی وقت اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئے۔ جینیٹ کھانا تیار کرنے لگی اور وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔

☆☆☆

اگلی صبح، اس نے اپنے سارے ماتحتوں کو اکٹھا کر کے اعلان کیا ''ہم کل شام کے سات بجے سے کلاسیں شروع کر رہے ہیں۔ یہ کلاسیں ہفتے میں دو دن ہوا کریں گی۔ اپنے فرائض سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ کلاسیں بے حد اہم ہیں۔''

مجمع میں بہت سوں کے حلق سے غراہٹ نکل گئی لیکن اس نے مطلق توجہ نہیں دی ''ہمارے قریب ہی چاند ماری کا میدان ہے۔ ہم اسے استعمال کریں گے۔ اب سب لوگ اپنا اپنا پستول دکھائیں۔''

فضا میں کھٹ کھٹ کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ ڈان ان کے درمیان ٹہلتا ہوا، ہر ایک کے پستول کا معائنہ کرنے لگا۔

''اس کی صفائی کرو اور اس میں تیل ڈالو۔'' اس نے ایک سپاہی کے ہاتھ میں موجود اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کی جانب اشارہ کیا ''یہ ٹھیک ہے۔'' اس نے اگلے سے کہا۔ پھر ایک پچیس سالہ سپاہی کے سامنے رک گیا۔ اس کا نام ایڈی تھا۔ ''ایڈی!'' وہ مخاطب ہوا ''کیا اس ریوالور سے کبھی گولی چلی ہے؟''

''کیوں...... نہیں سر!'' ایڈی نے جواب دیا۔

''ہوں......'' اس نے ہنکاری بھری ''کیا تم نے کبھی گولی چلائی بھی ہے؟''

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر مجمع میں سے کسی نے فقرہ چست کیا ''ایڈی ایک عاشق ہے، قاتل نہیں۔''

لوگ منہ دبا کر ہنسنے لگے۔ ایڈی کا چہرہ خفت سے گلابی ہوگیا ''نہیں، سر!'' اس نے بالآخر جواب دیا۔

''کیا تمہیں اس کا اندازہ ہے کہ اگر کسی لڑائی میں تمہارا ٹکراؤ کسی نشانہ باز مجرم سے ہوگیا تو کیا ہوگا؟'' اس نے برہمی سے پوچھا ''اس سے پہلے کہ تم یہ فیصلہ کر سکو کہ پستول کس ہاتھ میں پکڑنا چاہیے، وہ تمہاری انتڑیاں نکال دے گا۔ آج رات میدان میں پہنچ جاؤ اور چاند ماری شروع کردو۔''

وہ آگے بڑھ گیا اور پھر ایک پستہ قامت اور ٹھوس جسم کے مالک سپاہی کے پاس رک گیا ''کارلوس؟''

''جی ہاں جناب!''

''ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم واحد سپاہی ہو جو شوٹنگ بونس وصول کر رہے ہو۔ تم نے نشانہ بازی کہاں سے سیکھی ہے؟''

''سر، میں میرین میں تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''بہت خوب۔ کیا تم ان لڑکوں کو نشانہ بازی سکھانا پسند کرو گے؟''

''ہاں، کیوں نہیں سر! اگر یہ مجھ سے سیکھنا چاہیں تو ضرور سکھاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، آج تم ایڈی کو اپنے ساتھ شوٹنگ کے لیے لے جاؤ۔'' اس نے ہدایت کی اور اس کے ساتھ ہی مجلس برخاست کر کے اپنے چیمبر میں چلا گیا اور شبینہ رپورٹوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ ایک رپورٹ نقب زنی کی تھی۔ دو ٹریفک کے حادثات کی اور ایک نوجوانوں کی دہشت گردی کی۔ اس نے یہ رپورٹیں فائل میں رکھیں اور کمشنر ہارپر سے ملنے اس کے اسٹور پہنچ گیا۔ ہارپر نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔

''کمشنر!'' وہ گویا ہوا ''مجھے 22 کیلبر کی چھ یا آٹھ رائفلیں اور ڈھیر ساری گولیاں چاہئیں۔ لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مقامی تجار مل کر سب کچھ فراہم کردیں۔''

''یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔'' کمشنر ہارپر نے کہا ''تم ان کا کیا کرو گے؟''

''اس سے پہلے کہ وہ اپنے ریوالور سے خودکشی کرلیں، میں اپنے جوانوں کو بائیس بور کی رائفل چلانا سکھانا چاہتا ہوں اور جیسے ہی وہ سیکھ جائیں گے، ہم ہر اسکول کے ان لڑکوں کو مفت نشانہ بازی کی کلاس میں شمولیت کی دعوت دیں گے جو نشانہ بازی سیکھنا چاہیں گے۔''

''میرے خدا!'' ہارپر بولا ''کیا تم انہیں لوگوں کو ہلاک کرنا سکھانا چاہتے ہو؟''

''یہ بات نہیں ہے۔'' ڈان نے جواب دیا ''آج کل کے لڑکے بے حد کاہل ہوگئے ہیں کیونکہ انہیں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ حالانکہ وہ جسمانی اعتبار سے بالکل جوان ہوتے ہیں۔ انہیں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ نشانہ بازی ان کی کاہلی دور کر کے انہیں چاق و چوبند کردے گی۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ اگر یہ لڑکے ایک بار میرے جوانوں سے گھل مل گئے تو ان کے دلوں میں پولیس والوں کے خلاف جو نفرت ہے وہ ختم ہو جائے گی اور وہ ایک دوسرے کا احترام کرنے لگیں گے۔''

ہارپر کچھ دیر اس کی باتیں سن کر سوچتا رہا اور پھر گویا ہوا ''چیف، یہ بیل مشکل ہی سے منڈھے چڑھے گی، تاہم میں جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔''

وہاں سے دفتر واپس آ کر اس نے ایک حکم نامہ تحریر کر کے اسکواڈ روم کی دیوار پر چسپاں کردیا۔ ''اب ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کو میئر کی جانب سے سمن جاری کیے جائیں گے، کوئی بھتہ وصول نہیں کیا جائے گا۔''

یہ خاصا سخت حکم تھا لیکن اس کی بہت ضرورت تھی۔ اس نے سوچا، شاید اس سے دوستوں میں اضافہ نہ ہو۔ اس شام کلاس لیتے ہوئے، وہ حاضری کے رجسٹر سے باری باری سب کا نام پکار رہا تھا۔ وہاں سولہ پولیس والے منہ بنائے بیٹھے تھے اور جواب دے رہے تھے۔ جب اس نے اسٹین کا نام پکارا تو نیم دلی سے جواب ملا ''حاضر ہوں۔''

ڈان نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا ''کیا اسٹین حاضر ہے؟''

''نہیں۔'' دو تین آوازوں میں جواب آیا ''حاضر نہیں ہے۔''

ڈان نے اس شخص کی جانب دیکھا، جس نے اسٹین کے بدلے جواب دیا تھا۔ اس کا نام فلن تھا۔ ڈان نے اس کا نام پکارا۔

''حاضر ہوں۔'' یہ وہی آواز تھی۔

ڈان نے کلاس کے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر مسکرانے لگا۔

''میں تمہاری وفاداری کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' وہ بولا ''لیکن اسٹین سے ملاقات ہو تو کہنا کہ تم نے کوشش کی تھی۔''

بے اختیار سب لوگ ہنس پڑے اور فلن کھسیانا سا نظر آنے لگا۔ ڈان نے ایک نیا سگار اپنے دانتوں میں دبا لیا اور تختۂ سیاہ کی جانب مڑ کر یہ بتانے لگا کہ کسی مفرور مجرم کی کار کا تعاقب کیسے کرنا چاہیے، کسی تاریک علاقے میں روشنی کے بغیر کس طرح داخل ہونا چاہیے۔ ریوالور اور فلیش لائٹ کس طرح سنبھالنا چاہیے اور کسی گھر میں داخل ہو کر تاریکی میں گھات لگائے ہوئے نقب زن کو کس طرح دبوچنا چاہیے، وغیرہ۔ دھیرے دھیرے لوگوں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لینا شروع کردی بجز، اسمتھ کے۔ وہ سب سے پچھلی قطار میں بیٹھا خاموشی اور توجہ سے اس کی باتیں سنتا اور نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ جب سب لوگ رخصت ہونے لگے تو ڈان نے کارلوس سے پوچھا ''ایڈی چاند ماری میں کیسا رہا؟''

کارلوس خفیف سا مسکرایا ''اس نے کافی دلچسپی لی۔''

''یہ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ وہ ٹریگر دباتے وقت اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے، وہ دلچسپی لے رہا ہے۔''

''بہتر ہے، اسے سکھاتے رہو۔ اسے ہر قیمت پر سیکھنا ہے۔'' ڈان نے کہا۔

☆☆☆

اگلے روز ڈان کی کار میں پولیس ریسیور نصب کر دیا گیا اور رات کے کھانے کے فوراً بعد وہ سونے چلا گیا لیکن دو بجے اُٹھ گیا۔ ایک کپ کافی پی اور ڈرائیو کرتا ہوا شہر کی سمت روانہ ہو گیا۔ ایک جگہ درختوں کی چھاؤں میں کار روکی، اپنا ریڈیو آن کیا اور ایک نیا سگار دانتوں میں دبا کر، گشتی کاروں کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگا۔ رات کے تین بجے اچانک اس کا ریڈیو آن ہو گیا اور آواز آئی ''کار کا نمبر 4۔ تین تین دو...... ماریپوس لین پہنچو۔ وہاں شکار موجود ہے۔''

کار نمبر 4 سے فلن اور اسٹین نے جواب دیا۔ وہ پتا وہاں سے دو بلاک کے فاصلے پر مغرب کی سمت تھا۔ ڈان نے گیئر بدلا اور اسی لمحے ایک گشتی کار کے سائرن کی آواز ہائی وے پر مغرب کی سمت بڑھتی ہوئی سنائی دی۔ ڈان نے جھلا کر اپنا سگار پھینک دیا۔ وہ دو گھنٹے تک کلاس میں یہ لیکچر دیتا رہا تھا کہ کسی شکار تک پہنچ کر اسے دبوچنا چاہیے۔ لیکن یہ کار نمبر 4 سائرن بجاتی چلی جا رہی تھی اور اس کی سرخ بتی بھی روشن تھی۔ اس طرح وہ گویا مجرم کو خبردار کر رہی تھی۔ ڈان نے ماریپوس لین پہنچ کر کار کا انجن بند کر دیا اور روشنیاں بھی گل کر دیں۔ ایک بلاک دور، اسے پولیس کار کی سرخ بتی نظر آئی اور پھر سناٹے میں بریک لگانے کی اتنی تیز اور سمع خراش آواز اُبھری کہ وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ شکار اب تک یقیناً ان سے میلوں دور پہنچ چکا ہو گا۔ وہ خاموشی سے آ کر گشتی کار تک پہنچا۔ فلن اور اسٹین کار کی چابی اگنیشن میں لگی چھوڑ کر مکان کے اندر جا چکے تھے ڈان نے چابی نکالی اور جیب میں رکھ کر اپنی سیڈان میں آ بیٹھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فلن اور اسٹین ناکام و نامراد مکان سے باہر آئے۔ اس نے اپنی سیڈان اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ اس کے پانچ ہی منٹ کے بعد اس نے پولیس اسٹیشن پہنچ کر ڈیسک سارجنٹ کو حیرت زدہ کر دیا جو اپنی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ وہ یکبارگی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور احمقوں کی طرح میز پر بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹنے لگا۔

''بہت جلد کچھ لوگ مجھ سے ملنے آنے والے ہیں۔'' ڈان نے کاٹ دار لہجے میں کہا ''میں اپنے دفتر میں ہوں۔''

اپنی میز پر پہنچ کر اس نے اسٹین کی فائل نکالی اور از سرِ نو اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہ ایک مایوس کن ریکارڈ تھا۔ کئی باتوں کے علاوہ شہریوں کی جانب سے ملنے والی تین شکایتیں بھی تھیں کہ انہوں نے اس کی سانس میں شراب کی بو محسوس کی تھی، لہٰذا اسے اب تک ملازمت سے برخاست کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کا جواب اس کی ملازمت کی درخواست میں مل گیا۔ یہ کہ وہ مقامی سیاست دان اور کونسل کے ایک ممبر فوربس کا سالا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے بغلی دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور پھر سارجنٹ کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سمع برگوش ہوئی ''ہائیں، یہ کیا ہوا؟''

''تمہارے پاس کار نمبر 4 کی دوسری چابی ہے؟'' آواز میں سختی اور برہمی تھی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

''تمہارے پاس جو تھی، وہ کیا ہوئی؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔

''اس کی فکر مت کرو۔ دوسری چابی دو۔'' جھنجلا کر کہا گیا۔

ڈان ٹہلتا ہوا ہال میں آ نکلا۔ اور اس نے چابی کاؤنٹر کی جانب اُچھال دی۔ وہ اسٹین تھا۔ اس نے چابی دیکھتے ہی پہچان لی اور غصے سے ڈان کی جانب مڑا۔ وہ ایک قد آور شخص تھا ''مجھے شبہ تھا کہ یہ کسی ایسے ہی شخص کی حرکت ہو گی جس نے ہم پر پانی کے پستول جیسی اوچھی حرکت آزمائی تھی۔'' وہ برہمی سے بولا اور ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ''سنو ڈان! آیندہ میری تحویل میں موجود کسی بھی شے کے ساتھ بندروں والی حرکت مت کرنا، سمجھ گئے؟''

ڈان نے اس کی برہم آنکھوں میں اپنی آنکھیں پیوست کر دیں ''اگر تم کلاس میں حاضر ہوئے ہوتے تو چابی اگنیشن میں نہ بھولتے جہاں سے کوئی بھی مجرم فرار کے لیے خود تمہاری کار استعمال کر سکتا تھا۔ اگلی کلاس جمعرات کو ہو گی تمہیں حاضر ہونا ہے۔ سمجھ گئے؟ اور ہاں، اس لمحے سے تم خود کو آزمائشی مدت میں تصور کرو۔ اگر کوئی معمولی سے معمولی غلطی بھی کی تو تمہاری شامت آ جائے گی۔'' وہ مڑ کر آگے بڑھ گیا۔ پھر رک کر پلٹا ''ایک اور بات بھی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم ابھی سے ایک دوسرے کو جان لیں۔ اگر تم میرے سالے بھی ہوتے تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنے چیمبر میں داخل ہو گیا۔

اب اس نے سٹی کونسل میں ایک دشمن بنا لیا تھا۔ عجیب بات ہے، آپ پولیس فورس میں رہ کر جب بھی کوئی قدم اُٹھائیں گے، ایک دشمن بنا لیں گے۔ لوگان نے کہا تھا ''تمہیں صرف اور صرف یہ کرنا ہے کہ لوگوں کو اپنا دوست بنانا ہے، اس طرح تمہاری زندگی سنور جائے گی۔'' وہ اس بات سوچتے ہوئے اپنے سگار کو گھورنے لگا اور پھر اسے پھینک کر گھر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز اس نے ایک اور دوست گنوا دیا۔ کونسل کے ایک ممبر بکنر نے اس کے پاس آ کر اس سے ریوالور کا پرمٹ طلب کیا۔ لیکن ڈان کے پوچھنے پر وہ اس کے استعمال کی کوئی تسلی بخش وجہ بیان نہ کر سکا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس طرح خود کو محفوظ تصور کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ کونسل کا ممبر ہونے کی بنا پر ڈان اسے پرمٹ دے دے گا۔

''ایک ریوالور رکھ کر تم محفوظ ہونے کے بجائے زیادہ غیر محفوظ ہو جاؤ گے۔'' ڈان نے جواب دیا۔

بکنر غصے سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ چلا گیا۔ ڈان نے گویا اس کی سخت توہین کی تھی۔ جمعرات کی شام، اسٹین تاخیر سے کلاس میں حاضر ہوا لیکن ہوا ضرور۔ اسی روز ڈان نے کسی مکان پر چھاپہ مارنے کی فلم دکھائی۔ اس سے اگلی بار بلوے پر قابو پانے، شہریوں کو گرفتار کرنے، خطرات پر قابو پانے اور گھریلو جھگڑے سے نمٹنے سے متعلق فلمیں دکھائیں۔ پھر چاندنی راتوں میں انہیں باہر لے جا کر میدانی حربے سکھائے۔ ہر منگل کو پوری کلاس نشانہ بازی کرتی۔ اس طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ اس دوران وہ اپنے آدمیوں کی صلاحیتوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اور اسے ان کی صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافہ نظر آیا۔ اب وہ پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ خود اعتمادی سے چل پھر سکتے تھے اور گفتگو کر سکتے تھے اور ان میں ایک طرح کا رکھ رکھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اسے ناپسند کرتے تھے، خاص کر اسمتھ تو اسے سخت ناپسند کرتا تھا لیکن اس کی محنت کا نتیجہ سامنے آ رہا تھا۔

اپنی واپسی سے دس روز قبل اس نے جرائم کے ریکارڈ کا معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر اسے گہرا اطمینان حاصل ہوا کہ جرائم میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ مزید یہ کہ اس کے جوانوں نے پہلے کی بہ نسبت بائیس بور کی رائفل سے چاند ماری میں کہیں زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ یہ ریکارڈ اتنا شاندار تھا کہ وہ خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے سوچا کہ اگر معاملہ اتنی ہی خوبی سے چلتا رہا تو یہ ایک کارنامہ ہو گا۔ لیکن اگلے ہی روز ایک گڑبڑ ہو گئی۔

ایک سبزی فروش کلائنٹ، جس کی دکان ہائی وے پر واقع تھی، اس کے پاس آیا اور اس نے ایک آفیسر کو برخاست کرنے کی درخواست کی جس نے اس کے بیٹے کو بری طرح زدوکوب کیا تھا۔ ''میرے لڑکے نے ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی ضرور کی تھی لیکن اس آفیسر کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی اور اس نے میری بیوی کے سامنے اتنی بُری بُری گالیاں دیں جنہیں میں یہاں دُہراتے ہوئے بھی شرم محسوس کر رہا ہوں۔''

''اگر اس نے تمہاری بیوی کے سامنے گالیاں دی تھیں تو تم وہ گالیاں میرے سامنے دُہرا سکتے ہو۔'' ڈان نے کہا ''اس نے کیا کہا تھا؟''

کلائنٹ نے ایک ایک گالی اس کے سامنے دُہرا دی۔ ڈان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کلائنٹ ایسا آدمی نہیں تھا جو غلط بیانی سے کام لیتا۔ ڈان، ایسی گالیاں دینے والے کو فوراً ہی پہچان گیا۔ وہ اسٹین کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

کلائنٹ کے جانے کے بعد اس نے اسٹین کو فون پر طلب کیا ''ایک گھنٹے کے اندر اندر حاضر ہو جاؤ اور اپنا ریوالور اور بیج بھی لیتے آؤ۔''

تھوڑی دیر کے بعد اسٹین حاضر ہو گیا ''تمہیں ڈیوٹی پر شراب پینے اور انتہائی ناروا سلوک کرنے کی بنا پر ملازمت سے برخاست کیا جاتا ہے۔'' ڈان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اسٹین کا چہرہ راکھ رنگ ہو گیا اور حلق خشک ہو گیا۔ تاہم اس نے ان الزامات کی تردید نہیں کی۔ ساتھ ہی ڈان کو یہ احساس دلایا کہ اس کا بہنوئی، ملازمت سے برخاست کیے جانے کو پسند نہیں کرے گا۔

''بہت ممکن ہے۔'' ڈان نے عام سے لہجے میں کہا ''لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

اسٹین رخصت ہو گیا۔ اس کے پندرہ منٹ کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے بولنے والا اسٹین کا بہنوئی، کونسل کا ممبر فوربس تھا ''صبح بخیر ڈان!'' وہ بولا، اس کے لہجے سے گہری دوستانہ گرم جوشی جھلک رہی تھی۔ اس نے لہجے کی ساری گرم جوشی یہ بتانے میں صرف کر دی کہ...... وہ ڈان کو اچھی طرح جانتا ہے اور یہ کہ اس کے سالے کو شاید اس کی جانب سے تھوڑی بہت غلط فہمی ہو گئی ہے۔ چنانچہ معاملے کو رفع دفع کر دیا جائے۔

''مجھے افسوس ہے۔'' ڈان نے جواب دیا ''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ لوگ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک آفیسر ڈیوٹی پر شراب پیے اور گندی گالیاں دے۔''

''میں اس سلسلے میں اس سے گفتگو کروں گا۔'' فوربس نے وعدہ کیا ''اور اسے صاف صاف بتا دوں گا کہ......''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔'' ڈان نے بات کاٹ کر کہا ''اسے یاد آ گیا کہ لوگ پہلے بھی اس کی شکایتیں کر چکے

تھے۔ ”جب تک میں یہاں ہوں، ہم اسے استعمال نہیں کرسکتے۔“

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر ایک طویل وقفے کے بعد فوربس کی آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے ڈان! جب تک تم چیف ہو، اس وقت تک سہی......!“

اس کے ایک گھنٹے کے بعد ہارپر کا فون آ گیا ”خدا کی پناہ!......ڈان!“ وہ بولا ”کیا تم اسے تخفّف معطل نہیں کرسکتے؟ فوربس بے حد بااثر آدمی ہے۔ مجھے ڈر ہے، کہیں تمہارا ریکارڈ خراب نہ ہو جائے۔“

”مجھے احمق کہہ لو۔ میں تسلیم کرلوں گا لیکن اگر تم یہ چاہتے ہو کہ پولیس چیف ہوتے ہوئے میں ایسے شخص کو برداشت کرلوں تو اس سے پہلے ہی استعفیٰ دینا پسند کروں گا۔“

ہارپر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ ”ڈان! اگر میں پہلے تمہارے ساتھ نہیں تھا، تو اب ہوں۔“ وہ بولا ”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ تمہیں ضمانت پر رہا کرانے کے لیے مجھ سے جو کچھ ہوسکے گا، میں کروں گا۔“

ڈان نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ کاش وہ یہ کام قدرے ذہانت سے انجام دیتا۔ کچھ اسی طرح کے دشمن بھی اس کے دوست بن جاتے۔ اسے اپنی ملازمت کی پروا نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی ملازمت حاصل کرسکتا تھا یا بھوکا رہ سکتا تھا لیکن اس کی بیوی جینیٹ...... وہ پہلے سے کہیں خوش اور تندرست نظر آ رہی تھی۔ وہ کئی سال کے بعد اس کے چہرے پر رونق دیکھ رہا تھا۔ راکی بیچ کی آب و ہوا اسے بے حد راس آئی تھی۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہو جاتی تو اس کے لیے کئی مسائل کھڑے ہو جاتے۔

☆☆☆

ہفتے کی صبح وہ واچ آفیسر کے فرائض انجام دے رہا تھا اور اسمتھ، اسٹین کی جگہ ایڈی کے ساتھ گشتی کار نمبر ایک میں سوار گشت کر رہا تھا۔ جنوری کا مہینا تھا اور ڈان، جینیٹ کے ساتھ شام کو ساحل پر چہل قدمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انہیں غروب آفتاب کے وقت ساحل کی سخت ریت پر چہل قدمی کرنا بے حد پسند تھا۔ اچانک ڈیسک سارجنٹ کے ریڈیو سے آواز آئی ”کار نمبر ایک...... آفیسر کو مدد کی فوری ضرورت ہے۔“

اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی مقام پر آفیسر کو مقابلے میں شکست ہو رہی تھی۔ ڈان اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ریڈیو سے مسلسل آواز آ رہی تھی اور یہ اسمتھ کی آواز تھی ”چار مسلح ڈاکو بینک لوٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

ڈان بے تحاشا دروازے کی طرف بھاگا اور ایک ہی لمحے کے بعد اس کی سیڈان مرکزی شاہراہ پر اُڑی جا رہی تھی اور اس کے سائرن کی آواز سے ٹریفک کائی کی طرح چھٹتا چلا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا ”میرے خدا! ایڈی ڈاکوؤں سے دوبدو لڑ رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جو تین ماہ پہلے پستول تھامنا نہیں جانتا تھا، جس کی ایک بیوی اور تین بچے تھے۔“

بینک کے پاس پہنچ کر وہ ریوالور بدست کار سے کود گیا۔ سڑک حیرت انگیز طور پر ویران تھی، چہار سو ایک ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوتے ہی ہر شہری نے کہیں نہ کہیں پناہ لے لی تھی۔ ایک طرف گشتی کار کھڑی تھی۔ معاً اس نے دو آدمیوں کو فٹ پاتھ پر بھاگتے اور ایڈی کو بڑی مہارت سے اپنے ریوالور میں دوبارہ گولیاں بھرتے دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت کفن کی مانند سفید ہو رہی تھی۔

”میں ان دونوں کو سنبھال لوں گا۔“ اس نے چیخ کر ڈان سے کہا ”تم اسمتھ کی خبر لو۔ اسے گولی لگی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے بھاگتے ہوئے ایک ڈاکو کا نشانہ باندھ کر گولی چلا دی اور ڈاکو کی پیشانی میں سوراخ ہوگیا۔

دوسرے ڈاکو نے بھاگتے بھاگتے جھک کر اپنے ساتھی کے قریب پڑا ہوا ریوالور اُٹھا لیا لیکن ایڈی اس سے پہلے ہی اسے اپنی زد میں لے چکا تھا۔ ڈان اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر اسمتھ کی جانب بھاگا، جو گشتی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بائیں ران پر خون کا ایک بڑا سا دھبا تھا۔

”دو ڈاکو ایک نیلی سیڈان میں فرار ہو گئے ہیں۔“ وہ اپنا سر ذرا سا اُٹھا کر بھاری آواز میں بولا ”کوسٹ ہائی وے سے شمال کی طرف...... میں نے فرینک اور بٹلر کو ان کے تعاقب میں روانہ کر دیا ہے۔ میں...... میں نے ایمبولینس بھی طلب کرلی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔

وہ سڑک جو ایک منٹ پہلے دہشت ناک ویرانی میں ملفوف تھی، یکایک پُرشور ہوگئی۔ کار نمبر 3 جنوب سے نمودار ہوئی اور بینک کے سامنے پہنچتے ہی اس کے ٹائر بُری طرح چیخ اُٹھے۔ اس کے پیچھے ہائی وے پیٹرول کار آ کر رکی۔ بینک کے صدر جیمز فشر نے انتہائی پُرجوش انداز میں ڈان سے مطالبہ کیا کہ وہ مفرور ڈاکوؤں کی گرفتاری کے سلسلے میں فوری کوئی اقدام کرے۔ ڈان نے اپنے جوانوں کی اب تک کارگزاری کا جائزہ لیا اور اسے فرینک اور بٹلر نے اپنی پچھلی ملاقات اور ہائی کے پستول والی حرکت یاد آ گئی۔

”ڈاکو فرار نہیں ہوسکتے۔“ بالآخر اس نے کہا ”میں دس ڈالر کی شرط لگانے کو تیار ہوں، وہ اب تک گرفتار ہو چکے ہیں۔“

ہائی وے پیٹرول کار، بٹلر اور فرینک کی مدد سے اسی وقت ہوا ہوگئی اور اس سے قبل کہ وہ نکڑ تک پہنچتی، بٹلر کی آواز ریڈیو پر اُبھری ”کار نمبر 2...... ڈاکوؤں کی نیلی سیڈان 17 نمبر کوسٹ ہائی وے پر جا رہی ہے۔“

زخمی اسمتھ اور ہلاک ہونے والے ڈاکو کی لاش ایمبولینس میں ڈال کر روانہ کر دی گئی۔ ڈان نے ایک نیا سگار سلگایا اور بینک کے صدر جیمز کے ساتھ بینک کی عمارت میں داخل ہوگیا۔ کوئی اور کونسل ہوتی تو اتنے سارے معاملات میں ٹانگ اڑانے پر اس کی چھٹی کر دی جاتی لیکن وہ لوگ اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے تھے کہ اس نے محکمۂ پولیس کو بے حد موثر بنا دیا تھا۔ سہ پہر کے تین بجے تک سارے شہر میں رپورٹر صاحبان چھا گئے۔ ڈاکوؤں کی وہ ٹولی...... ڈنکن ٹولی کے نام سے مشہور تھی اور چھ ریاستوں کو عبور کر کے یہاں واردات کرنے آئی تھی۔ ایک مقامی اخبار کے رپورٹر بل نے بے حد پُرجوش لہجے میں ڈان کو مخاطب کیا ”ڈان، ہمارے پاس ایک دھماکا خیز خبر ہے۔ مقامی ناکارہ پولیس نے بدنام ترین ڈنکن ٹولی کو دبوچ لیا۔ کہو، کیسی رہی؟“

ڈان نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی اور سگار کا ایک گہرا کش لے کر سوچا ”انہیں یہ خبر شائع کرنے دو۔“ اور اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔ ”بل، بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ کاش کہ کیا ہوتا۔ لیکن جب میں جائے واردات پر پہنچا تو دو ڈاکو فٹ پاتھ پر بھاگ رہے تھے اور بقیہ دو کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے جا چکے تھے۔ حتیٰ کہ ایمبولینس بھی طلب کی جا چکی تھی۔ اگر تم ہیرو سے ملنا چاہتے ہو تو جاؤ، جا کر اسمتھ سے ملو۔ یہ کارنامہ اسی نے سرانجام دیا ہے اور اس کے عوض اس کی بائیں ٹانگ میں اعشاریہ چار پانچ کی گولی پیوست ہوگئی ہے۔“

☆☆☆

اگلے بدھ کی شام، کونسل کو اپنی آخری رپورٹ پیش کرنے اور ان کا فیصلہ سننے سے ایک گھنٹا قبل، سارجنٹ ہف نے اسے فون کیا ”کیا آپ اسی وقت آسکتے ہیں؟“

جب وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ فرینک اور بٹلر، فلن اور ایڈی پر پڑی جو ایک گوشے میں کھڑے تھے۔ اس نے نظریں گھما کر ہال کا جائزہ لیا۔ وہاں سب کے سب موجود تھے۔ حتیٰ کہ پچھلی پہر کے گشتی سپاہی بھی جن کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا اور جو بار بار جماہیاں لے رہے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ ان سے کچھ پوچھتا، بٹلر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مخاطب ہوا ”چیف...... ہم سب کو آپ پر بے حد فخر ہے...... ہم نے...... آپ کے لیے ایک حقیر سا تحفہ خریدا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ڈان کو سبز رنگ کے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ دے دیا۔

ڈان نے پیکٹ کو ہلکے سے دبایا اور سمجھ گیا کہ اس میں سگار ہیں۔ اس نے مسکرا کر وہ پیکٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا اور کہا ”کل صبح میں پہلے اس پیکٹ کو بم لیبارٹری کے ماہرین کے سپرد کروں گا۔ اس کے بعد ہی اسے کھولوں گا۔“

سب لوگ ہنس پڑے اور پھر سب نے فرداً فرداً آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ نو بجے اس نے تحفے میں ملنے والے کئی سگار اپنی جیب میں رکھے اور کونسل چیمبر کا رُخ کیا۔ چیمبر لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بیشتر چہرے اجنبی تھے لیکن چند ایک کو وہ پہچان گیا۔ کونسل کا چیئرمین، رپورٹ کے کاغذات اُلٹنے پلٹنے لگا اور اسی دوران ڈان نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔

چند ہی لمحوں کے بعد چیئرمین نے کونسل کی قرارداد پڑھ کر سنائی اور اسے یہ یقین کرنے میں پورا ایک منٹ لگ گیا کہ وہ لوگ اسے معاہدے کی پیشکش کر رہے تھے...... نعرۂ تحسین بلند ہونے لگے۔ ایسے میں کمشنر ہارپر، اس کی بغل میں آ بیٹھا ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم نے یہ سب کچھ کیسے کیا، ہارپر! ویسے تمہارا شکریہ۔“ ڈان بولا۔

”یہ تو بہت ہی آسان ثابت ہوا، ڈان!“ ہارپر نے جواب دیا ”تم نے اس شہر میں بے شمار دوست بنا لیے ہیں۔ میں نے صرف اتنا ہی کیا کہ انہیں یہاں مدعو کر کے تمہاری حمایت کرنے کو کہا۔ لہٰذا یہ لوگ آئے اور تمہاری زبردست حمایت کی۔ حتیٰ کہ فوربس بھی تمہارے خلاف ووٹ دینے کی جسارت نہ کرسکا۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ”لگتا ہے کہ لوگ اس وقت تک کسی پولیس آفیسر کی سخت گیری کو ناپسند نہیں کرتے جب تک وہ دیانت دار اور فرض شناس نہ ہو۔“

”لیکن لیفٹیننٹ اسمتھ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”اس نے اسپتال سے فون کر کے تمہیں مبارک باد دی ہے۔“ ہارپر نے جواب دیا ”تم رپورٹروں کو بے وقوف بنا سکتے ہو لیکن اسمتھ کو نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اصل ہیرو کون ہے؟ وہ تم سے مزید تربیت لینا چاہتا ہے۔“

جواں ہمت

طارق عزیز خان

اسے شکست دینے کے لیے سمندر کی موجیں تھیں، ہوائے تند کے تھپیڑے تھے، دھوپ کی تیزی تھی، پیاس کی شدت تھی اور بھوک کی اذیت تھی مگر اس نے ہر ایک کو شکست دے دی۔ یہ ثابت کر دکھایا کہ گر حوصلے کا ساتھ ہو تو کوئی بھی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔

عزم و حوصلے سے ناممکن کو ممکن کر دکھانے والے شخص کا احوال

میرا نام اسٹیون کیلاہن ہے۔ میرا جنم 1952ء میں نیویارک سٹی میں ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ میں نے فلسفے میں ماسٹرز کیا لیکن میری دلچسپی کا محور و مرکز سمندر تھا۔ اسکول کے زمانے سے ہی مجھے بوٹ ڈیزائننگ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد میں سیلنگ کے شعبے سے وابستہ ہوگیا۔ 1975ء میں، میں نے سنگل ہینڈڈ دخانی کشتیوں (Yacht) کے متعدد نئے ڈیزائن تیار کیے۔ کشتی رانی سے متعلق میرے تحقیقی مضامین نیویارک سے نکلنے والے میگزین سیلر اور سیلنگ میں شائع ہوئے اور مجھے نیول آرکیٹیکٹ کے طور پر شہرت ملی۔ 1979ء میں میری شادی ہوئی جو ناکام ثابت ہوئی۔ دراصل میری بیوی کو میرے شوق سے چڑ تھی۔ انہی دنوں میں نے اخبارات میں یورپ سے امریکا تک سنگل ہینڈیاٹ ریس کے بارے میں پڑھا۔ بین الاقوامی یاٹ یونین کے تحت ہونے والے اس مقابلے میں ایک فرد کی گنجائش والی چھوٹی کشتیاں حصہ لے سکتی تھیں۔ یہ ریس 1981ء کی گرمیوں میں منعقد ہونا تھی۔ میں اس سے پہلے شمال مغربی کینیڈا کے برفیلے سمندروں میں کشتی رانی کے جوہر دکھا چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس ریس میں حصہ لینے سے نہ صرف یہ کہ مجھے ماضی کی تلخ یادوں سے پیچھا چھڑانے میں مدد ملے گی بلکہ مجھے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا بھی بھرپور موقع ملے گا۔ میرے پاس سفید رنگ کی نپولین سولو (Nepoleon Solo) نام کی ایک مضبوط کشتی پہلے سے موجود تھی۔ سنگل انجن والی اس کشتی کی لمبائی 6.5 میٹر، درمیان سے چوڑائی چار میٹر اور وزن لگ بھگ 100 کلوگرام تھا۔ توازن برقرار رکھنے کے اس پر دو چھوٹے بادبان نصب تھے۔ درمیانی حصے میں دو افراد کی گنجائش والا کیبن بنا ہوا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ کشتی کو میں نے خود ڈیزائن کیا تھا۔

تمام تر تیاریوں کے بعد میں جنوری 1981ء میں امریکی ریاست رہوڈ آئی لینڈ کی بندرگاہ نیو پورٹ سے روانہ ہوا۔

☆☆☆

مئی 1981ء کی شروعات میں جنوبی انگلینڈ کی بندرگاہ پلے ماؤتھ سے ریس کا آغاز ہوا۔ اس ریس میں درجن سے زیادہ کشتیاں شریک تھیں اور ان سب کی منزل جزائر غرب الہند (West Indies) میں واقع اینٹی گوا اینڈ باربوڈا (Antigua & Barbuda) کے خوبصورت جزائر تھے۔ ریس کے پہلے مرحلے میں تمام کشتیوں کو شمالی بحراوقیانوس میں واقع پرتگالی جزائر میڈیرا (Madeira) پہنچنا تھا۔ وہاں سب کشتیوں کی جانچ پڑتال ہوتی اور پھر مقابلے میں حصہ لینے کے اہل اپنی حتمی منزل اینٹی گوا کی طرف روانہ ہوجاتے۔ بدقسمتی سے ریس کا آغاز اچھا نہیں رہا۔ بسکے کے طوفانی سمندر نے ریس کو تہس نہس کردیا۔ قریب قریب سب ہی کشتیاں سفر کے قابل نہ رہیں۔ منتظمین کی طرف سے ریس ملتوی ہونے کے بعد کچھ کشتیاں مرمت کے لیے فرانس اور کچھ اسپین روانہ ہوگئیں۔

میں نپولین سولو کو لے کر اسپین پہنچا۔ میں نے وہاں ماہ کے طویل قیام کے دوران کشتی کی مرمت کی اور خوب سپاٹا کیا۔ ہسپانوی ساحلوں پر دُھوپ سینکتے ہوئے میں نے طے کیا کہ میں اپنی نامکمل ریس کو تن تنہا پورا کروں گا۔ میں نے اپنے ایڈونچر کی شروعات کے لیے شمالی بحراوقیانوس میں واقع کینارے (Canary) کے ہسپانوی جزائر کا انتخاب کیا۔ ضروری تیاریوں کے بعد میں جولائی کی شروعات میں اسپین سے روانہ ہوا۔

یہ 29 جنوری 1982ء کی ایک خوشگوار صبح تھی جب میں نے کینارے کی حدود میں واقع ایل ہیرو (El Hierro) جزیرے سے اپنے سمندری سفر کی شروعات کی۔ میں نے کشتی کا رُخ جنوب مغرب کی طرف رکھا اور اندھیرا ہونے سے پہلے بحراوقیانوس کے کھلے سمندر میں رسائی حاصل کرلی۔ میں اپنے سفر کی پہلی رات میں بہت پُرجوش تھا۔ جنوبی امریکا اور یورپ کے درمیان بین الاقوامی سمندری شاہراہ پر سفر کرنے کی وجہ سے فی الحال میں سمندر میں اکیلا نہیں تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجھے برازیل کی طرف سے آرہے بڑے بڑے آئل ٹینکرز اور کنٹینرز شپ دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر کی منزل بحیرہ روم یا پھر فرانس اور برطانیہ تھے۔

میں پوری رات جہازوں کی رنگ برنگی روشنیوں کے درمیان سفر کرتا رہا۔ صبح کے قریب میں نے کشتی کو آٹو پائلٹ پر سیٹ کیا اور گرسیدھی کرنے کیبن میں چلا گیا۔ میں سارا دن گھوڑے بیچ کر سویا اور جب میری آنکھ کھلی تو دن ڈھل رہا تھا۔ میں نے کشتی کے عرشے پر ایک سے سورج غروب ہونے کا شاندار منظر دیکھا۔ میں نے اپنے پارٹس اور آلات کا جائزہ لیا۔ اس وقت میں خط استوا سے 27 ڈگری شمال اور 20 ڈگری مغرب میں سفر کررہا تھا۔ موسم خوشگوار تھا اور برازیل کی طرف چلنے والی تجارتی ہوائیں میری کشتی کو 2.7 ناٹ (5 کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھنے میں مدد دے رہی تھیں۔ میں نے دوربین سے چاروں طرف کا نظارہ کیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ سینکڑوں کلومیٹر کے وسیع علاقے میں میرے سوا اور کوئی ذی روح نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لیے میں بھول گیا کہ میں کون تھا؟ میں نے خود کو سمندری مخلوق تصور کیا اور خوشی سے گلا پھاڑ کر مختلف آوازیں نکالنے لگا۔ کچھ دیر کی چیخ پکار کے بعد میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور ڈنر کے انتظام میں لگ گیا۔

تین فروری کی صبح میری کشتی 25 ڈگری شمال اور 26 ڈگری مغرب کے خط پر سفر کررہی تھی۔ اس مقام سے قریب ترین سرزمین کیپ ورڈے کے پرتگالی جزائر 900 کلومیٹر جنوب اور مغربی صحارا 1100 کلومیٹر مشرق میں واقع تھے۔ میری کشتی آٹھ سو کلومیٹر کے قریب فاصلہ طے کرچکی تھی۔ اس کے تمام کل پرزے سبھی سلامت تھے اور وہ 3 ناٹ (5.5 کلومیٹر) کی رفتار سے جزائر غرب الہند کی طرف گامزن تھی۔ اس دن ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے ریڈیو پر موسم کا حال سنا۔

"بحراوقیانوس میں 25 ڈگری شمال اور 27 ڈگری مغرب کے خط پر سفر کرنے والے ہوشیار رہیں"۔ لزبن ریڈیو کی نشریات میں ایک مخصوص علاقے میں اچانک بننے والے سائیکلون (Cyclone) سے خبردار کیا جارہا تھا۔ میں

نے نقشہ سامنے رکھا اور طوفانی علاقے کا تعین کیا۔ میں نے پایا کہ سمندری طوفان خط سرطان پر 100 کلومیٹر کے دائرے کو گھیرے ہوئے تھا۔ ریڈیو کے مطابق طوفان کا نشانہ برازیل کا شمالی ساحل تھا۔ پریشانی یہ تھی میں طوفانی علاقے کی عین سرحد پر تھا۔ میں غرب الہند جانے کے لیے اپنی سمت تبدیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اگر میں شمال مغرب کی طرف سے ایک لمبا چکر کاٹ کر جنوب مغرب کی طرف جاتا تو میرا ایک ہفتہ ضائع ہوسکتا تھا۔ ایک راستہ یہ تھا کہ میں کشتی کا رُخ جنوب میں کیپ ورڈے کے پرتگالی جزائر کی طرف موڑ دیتا اور موسم بہتر ہونے پر دوبارہ سفر کرتا۔ میں نے کچھ دیر تک موجودہ حالات پر غور کرنے کے بعد سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ بحراوقیانوس کے اس حصے میں درمیانے درجے کے سمندری طوفانوں کا جنم لینا ایک معمول تھا۔ حقیقت یہ تھی میں اس سے پہلے گرینڈ بینکس (Grand Banks) کے طوفانی سمندر کا مقابلہ کرچکا تھا۔ میں نے دو سال پہلے کینیڈا کے جزیرے نیوفاؤنڈ لینڈ کے جنوب میں واقع گرینڈ بینکس کے برفانی طوفان کو اسی کشتی کے سہارے تن تنہا شکست دی تھی۔ مجھے اپنی کشتی پر بھروسا تھا کہ وہ سمندر کے اس معتدل حصے سے بھی بہ خیر و خوبی نمٹ لے گی۔ تاہم آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے بحراوقیانوس کے مزاج کو سمجھنے میں کتنی بڑی غلطی کردی تھی۔

میں نے ریڈیو لے جاکر نیچے کیبن میں رکھا۔ واپس ڈیک پر پہنچا اور ہر کھلی چیز کو سمیٹنے لگا۔ بادبان نیچے گرایا، کشتی کی رفتار دھیمی کی اور انجن کو آٹو پائلٹ پر سیٹ کردیا۔ لائف رافٹ کو ڈیک پر موجود قابلِ رسائی جگہ پر رکھا۔ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں لائف رافٹ میرا واحد سہارا تھی۔ اس کے سرے پر بندھی ڈوری کھینچنے سے اس میں آنا فانا ہوا بھر جاتی اور یہ پانچ فٹ قطر کی ایک گول کڑھائی نما کشتی میں تبدیل ہو جاتی۔ اپنے ضروری کاغذات کو واٹر پروف تھیلی میں رکھ کر کمر کے ساتھ باندھ لیا۔ خوراک اور دیگر ضروری سامان پر مشتمل ایمرجنسی کٹ اور لائف جیکٹ کو کیبن کے اندر مخصوص جگہ پر رکھا۔ اب میں طوفان کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سہ پہر ہوتے ہوتے سمندر کا مزاج برہم ہونے لگا۔ کالی سیاہ گھٹاؤں نے آسمان کو گھیر لیا اور ہوا کی رفتار تیز ہونے لگی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کل شام تک سمندر کے پُرسکون حصے تک رسائی حاصل کرلوں گا۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے طوفان کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی اور میں اسے بھی اپنے ایڈونچر کا ایک حصہ ہی سمجھ رہا تھا۔ اگلے

ایک گھنٹے کے دوران طوفانی ہواؤں کی رفتار 60 کلومیٹر گھنٹا تک پہنچ چکی تھی۔ لہروں کی اتھل پتھل خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی۔ اس دوران تیز بارش بھی شروع ہوگئی۔ میں نے خود کو واٹر پروف کیبن میں بند کرلیا۔ میں پائلٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور سامنے کے شیشے سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ فائبر گلاس اور ہلکے لوہے سے بنی اس کشتی کا ڈیزائن کچھ اس تھا کہ اگر کیبن کو مکمل لاک کردیا جاتا تو باہری حصے میں پانی بھرنے کے باوجود کشتی ڈوب نہیں سکتی تھی۔ کشتی کو خطرہ صرف ایک بات سے تھا اور وہ تھے لہروں کے خطرناک تھپیڑے۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ طوفان ایک حد سے زیادہ خطرناک رخ اختیار نہیں کرے گا۔ اب دن ڈھل رہا تھا۔ طوفان کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ رات گھرنے پر بھی سمندر کا مزاج برہم ہی رہا۔ میں نے ایک سینڈوچ کرکھایا اور ریڈیو آن کرلیا۔ لزبن ریڈیو ہر دس منٹ طوفان کی تازہ خبر نشر کررہا تھا۔ میرا اندازہ سہی تھا سمندر طوفان درمیانے درجے کا تھا اور ایک محدود علاقے پر تھا۔ ریڈیو کے مطابق بڑے بحری جہازوں اور فش ٹرالر طوفان سے کوئی خاص خطرہ نہیں تھا، تاہم ماہی گیروں چھوٹی کشتیوں خاص کر سیاحوں کو خبردار کیا جارہا تھا کہ وہ یاٹ جلد از جلد خشکی کے قریب لے جائیں۔

میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے فرینکوئسی کو اسی میوزک چینل پر سیٹ کردیا۔ آدھی رات تک صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ میں نے سونے سے پہلے کشتی کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ جہاں بارش کے تھپیڑوں اور چنگھاڑتی ہواؤں نے میرا استقبال کیا۔ خطرناک حد تک بلند لہریں کشتی کو اُٹھا پٹک رہی تھیں۔ میں نے ڈیک کی ریلنگ پکڑ کر اپنا توازن قائم رکھا اور سرسری انداز میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھا۔ بظاہر سب ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی اور واپس کیبن چلا آیا۔ باہر کے مقابلے میں کیبن کے اندر کا ماحول قدرے بہتر تھا، تاہم لہروں کے ٹکرانے کے باعث کشتی مسلسل ہل رہی تھی اور اسے زبردست جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں پینل سے جڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور صورتِ حال کا تجزیہ کرنے لگا۔ میرا دماغ مسلسل کام کررہا تھا۔ کیا میں نے ساحل کی طرف نہ جاکر غلطی کی تھی؟ میں نے سر جھٹکا اور خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ گرینڈ بینکس کے مقابلے میں یہ طوفان کچھ نہیں تھا، مجھے قوی امید تھی کہ کشتی کو کچھ نہیں ہوگا اور وہ اسے کو جھیل جائے گی۔ میں نے سونے کا فیصلہ کیا۔ ریڈیو

...واٹر پروف تھیلی میں بند کرکے ایمرجنسی کٹ میں رکھا اور اپنی ...دھن گنگناتے ہوئے بیڈ پر لیٹ گیا۔ بُری طرح ...کشتی میں نیند کا کوئی سوال نہیں تھا، لیکن میں پھر بھی ...بستر پر کروٹ بدلتا رہا۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ ...اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ میں اُچھل کر بیڈ سے نیچے گر ...گیا۔ ابھی میں صورتحال کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ کیبن کے نچلے ...حصے سے پانی کا سیلاب امڈ پڑا۔ غالباً اس کا پیندا پھٹ گیا ...تھا۔ میرے پاس سوچنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ کشتی ڈوب ...رہی تھی اور مجھے فوری طور پر باہر نکلنا تھا۔ میرے ضروری ...کاغذات اور کچھ رقم کمر سے بندھی بیلٹ کے ساتھ محفوظ ...تھے۔ میں نے بدحواسی میں ایمرجنسی کٹ اور لائف جیکٹ کی ...تلاش میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارا۔ میرا توازن بگڑ گیا اور میں ...کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ کیبن میں جیسے بھونچال سا آگیا ...تھا۔ چند ہی لمحوں میں پانی میری کمر تک پہنچ گیا۔ میں نے ...سامان کو چھوڑا اور کیبن کے دروازے کی طرف لپکا۔ اس ...دوران پانی میں تیرتے خشک خوراک کے کچھ ٹن اور پانی کی ...بوتلیں مجھ سے ٹکرائیں۔ میں نے بدحواسی میں کچھ ٹن اور دو ...بوتلیں اپنے گریبان میں شرٹ کے اندر ٹھونس لیں۔ میں کیبن ...کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ جہاں طوفان پوری شدت کے ...ساتھ آیا ہوا تھا۔ میں نے لپک کر لائف رافٹ اُٹھائی اور ...اسے کھولنے کے لیے ڈوری کو کھینچا۔ میرے اندر خوف کی ...لہر سرایت کرگئی۔ رسی کھینچنے کے باوجود رافٹ نہیں ...کھلی۔ میں نے بدحواس ہوکر رافٹ کو اِدھر اُدھر سے دبایا۔ ...ڈوری کھنچی رہی اور ایک جھٹکے سے ہوا رافٹ میں داخل ہوگئی۔ ...میں نے رافٹ سمندر میں اُچھالی اور خود بھی اس کے پیچھے پانی ...میں کود گیا۔ پانی قدرے ٹھنڈا تھا۔ میں نے ہاتھ پیر مارے ...اور رافٹ پر چڑھ گیا۔ ایک بلند لہر نے میری رافٹ کو کشتی ...سے کچھ دوری پر اُچھال دیا۔ میں نے گریبان سے پانی کی ...بوتلیں اور خوراک کے ٹن نکال کر رافٹ میں ڈھیر ...کردیے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس قلیل سامان کے ...سہارے میں چند دن بھی نہیں گزار سکتا تھا۔ مجھے ڈوبتی کشتی ...تک جانا تھا اور کم از کم اپنی ایمرجنسی کٹ کو تو لائف رافٹ تک ...لانا تھا۔ میں واپس سمندر میں کودا اور کشتی کی طرف بڑھا۔ ...طوفانی لہروں میں تیرنا آسان نہیں تھا، سمندر پوری طرح بپھرا ...ہوا تھا اور اندھیرے میں کچھ واضح دکھائی نہیں دے رہا ...تھا۔ میں ہاتھ پاؤں مارتا کشتی کے قریب پہنچا جو ایک رُخ پر ...جھک گئی تھی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں کیبن کی طرف ...بڑھا اور اس کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وہاں کا

◆ بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی چنانچہ والدین کو جہاں کسی ''تیر بہ ہدف'' قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بوڑھیاں، مُلّا یا مزار کی خبر ملی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کردی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پیے ہوں گے۔ مزارات پر حاضری دی ہوگی جتنی میں نے۔ آسیب سے نجات پانے کے لیے انار کے درختوں میں کسی کے لیے اتنے نقوش سلیمانی نہیں ٹھونکے گئے ہوں گے جتنے میرے لیے۔

اقتباس: خورشید احمد صدیقی

مرسلہ: نعمان صدیقی، حیدرآباد ◆

زیادہ حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ کیبن کے اندر گھپ اندھیرے میں بے شمار چیزیں تیر رہی تھیں۔ ان میں زیادہ تر میرے کام کی نہیں تھیں۔ کشتی کے ایک زینے پر پہلے جانے سے کیبن والی دیوار جہاں ایمرجنسی کٹ بندھی تھی، کشتی کا فرش بن چکی تھی۔ میں نے سانس کھینچی اور پانی میں غوطہ لگایا۔ میں سیدھا فرش کی طرف بڑھا۔ مجھے لائف جیکٹ تو نہ ملی البتہ ایمرجنسی کٹ قریب ہی ایک ہک میں پھنسی مل گئی۔ میں نے کٹ کو دبوچا اور پھرتی سے اوپر اُٹھا۔ کشتی بُری طرح چرمرائی اور اس کا پیندا اوپر کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس دوران تیز جھٹکا لگا اور کیبن کا دروازہ کھٹاک سے بند ہوگیا۔ میں نے لپک کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ میرے اوسان خطا ہوگئے جب کیبن کے دروازے نے کھلنے سے انکار کردیا۔ میں نے اپنا پورا زور لگا کر دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا، لیکن نتیجہ صفر رہا۔ میں بدحواس ہوگیا۔ مجھے لگا میری کہانی ختم ہوگئی۔ اب شاید میں کبھی باہر نہ نکل سکوں۔ میں جنونی انداز میں دروازے پر زور آزمائی کرنے لگا۔ اچانک کشتی اُلٹ گئی اور پانی میرے سر سے اونچا ہوگیا۔ میں نے سانس روک لیا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگاتے ہوئے دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا۔ میں بے دم ہو چکا تھا کہ ایک بڑی لہر کشتی سے ٹکرائی۔ زوردار جھٹکا لگا اور قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی۔ کیبن کا دروازہ کھلا اور میں پانی کی اس قبر سے باہر نکل آیا۔ میں تیزی سے اوپر اُٹھا اور تازہ ہوا محسوس کرتے ہی ایک گہری سانس لی۔ رافٹ کی طرف تیرتے

ہوئے گدے کا ایک کشن مجھ سے ٹکرایا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کسی نہ کسی طرح لائف رافٹ تک پہنچ گیا۔ میں نے اپنی سانسیں درست کیں اور ڈوبتی کشتی کے ہیولے کو دیکھا۔ مجھے لگا جیسے میرے خواب ڈوب رہے ہوں۔ میں نے ایمرجنسی کٹ رافٹ پر رکھی اور سوچا کہ کیا میں ایک اور کوشش کرسکتا تھا؟ حالات میرے خلاف تھے لیکن زندہ رہنے کی امنگ مجھے کچھ کر دکھانے پر اکسا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کچھ چیزیں کشتی کے قریب ہی تیر رہی ہوں گی۔ میں ایک بار پھر سمندر میں کودا۔ مجھے یاد ہے میں چار مرتبہ تیر کر کشتی تک گیا اور کچھ مزید سامان جمع کرنے میں کامیاب رہا۔ اس دوران چمکتی بجلی میں میری نظر سمندر کی سطح سے بلند ہوتے پانی کے فوارے پر پڑی۔ میں سمجھ گیا وہاں ایک بڑی وہیل تھی۔ فوری طور پر مجھے حادثے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اسی وہیل کے ٹکرانے کی وجہ سے میری کشتی کے پیندے میں سوراخ ہوا تھا۔ میں نے طویل سانس لی اور کلائی پر بندھی واٹر پروف گھڑی میں دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ طوفان اب بھی پورے جوبن پر تھا۔ بارش مسلسل برس رہی تھی اور خطرناک حد تک بلند پُرشور لہریں لائف رافٹ کو کسی تنکے کی طرح اُچھال رہیں تھیں۔ میری کشتی ڈوب چکی تھی اور میں لہروں کے رحم و کرم پر تھا۔ گو کہ میں سمندر کے معتدل حصے میں تھا لیکن بحراوقیانوس کی کھلی فضاؤں میں یہ ایک ٹھنڈی رات تھی۔ چنگھاڑتی ہوئی سرد ہوا اور ٹھنڈے پانی کی بوچھار سے بچنے کے لیے میرے پاس کوئی ڈھال کوئی چھت نہیں تھی۔ میں نے کاٹن کی پینٹ اور ہاف بازو کی شرٹ پہن رکھی تھی جبکہ جوتا پہننے کا موقع مجھے نہیں مل سکا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے گدے کا گیلا کشن کھول کر اسے سلیپنگ بیگ کی شکل دی اور اس میں گھس گیا۔ میں مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا اور رافٹ کے ایک کونے میں دبکا سردی سے کانپ رہا تھا۔ رافٹ کو زبردست جھٹکے لگ رہے تھے اور میرے لیے کسی ایک جگہ ٹکا رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ میرا دماغ بُرے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک شاندار میرکا ایسا بھیانک انجام میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں نے رافٹ کے دونوں کناروں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اِدھر اُدھر بکھرے سامان کو ایک کونے میں سمیٹا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبے اتھل پتھل سمندر کو دیکھنے لگا — میں فی الحال طوفان تھمنے کی دعا کے سوا اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

☆☆☆

دور مشرقی اُفق پر سرمئی سفیدی چھانے لگی تھی۔ یہ فروری کی چار تاریخ تھی اور لائف رافٹ میں میرے پہلے دن کی شروعات ہو رہی تھی۔ مجھے یہ محسوس کر کے سکون ملا کہ طوفان کی شدت میں بتدریج کمی ہو رہی تھی۔ بارش کا زور ٹوٹ رہا تھا اور آسمان پر تنے گہرے سرمئی بادلوں کا گھیرا کمزور پڑتا دکھائی دینے لگا تھا۔ قریب دو گھنٹے بعد بارش ہلکی بوندا باندی میں تبدیل ہو گئی۔ اس وقت دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ سمندر کو کسی حد تک قرار آیا تو میں نے موجودہ حالات پر غور کیا۔ میری حالت خراب تھی اور جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ موٹے ربڑ سے بنی میری لائف رافٹ محفوظ لیکن مکمل طور پر لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔ میں رافٹ اپنی مرضی سے کنٹرول نہیں کرسکتا تھا اور قسمت کے بھروسے تھا۔ میری پریشانی کی اصل وجہ خوراک تھی۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ میں کتنے عرصے کھلے سمندر میں رہتا۔ یہ مدت ایک دن بھی ہوسکتی تھی اور ایک ماہ بھی...... میں نے رافٹ میں بکھرے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ میرے پاس دو لیٹر والی پانی کی پانچ بوتلیں اور آدھا کلوگرام والے خشک خوراک کے چھ ٹن تھے۔ خوراک کو کنجوسی سے استعمال کیا جاتا تو وہ دو ہفتے تک چل سکتی تھی لیکن گرم مرطوب موسم میں پانی کے موجودہ ذخیرے کے ساتھ ایک ہفتے سے زیادہ نکالنا محال دکھائی دے رہا تھا۔ میری ایمرجنسی کٹ میں مزید کچھ چیزیں محفوظ تھیں جن میں ریڈیو، واٹر پروف ٹارچ اور سمندر کے کھارے پانی کو پروسس کر کے قابلِ استعمال بنانے والی چار سولر اسٹلز (Solar Stills) نمایاں تھیں۔ کرسٹل اور پلاسٹک سے بنی چھ انچ قطر کی پیالہ نما اسٹلس کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا تھا کہ ایک مخصوص طریقہ اختیار کرنے کے بعد یہ سورج کی روشنی سے اپنے اندر محفوظ پانی کو تین سے چار گھنٹوں میں پینے کے قابل بنا دیتی تھیں۔ ہر ایک اسٹلس ایک وقت میں ایک لیٹر پانی کو پروسس کر کے چوتھائی لیٹر سے کچھ کم پانی تازہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ پُرانے ماڈل کی سولر اسٹلس تھیں جنہیں دوسری جنگِ عظیم کے دوران مصیبت میں پھنسے پائلٹس کی مدد کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس سے پہلے میرے لیے سولر اسٹلس کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور بدقسمتی یہ تھی کہ مجھے انہیں استعمال کرنے کا صحیح طریقہ معلوم نہیں تھا۔ تاہم وہ جو کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ سو اَب مجھے انہیں استعمال کرنے کا طریقہ سیکھنا تھا۔ میرے پاس چند اور چھوٹی موٹی چیزیں بھی تھیں جن میں بحراوقیانوس کا نقشہ، کلائی پر بندھی واٹر پروف گھڑی، چار فٹ لمبی ایک چھتری، سمندر میں بچے رہنے سے متعلق میرے پسندیدہ مصنف کی کتاب اور ایک پینسل شامل تھی۔

میں اپنے موجودہ مقام کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرسکتا تھا، تاہم میرا اندازہ تھا کہ میں شمالی بحراوقیانوس میں 24 ڈگری شمال اور 28 ڈگری مغرب کے آس پاس تیر رہا تھا۔ یوں میں کیپ ورڈے اور افریقا کی مغربی ساحلی پٹی سے قریب بارہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ کیپ ورڈے میرے جنوب اور افریقا مشرق میں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میری رافٹ مغربی تجارتی ہواؤں کے ساتھ قریب 1 ناٹ (1.8 کلومیٹر) فی گھنٹا کی رفتار سے مغرب کی طرف تیر رہی تھی۔ اگر میری یہ رفتار برقرار رہتی تو میں کم از کم تین ماہ سے پہلے جزائر غرب الہند نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ حقیقت پر مبنی ایک خوفناک اندازہ تھا۔ افریقا میرے قریب تھا لیکن میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں چپو کے طور پر استعمال کر کے واپس مشرق کی طرف پلٹ جاتا۔ بہرحال میں میرے لیے امید کی واحد کرن کسی تجارتی یا فوجی بحری جہاز کی جھلک تھی۔ میں ایک ایسے علاقے میں حادثے کا شکار ہوا تھا جو یورپ، جنوبی امریکا اور جزائر غرب الہند کے درمیان بین الاقوامی سمندری راستوں کا جنکشن تھا۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ مجھے کوئی نہ کوئی بحری جہاز دیکھ لے جائے گا۔ اس کے علاوہ مدد کی ایک اور صورت یہ تھی کہ کسی طرح خشکی پر میرے حادثے کی خبر پہنچ جاتی۔ میں نے ایمرجنسی کٹ سے ریڈیو باہر نکالا اور اس کی فریکوئنسی کو مختلف سگنلز پر ایڈجسٹ کرنے لگا۔ میں نے مختلف چینلز پر اپنا اور اپنے حادثے کا مقام بتاتے ہوئے مدد طلب کی۔ میں بار بار اپنی لوکیشن سے متعلق الفاظ دُہراتا رہا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کسی بحری جہاز یا پھر کنٹرول روم نے میری مدد کی پکار کو سنا ہو۔ میں نے بیٹری بچانے کے لیے ریڈیو بند کر دیا۔ ایک بار ٹارچ کا بٹن دبا کر دیکھا وہ ٹھیک تھی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مجھے حدِ نگاہ تک ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔

دوپہر کے قریب بارش رک گئی اور بادل چھٹتے دکھائی دیے۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور بوتل منہ سے لگا کر پانی حلق سے اُتارا۔ پانی معدے میں جاتے ہی سکون کا احساس ہوا۔ میں نے ٹن سے خشک گوشت کا قتلا نکالا اور اسے منہ میں رکھ کر دھیرے دھیرے چبانے لگا۔ بے دھیانی میں میرا ہاتھ دوسرے قتلے کی طرف بڑھا، لیکن بھوکا ہونے کے باوجود میں نے خود کو مزید قتلے کھانے سے روک دیا۔ میں معمولی سی عیاشی کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے صورت حال بہتر ہونے تک صرف زندہ رہنے کے لیے ہی کھانا تھا۔ درجۂ حرارت بڑھتا ہوا محسوس ہوا تو میں سب کچھ بھول بھال کر سولر اسٹلس کو قابلِ استعمال بنانے میں جٹ گیا۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ سورج کی گرمی سے کھارے پانی میں موجود نمک اُڑ جاتا ہے۔ لیکن سولر اسٹلس پر یہ گرمی کس طرح اثر انداز ہوتی ہے یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے سمندر میں بچے رہنے سے متعلق کتاب کھولی اور اس کے ورق پہ ورق اُلٹنے لگا۔ ایک صفحے پر مختلف ڈیزائن کی سولر اسٹلس کی تصاویر دکھائی دیں۔ بدقسمتی سے وہ سب نئے ماڈل کی اسٹلس تھیں۔ وہاں آدھی صدی پہلے استعمال ہونے والی کسی اسٹلس کی تصویر نہیں تھی جسے دیکھ کر میں کچھ سمجھ پاتا۔ بہرحال میں نے کافی دیر تک اسٹلس سے متعلق باب کا مطالعہ کیا اور پھر اپنی چاروں اسٹلس کو کھارے پانی سے بھر دیا۔ ایک ڈوری اور ہک سے چمٹر چھاڑ کی اور انہیں کھلی جگہ پر رکھ دیا۔ اب میرے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ مجھے بچپن میں سنی وہ کہانیاں یاد آرہی تھیں جن میں حادثے کا شکار ہوا انسان اچانک کسی حسین جزیرے پر پہنچ جاتا ہے۔ میں بھی خود کو ایسی ہی کسی کہانی کا کردار محسوس کر رہا تھا۔ تاہم میں اندر سے خوف زدہ تھا۔ میری نظروں کے سامنے نیویارک کی بندرگاہ میں آویزاں گم شدہ ماہی گیروں کی وہ فہرستیں بھی گھوم رہی تھیں جن پر درج سیکڑوں نام بحراوقیانوس کی وسعت میں کہیں کھو گئے تھے۔ میں نے سر جھٹک کر بُرے خیالات کو دور بھگایا اور سولر اسٹلس کا جائزہ لیا۔ میں نے پانی کا ذائقہ چکھا۔ وہ تا حال کھارا تھا۔ میں سارا دن سولر اسٹلس سے اُلجھا رہا لیکن انہیں استعمال کرنے کا طریقہ دریافت نہ کر پایا۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کسی ملاح کے لیے سولر اسٹلس کا استعمال سیکھنا کس قدر اہمیت کا حامل تھا۔

سہ پہر کے وقت اچھی خاصی گرمی محسوس ہونے لگی، تاہم میں نے شدید پیاس کے باوجود چند گھونٹ سے زیادہ پانی نہیں پیا۔ سورج غروب ہوتے ہوتے موسم نے نئی انگڑائی لی اور درجہ حرارت تیزی سے گرنے لگا۔ حادثے کے بعد کھلے آسمان تلے سمندر میں یہ میری دوسری رات تھی۔ میں نے گوشت کا ایک قتلا کھایا، دو گھونٹ پانی پیا اور رات گزارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں

دور تھی اور دماغ اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ سمندر میں سکون کی تلاش مجھے موت کی دہلیز تک لے آئی تھی۔ میں نے وقت گزاری کے لیے ڈوگل روبرٹ سن کی کتاب اُٹھائی اور اس کے ایک خالی صفحے پر پینسل سے اپنی وصیت لکھی۔

''میرا نام اسٹیون کیلاہن ہے۔ شمالی بحراوقیانوس میں میری کشتی حادثے کا شکار ہوگئی ہے اور میں چھ لوگوں کے لیے بنی ایک لائف رافٹ میں لہروں کے رحم وکرم پر ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں کب تک سمندر سے مقابلہ کر پاؤں گا۔ میں اپنی ممی پاپا سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ان سے بہت پیار کرتا ہوں۔''

پوری رات سردی سے کپکپاتے سوتے جاگتے گزر گئی۔ کبھی اچانک آنکھ کھل جاتی تو میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بحری جہاز دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اس رات خواب میں بھی میں نے اپنے قریب سے گزرتے ایک بہت بڑے بحری جہاز کو دیکھا۔

بحراوقیانوس میں لائف رافٹ پر میرے دوسرے دن کی شروعات ہو رہی تھی۔ میں سورج طلوع ہونے کے بعد بھی رافٹ کے کنارے کو تکیہ بنائے دیر تک لیٹا رہا۔ دراصل میں ناشتے کا وقت گزار رہا تھا اور چاہتا تھا کہ دن اچھا خاصا نکل آئے تو میں بجائے ناشتے کی عیاشی کے تھوڑ بہت کھانا کھاؤں۔ میری نظریں سمندر میں دور دور تک بھٹک رہی تھیں۔ میرے چاروں طرف سیاہی مائل نیلگوں پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ چند گھنٹے مزید گزر گئے۔ اسی دوران مجھے البٹروس کا ایک غول دکھائی دیا۔ پرندے ہوا میں تیرتے میری لائف رافٹ کے قریب آگئے۔ وہ کھانا ملنے کی آس میں کچھ دیر تک میرے اوپر ہوابازی کرتے رہے اور پھر جنوب کی طرف پرواز کر گئے۔ پرندے دکھائی دینے پر ایک فوری خیال میرے دماغ میں آیا۔ میں ایک اچھا تیراک تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو اپنے کھانے کے لیے مچھلی یا پھر کیکڑا وغیرہ پکڑ سکتا تھا۔ اس طرح میرے پاس موجود خوراک کی بچت ممکن تھی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور سطح سمندر کو غور سے دیکھنے لگا۔ کیوں نہ پہلی کوشش ابھی اور اسی وقت کی جائے۔ اس وقت آسمان صاف اور سمندر پُرسکون تھا۔ میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا اور لکڑی کی چار فٹ لمبی اسٹک اُٹھالی۔ میں نے اس کے ایک سرے کو دانتوں سے کتر کر تیکھا کیا اور سمندر میں کود گیا۔ میں اپنے گزارے لائق نیزے کو سنبھالے رافٹ کے اردگرد تیرتا رہا لیکن مجھے کھانے کے قابل کوئی سمندری مخلوق دکھائی نہیں دی۔ شاید مچھلیاں زیادہ گہرائی میں تھیں اور وہاں تک غوطہ لگانا خطرناک تھا۔ میں واپس رافٹ پر آگیا۔ میں

نے گوشت کا ایک قتلا کھایا اور سولر اسٹلس سے جو... لگا۔ جوں جوں سورج اوپر اُٹھتا رہا، موسم گرم اور حبس زدہ... چلا گیا۔ میں خود کو مصروف رکھے ہوئے تھا لیکن میرا حلق... کر کانٹا ہو گیا تھا اور مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ میں ہاتھ بڑھا کر سمندری پانی کو ہتھیلی پر لیا اور منہ میں ڈال لیا... پانی بے حد کھارا تھا۔ میں نے اسے نگلنے کی بجائے کچھ دیر تک منہ میں رکھا اور پھر کلی کر دی۔ ایسا میں نے کئی بار کیا۔ میں... پیاس کیا بجھنی تھی اُلٹا میرا منہ کڑوا کسیلا ہو گیا۔ میں اس... بھی سولر اسٹلس کو قابلِ استعمال بنانے کا طریقہ نہ ڈھونڈ پایا... شام کے قریب میں نے بوتل کو منہ سے لگایا اور پانی کے گھونٹ حلق سے اُتارے۔ تھوڑا سا کھانا کھایا اور ستانے کے لیے لیٹ گیا۔

جب تک میرے پاس قابلِ استعمال پانی اور خوراک رہی حالات ایک جیسے رہے۔ یہ کھلے سمندر میں بے یار و مددگار تیرتے ہوئے میرا ساتواں دن تھا اور مجھے اب تک بحری جہاز کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ موسم کے مزاج... اندازہ ہو رہا تھا کہ میری لائف رافٹ خطِ سرطان کے آس پاس تھی اور مسلسل مغرب کی طرف تیر رہی تھی۔ سمندر کے اس حصے میں دن کے وقت گرمی اور رات میں اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جایا کرتی تھی۔ میں دن کے بیشتر حصے میں اپنی شرٹ کو ... کی طرح لپیٹے رہتا اور رات ہونے پر مکمل کپڑے پہن لیتا۔ گدے کا کشن میرے لیے ناکافی ثابت ہو رہا تھا اس... میں نے سردی سے بچنے کے لیے پلاسٹک سے بنی ایمرجنسی کٹ کو پھاڑ کر ایک کام چلاؤ جیکٹ تیار کر لی تھی۔ یہ جیکٹ رات کے وقت میرے اوپری جسم کو کسی حد تک حرارت... کرتی تھی۔

سفر کے آٹھویں دن میرے پاس خشک جھینگے کے دو... اور قریب ڈیڑھ لیٹر پانی ہی باقی بچا تھا۔ بھوک، پیاس مجھ پر حاوی تھے اور میں اپنے مستقبل کو لے کر خوف زدہ تھا۔ میرے ہونٹ خشک تھے اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ یہ بدقسمتی تھی کہ میرے چاروں طرف اربوں گیلن پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جسے میں صرف چھو ہی سکتا تھا۔ پچھلے چند دنوں کے دوران صرف ایک رات معمولی بوندا باندی ہوئی تھی۔ تاہم اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں اپنی خالی بوتلیں بھر پاتا۔ میں ہر... مدد کے لیے ریڈیو پر مختلف چینلز آزماتا۔ بول بول کر میرا... درد کرنے لگتا لیکن مجھے کہیں سے کوئی ردِعمل سنائی نہ دیتا۔ لگ رہا تھا جیسے دنیا ڈوب چکی تھی اور میں ہزاروں کلومیٹر پر... سمندر میں تیرتا واحد زندہ انسان تھا۔ اکیلے پن کا احسا...

...ی شدت کے ساتھ مجھ پر حاوی تھا۔ میں نے اپنی مٹھی بھر ...ہ کو دیکھا اور سوچا کہ میں اس خوراک کے سہارے زیادہ ...زیادہ دو یا پھر تین دن ہی مزید نکال سکتا تھا۔ اب میری ...ری امیدیں سولر اسٹلس کے قابلِ استعمال ہونے سے ...ستہ تھیں۔ اتنا تو میں جان گیا تھا کہ سولر اسٹلس ناکارہ ہرگز ...نہیں تھیں، البتہ میں انہیں قابلِ استعمال بنانے کے طریقے ...سے انجان تھا۔ میں نے ایک اسٹلس کو ہاتھ میں لیا اور اسے ...الٹ پلٹ کر دیکھا۔ میں نے دماغ ٹھنڈا رکھتے ہوئے سوچنا ...شروع کر دیا کہ آخر میں غلطی کہاں کر رہا تھا؟ بہت سوچ سمجھ کر ...میں نے ایک تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہ جاننے کے ...لیے کہ سولر اسٹلس میں پینے کے لائق میٹھا پانی کیسے پیدا ہوتا ...ہے؟ چار میں سے تین اسٹلس کی چیر پھاڑ کا فیصلہ کیا۔ جی ...ہاں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بنا سوچے سمجھے بار بار ایک عمل ...دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے اسٹلس کو کھول کر ان ...کے ایک ایک پرزے کی بناوٹ پر غور کرنا تھا۔ شاید اس ...طریقے سے میں جان پاتا کہ اسٹلس کو کیسے قابلِ عمل بنایا ...جاتا تھا؟ گو کہ اس تجربے سے میں تین اسٹلس سے ہاتھ دھو ...بیٹھتا لیکن کامیابی کی صورت میں میری واحد کارآمد اسٹلس ...کو فروغ کر دیتی۔ میں ایک طرح سے جوا کھیل رہا تھا۔ ...جیت مجھے زندگی کے قریب لے جاتی اور ہار موت کے منہ میں۔

پہلی سولر اسٹلس کے ایک ایک پرزے کا جائزہ لینے ...کے بعد میں نے حاصل نتیجہ کو دوسری اسٹلس پر آزمایا، لیکن ...وہاں پانی پیدا نہ ہوا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر دوسری ...اسٹل کو کھولا اور زیادہ باریک بینی سے پرزوں کی بناوٹ پر غور ...کیا۔ قریب دو گھنٹے تک ہر ہر پرزے کی الگ الگ چھان ...بین کی۔ اس وقت تک دوپہر ہو چکی تھی پیاس سے میرا بُرا ...حال تھا۔ میں نے پانی کی آخری بوتل کو منہ سے لگایا اور دو ...گھونٹ بھرے۔ کچھ دیر مزید اسٹلس کے پرزوں کا جائزہ لیا ...اور ایک طویل سانس لے کر تیسری اسٹلس کو اُٹھا لیا۔ میں نے ...اب تک حاصل شدہ تجربے کی بنیاد پر ایک مخصوص طریقہ ...اختیار کرتے ہوئے اسٹلس کو کھارے پانی سے بھرا اور اسے ...رافٹ کے فرش پر رکھ دیا۔ میں نے چوتھی اسٹلس میں پانی ...بھرتے وقت قدرے مختلف طریقہ اپنایا۔ میں ٹکٹکی لگائے ...اسٹلس کے اوپری حصے میں بنے مگ کو دیکھنے لگا، جہاں سے ...قطرہ قطرہ پانی ایک جالی دار کپڑے میں سے ہوتا ہوا نیچے ...جمع ہو رہا تھا۔ قریب دو گھنٹے بعد میں نے ایک اسٹلس ...کو کھول کر اس میں جمع چند چمچ پانی چکھا۔ خوشی سے میری ...چیخ نکل گئی۔ وہ پانی پینے کے قابل تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو

بہہ نکلے۔ سچ یہ ہے کہ اس خوفناک حادثے سے پہلے میں مذہب کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں آخری بار چرچ کب گیا تھا؟ تاہم موت اور زندگی کے اس کھیل میں، میں نے پہلی بار خدا کو اپنے وجود سے قریب تر محسوس کیا۔ خدا کی مرضی تھی کہ میں زندہ رہوں۔ اب مجھے اپنا حوصلہ جواں رکھتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس دن شام کے وقت میں نے دونوں سولر اسٹلس میں جمع شدہ آدھے کپ جتنا تازہ پانی حاصل کیا۔ پانی مکمل میٹھا نہیں تھا، تاہم اس میں سے بیشتر نمکیات اُڑ چکے تھے اور وہ پینے کے قابل تھا۔ پیاس بجھنے کے بعد میں نے ایک نئی امنگ کے ساتھ سطح سمندر کو دیکھا۔ اب میرے پاس پینے کے لیے پانی موجود تھا۔ خالی معدے میں پانی جاتے ہی مجھے شدت سے بھوک محسوس ہوئی۔ میں نے جھینگے کا ٹن کھول کر چند لقمے لیے۔ اس دن بھی لائف رافٹ کے قریب تیرتے ہوئے میں نے مچھلی پکڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

آنے والے دنوں میں حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ میرے پاس جمع شدہ خوراک ختم ہوگئی۔ میں ایک مچھلی بھی شکار نہیں کر پایا اور بھوک سے بے حال ہو گیا۔ میری پسلیاں نکل آئیں، پیٹ کمر سے لگ گیا اور آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ بھوک کی وجہ سے کمزوری اس قدر تھی کہ مجھے دونوں سولر اسٹلس میں پانی جمع کرنا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ یہ لائف رافٹ پر میرے سفر کا پندرہواں دن تھا۔ میں سارا دن کسی معجزے کے انتظار میں بے بس پڑا رہا۔ سہ پہر کے قریب بادل چھا گئے اور کچھ ہی دیر میں بوندا باندی شروع ہوگئی۔ میں نے لیٹے لیٹے منہ کھول کر چند بوندیں حلق میں اُتاریں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک مجھے سطح کے قریب میری رنگ برنگی ٹریگر فش (Triggerfish) کا غول دکھائی دیا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی اور سمندر میں کود گیا۔ قسمت نے میرا ساتھ دیا اور میں ایک گھنٹے کی تھکا دینے والی تیراکی کے بعد دو چھوٹی مچھلیاں شکار کرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے مچھلی کا پیٹ صاف کیا۔ اس کے ٹکڑے کیے اور کچے گوشت کے ایک قتلے کو خوب چبانے کے بعد نگل گیا۔ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پوری مچھلی چبا کر کھائی اور کسی حد تک توانائی محسوس کی۔ میں نے دوسری مچھلی کے قتلے کاٹ کر اسے محفوظ کر لیا۔ قدرت نے پینے کے ساتھ ساتھ میرے کھانے کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ اب اگر میری لائف رافٹ ساتھ دیتی تو میں کچھ دن مزید زندہ رہ سکتا تھا۔ پیٹ بھرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا

کہ اب میں بیکار پڑا رہنے کے بجائے شکار پر زیادہ توجہ دوں گا۔ اپنے پہلے شکار کے دن میں بحری جہاز دکھائی دینے کے حوالے سے بھی خوش گمان تھا، تاہم رات گئے تک مجھے سوائے سیاہی مائل نیلے پانی کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔

☆☆☆

فروری کے تیسرے عشرے کے دوران ایک صبح میری آنکھ پرندوں کے شور سے کھلی۔ میں نے دیکھا درجنوں سفید اور نیلے البٹروس سطح سمندر پر تیرتی کسی چیز پر منڈلا رہے تھے۔ ذرا غور کرنے پر مجھے پانی کی سطح پر ایک مردہ البٹروس تیرتا دکھائی دیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور پانی میں کود گیا۔ البٹروس کا جسم کافی حد تک گرم تھا۔ غالباً مچھلی پکڑنے کے دوران کچھ ہی دیر پہلے وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہوا تھا۔ پروٹین سے بھرپور دو کلو کے لگ بھگ گوشت ہاتھ آیا تو میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اگر میرے پاس جلانے لائق کوئی چیز ہوتی تو مزہ آجاتا۔ میں نے پرندے کے پر اور پیٹ کی غلاظت صاف کرکے سمندر میں پھینک دی۔ اس دن شام کے وقت بارش ہوئی جس کے پانی کو میں نے محفوظ کرلیا۔ کھانے پینے کے لحاظ سے میرا وہ دن قدرے بہتر رہا۔ سورج غروب ہوتے ہوتے بارش رکی تو مجھے نیند آگئی۔

رات کے آخری پہر شدید جھٹکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ لائف رافٹ بُری طرح لرز رہی تھی۔ کوئی چیز اس کے پیندے سے رگڑ کھا رہی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک لائف رافٹ سطح سمندر سے اس طرح بلند ہوئی جیسے کسی نے اسے نیچے سے مکا مارا ہو۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اُچھل کر پانی میں جا گرا۔ میرا کچھ سامان بھی سمندر میں گر گیا۔ میں نے رافٹ تک رسائی کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تو مجھے ایک نیلی شارک دکھائی دے گئی۔ قریب دس فٹ لمبی شارک نے مجھے دیکھ لیا اور تیزی سے میری طرف لپکی۔ میں نے خود کو شارک کے حملے سے بچانے کے لیے غوطہ لگایا اور رافٹ کی طرف بڑھا۔ اس دوران شارک اس حد تک میرے قریب آگئی کہ مجھے اس کے کھلے جبڑے میں سے جھانکتے نوکیلے دانت دکھائی دے گئے۔

"اے مجھ سے دور رہو۔" میں گلا پھاڑ کر چیخا اور ہاتھوں سے پانی پر چھپ چھپ کرنے لگا۔ شارک میرے قریب سے نکل گئی۔ میں لپک کر رافٹ پر چڑھا۔ میں نے اپنی چھڑی اُٹھائی اور اسے زور زور سے پانی پر مارنا شروع کردیا۔ کچھ سیکنڈ کے وقفے سے شارک مجھے دوبارہ دکھائی دی۔ میرے شور کرنے کا اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ وہ اگلے چند منٹ تک میری رافٹ کے قریب منڈلاتی رہی۔ اس کو دیکھ کر میری نیند اُڑ چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اب میں گرا تو وہ میرا کام تمام کردے گی۔ بھلے وہ مجھے نہ کھا سکتی لیکن اتنا نقصان پہنچا سکتی تھی کہ میں پھر کسی قابل نہ رہتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ناامید ہو کر غصے میں میری لائف رافٹ کو پھاڑ سکتی تھی۔ جب تک شارک کو یہ احساس نہ ہوتا کہ میں اس کے لیے خطرناک ہوں، تب تک وہ میری رافٹ کا طواف کرتی رہتی۔ مچھلی پکڑنے کی چھڑی میرے ہاتھ میں تھی اور میں اس کے قریب آنے کا انتظار کررہا تھا۔ اچانک اس کا اوپری جسم رافٹ کے قریب سطح سے اُبھرا۔ مجھے بس اسی پل کا انتظار تھا۔ میں نے پوری طاقت سے چھڑی کی نوک اس کی کمر میں اُتار دی۔ شارک کو ایک جھٹکا لگا اور وہ گہرے پانی میں غوطہ لگا گئی۔ میں چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، خیریت رہی اور وہ دوبارہ دکھائی نہیں دی۔ خطرہ ٹلا تو میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ رافٹ میں چند انچ پانی بھر چکا تھا اور اس میں کچھ چیزیں تیر رہی تھیں۔ میں نے پلاسٹک کے ایک ٹکڑے کی مدد سے پانی باہر نکالا اور اپنی چیزیں سنبھالنے لگا۔ اس دوران یہ دیکھ کر میرے اوپر گھبراہٹ طاری ہوگئی کہ شارک کے حملے کے نتیجے میں، میں ایک اٹلس اور ریڈیو سے محروم ہوچکا تھا۔ میری دو خالی بوتلیں بھی غائب تھیں، تاہم اٹلس اور ریڈیو کی محرومی میرے لیے کسی عظیم صدمے سے کم نہیں تھی۔ میں نے سامان کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن یہ خود کو تسلی دینے والی بات تھی۔ میرا قیمتی سامان سمندر میں ہزاروں فٹ کی گہرائی میں کہیں غائب ہوچکا تھا۔ میں ان چیزوں سے محروم ہوگیا تھا جو میری زندگی کی ضامن ہوسکتی تھیں۔

مارچ کی شروعات میں حالات گمبھیر ہوچکے تھے۔ شکار کے حوالے سے پچھلے چند دن نہایت بُرے گزرے تھے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اس دوران آسمان سے پانی کی ایک بوند بھی نہیں برسی تھی اور رہ گئی میری واحد سولر اسٹل، اس سے حاصل شدہ پانی میری ضرورت کے لیے ناکافی تھا۔ میں بھوک پیاس سے پریشان آسمان پر اٹکھیلیاں کرتے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔ پانی کے لیے اب میرا دارومدار ان پر تھا۔ اس دن دوپہر ہی سے حبس ناقابلِ برداشت تھا۔ آسمان پر بادلوں کے پانی سے بھرے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کے لیے یکجا ہوتے اور پھر بکھر جاتے۔ سورج غروب ہونے تک پیاس ناقابلِ برداشت ہوچکی تھی۔ میں رہ رہ کر سولر اسٹل کو دیکھتا جس میں قطرہ قطرہ تازہ پانی جمع ہو رہا تھا۔

بارش کی امید میں آسمان پر ٹکٹکی لگائے لیٹا ہوا تھا۔ چاند بادلوں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ کبھی سمندر پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا اور کبھی پورا ماحول دودھیا روشنی سے منور ہوجاتا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس نظارے سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا۔ اندھیرے اُجالے کے اس کھیل کے دوران اچانک میں نے دور شمال میں ایک جلتی بجھتی روشنی دیکھی۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں ایک بحری جہاز تھا۔ میرے ہیجان میں اضافہ ہوگیا اور میں بے چینی سے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے ایک بڑے بحری جہاز کا ہیولا دکھائی دے گیا۔ میں خوشی سے جھوم اُٹھا۔ آخرکار میں بہتے بہتے بحری جہازوں کی آمدورفت والے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ بحری جہاز مجھ سے قریب دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور مجھ سے مسلسل قریب ہورہا تھا۔ میں نے اپنی ٹارچ اُٹھائی اور بے چینی کے ساتھ بحری جہاز کے مزید قریب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ بالآخر مجھے عرشے پر اپنے سوا انسان کے ہونے کی جھلک دکھائی دے گئی۔ کچھ دیر مزید گزر گئی۔ فاصلہ کچھ کم ہوا تو میں نے ٹارچ کا بٹن دبایا اور اسے بحری جہاز کی طرف کرکے اشارہ کرنے لگا۔ چند سیکنڈ اسی طرح گزرے ہوں گے کہ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میں نے ٹارچ کا منہ اپنی طرف گھمایا اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ٹارچ میں لگے بلب میں زندگی کی ذرا سی بھی رمق باقی نہیں تھی۔ میں نے ایک نظر بحری جہاز کی طرف دیکھا اور عجلت میں ٹارچ کو ہلایا جلایا۔

"جلو جلو، خدا کے لیے جل پڑو۔" میں نے ٹارچ کے بٹن کو کھولا اور بند کیا، پھر کھولا۔ نتیجہ صفر رہا۔ آپ حیران ہوں گے کہ مجھے ہوا میں ڈیزل کی بو واضح طور محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ بحری جہاز کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بڑے بڑے کنٹینرز لدے ہوئے تھے۔ زندگی کو اس قدر قریب دیکھ کر میں حواس باختہ ہوگیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ٹارچ کو کھولا۔ بیٹری کے چاروں سیل باہر نکالے، انہیں شرٹ سے رگڑ کر صاف کیا اور دوبارہ ٹارچ میں ڈال کر بٹن پریس کیا لیکن نتیجہ پہلے جیسا ہی رہا۔ میں نے ٹارچ رافٹ پر پٹخا۔ اپنی شرٹ اُتاری اور اسے کسی جھنڈے کی طرح لہرانا شروع کردیا۔ ساتھ ہی میں حلق کے بل چیخ چلا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا شاید بحری جہاز کے عملے نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ میں شرٹ لہراتے ہوئے جہاز کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ مجھ سے آدھ کلومیٹر کی دوری تک آیا اور......

پھر...... میری بغل سے ہو کر اپنے مقرر راستے کی طرف بڑھنے لگا۔

"اے رکو...... میں اِدھر ہوں۔" میں اسے خود سے دور جاتے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ میں خشکی تک رسائی کے اس بہترین موقعے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں کہ جہاز کے عملے کی توجہ میری طرف مرکوز ہوجائے۔

"یہاں دیکھو، میں یہاں ہو...... میری مدد کرو...... میں یہاں ہوں......" میں مسلسل چیختا چلاتا رہا، لیکن وہ بحری جہاز میری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں بے دم ہو کر رافٹ کے فرش پر گر گیا۔ مدد قریب آکر بھی مجھ سے دور چلی گئی تھی۔ مجھے اپنی بدقسمتی پر رونا آگیا۔ میں نے بے بسی اور غصے سے ٹارچ کو دیکھا۔ غالباً مسلسل نمی کی وجہ سے اس کی بیٹریاں سیل چکی تھیں۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں تیز آواز میں چیخنے چلانے لگا۔ میں اپنا غصہ سمندر پر نکال رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ پانی میں کود کر سمندر سے بھڑ جاؤں۔ کسی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے یہ ایک آئیڈیل رات تھی۔ اگر میری ٹارچ کام کرتی تو سوال ہی نہیں تھا کہ جہاز کا عملہ مجھے دیکھ نہ پاتا۔ میں دھیرے دھیرے پُرسکون ہونے لگا۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ اس سارے معاملے میں بحری جہاز کے عملے کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ ان سے کچھ دور ایک بے یار و مددگار شخص موت و زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ میں نے خود کو سمجھانا شروع کیا کہ خاص کر رات کے وقت کھلے سمندر میں کچھ تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے، اسے بھی جیسے آپ اسے ڈھونڈ رہے ہوں۔ میں ایک بار پھر سمندر میں اکیلا تھا۔ تاہم بحری جہاز کی جھلک نے میرے اندر زندہ رہنے کی امنگ جگا دی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میری لائف رافٹ بہتی ہوئی...... کی طرف آنے جانے والے بحری راستے کے قریب سفر کررہی تھی تو پھر آنے والے دنوں میں میرا کئی بحری جہازوں سے سامنا ہوسکتا تھا۔ اس رات موسلا دھار بارش ہوئی۔ میں گدے کے گیلے کشن میں دبکا اپنی بے بسی پر کڑھتا رہا۔ مجھے لگا جیسے آسمان بھی میری بدقسمتی پر رو رہا ہو۔

اگلے ایک ہفتے کے دوران حالات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ بحری جہاز دیکھنے کی آس لیے میری آنکھیں پتھرا گئیں، تاہم لگتا تھا کہ جیسے وہ اس طرف کا راستہ ہی بھول گئے تھے۔ اس دوران میرے ہاتھ ایک آدھ مردہ مچھلی، سمندری کائی، بحری جہازوں سے بہہ کر آنے والا کوڑا اور کچھ

اسی قسم کی چیزیں ہی لگیں۔ میں نے اپنی تارچ کو کارآمد بنانے کی بھی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس میں زندگی کی کوئی رمق پیدا نہیں ہوئی۔

مارچ کے وسط میں، میری لائف رافٹ سمندر کے استوائی حصے میں داخل ہوئی۔ گرم مرطوب موسم اپنا اثر دکھانے لگا۔ میں ہر وقت پسینے میں شرابور رہنے لگا جس سے میرے اندر پانی کی طلب کئی گنا بڑھ گئی۔ مجھے ہر لمحہ یہ احساس ہوتا جیسے میں اُبلتے ہوئے کھارے پانی کے کڑاہے میں سفر کر رہا تھا۔ گرم مرطوب موسم میں نمی زیادہ ہونے کی وجہ سے پسینا زیادہ آتا ہے اور یہاں ایک آدمی کو چاق و چوبند رہنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کے دوران کم از کم سات سے دس لیٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موسم میں بنا کھائے دو ہفتے تک زندہ رہا جاسکتا ہے لیکن بغیر پانی کے دو دن بھی نہیں۔ تاہم صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میں ان حالات میں اپنی اکلوتی سولر اسٹلس کے ذریعے ایک دن میں صرف آدھ لیٹر کے قریب تازہ پانی ہی حاصل کر پا رہا تھا۔ لگ بھگ ہر روز دوپہر کے شدید حبس کے بعد یہ تماشا ہو رہا تھا کہ جنوب کی طرف سے امڈتی سرمئی گھٹائیں آسمان پر چھا جاتیں۔ میں پیاس سے نڈھال امید بھری نظروں سے آسمان کو تکتا رہتا۔ بادل خوب زور و شور سے گرجتے لیکن سوائے ہلکی بوندا باندی کے کچھ نہیں ہوتا۔ گھرے بادل برسنے سے پہلے ہی منتشر ہو جاتے اور میری امیدیں دم توڑ جاتیں۔ آسمان سے گرتی ایک ایک بوند میرے لیے امرت دھارا سے کم نہیں تھی۔ میری واحد سولر اسٹلس پینے کے لائق پانی تیار نہیں کر پا رہی تھی۔ میں اسٹلس میں پانی بھر کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہتا۔ یہ سمندر میں میری کڑی آزمائش کے دن تھے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی مجھ سے کہتا کہ پانی کی ایک بوند کے بدلے اپنا ہاتھ دے دو تو میں بنا سوچے سمجھے اپنا ہاتھ کاٹ کر دے دیتا۔ اس دوران میں بحری جہازوں کی جھلک پانے کے لیے مسلسل ارد گرد نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں راتوں کو بھی کم سو رہا تھا۔ جب آنکھ کھلتی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیتا۔ نیند کی کمی سے میں چڑچڑا ہو گیا تھا اور مجھ پر تھکاوٹ غالب رہنے لگی تھی۔ میرے لیے ہر صبح کا سورج امید کی نئی روشنی لے کر طلوع ہوتا اور پھر جیسے جیسے دن ڈھلتا مایوسی مجھ پر حاوی ہوتی جاتی۔

مارچ کے تیسرے عشرے کے دوران میرے اعصاب کی کڑی آزمائش شروع ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ لگاتار پانچ دن تک کوئی بھی دن ایسا نہ گزرا جب مجھے مختلف سمتوں میں جاتے کسی بحری جہاز کی جھلک دکھائی نہ دی ہو۔ میری نیندیں حرام ہو گئیں۔ بحری جہازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی میری ہر کوشش ناکام رہی۔ حیرت انگیز طور پر بیشتر بحری جہاز مجھے دن میں دکھائی دیے لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے لیے نہ رکا۔ میں وسیع و عریض سمندر میں اپنی قسمت کا ماتم کرتا رہا۔ لائف رافٹ پر 48ویں دن میں نے ایک گھنٹے کے وقفے سے دو بحری جہاز دیکھے۔ چیخ چیخ کر میرا گلا دکھنے لگا اور وہ اپنے راستے پر چلتے رہے۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں زار و قطار رویا۔ مجھے اپنی زندگی پوری طرح سے خطروں میں گھری اور خالی خالی سی دکھائی دی۔ ایک کڑوا سچ اب میرے سامنے تھا۔ بحری جہازوں کا رکنا محال دکھائی دے رہا تھا۔ اب میرے بچنے کی واحد امید کسی جزیرے تک رسائی تھی۔ تو اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہوائیں میری رافٹ کو مغرب کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ میں نے اپنی رفتار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندازہ لگایا کہ اگر میں فی دن تیس کلومیٹر کی رفتار سے تیرتا رہا تھا تو پھر اب تک پندرہ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری رافٹ خط سرطان 45 ڈگری مغرب کے آس پاس تھی۔ اگر میری موجودہ رفتار برقرار رہتی تو مجھے جزائر غرب الہند تک رسائی کے لیے ایک سے ڈیڑھ ماہ درکار تھا۔ جبکہ میری حالت یہ تھی کہ میں گزرتے لمحے خود کو موت سے قریب ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ میں اس سے زیادہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے پاس محفوظ شمالی بحر اوقیانوس کے نقشے کو سامنے رکھا اور غرب الہند سے پہلے نئے جزائر تلاش کرنے لگا۔ یہ خود کو تسلی دینے والی بات تھی۔ میں نقشہ دیکھے بغیر بھی بتا سکتا تھا کہ وہاں تین ہزار کلومیٹر کے وسیع دائرے میں سوائے خالی سمندر کے کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ کی ناامیدی سے خوش گمانی زیادہ بہتر تھی۔ ہوسکتا ہے کہ میرے قرب و جوار میں بہت ہی چھوٹے کچھ ایسے جزائر ہوں جنہیں اب تک دریافت نہ کیا جاسکا ہو۔

مارچ کے آخری ایام میں بارشوں کے ایک سلسلے نے مجھے سہارا دیا۔ اب میرے پاس ہر وقت کم از کم آدھی بوتل تازہ پانی محفوظ رہنے لگا۔ تاہم ایک مصیبت کم ہوئی تو دوسری سر اُٹھانے لگی۔ برساتی موسم میں مچھلیاں زیادہ گہرائی میں چلی گئیں اور میری شکار کی اوسط کم ہونے لگی۔ میں ہمت کر کے پانی میں اُترتا لیکن زیادہ تر میرے ہاتھ خالی ہی رہتے۔ اس دوران میں لائف رافٹ پر موجود چبانے لائق ہر چیز کھا گیا۔ میری پینٹ کی چمڑے سے بنی بیلٹ اور اپنے پسندیدہ مصنف کی کتاب کا دو تہائی حصہ میرے پیٹ میں تھا۔ لکڑی کے چند ٹکڑے، ایمرجنسی کٹ کا کچھ حصہ اور دونوں ناکارہ سولر اسٹلس کے پرزے میری خوراک بن چکے تھے لیکن بھوک کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ غیر متوازن غذا کھانے سے میری زندگی کی ڈور تو بندھی رہی لیکن معدہ خراب رہنے لگا۔ مجھے ہر وقت متلی، چکر اور سر درد کی شکایت رہنے لگی۔ میں اپنا کئی کلو گرام وزن کھو چکا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔ ناخن، سر اور داڑھی کے بال بڑھ چکے تھے۔ میرا رنگ کھارے پانی کی مار سہہ کر پیلا زرد ہو چکا تھا۔ میں بیمار تھا اور خود کو ایک کمزور بوڑھے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ بھوک نے مجھے بے صبرا بنا دیا تھا۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ میں خود کو بھی نوچ کھاؤں۔ ایک دن نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنے ہاتھوں کے بڑھے ہوئے ناخن اور اس کے گرد پھولا ہوا گوشت کتر ڈالا۔ ایک ہاتھ کے ناخن کھانے کے بعد میں نے ہوس بھری نظروں سے دوسرے ہاتھ کو دیکھا، لیکن فوراً ہی رک گیا۔ اتنی بھی بے صبری ٹھیک نہیں تھی۔ اپنا ہاتھ تھا، کہیں بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کے ناخنوں کو کل کے لیے بچا لیا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بھوک پیاس مل کر مجھے اس مقام تک لے آئے تھے جہاں میں چبانے لائق ہر شے کھانے پر تلا ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف ایک خالی پن تھا جسے بھرا نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ خشکی پر گزری میری زندگی ایک خواب تھی۔ دراصل میں سمندر ہی میں پیدا ہوا تھا اور اب اس کی گہرائیاں ہی میرا مقدر تھیں۔

اپریل کی شروعات تھی اور لائف رافٹ پر میرا ساٹھواں دن تھا۔ میں نے رافٹ پر بیٹھے بیٹھے سطح سمندر کے قریب تیرتی ایک مچھلی پر اپنی نیزہ نما چھری کا وار کیا۔ چھری اس کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ تاہم مچھلی اس زور سے تڑپی کہ میری چھری کا اوپری نوک دار سرا ٹوٹ گیا۔ چھری سے خود کو چھڑاتے ہی مچھلی میری رافٹ کے کنارے سے ٹکرائی۔ اچانک ایک تیز سیٹی کی آواز نکلی اور رافٹ کے نیچے سطح سمندر سے پانی کے بلبلے نکلنے لگے۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ نامراد مچھلی نے میری رافٹ میں سوراخ کر دیا تھا۔ میں بدحواس ہو گیا۔ رافٹ ایک سائیڈ سے پچکنے لگی۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کروں؟ میں ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ زندہ رہنے کی میری تمام امیدیں لائف رافٹ کے وجود سے وابستہ تھیں۔ رافٹ کا توازن بگڑتے ہی میں اس پر سے وزن کم کرنے کے لیے سمندر میں کود گیا۔ میں نے سطح سمندر سے چند انچ نیچے رافٹ کے کنارے کو ٹٹولا۔ میری انگلیاں ایک انچ لمبے ایک سوراخ سے ٹکرائیں۔ میں نے فوری طور پر سوراخ والے ربڑ کے کمزور حصے کو اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ ہوا خارج ہونی بند ہو گئی۔ مجھے کچھ سکون ملا۔ اب مجھے اس مسئلے کا مستقل حل نکالنا تھا۔ لائف رافٹ کے کنارے سے جڑا میرا پورا دھڑ پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور میں نے ایک ہاتھ کی مدد سے اپنی کشتی میں ہونے والے سوراخ کو بند کر رکھا تھا۔ مجھے ایک مضبوط دھاگے اور سوئی کی ضرورت تھی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ یہاں کھانے کے لالے پڑے تھے اور میں سوئی دھاگا تلاش کر رہا تھا۔ میں نے سر اونچا کر کے رافٹ کے فرش پر ڈھیر اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ وہاں بہت سی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں ایک ایک شے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ تاہم بدحواسی اور عجلت میں مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ کو ٹھنڈا کیا اور پھر نئے سرے سے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ میں نے سورج کی روشنی کو کسی چمکدار چیز سے منعکس ہوتے دیکھا۔ میرے دماغ میں ایک جھماکا ہوا۔ میری پینٹ کی بیلٹ کا کچھ حصہ قریب ہی پڑا تھا اور اس سے منسلک اسٹیل کا بکل سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر بکل اُٹھایا اور کھینچ کھانچ کر اس میں لگی ڈیڑھ انچ لمبی پن باہر نکال لی۔ پن کو منہ میں زبان کے نیچے محفوظ کیا اور دھاگے کی تلاش شروع کی۔ میں نے اپنی شرٹ کا ایک سرا پھاڑ کر پتلی لمبی رسّی بنائی۔ اسے پن سے منسلک کیا اور اپنے کام میں جت گیا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کی کڑی مشقت کے بعد میں رافٹ کے سوراخ کو کافی حد تک بند کرنے میں کامیاب رہا۔ گو کہ رافٹ کا ایک سرا کچھ پچک گیا تھا۔ تاہم وہ اب بھی تیرنے کے قابل تھی۔ کام مکمل کرنے کے بعد میں رافٹ کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی سی محنت نے مجھے تھکن سے چور کر دیا تھا۔ اس دن میں نے ہر گھنٹے بعد سوراخ کا جائزہ لیا۔ تاہم یہ دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی کہ سوراخ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔

اگلے دو دن خیریت سے گزرے، تاہم 63ویں دن میں نے پایا کہ میرا لگایا پیچ کمزور پڑ رہا تھا۔ میں نے ہمت جمع کی اور ایک بار پھر پانی میں اُتر گیا۔ میں نے نئے سرے سے سوراخ کی مرمت کی۔ آخر کب تک میں اس سوراخ کو بند رکھ پاؤں گا؟ اپنی بدقسمتی پر میرے آنسو نکل پڑے۔ مجھے لگا کہ میں ایک ناکام انسان تھا۔ میری بیوی مجھے چھوڑ گئی تھی۔ کوئی قریبی دوست نہیں تھا۔ میں بے یار و مددگار ایک مصیبت

سے نکلتا تو دوسری میری منتظر ہوتی۔ کیا زندگی اتنی چھوٹی بھی ہوسکتی ہے یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے وہ قیدی یاد آئے جنہیں جیل میں قیدِ تنہائی میں رکھا جاتا ہے۔ شاید وہ قیدی مجھ سے بہتر محسوس کرتے ہوں۔ کم از کم انہیں کھانا پانی تو ضرور ملتا ہوگا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں ہر لمحہ کسی قبر میں اُترنے کا دھڑکا تو نہیں لگا رہتا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا کے سمندروں میں ہزاروں ایسے جزائر بکھرے ہوئے تھے جہاں اب تک انسانی قدم پہنچ نہیں پائے تھے۔ آخر کہاں گئے وہ جزائر؟ بحرِ اوقیانوس کی حد تک غیر دریافت شدہ جزائر کا مفروضہ کتنا غلط تھا، یہ مجھ سے بہتر اور کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ اس حادثے سے پہلے میں اپنی زندگی کا ایک عشرہ سمندر میں گزار چکا تھا اور اسے ہمیشہ اپنے اوپر مہربان ہی پایا تھا۔ میں نے پانی کے سامنے کبھی ہار نہیں مانی تھی، تاہم اب لگتا تھا کہ میرے بُرے دن شروع ہوچکے تھے۔ سمندر اتنا بے رحم بھی ہوسکتا ہے یہ مجھے اب احساس ہو رہا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے اپنی موت کے بارے میں غور کرنا شروع کردیا۔ کیا میں مرنے کے بعد مچھلیوں کی خوراک بن جاؤں گا؟ کیا دنیا کو کبھی پتا چل پائے گا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟ اب تو یہ امید ہی ختم ہوچلی تھی کہ ریڈیو پر میری مدد کا پیغام کسی نے سنا ہوگا۔

آنے والے چند دن ایسے گزرے جب آسمان سے پانی کی ایک بوند نہیں برسی۔ بھوک، پیاس، بیماری اور دن رات لہروں کے تھپیڑے سہنے کے بعد میری زندہ رہنے کی خواہش کمزور پڑنے لگی۔ اب مجھ میں شکار کرنے کی ہمت بھی باقی نہیں بچی تھی۔ میں منہ کھولے پتھرائی ہوئی خالی آنکھوں سے آسمان کو تک رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے میرے جسم کے اندر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ میرے جسم میں نمک کی بڑھتی ہوئی مقدار میری سوچ پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ میں ہر چیز کے منفی پہلو کو دیکھ رہا تھا۔ میری واحد سولر اسٹلس کھارے پانی سے بھری ہوئی تھی اور لگ رہا تھا کہ اسے تازہ پانی پیدا کرنے میں کئی صدیاں لگیں گی۔ میرا جسم پکار رہا تھا کہ چاروں طرف پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے تو پھر میں اسے پیتا کیوں نہیں؟ میں نے بہت برداشت کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے چلو بنا کر سمندر کا پانی حاصل کیا اور بغیر سوچے سمجھے اسے حلق سے اُتار لیا۔ کڑوے کسیلے نمک کی تیز دھار میرے معدے کی نالی میں بھر گئی۔ معدے میں شدید اینٹھن کا احساس ہوا اور فوراً ہی مجھے قے آگئی۔ میرا معدہ اُبل پڑا تھا۔ کھارا پانی پینے کا انجام اور بھی بھیانک تھا۔ جسم کی بچی کھچی طاقت بھی باہر نکلنے پر تلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک اوندھا پڑا رہنے کے بعد میں نے

ہمت کی اور سولر اسٹلس کی طرف گھسٹتا ہوا گیا۔ اس میں د... کے قریب پانی جمع تھا۔ میں نے بے صبری سے اس کا کور ... اور کرسٹل کے پیالے کو منہ سے لگالیا۔ میں نے تھوک نگلا ... پیالے کو چاٹنے لگا۔ کچھ نمی میرے جسم میں گئی تو سکون ... احساس ہوا۔ میں نے اسٹلس کو دوبارہ پانی سے بھرا اور ڈ... رابرٹ سن کی ادھ کھائی کتاب کو اُٹھالیا۔ میں نے کتاب ... دو گیلے ورق پھاڑے، انہیں تہ کر کے نوالا بنایا اور منہ ... ڈال کر چبانے لگا۔ کاغذ چباتے ہوئے ایک انوکھا خ... میرے دماغ میں آیا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب ... آگیا تھا کہ میں سانس کی ڈور کو بحال رکھنے کے لیے ... پسندیدہ طریقے اختیار کرتا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے ... اپنے جسم میں محفوظ پانی کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔

انسانی پیشاب میں 95 فیصد پانی اور باقی نمکیا... ہوتے ہیں۔ جان بچانے کے لیے اس کا تازہ استعمال ... ہوتا ہے۔ اگر اسے کچھ دیر تک یونہی جمع رکھا جائے تو پھ... میں مہلک جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں جو کسی کمزور انسان کی ... بھی لے سکتے ہیں۔ جب جان پر بنی ہو تو زندہ رہنے کے ... قدرتی طریقے اپنانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھانی چا...

رابرٹ سن کی کتاب کے الفاظ میرے دماغ ... گردش کرنے لگے۔ میں نے اس دن بہت مجبور ہو... پیشاب جمع کیا۔ بدبودار پیلے محلول کو دیکھ کر مجھے ش... کراہیت محسوس ہوئی تاہم میں نے خود کو سمجھایا اور نہ چا... ہوئے بھی اسے استعمال کر ڈالا۔ کچھ نمی میرے جسم میں ... پہنچی، تاہم میرا معدہ اسے قبول نہیں کرپایا۔ میرے پیٹ ... شدید مروڑ اُٹھنے لگے اور پھر مجھے پیچش لگ گئے۔ اگلے چ... گھنٹے کے اندر اندر میری حالت خراب ہوگئی اور میں ہاتھ ... چھوڑ بیٹھا۔ بہت ممکن تھا کہ پیچش کی جان لیوا بیماری میر... تمام کردیتی کہ تب ہی قدرت کو مجھ پر رحم آگیا۔ اُس ... موسلا دھار بارش ہوئی اور مجھے زندگی سے چند لمحے اُدھار مل گئے۔

☆☆☆

اپریل کے وسط میں ایک اور خوفناک حقیقت م... سامنے تھی۔ میری سولر اسٹلس کی پانی تیار کرنے کی صلا... قریب قریب ختم ہوچکی تھی۔ اس میں لگا جالی دار کپڑا ... ہوچکا تھا۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جس کی مرمت نہیں کی ... تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اب زیادہ سوچنے ... کرنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ بجائے مایوسی کے مسکر... میرے لبوں پر کھیلنے لگی۔ ٹھیک ہے، میں ہر نئی مصیبت کا

...لے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے سوچا اب زیادہ سے ... کیا ہوگا؟ کیا موت سے بڑھ کر بھی کوئی مصیبت ہے؟ ...ہے میں تیار ہوں، میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور بڑ... میرے پاس گزشتہ بارش کا جمع شدہ ایک لیٹر کے ... پانی موجود تھا، تاہم سچ بات تو یہ ہے کہ بنا کسی ٹھوس ...اک کے صرف پانی کو معدے میں اُتارنے سے مجھے ... ہونے لگی تھی۔ مجھے آخری بار شکار کیے ہوئے بھی چار ... ہوچکے تھے۔ کھانے کے نام پر میری لائف رافٹ میں ... مچھلیوں کی چند باقیات ہی اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ ...نے انہی کو غنیمت جانا اور کچھ کانٹے، پَر اور اسی قسم کی ...وں کو اُٹھا کر دھیرے دھیرے چبانے لگا۔ انہیں معدے ... اُتارنے کے بعد میں نے دو گھونٹ پانی پیا اور پھر کسی ... کے انتظار میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

سفر کے 70ویں دن سورج ڈھلنے کے کچھ دیر بعد ... رنگ کا ایک بڑا کیکڑا میری رافٹ سے آکر چمٹ گیا۔ ...نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا اور اپنی جگہ لیٹا ... کمزوری اس قدر تھی کہ مجھے ہاتھ پیر ہلانا تو درکنار پلک ... ہی دشوار لگ رہا تھا۔ کیکڑا بغیر پلک جھپکائے مجھے دیکھ ... شاید فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ ہم دونوں میں سے شکار ... تھا؟ بہت دلچسپ صورتِ حال تھی۔ بے رحم سمندر کے بیچوں ... رافٹ پر موجود ہم دونوں ہی بھوکے تھے لیکن ایک ...ے پر حملہ کرتے ہچکچا رہے تھے۔ شدید بھوک کے باوجود ...ے پر ترس آگیا یا شاید میرے اندر اسے پکڑنے کی ... نہیں بچی تھی۔

"جاؤ بھاگ جاؤ۔" میں دھیرے سے بولا۔ مجھے تو ...ہے پھر اس ننھی سی جان کو اپنا شکار کیوں بناؤں؟ میں ... اور آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ کیکڑا ... بے بسی محسوس کرچکا تھا اور کچھ کر دکھانے کے موڈ ... جائے سمندر میں واپس جانے کے وہ میری رافٹ ... اور ادھر اُدھر رینگنے لگا۔ آخر کار میں نے اپنی چھڑی ... اسے بے جان کیا اور کھانے کے لیے رکھ چھوڑا۔ ... مجھے سطحِ سمندر پر تیرتی ایک چھوٹی بے جان مچھلی ... میں نے کسی نہ کسی طرح اسے پکڑ لیا۔ کچھ پروٹین ... تو زندہ رہنے کی اُمنگ پھر جوان ہوگئی۔ میں نے ... کہ میری رافٹ خشکی کے آس پاس ہی تھی۔ بس ... رکھی تھی۔

... سے زیادہ سمندر سے مقابلہ کرنے کے ... بندھی گھڑی وہ واحد مشین تھی جو اپنی پوری

صلاحیت سے کام کررہی تھی۔ تاہم مجھے گھڑی سے چڑ ہونے لگی تھی۔ دراصل وقت گزرنے کا احساس مجھے موت کی یاد دلا رہا تھا۔ 75ویں دن میں نے کلائی سے بندھی واٹر پروف گھڑی کو اُتارا اور اس کی چمڑے سے بنی چین کو چبا ڈالا۔ میں نے کھانے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ اب رافٹ پر چبانے لائق کوئی چیز باقی نہیں بچی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مجھے ان لوگوں کا خیال بھی آیا جو سمندر میں تنہا بھٹکتے ہوئے موت کا شکار ہوگئے تھے۔ شاید میں انہی میں سے ایک تھا اور اپنے ارد گرد انہیں محسوس کررہا تھا۔ میں نے رحم طلب نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے آنکھیں بند کرنا چاہیں تو مجھے پپوٹوں میں درد محسوس ہوا۔ میں ایک زندہ لاش میں تبدیل ہوچکا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ کمزوری اس قدر تھی کہ میرے لیے ایک انگلی ہلانا بھی دوبھر تھا۔ اس دن میں حتمی طور پر اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ بالآخر موت میرے سر پر آپہنچی تھی۔ سولر اسٹلس کے پیالے میں تازے پانی کی جگہ کچھ نمی سی جمع تھی۔ میری بجھی ہوئی آنکھوں میں امید کی ایک ہلکی سی کرن چمکی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر قریب رکھی اسٹلس کو قریب کیا۔ اس کا کور ہٹایا اور نمی کو چاٹ لیا۔ زندگی کے چند لمحے مزید حاصل ہوگئے۔

میں نے اَدھ کھلی آنکھوں سے سورج کی پہلی کرن کو نمودار ہوتے دیکھا۔ یہ سمندر میں میرا 76واں دن تھا۔ سرمئی بادلوں کے درجنوں ٹکڑے آسمان پر آوارہ گھوم رہے تھے۔ ہوا میں اچھی خاصی خنکی تھی۔ میں اس قابل بھی نہیں تھا کہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔ میں نے کروٹ لینے کی کوشش کی۔ پورے جسم میں درد کی ٹیسیں سی اُٹھیں۔ کراہوں کی بجائے میرے حلق سے سیٹی کی آواز نکلی اور میری گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ شاید میں مرچکا تھا اور میری روح سمندر میں بھٹک رہی تھی۔ میں نے بہت سے لوگوں کا دل دکھایا تھا۔ مجھے گھٹیا طور طریقوں والی اپنی زندگی کا بدلہ مل رہا تھا۔ یہ ناامید کردینے والا خوفناک خیال تھا۔ میں نے اپنے ماں باپ کے بارے میں سوچا۔ میری ممی کو مجھ سے بہت پیار تھا۔ وہ ہمیشہ چاہتی تھیں کہ میں ان کی نظروں کے سامنے رہوں۔ بچپن کی کچھ دھندلی یادیں میرے دماغ میں چکرانے لگیں۔ کبھی اسکول کی کلاس کا منظر، کبھی گھر میں کھیل کود اور کبھی شادی کے بعد مارتھا سے لڑائی کا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ میں نے ممی پاپا کو رافٹ کے اندر بیٹھے

بے ہوش ہوگیا۔

دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر می کو چھونے کی کوشش کی۔ پوری دنیا میں وہی ایک ایسی ہستی تھی جسے میری پروا تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوچا کہ بس دو بوند پانی مل جائے پھر میں اپنی پیاری می کے پاس پہنچ کر ہی دم لوں گا۔ والدین کا خیال آیا تو میں اپنی بچی کھچی طاقت کے سہارے اُٹھا اور رافٹ کے کنارے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ مجھے اپنے قریب سطح سمندر پر پانی کی خالی بوتلیں، پلاسٹک کے خالی کین، کچرا نما چیزیں اور کچھ اسی قسم کا سامان تیرتا دکھائی دیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کچھ دیر بعد دوبارہ دیکھا۔ منظر وہی تھا۔ میری آنکھوں میں چمک آگئی۔ ضرور آس پاس کچھ تھا۔ میں نے چندھیائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور مغرب میں بادل کا ایک بہت بڑا ٹکڑا دکھائی دیا...... شاید کوئی جزیرہ...... نہیں بادل کا ٹکڑا...... میں نے غور کیا...... نہیں یہ بادل کا ٹکڑا نہیں بلکہ کہرے میں ڈوبا ایک بہت بڑا جزیرہ تھا۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے سر کو ہلکے سے جھٹکا، ہاتھ پیر ہلائے اور پھر پوری آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ وہ ایک جزیرہ ہی تھا اور میری لائف رافٹ اسی کی جانب بہہ رہی تھی۔ قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی تھی۔ خوشی سے میرے آنسو نکل پڑے۔ موت دور کھڑی ہاتھ مل رہی تھی اور میں زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ مجھے جزیرے پر بلند و بالا پہاڑ دکھائی دیے۔ جزیرے کا ساحلی علاقہ کائی جمی سرسبز عمودی چٹانوں پر مشتمل تھا۔ لگتا تھا قدرت نے جزیرے کے گرد قلعہ نما اونچی دیوار کھڑی کردی تھی۔ یہ سمندر میں میرا آخری امتحان تھا۔ مجھے اپنی رافٹ کو قابلِ رسائی ساحل تک لے جانا تھا۔ ورنہ ہوسکتا تھا کہ لہریں میری رافٹ کو کسی عمودی چٹان پر پٹخ دیتیں۔ زندگی کے اس حد تک قریب آکر میں ہار ماننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی پوری طاقت سے پانی کو ایک طرف دھکیلنا شروع کردیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ میری سانس پھول گئی لیکن میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ میری محنت رنگ لائی اور کمال ہوگیا۔ ماہی گیروں کی ایک کشتی نے مجھے دیکھ لیا۔ اس میں سوار کچھ لوگ میری طرف اشارہ کررہے تھے۔ کشتی میرے قریب آئی اور انہوں نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔

"کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" ایک مقامی نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے سوال کیا۔

"امریکا" میرے منہ سے پہلا لفظ نکلا اور میں

میں نے 29 جنوری 1982ء کے دن کینارے ہسپانوی جزائر سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میری کشتی 4 فر... حادثے کا شکار ہوئی۔ کھلے سمندر میں لائف رافٹ مغر... طرف بہتی رہی۔ میں نے اپنی مدد آپ کے تحت چار... کلومیٹر کے قریب طویل فاصلہ طے کیا اور 76 دن... 20 اپریل 1982ء کی صبح جزائر غرب الہند کی حدود میں... استواء سے 16 ڈگری شمال اور 61.15 ڈگری مغرب... واقع میری گلانٹ (Marie-Galante) کے جم... سے جزیرے تک رسائی میں کامیاب رہا۔ یہ جزیرہ فر... جزائر گوڈلوپ (Guadeloupe) کا حصہ ہے اور گوا اینڈ باربوڈا کی آزاد مملکت سے 100 کلومیٹر جنوب واقع ہے۔

میری گلانٹ کے مقامی اسپتال میں چوتھے دن... ریکو سے آئے چند امریکی اہلکاروں نے مجھ سے ملاقات... میری حالت کے پیش نظر مجھے ہیلی کاپٹر کے ذریعے پور... کے دارالحکومت سان جوآن منتقل کیا گیا۔ یہاں علا... سہولتیں بہت بہتر تھیں۔ میں بیڈ پر سہارے سے لیٹا تھا... نے کھلے دروازے سے اپنے پیارے می پاپا کو اندر... ہوتے دیکھا۔ والدین کو خود سے قریب پا کر میں... جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اسپتال میں چھ ہفتے گزار... بعد میں اپنے والدین کے ساتھ امریکا پہنچ گیا۔ آج... نیویارک میں ایک خوش و خرم زندگی گزار رہا ہوں۔ 86... میں میں نے اپنے ساتھ پیش آئے حالات پر مبنی کتاب Days Lost At Sea لکھی۔ جس کی اش... نے مجھے ایک مشہور شخصیت بنا دیا۔ اب بہت سے لوگ... جانتے ہیں۔ میں جب بھی کسی پُرہجوم جگہ پر جاتا ہوں... میری طرف دیکھ کر اشارے کرتے ہیں۔ وہ اس با... حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ آخر وہ کون سی طاقت تھی جس... سہارے میں نے ایک طویل عرصے تک سمندر کی ہولنا... کا مقابلہ جاری رکھا؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی... جواب نہیں ہے۔ میں تو زندہ رہنے کی آس ہی چھوڑ ب... لیکن شاید میرے دماغ کے کسی دور دراز گوشے میں ا... ایک دیا روشن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں... والدین سے ضرور ملوں گا۔ شاید اسی یقین نے میری سا... ڈور کو تھامے رکھا اور میں اپنی رہی سہی ہمت کے سہا... سمندر کا مقابلہ کر پایا۔

ایک روسی ملکہ کے شب و روز کا ذکر خاص

نسرین کبیر

باپ کی نفرتوں اور ماں کی بے توجہی کے سایہ میں اس نے پرورش پائی، شہزادی ہو کر بھی آیا کے سہارے بچپن گزارنے پر مجبور کر دی گئی، صرف اس لیے کہ وہ لڑکی تھی، تخت کی وارث نہیں بن سکتی تھی۔ عام سی شکل و صورت کی حامل تھی۔ والدین کو خوف تھا کہ اسے کوئی بھی شہزادہ شریکِ زندگی نہیں بنائے گا۔ مگر اس نے عقل کا استعمال کیا اورپورے روس کی مطلق العنان ملکہ بن گئی۔ ایک ایسی ملکہ جس کا ذکر کرتے ہوئے روسی تاریخ داں آج بھی شرما جاتے ہیں، وجہ کیا تھی؟

وہ رات کچھ زیادہ ہی سرد تھی... خلیج فن لینڈ غصے سے ...رہا تھا اور طوفانی ہواؤں نے سینٹ پیٹرز برگ میں کھلبلی ...رکھی۔ ...لینڈ سے ٹھٹھرتا ہر انسان خود کو فطرت کے قہر سے محفوظ ...کی جتن کررہا تھا۔ پُرشکوہ شاہی محل میں بھی خاصی گہما گہمی تھی، جس کی دیواروں سے ٹکرا کر طوفان ہیبت ناک چنگھاڑ پیدا کررہا تھا، اپنی تباہ کن طاقت کا اظہار کررہا تھا۔

محل کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کردی گئی تھیں، بیشتر بتیاں بجھادی گئیں تاہم اوپری منزل کی ایک کھڑکی تا حال کھلی تھی، جس کے ہوا سے بجتے پٹ ماحول کی ہولناکی بڑھا

رہے تھے۔

کھڑکی کی دوسری طرف، نیم تاریک کمرے میں ایک سایہ لرز رہا تھا۔

وہ رات واقعی دہشت ناک تھی، مگر کھڑکی میں کھڑی یاسیت کی شکار بوڑھی عورت کو اِس کا چنداں احساس نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی بے حس و حرکت محل کے باہر پھیلی تاریکی پر نظریں گاڑے کھڑی رہی۔ پھر قریب پڑی کرسی پر اپنا بیمار، بھاری جسم ڈھیر کر دیا۔ کرسی آرام دہ ضرور تھی، لیکن اب آرام اُس کے نصیب میں نہیں تھا۔ اُس کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے کچھ بڑبڑا رہی تھی، کسی کو پکار رہی تھی اور پھر وہ نیند کی وادی میں اُتر گئی۔

چند پلوں بعد ہوا سے پھڑپھڑاتے دبیز پردوں کے درمیان سے ایک سایہ نمودار ہوا جو آہستگی سے حرکت کرتا ہوا کرسی کے نزدیک آکر ٹھہر گیا، پھر کھڑکی کی جانب بڑھنے لگا۔

"کون..کون ہے؟" کھٹکے سے بوڑھی عورت کی آنکھ کھول گئی۔

"میں ہوں۔" شعیلہ، امیر کی رازوں کی امین خادمۂ خاص نے اپنی شناخت کروائی۔ "کھڑکی بند کر رہی ہوں، طوفان آنے والا ہے۔"

"ہوں۔" عورت نے دوبارہ آنکھیں موندلیں۔

کھڑکی بند کرنے کے بعد بوڑھی خادمہ نے مڑ کر امراض سے لڑتی اپنی مالکن کی طرف دیکھا جو ایک ملکہ تھی، روئے زمین کی سب سے پُرقوت ریاست کی حکمران... پر آج وہ شکستگی، بدحالی کا شکار نظر آتی تھی، بے چہرگی کا المیہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

خادمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے وہ دن یاد تھا، جب 34 برس قبل اس کی مالکن کے سر پر تاج رکھا گیا تھا۔ جب وہ انتہائی نازک اندام اور حسین ہوا کرتی تھی، لیکن آج...!

خادمہ نے پلنگ سے کمبل اُٹھا کر ملکہ کے جسم کو ڈھانپ دیا۔ دھیرے سے اُسے مخاطب کیا۔ "کبھی تمہارے رومان بھرے گرم دل کی رقص گاہ میں سیکڑوں عاشق رقص کرتے تھے، لیکن اب..." اُس نے سرد آہ بھری۔ "وقت... وقت سب کچھ ختم کر دیتا ہے۔"

وہ رات... کچھ زیادہ ہی سرد تھی!

☆☆☆

سورج گہنا گیا۔ مشرقی اُفق تاریک ہو گیا اور قہر کا ہولناک سایہ شہر کی جانب بڑھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یومِ حساب آن پہنچا ہے!

شہر کے باسی آنکھوں میں تحیر اور خوف لیے اُس آ... اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے اُن کے اندیشوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ متذبذب تھے کا شہر اپنی طویل تاریخ میں پہلی بار طوفان ریگ و باد کے نر... میں آیا تھا۔ وہ اِس قسم کے طوفانوں سے نبرد آزما ہونے ... تجربے سے لیس نہیں تھے، سو بے بسی کی تصویر بنے، خوف سے لرزتے ہوئے سیاہ آندھی کو اپنی جانب آتا ہوا دیکھتے رہے۔

یہ لگ بھگ تین صدی پُرانا واقعہ ہے، جب مو... پولینڈ کے صوبۂ پومیرینیا (Pomerania) کے مر... شہر شچیچن (Szczecin) پر ایک افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ چیچن اُس وقت سلطنتِ پروشیا کا حصہ تھا اور اُس پر جرمن شا... خاندان کی حکومت تھی۔

مئی 1729ء کی اُس پریشان کن صبح جب شہر کے ... ترین شخص کرسٹن اوگست نے اپنے محل کی کھڑکی سے ر... بادلوں کو اپنی جانب آتا دیکھا تو اُس کا اضطراب دوچند ہو... وہ پہلے ہی اپنی بیوی جوایناالزبتھ کے لیے پریشان تھا جو ... لمحے زچگی کے عمل سے گزر رہی تھی کہ یہ عذاب نازل ہو گیا ... اپنے جنگی تجربے کے باعث وہ فوراً ہی سمجھ ... گرد و غبار کا تباہ کن طوفان شہر کو اپنی لپیٹ میں لینے کو ہے۔ ... نے فوراً حفاظتی اقدامات جاری کر دیے اور اپنے دل کو دلا... دیتے ہوئے اُس کمرے کی جانب بڑھنے لگا جہاں چند لمحوں ... ایک نئی روح جنم لینے والی تھی۔ ایسی روح جسے قدرت ... سرزمین روس کی حکمرانی کے لیے چُن لیا تھا۔

جس لمحے محل میں معصوم قلقاری گونجی، طوفان ریگ ... پوری قوت سے محل کی کھڑکیوں پر دستک دے رہا تھا۔

☆☆☆

وہ دن کرسٹن اوگست کے لیے کسی طور خوشگوار نہیں تھا ... بیٹے کی توقع کر رہا تھا، ایک وارث کی لیکن اس کے گھر بچی ... ہوئی۔ اس پر مستزاد، بچی کی پیدائش والے روز شہر پر ایک آ... افتاد ٹوٹ پڑی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس بچی کو نحوست کی علا... تصور کر رہا تھا۔ جب نام رکھنے کی تقریب منعقد ہوئی تو کر... نے بادل ناخواستہ اُس میں شرکت کی۔ نومولود کا نام صوفیہ ... کیا گیا۔

کرسٹن اوگست کا تعلق جرمنی کے شاہی خاندان ... سے تھا جو ریاست این ہلٹ کا حکمران تھا۔ وسطی جرمنی ... ریاست پہاڑی سلسلے ہرز اور دریائے ایلب کے درمیان ... (آج یہ ریاست جرمنی کا حصہ ہے)

... تقریب کے اختتام پر جونہی تنہائی میسر آئی، یاسیت کے ... کرسٹن نے اپنی بیوی کے کان میں سرگوشی کی۔ "میں بیٹے کی ... رہا تھا!"

"میں بھی!" مغموم جواینا نے سرد آہ بھری۔

"اس کھوٹے سکے کا میں کیا کروں گا؟ کسی کو اس کی ذمے ... دے دو، میرے پاس اس کے لیے وقت نہیں!" کرسٹن نے ... سے کہا۔

"کھوٹا سکہ... ہاں تم دُرست ہو!" جواینا بڑبڑائی۔ شوہر ... طرح اُسے بھی یقین تھا کہ اُس کی بیٹی کا مستقبل تاریک ... تاہم وہ غلط تھے۔

صوفیہ کی ذمے داری ایک شفیق اور تجربے کار گورنس بیبتا ... دی گئی۔ اُسی کی گود میں ننھی صوفیہ نے شعور کی آنکھ کھولی۔ ... اُس کی کل کائنات تھی جو اُسے نیک پریوں، حسین ... اور جری شہزادوں کی کہانیاں سناتی۔

ننھی صوفیہ اُس شفیق عورت ہی کو اپنی ماں سمجھتی تھی لیکن ... جب شاہی تقریب منعقد ہوئی اور اُسے شہر کے قابل ... گورنر کی لاڈلی بیٹی کہہ کر متعارف کروایا گیا، وہ ششدر رہ ... احساس واقعی اذیت ناک تھا کہ ماں باپ اُسے ایک ... کو سونپ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھلا چکے ہیں۔

گو کہ اُس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا لیکن یہ ایک ایسی ... حال جس میں تبدیلی اُس کے بس میں نہیں تھی سو اس ... اپنی قسمت پر صبر کر لیا اور یکساں، بیزار کن ماہ و سال ... کرتے ہوئے، نیک فطرت پریوں کی کہانیاں سنتے ہوئے ... بڑھتی رہی۔

اُس زمانے میں جرمنی کے شاہی خاندان میں لڑکیوں کی ... خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ جب ایک روز شاہی مشیر نے ... اوگسٹ کی توجہ صوفیہ کی تعلیم کی جانب مبذول کروائی، وہ ... لگا جیسے خواب سے جاگا ہو۔ پہلی بار اُسے یہ احساس ہوا ... برسوں سے اپنی بیٹی کو نظر انداز کر رہا ہے۔

"صوفیہ کے لیے بہترین اتالیق کا انتظام کیا جائے۔" ... خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔ "اُسے شاہی طریق ... مذہب، تاریخ، فرانسیسی اور جرمن زبان اور موسیقی ... دی جائے!"

... نے سر جھکا کر کرسٹن کا حکم سنا اور کمرے سے نکل ...

... اس لمحے خاصا مغموم نظر آ رہا تھا۔ شاہی خاندان ... والے اختلافات شدت اختیار کر گئے تھے جس کی وجہ سے خزانہ تیزی سے خالی ہو رہا تھا۔ گو کہ وہ ایک بارسوخ شہزادہ تھا لیکن معاشی مسائل نے اُسے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ کافی دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد بالآخر وہ کھڑا ہو گیا اور صوفیہ کے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ اُس کے سخت دل میں شاید پہلی بار اپنی معصوم بیٹی کے ماتھے پر بوسہ دینے کی خواہش نے جنم لیا تھا، تاہم کمرے کے دروازے پر پہنچنے کے بعد اُس کا ارادہ بدل گیا۔

"کھوٹا سکہ!" وہ بڑبڑایا۔

☆☆☆

"پیاری بیبتا، آپ کہتی ہیں کہ میں ایک شہزادی ہوں لیکن میرا بچپن تو شہزادیوں جیسا نہیں ہے، یہ تو بے کیف ہے!" ایک شب معصوم صوفیہ نے اپنی گورنس سے سوال کیا۔

بوڑھی عورت کے چہرے پر شفیق مسکراہٹ پھیل گئی۔ "شہزادی، آپ کا مستقبل روشن ہے۔ آپ کی روح نیک ہے اور نیکی ہمیشہ فاتح رہتی ہے۔" اُس نے کمبل صوفیہ کے جسم پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آج رات حسین سپنے دیکھنا، شب بخیر!"

صوفیہ سپنے ضرور دیکھتی تھی لیکن اُن میں سے کوئی حسین نہیں ہوتا بلکہ وہ تلخ مستقبل کے بے جان رنگوں سے رنگے ہوتے۔

اور پھر ایک منحوس سپنا سچ ثابت ہوا۔ اُسے ریڑھ کی ہڈی کے ایک موذی مرض نے آ لیا۔ ہڈی کے مہرے اپنی جگہ سے

ممبئی میں اردو بولنے والے دوسرے مقام پر

روزنامہ ٹائمز آف انڈیا نے حال ہی میں یہ انکشاف کیا ہے کہ بھارت میں ممبئی واحد کوسموپولیٹن شہر ہے جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد دوسرے مقام پر ہے نیز یہاں کے پچاس ہزار لوگ ایسے ہیں جو 14 زبانیں بولتے ہیں۔

بھارت کے چھ میٹروپولیٹن شہروں یعنی دہلی، ممبئی، کلکتہ، بنگلور، چنئی، احمد آباد اور حیدر آباد کے سروے کے بعد ممبئی کو فیشن اور زبان کے لحاظ سے واحد کوسموپولیٹن قرار دیا گیا۔ لیکن جب زبانوں کی فہرست تیار کی گئی تو اس میں اوّل مقام پر ہندی اور دوسرے نمبر پر اردو زبان بولنے والوں کی تعداد تھی۔

اقتباس: اردو بک ریویو، دہلی

مرسلہ: شاہد خان، لاہور

کھسک گئے تھے۔

وہ عذاب ناک دن تھے۔ صوفیہ شدید درد میں مبتلا تھی۔ اُس کی چیخیں محل کی راہداریوں میں گونجا کرتی تھیں جنھوں نے کرسٹن اور جوایتا کو بھی مضطرب کر دیا۔ علاج کے لیے معالجین کی تلاش شروع ہوئی۔ ادویہ تجویز کی گئیں، ٹوٹکے کیے گئے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بالآخر ریاست این ہلٹ کے شاہی معالج کو شچ چین آنا پڑا۔

''اِسے آہنی جیکٹ پہنانی پڑے گی، کئی روز تک!'' تشخیص کے بعد جب اس نے علاج تجویز کیا تو کرسٹن بھونچکا رہ گیا۔

''کیا مطلب؟'' چہرے پر حیرت تھی۔

''یہی علاج ہے۔ اِس کے جسم کی مناسبت سے ایک جیکٹ کی تیاری کا انتظام کرو... مجھے اب لوٹنا ہوگا۔'' بوڑھے معالج نے اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔

جب معالج کی بگھی نے شچ چین کی سرحد عبور کی، کرسٹن ایک آہنی جیکٹ کی تیاری کا حکم جاری کر چکا تھا جو اگلے ہی دن تیار ہوگئی اور کم سن صوفیہ کو اُس میں قید کر دیا گیا۔

''بیتا، اِس عذاب سے مجھے نجات دلاؤ!'' اُن اذیت ناک دنوں میں وہ اکثر اپنی گورنس کو پکارتی، جو اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور زیرِلب دعائیں پڑھتی رہی۔

شاید نیک بیتا کی دعاؤں میں اثر تھا، وقت کے ساتھ ساتھ صوفیہ کے مرض کی شدت میں کمی آتی گئی۔ چند ماہ بعد جب شاہی معالج اُس کا معائنہ کرنے آیا، اُس نے مسکراتے ہوئے صوفیہ کی ڈھارس بندھائی۔ ''تم جلد... ٹھیک ہو جاؤ گی!''

پھر وہ اس کی ماں کی جانب مڑا۔ ''اب اس کی شادی کا انتظام کرو۔ یہ جوان ہوگئی ہے!''

☆☆☆

سیاسی حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ شاہی اختلافات نے دشمنیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ طاقت کے حصول کے لیے شرم ناک ہتھکنڈے اپنائے جا رہے تھے اور کرسٹن اپنا اقتدار تیزی سے کھو رہا تھا۔ اسے سرمائے کی کمی کا غم بھی کھا رہا تھا۔ اُن حالات میں اس کی شاطر بیوی جوایتا نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔

''ہمارے تمام مسائل کا ایک ہی حل ہے۔'' ایک اُداس دوپہر اُس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''ہمیں کسی بااثر شہزادے سے صوفیہ کا رشتہ طے کر دینا چاہیے۔''

کرسٹن نے چونک کر اپنی بیوی کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں سے اُس کا مضبوط ارادہ جھلک رہا تھا۔

''کیا تم نے صوفیہ کو دیکھا ہے؟'' اُس نے آہ بھری کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''اُس کا سر کس قدر چھوٹا اور ہمارے حالات بھی تیزی سے بگڑ رہے ہیں، ایسے میں ممکن ہے کہ کوئی بااثر شاہی خاندان اِس کھوٹے سکے کو قبول لے؟''

''ہاں، میں اس بابت غور کر چکی ہوں۔'' جوایتا آنکھوں میں اُداسی تھی۔ ''لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہ بیٹھ سکتے، ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا!''

''کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟'' کر نے سوال کیا۔

''ہاں!'' وہ اپنے شوہر کے پہلو میں آن کھڑی ہو ''روس میں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ملکۂ الزبتھ طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ روس وسعت اختیار کر رہا ہے اسے آسٹریا کو شکست دینے کے لیے نئے اتحادیوں کی ضرور ہے۔'' وہ یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''میں سن رہا ہوں۔'' کرسٹن نے کہا۔

''الزبتھ کا خارجہ پالیسی کا مشیر کاؤنٹ لیسٹوک معاملے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ پروشا کا بادشاہ فریڈرک بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔''

''کیا تمہاری نظر میں کوئی روسی شہزادہ ہے؟'' کر نے سوال کیا۔ بے چینی چہرے سے عیاں تھی۔

''ہاں، میں شہزادے پیٹر کے بارے میں سوچ ہوں جو چارلس کا بیٹا ہے!''

''خدایا پیٹر... وہ ایک نامعقول اور نیم پختہ نوجوان کی حرکات تو بچوں جیسی ہیں۔ کیا تمہیں اس کے کارناموں نہیں؟''

''وہ ملکۂ الزبتھ کا بھانجا ہے۔ تخت کا اگلا وارث اس کی بیوی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ا وہ بادشاہ بن گیا اور ہمارا کھوٹا سکہ کام آ گیا تو روس کی ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔'' اُس کے ہونٹوں پر شا مسکراہٹ تھی۔

''ٹھیک ہے... میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' کرسٹن بے تاثر لہجے میں کہا اور جوایتا کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

اس منصوبے کو بُننے میں مصروف مفاد پرست میاں کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ دروازے کے اوٹ میں کھڑی معصوم بچی نے اپنے ظالم ماں باپ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ ہے۔

''کھوٹا سکہ...'' اُس نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش ناکام رہی۔

☆☆☆

جب صوفیہ کی شاطر ماں نے اُسے اپنے منصوبے سے گیا، اُس نے صاف انکار کر دیا کیونکہ اُسے چند برس قبل ہ ماداات کے حامل پیٹر سے ہونے والی پہلی ملاقات اچھی ادتھی۔ ''پیٹر تو نرا احمق اور بلا کا بادہ نوش ہے!''

''تمہارے پاس انکار کی گنجائش نہیں، بہتر ہے اپنا ذہن ا'' جوایتا نے دوٹوک لہجے میں کہا اور اُسے تنہا چھوڑ دیا۔

کچھ لمحوں بعد صوفیہ اپنی شفیق گورنس کی گود میں سر رکھے ہاں لے رہی تھی۔ ''وہ مجھے خود پر بوجھ سمجھتے ہیں... کوئی مجھ محبت نہیں کرتا!''

''نہیں پیاری شہزادی، ایسا نہیں کہتے۔ میں... تم سے کرتی ہوں... بیٹی!'' بیتا محبت سے اس کے بالوں میں پھیر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔

وہ آخری موقع تھا جب محرومیوں کی شکار صوفیہ کو نیک بیتا کی شفیق گھنی چھاؤں میں خواب دیکھنے کا موقع ملا اس شب محبت سے لبریز وہ عورت ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔

اس سرد صبح غموں کی ماری صوفیہ دھاڑیں مار مار کر روئی کسی نے اس کے ساتھ گریہ نہیں کیا۔ کسی نے آنسو نہیں ۔ شاہی خاندان کے ارکان کے پاس ایک گورنس کی دکھ کا اظہار کرنے کے لیے قطعی وقت نہیں تھا۔ اُنہیں بھی بہت ناگوار گزری کہ شہزادی ایک معمولی عورت کی یوں زار و قطار رو رہی ہے۔

بیتا کی آخری رسومات انتہائی جلد بازی میں ادا کی گئیں۔ تدفین کے وقت سوائے صوفیہ کے قبرستان میں شاہی ان کا کوئی فرد موجود نہیں تھا۔

اس شام صوفیہ بہت دیر تک بیتا کی قبر کے سرہانے بیٹھی یہاں تک کہ تمام خادم ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے قبرستان میں تنہا رہ گئی۔ وہ غم و غصے سے کانپ رہی تھی۔

''مجھے معاف کرنا پیاری بیتا...'' بالآخر تاریک قبرستان اس کی آواز گونجی۔ ''شاید میں تمہاری نصیحتوں پر عمل نہ کروں، کیونکہ اس دنیا میں نیک کاروں کے لیے کوئی جگہ مفاد پرستوں کی دنیا ہے... مفاد پرستوں کی!''

اس سرد شام جب وہ قبرستان سے باہر نکلی، اُس کی قلبی تبدیلی ہو چکی تھی، روح نے نیا چولہ پہن لیا تھا۔ وہ نیکی کی ۔ ہمیشہ کے لیے دفن کر چکی تھی۔

عالمگیر اپنے بیٹے کو لکھتا ہے۔

''فرزند عالی جاہ! یہ واقعہ ایک معتبر شیخ کی زبانی ہم تک پہنچا ہے جسے ہم نے قلمبند کیا ہے تاکہ آپ بھی پڑھ لیں۔

ایک روز اعلیٰ حضرت (یعنی شاہ جہاں) نے علی مردان خاں اور سعادت اللہ خاں کو خلوت خاص میں طلب کیا اور فرمایا کہ ملک اور مال کا بندوبست عقل اور انصاف پر مبنی ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ''بے جوہر'' بادشاہ سلطنت کا مالک ہو جائے۔ نااہل کو وزیر امیر اور مصاحب بنالے تو شہروں کا بندوبست بالکل خراب ہو جائے گی۔ رعایا پریشان ہوگی۔ پیداوار نابود ہو جائے گی۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آئے گی۔ تم اللہ کے بندوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے درخواست کرو کہ وہ پانچوں نمازوں کے بعد دعا کریں کہ اس سلطنت کی رونق کم نہ ہو۔ کوئی شخص برا کلمہ زبان پر نہ لائے اور ہمارے بعد ہمارا جو بیٹا بادشاہ ہو اسے خدا نیک توفیق دے۔

اقتباس: اورنگ زیب عالمگیر

مرسلہ: ریاض مظہری، کراچی

☆☆☆

جن دنوں انتقام کا جذبہ صوفیہ کی روح میں کروٹ بدل رہا تھا، نفرت کے بیج بو رہا تھا، اس کی ماں غارت کاری کے گر اپناتے ہوئے اُس کا رشتہ جوڑنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی لیکن اُسے سخت رکاوٹوں کا سامنا تھا کیونکہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے اور اس کا بنیادی سبب اُس کی منفی شہرت تھی۔

دراصل اُس کے مزاج میں بہت شوخی تھی۔ اعلیٰ سماجی حلقوں میں اپنے مخالفین کی بابت لطیفے سنانے کی قبیح عادت میں وہ گرفتار تھی اسی کے باعث اس کے مخالفین بڑی تعداد میں تھے کیونکہ روس کے سیاہ و سفید کی مالک ملکۂ الزبتھ کو یہ جوایتا ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جوایتا شہرت اور اقتدار کی بھوکی ہے، اس کی سرشت میں دغابازی ہے۔ البتہ اُسے صوفیہ اچھی لگتی تھی۔

اور یہ بات صوفیہ کے علم میں تھی جس کے خیالات بیتا کی موت کے بعد پوری طرح تبدیل ہو چکے تھے۔ اُس کا بچپن کسی طور شہزادیوں والا بچپن نہیں تھا، فقط محرومیاں اس کے حصے

میں آئی تھیں لیکن اب اپنی محرامیوں سے نجات حاصل کرنے کا سنہری موقع اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔

"پیٹر سے شادی کرنے ہی میں میرا بھلا ہے!" اس نے حقیقت پسندانہ لیکن تلخ لہجے میں خود کو سمجھایا۔ وہ جانتی تھی کہ روس کی ملکہ اُس کی ماں کو سخت ناپسند کرتی ہے، سو اس نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔

"میں روس جانا چاہتی ہوں!" بالآخر 1744ء کے موسم سرما میں پندرہ سالہ صوفیہ نے اپنے باپ کے سامنے اعلان کر دیا جس کی آنکھوں سے خوشی کے ساتھ حیرت بھی جھلک رہی تھی۔

"ضرور شہزادی، میری بھی یہی خواہش تھی کہ تم اپنی ماں کے ساتھ روس جاؤ اور شاہی خاندان میں جگہ بنانے کی کوشش کرو ....." کرسٹین کے لہجے میں مصنوعی شفقت تھی۔

"میں آپ کی خواہش کی تکمیل کروں گی۔" صوفیہ کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ شطرنج کی بساط پر نئی چالیں چلنے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

"شاہی خاندان میں قبولیت حاصل کرنے کے لیے مجھے روسی زبان سیکھنی ہوگی!" صوفیہ نے خود سے کہا۔ "ملکہ کو اپنی مٹھی میں لینے کے لیے یہ از حد ضروری ہے۔"

گو کہ ایک اجنبی زبان پر عبور حاصل کرنا آسان نہیں تھا لیکن وہ بھی ضد کی پکی تھی۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ اب وہ گھنٹوں روسی زبان کی مشق کرتی، تلفظ پر عبور حاصل کرنے کے لیے رات رات بھر جاگتی رہتی۔ اِس شب و روز کی محنت نے اس کی صحت کو بُری طرح متاثر کیا لیکن وہ حتمی فیصلہ کر چکی تھی سو نقاہت کے باوجود مشق کا سلسلہ جاری رکھا۔ کبھی کبھار جب بہت تھک جاتی تو خود سے کہتی۔ "مجھے روس کے تخت پر بیٹھنا ہے، اس ذلت کی زندگی سے نجات حاصل کرنی ہے اور اس کے لیے میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گی۔"

چند ماہ بعد وہ روسی زبان پر عبور حاصل کر چکی تھی اور اب آنکھوں میں سپنے لیے روس کے سفر کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

یہ ایک ایسا سفر تھا جو اس کی زندگی بدلنے والا تھا۔

اگر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب اس نے روس کی زمین پر قدم رکھا، اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ افلاس کی ماری ایک جرمن شہزادی تھی جسے اس کے ماں باپ اپنی راہ کا پتھر سمجھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب صوفیہ روس پہنچی، وہ بے یار و مددگار تھی لیکن وہ عزم کر چکی تھی، تخت کے حصول کا عزم!

اُس نے اپنے منصوبے کے بارے میں کسی کو نہیں... اور پھر اُس کا اپنا تھا بھی کون؟ اُس کی پیاری گورنس تو جہان سے کوچ کر چکی تھی۔

جرمن شہزادی کی حیثیت سے روس میں اُس کا ... استقبال ہوا۔ طریق کے مطابق قیام و طعام کا انتظام کیا گیا گو کہ اُس کی ماں روس میں ایک ناپسندیدہ شخصیت... لیکن خوش قسمتی سے صوفیہ کی ملکۂ الزبتھ سے ملاقات شان... رہی۔ وہ اپنی ذہانت اور اخلاق سے اُسے متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ دربار میں موجود دیگر بااثر افراد کی آنکھوں میں بھی اُس کے لیے پسندیدگی تھی۔

"اے محترم ملکہ، کیا آپ مجھے روس کے محنتی اور بے مخلص باسیوں سے ملاقات کی اجازت عطا فرمائیں گی... میں اُن میں گھل مل سکوں؟" ایک روز اس نے الزبتھ کے سامنے بڑے نپے تلے الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ضرور شہزادی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ اس ریاست... یہاں کے باسیوں میں دلچسپی لے رہی ہیں۔" ملکہ نے مسکرا... ہوئے کہا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ صوفیہ کا مقصد روس... باسیوں سے گھلنا ملنا نہیں، فقط ان کے دل میں جگہ بنانا ہے۔

چند ہی روز میں صوفیہ نے ملکۂ الزبتھ کا اعتماد حاصل... لیا لیکن ابھی ایک مسئلہ باقی تھا جو خاصا گمبھیر تھا۔

عقائد کے لحاظ سے روسی شاہی خاندان کا تعلق آرتھوڈکس چرچ سے تھا، جب کہ صوفیہ کا خاندان مارٹن... معتقد تھا اور اپنے سخت گیر نظریات کے لیے شہرت رکھتا تھا۔

صوفیہ کو بخوبی اندازہ تھا کہ لوتھری عقائد تج کر آرتھو... نظریات اپنانے کے فیصلے کی جرمنی میں سخت مخالفت کی... گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جلا وطن قرار دیتے ہوئے اس کی... کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جائیں۔

موسم گرما کی ایک طویل رات صوفیہ نے اس... سوچ بچار کرتے ہوئے صرف کی۔ ہر پہلو پر غور کیا۔ ممکنہ... کے بابت اندازے لگائے۔ جب سورج کی پہلی کرن... اُفق پر نمودار ہوئی، وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

دوسرے روز جب وہ دربار میں ملکۂ الزبتھ کے... میں بیٹھی تھی، اس نے سرگوشی کی۔

"ملکہ عالیہ، آپ کی ریاست، آپ کی زبان اور... کے عوام نے مجھے بہت متاثر کیا، مجھے فخر ہے کہ مجھے یہاں... کا موقع ملا، اس تجربے نے حقیقتاً مجھے بدل دیا ہے۔"

الزبتھ نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ "مجھے خوشی ہے... کہ آپ کے لیے یہ تجربہ شاندار رہا!"

"دراصل ملکۂ عالیہ، میں یہاں آنے کے بعد ایک...

...لی سے گزری ہوں اور یہ ہے عقائد کی تبدیلی! میں... ...ڈکس عقائد قبول کرنا چاہتی ہوں!"

"کیا؟" ملکہ کی آنکھوں میں خوشی اور حیرت کی ملی جلی ...ہٹ تھی۔ حالانکہ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھی لیکن سچ تو یہ ...کہ وہ شاطر صوفیہ کو پرکھ نہیں سکی۔ اس کی تجربہ کار آنکھیں یہ ...دیکھ سکیں کہ اِس لڑکی کا اصل مقصد اُس تخت کا حصول ہے ...س پر وہ براجمان ہے۔

جب درباریوں کو صوفیہ کے فیصلے کا پتا چلا، ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جلد ہی یہ خبر روسی عوام میں گردش کر رہی تھی۔ یوں ...علوم ہوتا تھا جیسے روس نے صوفیہ کو اپنی نئی ملکہ کے طور پر قبول کر ...لیا ہے۔

چند مورخین کا خیال ہے کہ صوفیہ نے آرتھوڈکس چرچ ...کے عقائد اقتدار حاصل کرنے کے لیے قبول نہیں کیے تھے، وہ ...ان پر یقین رکھتی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی میں رونما ...ہونے والے چند واقعات میں، خصوصاً جب وہ روس پہنچنے کے ...بعد شدید بیمار پڑ گئی تھی، یہ اشارہ ملتے ہیں کہ وہ سچے دل سے ...آرتھوڈکس نظریات پر ایمان لے آئی تھی۔ البتہ محققین کا بڑا ...حلقہ آج بھی اِس خیال کا حامی ہے کہ لوتھری عقائد سے کنارہ ...کشی فقط سیاسی معاملہ تھا۔

جب یہ اطلاع جرمنی پہنچی تو کرسٹن آگ بگولا ہو گیا۔

"کچھ خبر ہے، ہماری شہزادی وہاں کیا گل کھلا رہی ...ہے؟" وہ اپنے مشیر کے سامنے دہاڑا۔ "وہ اپنے عقائد بدلنے کو ...آمادہ ہو گئی ہے۔"

اُسی شام کرسٹن نے اپنی بیٹی کے نام لعن طعن سے بھرا ...ایک طویل خط لکھا جس میں اِس فیصلے کی مخالفت کرتے ہوئے ...فوراً لوٹ آنے کا حکم جاری کیا۔

اس سے قبل کہ وہ خط صوفیہ تک پہنچتا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے ...لیے بدل چکی تھی۔

28 جون 1744ء کو جب سورج طلوع ہوا، وہ روسی ...آرتھوڈکس چرچ کی رکن بن چکی تھی۔ اس کا نیا نام کیتھرین ...تجویز کیا گیا۔

اس رسم کے ادائیگی کے فوراً بعد ملکۂ الزبتھ نے اپنے ...بھانجے پیٹر سے اس کی منگنی کا اعلان کر دیا اور اِس امر پر تصدیق ...کی مہر ثبت ہو گئی کہ وہی روس کی اگلی ملکہ ہوگی۔

جب صوفیہ کو اپنے باپ کا ملامت بھرا خط ملا، اس وقت ...وہ ساتویں آسمان پر تھی۔ خط کا جواب اُس نے یک سطری تحریر ...کی صورت دیا۔

"صوفیہ مر چکی ہے، میں کیتھرین ہوں۔ پیٹر کی منگیتر!"

...وہ الزبتھ کی منظورِ نظر تھی۔ اُس کے سامنے ایک نئی دنیا

ہماری پیدائش

ہم 9 محرم الحرام 1262ھ مطابق 8 جنوری 1846ء یوم سہ شنبہ شب شہادت کو بلاقی بیگم کے کوچے میں پیدا ہوئے۔ وہیں ہمارا نال گڑا۔ اس وقت تک حافظ بہاء الدین صاحب ایک معزز رئیس و ملازم شاہی کے مکان میں ہمارے والدین سکونت پذیر تھے۔ چھ سات مہینے بعد شاہ صابر بخش صاحب کے باغ میں موتی بیگم زوجہ میر ظہور علی سے ذاتی مکان خرید کر آن رہے۔ ہمارا شجرہ قلعہ تو صرف حسب یادداشت یہی ہے۔ جس طرح ہمارے والد مرحوم نے اپنا جد جدّی حصہ اپنے لواحقین سے نہیں لیا، اسی طرح ہماری حمیت نے بھی لالچ اور ذاتی منفعت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ خدا سلامت رکھے حضور نظام کو جنہوں نے ہمیں ہماری زندگی تک اور ہمارے فرزند اقبال مند کو 22 فروری 1915ء سے منصب عطا فرما کر نسلاً بعد نسل کے واسطے بے فکر کر دیا۔ اللہ بس باقی ہوس۔

اقتباس: سید احمد دہلوی، مولف فرہنگ آصفیہ

مرسلہ: شاہد سہیل، جھنگ صدر

تھی، ہر آسائش میسر تھی۔ اب محرومیوں کا ازالہ ممکن تھا، وہ اپنے خواب پورے کر سکتی تھی لیکن اس کی ذہنیت نے متنبہ کیا کہ اُسے جلد بازی نہیں کرنی چاہیے، معمولی سی غلطی بھی خوابوں کے محل کو چکنا چور کر سکتی ہے۔ سو اس نے پیٹر کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی اور زیادہ وقت ملکہ کی خوشامد کرنے، دربار میں اپنی جگہ بنانے میں صرف کیا۔ مورخین کے لیے یہ امر واقعی باعث حیرت ہے کہ الزبتھ جیسی شاطر عورت 16 برس کی ایک لڑکی کی چالوں میں آ گئی۔

☆☆☆

محل دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے رنگ و نور کی بارش ہو رہی ہو۔ ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، ملکہ بھی بہت مسرور تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس نے اپنے نالائق بھانجے کے لیے ایک قابل اور بااخلاق جیون ساتھی ڈھونڈ نکالا ہے۔

پیٹر بھی آج خاصا معتبر نظر آ رہا تھا۔ شہزادے کے نفیس جوڑے کی تیاری کا ذمہ فرانسیسی ماہرین کو سونپا گیا تھا۔ اس کے پھنسیوں سے بھرے چہرے پر پاؤڈر کی دبیز تہ چڑھائی گئی تھی اور محل کے سب سے تجربے کار اتالیق نے اُسے تقریب کے آداب کی بابت تربیت دی تھی۔

''تم آج بہت وجیہہ لگ رہے ہو۔ خدا تمہیں خوش رکھے میرے بچے!'' ملکہ نے پیٹر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے دعا دی۔ ایک ایسی دعا جو کبھی قبول نہیں ہوئی!

صوفیہ، جو اَب کیتھرین بن چکی تھی، بہت خوش تھی۔ اس کے لباس کی تیاری کے لیے بھی بیرونِ ملک سے ماہرین مدعو کیے گئے تھے۔ اُسے خوب سجایا گیا تھا۔

21 اگست 1745ء کو سینٹ پیٹرز برگ میں ادا کی جانے والی شادی کی رسم کے بعد ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ شام کی آمد کے ساتھ ہی رقص و سرور کی محفل کا آغاز ہوگیا، جو رات گئے تک جاری رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جشن کبھی ختم نہیں ہوگا لیکن آدھی رات کے وقت تقریب اختتام کو پہنچ ہی گئی۔

ملکۂ خود اسے حجلہ عروسی تک چھوڑنے آئی۔ اس نے کیتھرین کا ماتھا چوم کر اُسے دعائیں دی۔ ''تمہارا دامن خوشیوں سے بھر جائے، مسرتیں تمہاری زندگی کی راہداریوں میں رقص کریں۔''

اب کیتھرین ایک پُرشکوہ شاہی پلنگ پر بیٹھی اپنے شوہر کی منتظر تھی۔ آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے، دل میں کئی خواب تھے۔ اسے یقین تھا کہ جونہی پیٹر اس کے سامنے آئے گا محرومی کے دن تمام ہو جائیں گے، انتظار ختم ہو جائے گا لیکن وہ غلط تھی کیونکہ اُس رات پیٹر کمرے میں آیا ہی نہیں۔ وہ نشے میں اس قدر دھت تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا رہنا اُس کے لیے ناممکن ہوگیا تھا۔ جس لمحے کیتھرین کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں، بوڑھا اتالیق پیٹر کو سہارا دے کر قریبی کمرے تک لے جا رہا تھا۔

توقع کے عین مطابق کیتھرین کے باپ کرسٹن اوگست نے تقریب میں شرکت نہیں کی!

☆☆☆

وہ اذیت ناک دن تھے۔ اس کے خوابوں کا محل ڈھے گیا تھا اور اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔

''کیا بدنصیبی کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی؟ کیا میں اپنے مقدر میں بدنصیبیاں لکھوا کر لائی ہوں؟'' کیتھرین اکثر اپنے دل سے سوال کرتی جو جواب میں خاموش رہتا۔

نئے نویلے جوڑے کے قیام کے لیے سینٹ پیٹرز برگ کے مغرب میں واقع اورنین بیم نامی شاہی محل کا چناؤ کیا گیا تھا جو خلیج فن لینڈ کے کنارے ایک پُرفضا، سرسبز مقام پر واقع تھا لیکن اُس روشن محل کے اندر تاریکی تھی کیونکہ نئے شادی شدہ جوڑے کی زندگی میں محبت اور اعتماد نام کی کوئی شے نہیں تھی۔

وہاں تو شک تھا، نفرت تھی!

میاں بیوی کے درمیان بڑھتی کشیدگی کی بنیادی وجہ بھی پیٹر تھا۔ وہ نہ صرف ایک نیم پختہ، شرابی، پھوہڑ نوجوان تھا بلکہ کا عاشق مزاج بھی تھا۔

اُس نے کبھی کیتھرین کی جانب توجہ نہیں دی۔ ہمیشہ اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ ہر موقع پر اُسے نیچا دکھانے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے وہ دل برداشتہ ہوگئی اور جب اسے پتا چلا کہ اس کا نامعقول شوہر الزبتھ ورونتسوا نامی ایک شہزادی سے عشق لڑا رہا ہے تو وہ ٹوٹ گئی۔

چند ہی روز میں صورتِ حال اتنی بگڑ گئی کہ نشے میں دھت پیٹر درباریوں کے سامنے علی الاعلان ورونتسوا سے اپنی محبت کا اظہار کرنے لگا۔ وہ کیتھرین پر تشدد سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

پیٹر کے ساتھ چند دیگر مسائل بھی تھے۔ چیچک کے داغوں سے بھرے چہرے والا وہ دھان پان سا نوجوان درجے احمق تھا۔ اُسے محافل کے آداب کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ وہ جوتے پہنے پہنے بستر میں چلا جاتا۔ اپنے ملازموں کے ساتھ شراب نوشی کی محفل جماتا اور جب آپے سے باہر ہو جاتا تو چھڑی لے کر اپنے خادموں کو پیٹنے لگتا۔ اُن سے تقاضا کرتا کہ جو شراب اُنہوں نے پی ہے اُس کی قیمت ادا کریں۔ اُسے گڈے گڑیا سے کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ گھنٹوں فرش پر لیٹا گڑیوں سے کھیلتا رہتا، جنہیں اُس نے سپاہیوں کی وردی پہنائی ہوتیں۔ اگر کیتھرین اسے سمجھانے کی کوشش کرتی، تو اسے بُری طرح جھڑک دیتا، اُسے دھمکیاں دینے لگتا کہ وہ اسے طلاق دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کال کوٹھری میں ڈال دے گا۔

گو کہ پیٹر اپنی بیوی سے نفرت کرتا تھا لیکن وہ اسے طلاق نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ ملکۂ الزبتھ سے بہت ڈرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ملکہ اس کی تمام حماقتیں برداشت کر لے گی لیکن کیتھرین کو طلاق دینا برداشت نہیں کرے گی۔ کیتھرین بھی اِس امر کا اندازہ تھا۔ سو جب پیٹر کی دشنام طرازی اور عیاشیاں حد سے گزر گئیں، اُس کی برداشت جواب دے گئی۔

''اگر تم مجھے دھوکا دے سکتے ہو، غیر عورتوں کے ساتھ گل چھرے اُڑا سکتے ہو، تو میں بھی ایسا کر سکتی ہوں۔'' ایک روز وہ دہاڑی لیکن پیٹر نے اُس کی جانب قطعی توجہ نہیں دی اور قہقہے لگاتا ہوا، منہ چڑاتا ہوا خواب گاہ سے باہر چلا گیا۔

کیتھرین نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر قدم جمانے کے لیے اُسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ روس کی بااثر شخصیات کی بابت زیادہ نہیں جانتی تھی۔

اس نے اپنے شوہر کی محبوبہ کی چھوٹی بہن، شہزادی اکیتیرینا کو آلۂ کار بنایا اور بڑی ہی چالاکی سے اُسے شیشے میں اُتار لیا۔

اکیتیرینا نے کیتھرین کی ملاقات چند ایسے افسران سے کروائی جو پیٹر کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اِس ضمن میں خاصے فکرمند تھے کہ کل اُس جیسا احمق شخص روس کے تخت پر بیٹھ جائے گا۔

''محل کے مکین اور روسی شاہی خاندان کے افراد پیٹر کی ... سے خاصے پریشان ہیں۔'' ایک روز ایک بااثر فوجی جرنیل نے اُس سے کہا۔

کیتھرین خاموش رہی۔

جرنیل نے بات جاری رکھی۔ ''میں نے سنا ہے کہ وہ ہر صبح محل کے خادموں کو سپاہیوں کی وردی پہنا کر جنگی مشقیں کرواتا ہے۔''

''یہ دُرست ہے۔'' کیتھرین نے اثبات میں جواب دیا۔

''میں نے یہ بھی سنا ہے کہ شام میں تمام ملازمین آپ کی خواب گاہ میں جمع ہو جاتے ہیں جہاں وہ رات گئے تک پیٹر کے ہمراہ اودھم مچاتے ہیں۔''

''آپ اِس بار بھی درست ہیں محترم جرنیل!'' اس کی کراہٹ میں دکھ تھا۔

''افسوس ناک!'' جرنیل کے لہجے میں حقارت تھی۔

اس جرنیل کے مانند اور بھی کئی افراد پیٹر کی بابت کیتھرین کے سامنے اپنی نفرت کا اظہار کر چکے تھے جن میں ایک کاؤنٹ سرج سالٹی کوف بھی تھا۔ یہ بااثر شخص شاہی ... (چیمبرلین) کے عہدے پر فائز تھا۔

گو کہ کیتھرین کی شادی نے ایک المیے کی شکل اختیار کر لی، تاہم اُس کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ روس کا طبقۂ امراء اُس کی ذہانت کا قائل تھا۔ ... کی پختہ عادت کے طفیل وہ معلومات سے لیس تھی۔ ... ناول، ڈرامے اور شاعری باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ ... مزاج رکھنے والی شخصیات سے بھی اچھے روابط تھے۔ اُس ... روس میں فرانسیسی انقلاب میں کلیدی کردار ادا کرنے ... والے ادیبوں کی تحریریں خاصی مقبول تھیں۔ دربار میں اکثر ... اور روسو کے بارے میں بحث ہوتی جس میں کیتھرین بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ خوبرو سالٹی کوف بھی فرانسیسی ادب کا مداح ... یہی معاملہ ابتدائی تعارف کا سبب بنا اور جلد ہی ان کے ... میں اُنسیت دَر آئی۔ اِس شخص نے اپنی اخلاقیات اور ... طور طریقوں سے کیتھرین کا دل جیت لیا۔

''یہی وہ انسان ہے، جو میرے زخموں پر مرہم رکھ سکتا ہے!'' دُکھوں کی ماری کیتھرین نے ایک روز خود سے کہا۔ ''مجھے خود کو اس کے سپرد کرنا ہوگا!''

اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ایک روز سالٹی کوف کو پیغام بھجوایا کہ وہ تنہائی میں اس سے ملنا چاہتی ہے۔

سالٹی کوف کا خیال تھا کہ شہزادی شاید فرانسیسی ادب کے موضوع پر اس سے مکالمہ کرنے کی خواہش مند ہے لیکن جب وہ اس تاریک کمرے میں پہنچا جہاں کیتھرین نے اسے مدعو کیا تھا، فوراً ہی اسے احساس ہوگیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

کیتھرین کو اندازہ تھا کہ اگر ایک بار سالٹی کوف نے اس کی خواہش رُد کر دی تو اس شخص کو حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا، سو اس نے سالٹی کوف کو سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا، وہ اُس سے لپٹ گئی۔ اگلے ہی پل کمرے میں کیتھرین کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

سالٹی کوف کے لیے خود کو سنبھالنا ممکن نہیں تھا، پُرکشش کیتھرین کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ خاموش کھڑا رہا جیسے کسی سحر کے زیرِ اثر ہو۔

بالآخر ہچکیوں کے درمیان کیتھرین کی کرب میں ڈوبی آواز کمرے میں گونجی۔ ''پیارے سالٹی کوف۔ میری زندگی بے رنگ ہے، تاریک ہے اور تم روشنی کی اکلوتی امید ہوں۔ کیا تم اس خوفناک سفر میں میری رہنمائی کرو گے؟''

حسن کے سحر نے سالٹی کوف کو بے بس کر دیا تھا۔

''ہاں!'' وہ اتنا ہی کہہ سکا اور کیتھرین کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر لیا۔ یوں ایک ایسا معاشقہ شروع ہوا جس نے تاریخ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیا!

☆☆☆

جب احمق پیٹر اپنی محبوبہ کو بانہوں میں لیے شراب کے نشے میں دھت محل کی راہداریوں میں گھوم رہا ہوتا، سالٹی کوف چپکے سے کیتھرین کی خواب گاہ میں داخل ہو جاتا، وہاں گھنٹوں گزارتا۔

1754ء کے اوائل میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ کیتھرین حاملہ ہوگئی ہے۔ عوام کی سطح پر تو اِس خبر کو روایتی معنوں ہی میں لیا گیا لیکن شاہی خاندان میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ اُس وقت یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ پیٹر اور کیتھرین کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ کیتھرین کے سالٹی کوف سے معاشقے کی تفصیلات سے بھی بیشتر درباری آگاہ تھے لیکن اِس

معاملے میں سب خاموش رہے۔

جب پیٹر کو کیتھرین کے حاملہ ہونے کی خبر ملی، وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اُسے یقین تھا کہ کیتھرین نے اُسے دھوکا دیا ہے مگر اِس ضمن میں وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا کیونکہ ملکۂ الزبتھ خود اِس معاملے میں خصوصی دلچسپی لے رہی تھی۔ اُس نے کیتھرین کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور جشن کی تیاریوں کا حکم جاری کر دیا تھا۔

اکتوبر کے مہینے میں کیتھرین نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام پال رکھا گیا۔ ملکہ نے ملک بھر میں جشن منانے کا اعلان کر دیا جو کئی روز تک جاری رہا۔ محل میں پُرتکلف ضیافت کا اہتمام کیا گیا جس میں پال کو پیٹر کا وارث اور اگلے حکمران کے طور پر پیش کیا گیا۔

اس گہما گہمی میں پیٹر کو کیتھرین سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن جونہی تنہائی میسر آئی اُس نے کف اُڑاتے ہوئے کیتھرین سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں پال میرا بیٹا نہیں!“

”تم دُرست ہو!“ کیتھرین کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ”وہ واقعی تمہارا بیٹا نہیں ہے اور جونہی وہ باشعور ہوگا میں اُسے یہ بتا دوں گی کہ پیٹر جیسا احمق شخص تمہارا باپ نہیں۔“

”میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“ پیٹر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”اب تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ کیتھرین تن کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس لمحے وہ خود کو بہت طاقتور محسوس کر رہی تھی اور اس کا سبب بھی تھا۔ سلطنتِ روس کو اُس کا اگلا وارث دینے کے بعد یکدم اس کی اہمیت دگنی ہوگئی تھی۔ پھر اشرافیہ میں بھی اس کا بہت اثر و رسوخ تھا۔

”چڑیل!“ پیٹر پھنکارا۔ ”جب میں زار بن جاؤں گا تو سب سے پہلے تیرے قتل کا حکم جاری کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ کیتھرین زیرِ لب بڑبڑائی۔

☆☆☆

کیتھرین کو یقین تھا کہ بچپن میں اُس نے جس بہادر شہزادے کے سپنے دیکھے تھے، وہ سالٹی کوف ہی ہے، تاہم سالٹی کوف کے خیالات مختلف تھے۔ اسے جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ کیتھرین کی قربت آنے والے برسوں میں اس کے لیے عذاب بن جائے گی۔ جونہی پیٹر اقتدار میں آئے گا، وہ اور اس کا خاندان ختم کر دیا جائے گا۔

لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اب اُسے شہزادی سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ جس شام وہ کیتھرین کو یہ خبر سنانے گیا، عشق سے سرشار شہزادی بڑے چاؤ سے تیار ہوئی تھی۔ اپنے محبوب کے لیے اُس نے ایک انتہائی مہنگا تحفہ بھی خریدا تھا۔

جونہی سالٹی کوف کمرے میں داخل ہوا، کیتھرین دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی، تاہم اُس نے جواباً کسی قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب کیتھرین نے ہیرے کی وہ انگوٹھی سالٹی کوف کو پیش کی، جو اُس نے بہت محبت سے خریدی تھی، اُس نے بڑی ہی سرد مہری سے اُسے بتا دیا کہ اب وہ کیتھرین سے مزید ملنا نہیں چاہتا۔

”کیوں؟“ شہزادی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اِسی میں ہماری بھلائی ہے۔“ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

”لیکن میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ کیتھرین روہانسی ہوگئی۔

”لیکن میں نہیں، آج سے ہمارے راستے جدا ہیں۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے، تم مجھے یوں رَد نہیں کر سکتے!“ کیتھرین چلّائی۔

”میں ایسا کر چکا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا اور کیتھرین خواب گاہ میں تنہا رہ گئی۔

دوسرے روز غموں سے نڈھال کیتھرین کو اطلاع ملی کہ سالٹی کوف نے اپنا تبادلہ کروالیا ہے۔

☆☆☆

وہ دن یاسیت سے بھرپور تھے۔ وہ ٹوٹ چکی تھی، پوری طرح... اور خود کو سمیٹنے سے قاصر پاتی تھی۔ اُس کے اُداس دل میں چہار سو ویرانی تھی، محسوس ہوتا تھا جیسے وہ قنوطیت کے صحرا میں کھڑی ہو، محرومیوں کے طوفان میں پھنس چکی ہو۔

اُس نے سالٹی کوف سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، کئی خطوط لکھے، جواب ندارد!

دوسری جانب پیٹر کو بہ خوبی علم تھا کہ اُس کی بیوی جس سے وہ شدید نفرت کرتا ہے کس کرب سے گزر رہی ہے۔ اور وہ بہت مسرور تھا۔

ایک رات وہ نشے میں دھت، بوتل ہاتھ میں لیے ایک فوجی افسر کے سہارے کیتھرین کی خواب گاہ میں آیا۔

”چڑیل تو خوشیوں سے محروم ہوگئی... تیرا مستقبل تاریک ہے... مجھے دیکھ، میں آج بھی عیاشی کر رہا ہوں... خوش ہوں یہ کہتے ہوئے وہ بُری طرح لڑکھڑایا اور فوجی افسر بہ مشکل اسے سنبھال پایا۔ کیتھرین دیکھ سکتی تھی کہ افسر کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمدردی اور اپنے مستقبل کے بادشاہ کے لیے حقارت ہے۔

شراب حلق میں اُنڈیلتے ہوئے پیٹر اُسے مسلسل گالیاں دے رہا تھا۔ بالآخر وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس لمحے فوجی افسر نے بڑے ہی کرب کے ساتھ کیتھرین کی جانب دیکھا جو اس پورے عرصے میں خاموش کھڑی رہی تھی۔ آخر وہ افسر پیٹر کو، مستقبل کے زار کو گھسیٹتے ہوئے خواب گاہ سے باہر لے گیا۔

”میری خوشیاں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“ کیتھرین نے خود کو مخاطب کیا۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ پنپ رہا تھا۔

☆☆☆

”شہزادی کیتھرین آپ سے ملنا چاہتی ہیں، تنہائی میں!“ جب یہ پیغام استالین کو ملا وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔

استالین وہی افسر تھا جس کے سامنے چند روز قبل پیٹر نے شہزادی کی بے عزتی کی تھی اور اب اس کے سامنے کیتھرین کی خادمہ کھڑی تھی۔ استالین کچھ ہفتوں قبل ہی محاذ سے لوٹا تھا۔ اسے سالٹی کوف اور شہزادی کے معاشقے کے بارے میں علم نہیں تھا۔ سو پہلا خیال جو اُس کے ذہن میں آیا، وہ یہی تھا کہ شاید شہزادی اُسے کوئی ضروری ذمّے داری سونپنا چاہتی ہے، اِس لیے تنہائی میں اُسے مدعو کیا گیا ہے۔

مقررہ وقت پر جب وہ محل کے ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا، اُس پر جرمن حسن نے اچانک، پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع اور پُراثر تھا کہ استالین کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جب اسے ہوش آیا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ شہزادی اُس کی بانہوں میں تھی اور وہ شاہی پلنگ پر دراز تھا۔

اُسے فوراً خطرے کا احساس ہوگیا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا لیکن ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس کی مضبوط کلائی ایک کمزور لیکن نازک حسین ہاتھ کی گرفت میں تھی۔ دو جھیل سی گہری اُداس آنکھیں اس سے التجا کر رہی تھیں، مت جاؤ!

وہ بت بنا وہیں کھڑا رہا، کسی قوت نے اس کے پیر پکڑ لیے تھے اور تب کیتھرین نے ایک خطرناک وار کیا، خوبصورت عورت کا سب سے پُراثر وار۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

ہر مرد کی طرح استالین بھی ان آنسوؤں کے سامنے موم ہوگیا۔ اگلے ہی پَل کیتھرین اس کی بانہوں میں تھی۔

☆☆☆

1750ء میں جب شہزادی کے دوسرے بار حاملہ ہونے کی خبر آئی، ملکۂ الزبتھ اس حد تک ضعیف ہو چکی تھی کہ وہ بڑے پیمانے پر جشن کا انتظام نہیں کروا سکتی تھی، سو اس نے اپنے خاص آدمیوں کو اس ضمن میں تیاریوں کا حکم دیا لیکن یہ جشن کبھی نہیں منایا گیا۔ کیونکہ جب بوڑھا مشیر یہ پیغام لے کر پیٹر کے پاس پہنچا، احمق شہزادے کی چھڑی اُس کی منتظر تھی۔

اُس نے بوڑھے مشیر پر پے در پے کئی وار کیے اور مسلسل چیختا رہا۔ ”کس لیے جشن؟ وہ چڑیل شیطان کے ساتھ ہم بستری کرتی ہے اور تجھے جشن کی پڑی ہے!“

شاید پیٹر اُسے قتل ہی کر دیتا لیکن محل کے چند بااثر درباریوں نے اُسے روک لیا اور بوڑھا مشیر بہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگا۔

جب استالین کو کیتھرین کے حاملہ ہونے کی اطلاع ملی، اُس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اُسے شدت سے یہ احساس ستانے لگا تھا کہ اُسے شہزادی سے دُور ہو جانا چاہیے، ورنہ تباہی اس کا مقدر بن جائے گی لیکن کوشش اور خواہش کے باوجود وہ ایسا نہیں کر سکا، نہ جانے کیتھرین کی کمزور گرفت میں کیا جادو تھا۔

ہاں، جب چند ماہ بعد جب کیتھرین شاہی معالجین کے نرغے میں آگئی، استالین کو اپنی غلطی سدھارنے کا موقع مل گیا۔

اس بار قدرت نے کیتھرین کو ایک بیٹی سے نوازا اور وہ مسرت سے بھر گئی۔ اُسے یقین تھا کہ جو محرومیاں اس کا نصیب بنیں، اُس کی بیٹی اُن سے محفوظ رہے گی۔

جب پیٹر کو یہ اطلاع ملی کہ اُس کی بیوی نے ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ ”وہ شیطان کی بچی ہے، میں اُسے قتل کر دوں گا۔“

بچی کا نام اینا تجویز کیا گیا۔ نام رکھنے کی تقریب والے روز پیٹر نے بیماری کا بہانہ بنا کر شرکت سے معذرت کر لی اور اپنی محبوبہ کے پہلو میں لیٹا، جو ایک معمولی ملازمہ تھی، شراب پیتا رہا۔

پیٹر کو اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ پیدائش کے چند ہی ماہ بعد اینا کا انتقال ہوگیا۔

اُس سانحے نے شہزادی کو توڑ دیا لیکن سنگدل پیٹر بہت خوش تھا۔ وہ غموں میں ڈوبی کیتھرین کی خواب گاہ میں آیا جو ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور بے ہودہ رقص کرنے لگا۔

”وہ شیطان کی بچی تھی... غم مت مناؤ، وہ اپنے گھر لوٹ چکی ہے، جہنم میں چلی گئی ہے!“

ان جملوں نے دکھی ماں کے دل میں چھید کر دیے۔ پیٹر کے لیے اُس کی نفرت انتقام کی خواہش میں بدلنے لگی لیکن وہ بے بس تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی، اِس لیے رقص کرتے پیٹر پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے فقط اتنا ہی کہا۔ ”بہت جلد تم بھی

جہنم میں ہو گے، بہت جلد تم موت کا ذائقہ چکھو گے!"

"اچھا..." پیٹر نے قہقہہ لگایا۔ "لگتا ہے کہ منحوس عورت تیرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے، میں زار بننے والا ہوں ۔ پھر میں تیرے لیے زمین ہی کو دوزخ بنا دوں گا۔"

☆☆☆

اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اُس نے خود کو غم کے پاٹوں کے درمیان پستا ہوا محسوس کیا۔ ایک بار پھر اُسے دھوکا دیا گیا۔ اُس کا محبوب جا چکا تھا، دور، بہت دور!

دراصل جن دنوں وہ اپنی بیٹی اینا کے غم سے بے حال تھی، استالین نے خاموشی سے رختِ سفر باندھ لیا لیکن وہ قصوروار نہیں تھا۔ دراصل پیٹر نے اپنے خفیہ سپاہیوں کو یہ حکم جاری کیا تھا کہ کیتھرین کے تمام عاشقوں کو فی الفور ٹھکانے لگا دیا جائے۔ واضح رہے کہ اس وقت کیتھرین بیک وقت کئی مردوں سے عشق لڑا رہی تھی۔

جب پیٹر کے اقدام کی اطلاع استالین کو ملی، اس نے اپنی جان بچانے کے لیے منظر سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا، البتہ اس نے کیتھرین کے نام ایک رقعہ ضرور چھوڑا۔

"شہزادی، مجھے معاف کرنا، میں کمزور ہوں، تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

کیتھرین نے وہ مختصر سی تحریر کئی بار پڑھی۔ پھر زیرِ لب بڑبڑائی۔ "ہاں تم کمزور تھے، میرا انتخاب غلط تھا لیکن اب میں غلطی نہیں کروں گی۔"

غم سے سنبھلنے کے بعد کیتھرین ایک بار پھر شاہی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔ اُس نے سماجی و سیاسی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ کئی بااثر افراد سے خفیہ ملاقاتیں کیں۔ ساتھ ساتھ اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بُنتی رہی۔

دراصل وہ ایک ایسے جرأت مند، بااثر شخص کی تلاش میں تھی، جس کی پشت پر بڑی خاندانی قوت ہو۔ ایک ایسا خاندان جو ریاستی سطح پر انتہائی مستحکم ہو۔

بالآخر اس کی نظرِ انتخاب اورلوف خاندان پر ٹھہری جو انتہائی رئیس اور سیاسی طور پر روس کا مضبوط ترین خاندان تھا۔ اس خاندان کے کئی افراد اہم ترین عہدوں پر فائز تھے۔ کیتھرین کو ان میں سے کسی ایک کو چننا تھا اور اُس نے گریگوری اورلوف کا انتخاب کیا، جو ایک جرأت مند فوجی افسر تھا۔ وہ انتہائی وجیہہ شخص تھا۔ اس کے کارناموں کی فہرست طویل تھی۔ وہ معرکہ آرا "سات سالہ جنگ" میں روس کا ہیرو تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ اس کا جسم یونانی دیوتاؤں جیسا تھا، وہ دس انسانوں جتنا طاقتور تھا اور اس پر مستزاد وہ پیٹر سے سخت نفرت کرتا تھا۔

جب کیتھرین نے اُسے ملاقات کا پیغام بھجوایا، وہ جری مرد بلاخوف و خطر سینہ تان کر اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ شہزادی اُس کا حسن دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

"یہی شخص میرے منصوبے کو حقیقت کی شکل دے گا۔"

اُس نے خود سے کہا تاہم وہ جلد بازی میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے پہلی ملاقات والے روز عمومی سیاسی موضوعات پر گفتگو کرتی رہی۔

گریگوری کو رخصت کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ "محترم جرنیل، مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری دعوت قبول کی۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہماری دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

گریگوری کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے براہِ راست شہزادی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یقیناً حسین شہزادی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگلی بار آپ زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کریں گی۔"

"یقیناً!" شہزادی مسکرائی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

☆☆☆

بادلوں نے چاند کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ گلیوں میں پُراسرار سائے حرکت کر رہے تھے اور محل کے ایک خاموش کمرے میں مسرت رقص کر رہی تھی۔ دو دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے، اُن کے سانس ایک دوسرے میں پیوست تھے۔

یہ کیتھرین اور گریگوری کے درمیان ہونے والی دوسری ملاقات تھی، جو ساری رات جاری رہی اور انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

منہ اندھیرے جب وجیہہ گریگوری خواب گاہ سے رخصت ہوا، شہزادی نے اپنا سر پلنگ کے سرہانے سے ٹکا دیا۔ وہ تھک چکی تھی لیکن خوشی سے سرشار تھی۔ اس نے گریگوری کا انتخاب فقط اپنے منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کیا تھا لیکن گریگوری نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اُسے مکمل کرنے کی بھی قوت رکھتا ہے۔

دراز قد، وجاہت کا پیکر گریگوری ایک پُرقوت اور جارحیت پسند انسان تھا، جو محبت کے مخصوص لمحات میں خاصا پُرتشدد ہو جاتا لیکن اُس کی ضربیں کیتھرین پر گراں نہیں گزرتیں، بلکہ اُسے یوں لگتا جیسے گریگوری کی ہر ضرب اُس خول کو توڑ رہی ہے جس میں وہ برسوں سے قید تھی۔

محبت سے بھرپور ملاقاتوں میں جب چاند کی روشنی کھڑکی سے چھن کر آ رہی ہوتی، شہزادی خطروں کے ا...

...ملاقاتی کو پُرنم آنکھوں کے ساتھ، گلوگیر آواز میں اپنے دُکھوں سے آگاہ کرتی۔

اور جب شاطر کیتھرین اُس فولادی انسان کی آنکھوں میں ہمدردی دیکھتی تو خاموشی سے ایک منصوبہ اُس کے کانوں میں انڈیلنے لگتی، ایسا منصوبہ جو روس کو بدلنے والا تھا!!

☆☆☆

5 جنوری 1762ء کی صبح سورج کی کرنیں روس کے ...زاروں تک پہنچنے سے قاصر رہیں کہ اس سرزمین پر غم کی ...دبیز چادر تنی تھی۔

عظیم ملکہ الزبتھ کا انتقال ہو چکا تھا۔ روسی یتیم ہو گئے ...ے۔ ہر طرف گریہ ہو رہا تھا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے ...ے، البتہ بادہ نوش پیٹر بہت خوش تھا اور اپنی حماقتوں کے ...باعث خوشی چھپانے میں بھی یکسر ناکام نظر آتا تھا، جس کی وجہ ...ملکہ کے چاہنے والوں کے دل میں اُس کے لیے نفرت کا جنم ...فطری بات تھی۔

دوسری جانب کیتھرین کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ...ملکہ اس کی لیے ڈھال تھی جس کی موجودگی میں پیٹر اُسے کسی ...قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا لیکن اب وہ دنیائے فانی سے کوچ ...کر چکی تھی اور احمق پیٹر نیا زار منتخب ہونے کو تھا جس کا ہر حکم پتھر ...کی لکیر ہوتا۔

جب روس عظیم ملکہ کی تدفین میں مصروف تھا، کیتھرین ...اور گریگوری اپنے منصوبے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے میں ...مصروف تھے۔

جلد ہی پیٹر کے سر پر تاج رکھ دیا گیا اور وہ اپنی بیوی کے ...ساتھ سینٹ پیٹرز برگ کے اُس مرکزی محل میں آن بیٹھا جہاں ...الزبتھ روس پر حکومت کیا کرتی تھی۔

تاج پوشی کے بعد پیٹر اتنا خوش تھا کہ وہ کیتھرین کو کچھ ...دن کے لیے بھول گیا۔ سینٹ پیٹرز برگ پہنچ کر جیسے اُس کی ...چال بدل گئی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوتا۔ شاہی ضیافت کے موقع پر کہتا۔ "خدایا، یہ سوپ کتنا لذیذ ...اور شوربہ نہایت ہی اعلیٰ ہے... گوشت کا تو جواب نہیں... ...یہاں کی شراب عمدہ ہے!"

خود کو ایک قابل بادشاہ ثابت کرنے کے لیے اُس نے ...احکامات بھی جاری کیے اور دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھانے ...کے لیے فیصلے کیے۔

دوسری جانب کیتھرین روس کی اشرافیہ سے خفیہ ملاقاتیں ...کر رہی تھی اور اُنھیں انعام و اکرام کا لالچ دے کر اپنے ...گروپ میں شامل کر رہی تھی۔ گریگوری کی موجودگی اُس کے لیے کسی رحمت سے کم نہیں تھی۔ بیشتر بااثر افراد اِس بات سے آگاہ تھے کہ کیتھرین کو اورلوف خاندان کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔ وہ خود بھی پیٹر کو پسند کرتے تھے اور انھیں یقین تھا کہ اس شرابی بادشاہ کا مستقبل تاریک ہے۔

جولائی 1762ء میں زار بننے کے فقط چھ ماہ بعد پیٹر ایک تاریخی حماقت کر بیٹھا جسے مورخین اُس عہد کی فاش ترین سیاسی غلطی گردانتے ہیں جس کا خمیازہ شاہ کو بھگتنا پڑا۔ دراصل اُس نے جو احکامات جاری کیے تھے، اُن کی رو سے اداروں کے دائرہ اختیار میں چند بنیادی تبدیلیاں آ گئی تھیں جن کا براہِ راست اثر شاہ اور اُس کے وفاداروں کے اختیارات پر پڑ رہا تھا اور اُن کی کمزوریاں عیاں ہو گئی تھیں۔

پھر چند اہم معاملات کو نمٹانے کا اعلان کرتے ہوئے وہ کیتھرین کو سینٹ پیٹرز برگ میں چھوڑ کر چند وفاداروں کے ساتھ مغرب میں اورنین بم کے شاہی محل کی جانب چل دیا جہاں وہ شدید بیمار پڑ گیا۔

یہ کیتھرین کے لیے ایک سنہری موقع تھا۔

8 جولائی کو گریگوری کی قیادت میں شاہی محافظ دستوں نے جو تاریخ میں Leib Guard کے نام سے معروف ہیں، پیٹر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اشرافیہ کے بڑے طبقے نے بغاوت کی حمایت کی۔ پیٹر کو معزول کر دیا گیا، کیتھرین کو نئے حکمران کی حیثیت سے تخت پر بٹھا دیا گیا اور محل میں موجود زار کے حامیوں کو چن چن کر قتل کر دیا گیا۔

جب روپشا کے شاہی محل میں مقیم، کسی پُراسرار مرض میں مبتلا پیٹر کو بغاوت کی اطلاع ملی، اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ جلد از جلد سینٹ پیٹرز برگ پہنچنا چاہتا تھا لیکن بیماری کے باعث اس کے لیے سفر ممکن نہیں تھا۔ وہ عملی طور پر چند وفادار خادموں اور معالجین کے رحم و کرم پر تھا۔

بغاوت کے دوسرے روز اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ اُسے زہر دیا گیا ہے، ایسا زہر جس نے اُس کے اندرونی اعضا کو کاٹ ڈالا ہے۔ یہ زہر اُسے شراب میں ملا کر دیا گیا تھا۔

دوسری جانب سینٹ پیٹرز برگ میں جشن کا سماں تھا۔ کیتھرین کے سر پر تاج رکھا جا چکا تھا، اسے ملکہ کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا تھا۔ جو خواب آنکھوں میں سجائے مفلوک الحال جرمن شہزادی نے روس کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، وہ سچ ہو چکا تھا لیکن وہ متذبذب تھی، پیٹر تاحال زندہ تھا۔ وہ احمق توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا۔

بالآخر گریگوری نے یہ ذمّے داری اپنے چھوٹے بھائی ایلکس اورلوف کو سونپی، جو اپنے محافظوں کے ساتھ روپشا کے

نااس محل ہتھیا۔ اس نے بڑے ہی بہیمانہ طریقے سے ریشمی رومال پیٹر کی گردن پر لپیٹا اور اس وقت تک بل دیتا رہا، جب تک اس نے دم نہیں توڑ دیا۔

پیٹر شاہی خاندان کا وہ اکیلا فرد نہیں تھا جو اس بغاوت کا شکار بنا۔ ایسے کئی شہزادے جو مستقبل میں تاج پر اپنا حق جتا سکتے تھے، بڑی ہی خاموشی اور پُراسرار انداز میں قتل کر دیے گئے۔

مورخین کا ایک طبقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ پیٹر اور دیگر شہزادوں کے قتل میں کیتھرین براہِ راست ملوث نہیں تھی، یہ گریگوری کا منصوبہ تھا، جو ممکنہ بغاوت کو کچل کر اپنی محبوبہ کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔

حقیقت جو بھی ہو، کیتھرین تخت پر بیٹھ چکی تھی، تاج اس کے سر پر رکھا جا چکا تھا اور اب وہی روس کے سیاہ و سفید کی مالک تھی!

برسرِ اقتدار آنے کے بعد جو پہلا حکم کیتھرین نے جاری کیا، وہ اپنے محبوب گریگوری کی ترقی سے متعلق تھا۔ روسی فوج کا اعلیٰ ترین عہدہ اُسے سونپ دیا گیا تھا۔

اُسی زمانے میں اُس نے ایک بیٹے الیکسی کو جنم دیا جو کیتھرین اور گریگوری کی محبت کا نتیجہ تھا۔ اس لڑکے نے اپنی زندگی بوبرکی نامی ایک گاؤں میں گزاری اور کبھی روسی سیاست میں بڑا کردار ادا نہیں کر سکا۔

☆☆☆

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ روس کی سرحدیں پھیل رہی تھیں۔ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں روس میں شامل ہو چکی تھیں۔ پولینڈ اور سلطنتِ عثمانیہ پر تابڑ توڑ حملے کیے جا رہے تھے۔ نئے دوستوں کی تلاش بھی زوروں پر تھی۔ برطانیہ اور روس کے رابطے بڑھ رہے تھے۔ نئی ملکہ کی معاشی پالیسیوں کے طفیل خزانے میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔

جہاں تک کیتھرین اور گریگوری کے عشق کا تعلق تھا، اب وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ پورا روس اِس سے واقف تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس رشتے میں شدت آتی جا رہی تھی۔ جاذبِ نظر گریگوری نے کیتھرین کو پوری طرح اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے خاندان پر نوازشات کی بارش ہو رہی تھی۔ خارجہ پالیسی میں بھی اُس کی مداخلت بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کے باوجود عوام کیتھرین سے مطمئن تھے، جس کا سبب اس کی کامیاب جنگی حکمتِ عملی تھی۔ روسی فوج کئی محاذوں پر کامیاب رہی تھی، بحری بیڑوں نے بھی کامیابی حاصل کر لی تھی۔

کیتھرین مسرور تھی، تاہم ایک شخص اُس کی خوشیوں کو برباد کرنے کے درپے تھا۔ اور یہ تھا اسٹین سولو پنوڈسکی جو اُس کے پُرانے عاشقوں میں سے ایک تھا اور اب اُسے پریشان کرنے لگا تھا۔ بااثر پنوڈسکی سے اس کی ملاقات 1755ء میں ہوئی تھی۔ چند مورخین کا خیال ہے کہ کیتھرین کے بطن سے پیدا ہونے والی اینا درحقیقت پنوڈسکی ہی کی ناجائز اولاد تھی۔

کبھی یہ شخص کیتھرین کا منظورِ نظر تھا لیکن اب گریگوری اُس کا چہیتا بن گیا تھا۔ حسد کا مارا پنوڈسکی خواہش مند تھا کہ ملکہ اُسے ماضی کی طرح ایک بار پھر اپنے قرب سے نوازے، اس پر انعامات کی بارش کر دے۔

”ملکہ، آپ کا خادم حاضر ہے۔ وہ آپ کے دل کو خوشیوں سے بھر دے گا!“ وہ اکثر کیتھرین سے کہتا جو اُسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی لیکن وہ باز نہیں آتا۔

اگلی بار جب دونوں کا سامنا ہوتا، وہ پھر اُسے یاد دلاتا کہ کبھی وہ ایک دوسرے سے محبت کیا کرتے تھے۔ ”کیا آپ کو وہ حسین لمحات یاد نہیں ملکہ؟“

کیتھرین کو یہ خبر بھی مل چکی تھی کہ پنوڈسکی کیتھرین اور اپنے معاشقے کی رُوداد ہر دوسرے شخص کو سُناتا پھر رہا ہے، خصوصاً بیرونِ ملک سے آنے والے مہمانوں اور سفارت کاروں کو وہ یہ قصہ خوب مرچ مسالا لگا کر سناتا جس میں وہ کو ایک محبت کی بھوکی اور جنسی خواہشات کی اسیر عورت کے روپ میں پیش کرتا۔

پنوڈسکی روسی اشرافیہ کا اہم ستون تھا، ملکہ کے لیے اسے راہ سے ہٹانا خاصا مشکل تھا لیکن اُس کے بڑھتے ہوئے تقاضوں نے کیتھرین کو پریشان کر دیا تھا۔ بالآخر حالات نے رُخ بدلا۔ پولینڈ کے خطے پر روس کی حکومت قائم ہونے کے امکانات پیدا ہونے لگے اور تب کیتھرین کو اِس ناہنجار سے جان چھڑانے کا موقع مل گیا۔

1764ء میں اس نے پنوڈسکی کو پولینڈ کا حکمران مقرر کر دیا۔ گوکہ وہ پولینڈ کے تخت پر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن حکم ہو چکا تھا جس کی روسی اشرافیہ نے حمایت کر دی تھی۔ اِس میں گریگوری کی چال بازیوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

یہ ایک طرح کی ملک بدری تھی۔ اُسے سینٹ پیٹرز برگ سے دُور کر کے کیتھرین نے اُس کے احمقانہ تقاضوں سے جان چھڑالی۔

جس روز پنوڈسکی آخری بار ملکہ سے ملنے آیا، اُس نے پرنم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ”میں آپ کے قرب کا، آپ کی محبت کا متمنی تھا لیکن آپ مجھے خود سے دُور بھیجنا چاہتی ہیں، تو...جیسا آپ کا حکم۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“

”یہ تو میرے احسانات کی ابتدا ہے محترم پنوڈسکی، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!“ ملکہ کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

آنے والے برسوں میں کیتھرین نے اپنے اِس عاشق کو عبرت کا نشان بنا دیا۔ پولینڈ کے حکمران کی حیثیت سے اُس کے لیے انتہائی مشکل حالات پیدا کر دیے گئے۔ بالآخر کیتھرین کے انتقام نے اُسے تباہ و برباد کر دیا۔ 1795ء میں اُسے معزول کر کے سینٹ پیٹرز برگ بلوایا گیا جہاں اس نے اپنے آخری ایام انتہائی کسمپرسی میں گزارے۔ اسے جو وظیفہ ملا کرتا تھا، وہ انتہائی تھوڑا تھا۔ پولینڈ کے فرماں رواں کی حیثیت سے اس نے ایک طلائی تخت تیار کروایا تھا، اُسے معزول کرنے کے بعد کیتھرین نے یہ تخت روس منگوا لیا اور اپنے غسل خانے میں رکھوا دیا جس پر بیٹھ کر وہ غسل کیا کرتی تھی۔

اپنی حماقتوں سے اپنے لیے تباہی کا سامان کرنے والا یہ شخص بالآخر قرضوں کے بوجھ تلے، امراض سے لڑتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ گیا۔

☆☆☆

ملکہ کیتھرین نے تخت سنبھالنے کے بعد جو پالیسیاں اختیار کیں، انہوں نے روس کو یکسر بدل دیا۔ باغیوں کو نیست و نابود کر دیا، پنوڈسکی جیسے احمق سے بھی وہ جان چھڑا چکی تھی اور وہ اس امر پر بہت خوش تھی تاہم اسے اندازہ نہیں تھا کہ روس کے اندر اس کا محبوب گریگوری بھی تیزی سے بدل رہا ہے۔

وہ خاصا جارح ہو گیا تھا۔ رومانوی راتوں میں وہ ملکہ پر باتوں اور لاتوں کی بارش کر دیتا جنہیں ملکہ گریگوری کی محبت کا انداز سمجھتی۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اب یہ جنگجو اس سے اُکتا گیا ہے۔ اُس کا دل ادھیڑ عمر کیتھرین سے بھر گیا ہے۔

پھر ایک اُداس صبح جب کیتھرین بستر پر پڑی کراہ رہی تھی، خادمۂ خاص دست بستہ سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں ملکہ عالیہ؟“

”بولو، کیا کہنا چاہتی ہو۔“ وہ مسکرائی۔

”وہ...“ خادمہ تذبذب کا شکار تھی۔ ”ملکہ مجھے معاف کیجیے، لیکن میں اب چپ نہیں رہ سکتی۔ وہ گریگوری آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔“

”کیا؟“ ملکہ اُچھل پڑی...”کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”جی ملکہ عالیہ! جن دنوں آپ بستر پر دراز اُن زخموں کے مندمل ہونے کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں، جو یہ ظالم شخص محبت کے نام پر آپ کو عطا کرتا ہے، وہ محل کی حسین خادماؤں کے ساتھ گل چھرّے اُڑا رہا ہوتا ہے۔ اُسے آپ کی عزت کا ذرا پاس نہیں۔ اُس کی عیاشیاں حد سے تجاوز کر چکی ہیں لیکن وہ اتنا بااثر ہے کہ کوئی اُس کے خلاف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔“

خادمہ نے جو کچھ کیتھرین کو بتایا، اُس نے اُسے توڑ دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اُس کا محبوب، اس کا پیارا گریگوری اسے دھوکا دے رہا ہے۔ وہ کرب ناک لمحات تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے اپنے ایک مشیر کو گریگوری کی جاسوسی پر مامور کیا جس نے دوسرے ہی دن اُس کا کچا چٹھا کھول دیا۔

”اسے فوراً میرے سامنے حاضر کیا جائے!“ ملکہ نے حکم جاری کیا۔

دوسری جانب گریگوری کو بھی اطلاع مل چکی تھی کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ جب بلاوا آیا تو اس نے اپنا بہترین لباس زیبِ تن کیا اور ملکہ کی خواب گاہ کی جانب چل دیا۔

چند لمحات بعد ملکہ کی خادماؤں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دراز قد، خوبرو اور طاقت کا پہاڑ گریگوری کیتھرین کے قدموں میں بیٹھا رو رہا تھا، اپنی غلطیوں کی معافی مانگ رہا تھا اور اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ فقط اسی سے محبت کرتا ہے۔

کیتھرین واقعی گریگوری پر فریفتہ تھی، اُس نے اُس دغاباز کو معاف کر دیا، کھڑا کیا اور سینے سے لگا لیا۔ اور اُس لمحے گریگوری مسکرایا۔ اُس کی چال کامیاب رہی تھی۔ وہ ملکہ کے کمزوریوں سے واقف تھا، اُس نے چند آنسو بہا کر اُس کے دل کو نرم کر دیا تھا۔ اُس رات اس نے کیتھرین پر بھرپور انداز میں اپنی محبت نچھاور کی۔

”میں آج بھی فقط تم سے محبت کرتا ہوں!“ نیند کی وادی میں اُترنے سے قبل اُس شاطر شخص نے ملکہ کے کان میں سرگوشی کی۔

☆☆☆

ملکہ سلطنت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکی تھی اور اب وہ سنجیدگی سے اپنے محبوب گریگوری اورلوف سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اِس نے اس ضمن میں اپنے ذہین مشیر نکیتا پینن سے مشورہ کیا، جس نے اُس پر واضح کر دیا کہ یہ اقدام تباہ کُن ثابت ہوگا۔

”آپ ایک عظیم ملکہ ہیں۔ ہم سب آپ کے خادم ہیں اور ہمہ وقت آپ کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ شوہر کا بیوی پر

قانونی حق ہوتا ہے، بہتر ہے کہ آپ یہ حق کسی کو نہ دیں۔ ویسے آخری فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کو ہے لیکن میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ خودمختار زندگی گزاریں۔"

نکیتا پینن درست تھا۔ بے شک گریگوری روس کا سب سے بااثر اور مال دار شخص تھا، ملکہ اُس پر مہربان تھی، اُس کی اشرافیہ پر بھی گرفت مضبوط تھی لیکن بڑھتی ہوئی عیاشیاں اُسے تباہی کی جانب دھکیل رہی تھیں۔

ملکہ کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے بعد، چند ماہ تک تو ذہین گریگوری اُس پر بھرپور توجہ دیتا رہا لیکن جلد ہی وہ اپنی جون میں لوٹ آیا۔ پھر درشت ہو گیا، ملکہ پر تشدد کرنے لگا اور ایک بار پھر محل کی ایک معمولی کنیز کے ساتھ عشق لڑاتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

ملکہ کا دل جیتنے کے لیے اُس نے ایک بار پھر وہی طریقہ اپنایا۔ قدموں میں بیٹھ گیا، معافی مانگی، آنسو بہائے۔ ملکہ کا دل پھر پگھل گیا۔ اُسے معاف کر دیا گیا۔

چند ماہ بعد پھر یہ عمل دُہرایا گیا۔ ایک بار پھر وہ ملکہ کے سامنے زاروقطار رو رہا تھا۔

کیتھرین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ گریگوری اب اُس سے اُوب چکا ہے، اُس پر اعتبار کرنا خطرناک ثابت ہوگا۔ تیسری بار رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد ملکہ نے اُسے معاف تو کر دیا تھا لیکن اُسے اپنی التفات سے محروم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس شام کیتھرین نے اپنے مشیر نکیتا سے کہا۔ "تم درست تھے ذہین بزرگ۔ جب ہم اپنی خوشیاں دوسروں سے وابستہ کر لیتے ہیں تو نتیجے میں فقط ہمیں غم ہی ملتے ہیں۔ اب گریگوری ہمارے دل سے اُتر چکا ہے۔"

بوڑھے نکیتا پینن کا خیال تھا کہ یہ جملے ایک شکستہ دل عورت نے ادا کیے ہیں لیکن اُس کا اندازہ غلط تھا۔ کیتھرین واقعی گریگوری سے اُوب چکی تھی۔ اب وہ نئے شکار کی تلاش میں تھی اور شکاری کی نظر ایک فوجی جرنیل الیگزینڈر رواسل چیکوف پر ٹھہری۔

اب وہ ایک گھاگ کھلاڑی تھی، جلد ہی اُس نے نوجوان الیگزینڈر کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ جس حسین رات الیگزینڈر نے اس شاطر، عاشق مزاج ملکہ پر اپنی محبت نچھاور کی، وہ زیرِلب بڑبڑائی۔ "گریگوری جہنم میں جاؤ۔ مجھے تمہارا متبادل مل گیا ہے!"

اگلے ہی ماہ الیگزینڈر کی ترقی ہو گئی۔ ملکہ کی التفات نے اُسے ایک بااثر فوجی افسر بنا دیا تھا۔

1771ء کا سال گریگوری کے لیے قاتل ثابت ہوا۔

اسے روس سے برسرِپیکار قوتوں سے مذاکرات کے لیے رومانیہ کے شہر فوکسانی بھیجا گیا تھا لیکن وہ عثمانیوں کی ضد اور اپنی اشتعال انگیزی کی وجہ سے ناکام رہا اور یہ ناکامی اُس کے زوال کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوئی۔

وہ ملکہ سے اجازت لیے بغیر جب سینٹ پیٹرز برگ پہنچا تو یہ جان کر بھونچکا رہ گیا کہ اُسے معزول کر دیا گیا ہے اور اب پوتمکن عظیم روس کی فوج کا نیا، بااختیار سربراہ ہے۔

اس ذلت نے اُسے آگ بگولا کر دیا لیکن وہ بے بس تھا۔

اپنے عہدے اور اختیارات کا دوبارہ حصول فقط ایک صورت میں ممکن تھا کہ وہ ملکہ کا دل جیت لے لیکن یہ کسی طور آسان نہیں تھا۔ کیتھرین کا دل جیتنے کے لیے اُس نے ملکہ کو تاریخی اہمیت کا حامل ہیرا جو تاریخ میں اورلوف ہیرا کے نام سے معروف ہے، بہ طور تحفہ پیش کیا۔ ملکہ نے تحفہ تو قبول کر لیا لیکن عہدے کی واپسی کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

چند روز بعد رونما ہونے والے ایک واقعے نے گریگوری کو یہ یقین دلا دیا کہ کھیل اُس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

اُس شام محل میں فوجی افسران کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں گریگوری کی پیش کردہ تجاویز پر سخت تنقید کی گئی۔ الیگزینڈر جیسے نوجوان افسر نے بھی جو اَب ملکہ کا چہیتا تھا اُسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔

فوج کا نیا سپہ سالار پوتمکن جو کل تک گریگوری کے اشاروں پر چلا کرتا تھا، اجلاس کے دوران خاموش رہا تھا۔ آخر میں جب اُس کے بولنے کی باری آئی، اُس نے بھی گریگوری کی تجاویز کو رد کرتے ہوئے الیگزینڈر کی حمایت کر دی۔

اُس شام عظیم گریگوری، سات سالہ جنگ کا ہیرو ٹوٹ گیا۔ اس واقعے کے بعد اُس نے کثرت سے شراب نوشی شروع کر دی۔ ملکہ نے بھی اُس کی جانب توجہ نہیں دی۔ پھر خبر آئی کہ وہ ایک معمولی لڑکی کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔

جب کیتھرین کو یہ اطلاع ملی، اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تم بھاگ سکتے ہو لیکن چھپ نہیں سکتے!" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے نئے عاشق الیگزینڈر کو اشارہ کیا جو اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

چند روز بعد خبر ملی کہ گریگوری اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ شراب کی لت نے اُسے تباہ کر دیا ہے اور وہ قرضوں کے بوجھ تلے دب چکا ہے۔ بالآخر 1783ء میں وہ ماسکو میں دم توڑ گیا۔

جس صبح اُس کی موت کی اطلاع نے روس کے باسیوں

کے دروازوں پر دستک دی، ملکہ نے شاہی محل سے منسلک اودیہ کے اُس ماہر کو بیش قیمت اشرفیوں سے نوازا جو زہر کے استعمال پر یدِطولیٰ رکھتا تھا۔

☆☆☆

الیگزینڈر ملکہ کا منظورِ نظر تھا لیکن وہ جلد ہی رنگین مزاج کیتھرین کے دل سے اُتر گیا کیونکہ اُسے نیا شکار مل گیا تھا۔ ایک ایسا شخص جو حقیقی معنوں میں اُس کی خواہشات پوری کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ اور یہ تھا، فوج کا نیا سربراہ اور روس کا بااثر ترین شخص پوتمکن!

وہ ایک دیوقامت شخص تھا۔ گوکہ کیتھرین کے پُرانے عاشقوں کی طرح وجیہہ نہیں تھا لیکن وہ توانائیوں سے بھرپور تھا۔ دراصل اِس تعلق کا آغاز 1772ء ہی میں ہو گیا تھا جب کیتھرین نے گریگوری کو اپنے دل کے مکان سے بے دخل کیا تھا لیکن، ملکہ کے محبوب کی اسامی الیگزینڈر نے فوراً ہی بھر دی۔

1773ء میں پوتمکن محاذ پر چلا گیا۔ یہی وہ موقع تھا جب ملکہ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ دیوہیکل پوتمکن کی یاد اکثر راتوں کو اُسے ستاتی ہے۔ جنوری 1774ء میں جب وہ ایک جنگی ہیرو کی حیثیت سے سینٹ پیٹرز برگ لوٹا تو سیدھا ملکہ کی بانہوں میں چلا گیا کیونکہ اُس وقت تک عاشق بدلنے کی شوقین کیتھرین الیگزینڈر سے اُکتا چکی تھی۔

اُسے بے شمار اعزازات سے نوازا گیا، نوازشات کی بارش کر دی گئی، جس سے روس کی اشرافیہ میں بے چینی پھیل گئی کیونکہ وہ نوجوان پوتمکن کی صلاحیتوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے لیکن جلد ہی اُس کی سیاسی چالوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ گھاگ کھلاڑی ہے۔

کیتھرین نے اپنا دل بہلانے کے لیے اور بھی عاشق پال رکھے تھے لیکن پوتمکن کو یہ برداشت نہیں تھا۔ اُس نے ایک ایک کر کے تمام عاشقوں کی چھٹی کروا دی۔ جلد ہی روس کے گلی کوچوں میں اِس عشق کے چرچے ہونے لگے۔ یہ افواہیں بھی گردش کر رہی تھیں کہ دونوں نے شادی کر لی ہے۔ کئی مواقع پر کیتھرین نے اُسے اپنے شوہر کی حیثیت سے متعارف کروایا، لیکن اس رشتے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ دراصل کیتھرین یہ سمجھ چکی تھی کہ خودمختار رہنے ہی میں اُس کی بہتری ہے۔

پوتمکن ایک دلچسپ شخص تھا۔ گوکہ وہ روس کی تاریخ کا بہترین جرنیل تھا اور اُس نے کئی جنگیں جیتیں لیکن توپیں چلنے کی آواز سے وہ خوفزدہ ہو کر تھرتھر کانپنے لگتا تھا۔ وہ اپنے عالی محل میں سادہ چپل پہن کر گھومتا تھا۔ اُس کے بال ہمیشہ بکھرے رہتے۔ وہ جنگلیوں کی طرح کھانا کھاتا۔ لباس کا بھی خاص خیال نہیں رکھتا۔ الغرض وہ کسی طور ملکہ کے قابل نہیں تھا لیکن وہ ایک پُرقوت انسان تھا جس کی قربت ملکہ کو خوشی سے سرشار کر دیتی، اُسے مسرت سے بھر دیتی۔ یہی سبب ہے کہ اُس نے پوتمکن کو اس کی تمام تر خامیوں کے ساتھ قبول کر لیا۔

☆☆☆

پوتمکن، روس کا مردِ آہن، ریاست کا سب سے طاقتور آدمی غصے اور رقابت کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا، اپنے رقیب کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اُسے ملکہ کی آشیرباد حاصل تھی۔

پوتمکن جس عذاب کا شکار تھا، اس کا سبب پیوتر زیودوسکی تھا، جو اَب ملکہ کا نیا چہیتا تھا اور پوتمکن کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا تھا۔

ملکہ زیودوسکی کی محبت میں اس حد تک اندھی ہو چکی تھی کہ اُس نے نہ صرف پوتمکن کو اپنے دل کے مکان سے بے دخل کیا بلکہ عہدے سے بھی معزول کر دیا۔ یہ عہدہ اب زیودوسکی کے پاس تھا۔

پوتمکن دلبرداشتہ تھا لیکن اُس نے ہار ماننے کے بجائے کیتھرین کو جیتنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

زیودوسکی اور ملکہ کا معاشقہ فقط ایک برس جاری رہا۔ بااثر اشرافیہ اور مشیروں کے مشورے پر بالآخر اُس نے 1776ء میں اِس نوجوان سے اپنا رشتہ ختم کر لیا۔

مورخین کے مطابق اگرچہ بعد میں کیتھرین نے زیودوسکی سے دوبارہ رشتہ بحال کرنے کی کوشش کی، تاہم چند وجوہات کے سبب وہ پھر کبھی مل نہیں سکے۔

جہاں تک پوتمکن کا تعلق ہے، وہ خوش قسمت رہا کہ ملکہ کے دیگر عشاق کی طرح اُس کا انجام دردناک نہیں ہوا۔ معاشقہ ختم ہونے کے بعد بھی ملکہ اور اس کے درمیان دوستانہ روابط رہے اور پوتمکن اپنی زندگی کے آخری برسوں تک اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔

☆☆☆

گوکہ کیتھرین ایک عاشق مزاج عورت تھی لیکن روس پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ تعلیم اور صحت کے میدانوں میں اُس کے اصلاحات نے روس کو ایک نئے عہد میں داخل کر دیا تھا۔ معیشت بھی تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ مذہب کے ساتھ اُس نے فلسفے اور منطق کے میدان پر بھی خصوصی توجہ دی۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی رومان پسند طبیعت کے باوجود ملکہ کی شہرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

البتہ کامیابیوں کے اُس زمانے میں کیتھرین کو صحت کے مسائل نے پریشان رکھا۔ بچپن میں اُس کا سر بہت چھوٹا تھا لیکن جب وہ چھبیس برس کی ہوئی، اُس کی کھوپڑی اچانک بڑھنے لگی۔ کئی آپریشن ہوئے، متعدد معالجین نے اُس کا علاج کیا لیکن سو فیصد افاقہ نہیں ہوا۔ اکثر اُسے دردِ سر کی شکایت رہتی تھی۔ دورے بھی پڑتے تھے۔ وہ زود رنج نہیں تھی۔ اچھی حس مزاح رکھتی تھی لیکن ایک معاملے میں وہ خاصی سخت تھی، اگر کوئی شخص اُس کی انا کو ٹھیس پہنچاتا تو وہ اُسے تباہ کر دیتی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کا وزن بھی بڑھ رہا تھا۔ گو کہ وہ کھانے کے معاملے میں بہت احتیاط برتتی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی میں شراب کا ایک قطرہ بھی حلق سے نہیں اُتارا۔ وہ تو پھلوں کا رس پیا کرتی تھی، بادی غذا سے دُور ہی رہتی تھی لیکن وزن تھا کہ بڑھے ہی جا رہا تھا۔

وہ ہر صبح بیدار ہونے کے بعد کافی کی پانچ پیالیاں پیا کرتی تھیں، معالجین نے اُسے یہ عادت ترک کرنے کا کئی بار مشورہ دیا، لیکن کیتھرین نے اِس معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ وہ تمباکو چبانے کی عادت میں بھی مبتلا تھی، جو اُس کے لباس پر بکھرا رہتا تھا۔

زندگی کے آخری برسوں میں تو بڑھتا وزن کیتھرین کے لیے عذاب بن گیا۔ نقاہت کے دنوں میں وہ اپنے بوجھ کو اُٹھانے سے خود کو قاصر پاتی۔ اکثر وہیل چیئر پر نظر آتی۔ اِس صورتِ حال نے اُسے چڑچڑا بنا دیا۔ وہ اپنے بیٹے پال کے ساتھ سختی برتنے لگی۔ اپنے پوتے پوتیوں کو بھی جھڑک دیتی۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری کرنے سے انکار کر دیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ آخر کے برسوں میں اُس نے ایک آمر کا روپ اختیار کر لیا تھا۔

اِن سب کے باوجود اُس نے عشق لڑانے کی عادت ترک نہیں کی۔ ہر سال وہ اپنے عاشق بدلتی۔ انتہائی کم عمر نوجوان اس کے پہلو میں نظر آتے، جنھیں وہ بڑے بڑے عہدوں سے، انعامات سے نوازتی۔ خوشامدیوں پر وہ پیسا پانی کی طرح بہاتی۔ کیتھرین کی متنازعہ شخصیت اور عاشقوں کی طویل فہرست نے اُس کی بابت عجیب و غریب، انتہائی بیہودہ جنسی قصے مشہور کر دیے تھے، تاہم اُس دل پھینک عورت کو اِن باتوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

جن دنوں ساٹھ سالہ رنگین مزاج ملکہ ملبوسات کی طرح عاشق بدل رہی تھی، ایک 22 سالہ، شرمیلے نوجوان نے اُس کے دل کے دروازے پر دستک دی۔ انتہائی فربہ، تمباکو چبانے والی ملکہ نے دل کا دروازہ کھولا، وہ نوجوان مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو گیا اور روس کا سب سے بارسوخ شخص بن گیا۔

یہ نوجوان پلوٹون زیبو تھا جو عمر میں اُس سے 38 برس چھوٹا تھا لیکن ملکہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ گو کہ مخلص مشیروں نے اسے سمجھایا کہ ریاست پر اُس کی گرفت کمزور ہو رہی ہے، اِن حالات میں وہ ایک اور معاشقے کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن بااخلاق، تہذیب یافتہ پلوٹون زیبو کے سامنے وہ ڈھیر ہو گئی جو محققین کے مطابق اُس کا آخری محبوب تھا۔

پلوٹون کا تعلق ایک بااثر سیاسی و کاروباری خاندان سے تھا۔ اُس کے رشتے دار اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، ان ہی کی توسط سے اُس نے ملکہ تک رسائی حاصل کی، جس کے بعد اُس کی قسمت چمک اُٹھی۔

پلوٹون سے ملاقات کے بعد اگست 1789ء میں کیتھرین نے اپنے پُرانے عاشق پوتمکن کو ایک خط لکھا جس میں اس نے ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”میں مایوس کن اور سرد دنوں کے بعد بالآخر زندگی کی جانب لوٹ آئی ہوں۔ میں تیار ہوں اور میرا ایک ننھا لیکن وجیہہ دوست بھی ہے۔ وہ بہت ہی پیارا ہے۔ جب میں اُسے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی، تو وہ رونے لگتا ہے!“

تاریخ بتاتی ہے کہ پوتمکن نے اِس خط کا جواب نہیں دیا۔ روس کے دیگر باسیوں کی طرح اُسے بھی ساٹھ سالہ ملکہ کا ایک نیم پختہ نوجوان سے عشق لڑانے کا خیال احمقانہ لگا۔

”شاید بوڑھی اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔“ اُس نے کسی سے کہا۔ ”جلد ہی وہ اس سے اُوب جائے گی!“

لیکن وہ غلط تھا۔ یہ نوجوان اگلے چھ برس تک کیتھرین کے دل کو گرماتا رہا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیرتا رہا لیکن وقت بہت ظالم شے ہے، وہ سب کچھ بدل دیتا ہے۔

1795ء کے اواخر میں معاملات تیزی سے بدلنے لگے۔ کیتھرین کی صحت گر رہی تھی۔ ادویہ کے مسلسل استعمال نے اُس کے اعصاب کو بوجھل کر دیا، اُسے زود رنج بنا دیا تھا۔ گو کہ وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی، چاق و چوبند رہنے کے جتن کرتی، لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ اُس کی رخصت کا وقت قریب آ رہا ہے۔

اُن ہی دنوں وہ تواتر کے ساتھ، طنزیہ پیرائے میں خاص و عام کے سامنے یہ بات دُہرانے لگی کہ اُس کا بیٹا پال پیٹر کا نہیں بلکہ اُس کے پہلے محبوب سالٹی کوف کا بیٹا ہے۔ اس بات نے مستقبل کے بادشاہ کو اپنی ماں سے متنفر کر دیا۔

اضطراب کے ابتدائی زمانے میں تو نوجوان پلوٹون اُس کا غم گسار بنا رہا لیکن پھر وہ اپنی مصروفیات میں اُلجھ گیا۔ دوسری جانب کیتھرین کو یہ خیال ستانے لگا کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے، جبکہ اُس کا محبوب جوان اور طاقتور ہے، وہ ضرور اسے دھوکا دے رہا ہو گا۔

کچھ عرصے بعد یہ خیال راسخ ہو گیا۔ ایک بار تو وہ اتنی آگ بگولا ہو گئی کہ خادموں سے پلوٹون کو دھکے دے کر خواب گاہ سے نکلوا دیا۔ اُسے معزول کرنے کی بلکہ قتل کرنے کی بھی دھمکی دے ڈالی۔

اِس واقعے نے پلوٹون کو متنفر کر دیا۔ گو کہ بعد میں ملکہ نے اس سے معافی مانگ لی، لیکن اب وہ شاذ شاذ ہی اُس کی خواب گاہ میں آتا۔ اُس کی محبت کے جواب میں کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کرتا۔ آنے والے چند ماہ میں وہ کیتھرین سے کترانے لگا۔ جب وہ اُسے بلواتی، وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔

کیتھرین کو یقین ہو گیا کہ پلوٹون بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ وہ اُسے سخت سزا دینا چاہتی تھی لیکن اب وہ ذہنی و جسمانی طور پر اتنی بکھر چکی تھی کہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکی۔

ایک روز اُس نے پلوٹون کو پیغام بھجوایا کہ وہ شدید بیمار ہے اور خواہش مند ہے کہ شکستگی کے اِس زمانے میں پلوٹون اُس کا ہاتھ تھامے رکھے!

اس شام پلوٹون آیا ضرور لیکن فقط چند لمحات کے لیے... ابھی ادویہ کے زیرِ اثر بوڑھی ملکہ غنودگی میں گئی، وہ خواب گاہ سے نکل گیا۔

چند محققین کا خیال ہے کہ نوجوان پلوٹون ملکہ سے مخلص تھا، وہ اسے دھوکا نہیں دے رہا تھا، دراصل مستقبل کے بادشاہ پال نے بڑی چالاکی سے اُسے ریاستی معاملات میں اُلجھا دیا تھا۔

وجہ جو بھی رہی ہو، سچ تو یہ ہے کہ دھیرے دھیرے عظیم ملکہ یاسیت کا شکار ہوتی گئی۔ اندر ہی اندر ٹوٹتی گئی۔

بھرپور رومانی زندگی گزارنے والی کیتھرین کی زندگی کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے۔ اُس کی خواب گاہ میں سناٹا رقص کرنے لگا تھا، خاموشی گشت کرنے لگی تھی۔ گو کہ محافل میں وہ خود کو سنبھالے رکھتی لیکن تنہائی میں مایوسی اُسے گرفت میں لے لیتی۔ سورج غروب ہونے کے بعد وہ خواب گاہ میں بیٹھ کر اپنے محبوب کو پکارتی رہتی۔

ان ہی اُداس شاموں میں سے ایک شام شدید طوفان نے دروازے پر دستک دی۔ ملکہ پر غنودگی نے یلغار کر دی۔ اُس کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ پلوٹون کو پکارتے پکارتے پوتمکن کو پکارنے لگی۔ پھر اُس نے الیگزینڈر کا نام لیا، پھر وہ سالٹی کوف کو یاد کرنے لگی۔ گریگوری کا نام لے کر سسکیاں لینے لگی!

اُس وحشت ناک رات کیتھرین نے خواب میں ہر اُس مرد کو دیکھا جس نے کبھی اُسے اپنی بانہوں میں بھرا تھا، اُس کا پہلو گرم کیا تھا مگر صرف خوشنودی کے لیے، عہدے اور طاقت کے حصول کے لیے... اُن میں کوئی اُس سے محبت نہیں کرتا تھا!

☆☆☆

16 نومبر 1796ء اُس مضمحل صبح کیتھرین نے معمول کے مطابق کافی کے کئی کپ حلق میں اُنڈیلے اور پھر کاغذات سنبھالے اسٹڈی میں جا بیٹھی۔

جب خادمۂ خاص، ماریا نے اُس سے گزشتہ رات کی بابت پوچھا، تنہائی کی شکار ملکہ نے بڑے ہی اُداس لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے سکون سے سوئے برسوں بیت گئے ہیں۔ شاید میری نیند چھن گئی ہے!“

صبح نو بجے وہ لباس تبدیل کرنے کے ارادے سے غسل خانے میں داخل ہوئی۔ جب کافی دیر تک نہیں لوٹی، تو پریشان خادمہ نے غسل خانے میں جھانکا۔ روس کی عظیم ملکہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ چہرے پر شکستگی کے سائے تھے، نبض ڈوب رہی تھی اور جسم پیلا پڑ گیا تھا۔

ملازمین نے اُسے اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ ایک گھنٹے بعد شاہی معالج اُس کی خواب گاہ میں داخل ہوا جس نے ابتدائی تشخیص کے بعد اعلان کر دیا کہ اُسے دل کا دورہ پڑا ہے۔

معالجین کی بھرپور کوشش کے باوجود وہ کوما میں چلی گئی جہاں کیتھرین دی گریٹ کو تاریکی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نگل لیا۔ 17 نومبر کی صبح دس بجے اُسے مردہ قرار دے دیا گیا۔ وصیت کے مطابق اُس کے مردہ جسم کو سفید رنگ کا شاہانہ لباس پہنایا گیا۔ سر پر سنہری تاج رکھا گیا۔ 25 نومبر کو اس کے جسدِ خاکی کو انتہائی قیمتی تابوت میں لٹایا گیا اور اسے سینٹ پیٹرز برگ کے شاہی قبرستان میں سابق زار اور اس کی شوہر پیٹر کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

تدفین کی تقریب میں اُس کے کسی عاشق نے شرکت نہیں کی، کیونکہ اُن میں بیشتر پہلے ہی قبر میں اُتر چکے تھے۔ اور جو زندہ تھے، اب اُنھیں مردہ کیتھرین میں کوئی دلچسپی نہیں تھی!!

☆☆☆

ماخذات:

وکی پیڈیا، ہسٹری چینل، Little Known Facts About Well Known People، از ڈیل کارنیگی

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آیا۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر وبلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درد داستاں سرگزشت

غالب نے کہا تھا:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

حیرت ہے کہ دوسو سال پہلے حضرت غالب کو کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے۔ آج کل افراتفری کا دور ہے۔ خاندانی نظام ختم ہو چکا ہے۔ سب اکیلے ہوگئے تو پھر تیمارداری کون کرے؟ قریب ترین عزیزوں کے پاس بھی تیمارداری کی فرصت نہیں ہے۔ مصروفیات، فاصلے اور دیگر مسائل اتنے ہوگئے ہیں کہ انسان بیماروں کے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتا لیکن بیماری پر تو انسان کا بس نہیں چلتا۔ البتہ تیمارداری کی ضرورت آج بھی ہے۔ اب تو ایسا زمانہ آ گیا ہے جب تیماردار ملازم رکھنے پڑ رہے ہیں یا تیمارداروں کے ادارے قائم ہوگئے ہیں جنہیں اٹینڈنٹ یا میل نرس کہتے ہیں، نرسنگ کے باقاعدہ ادارے بن گئے ہیں۔ کرائے پر ان کی خدمات مل جاتی ہیں۔ وہ آ کر آپ کی تیمارداری کرتے ہیں۔

جیسے یورپ، امریکا میں ہوتا ہے کہ کفن دفن کا بندوبست بڑے بڑے ادارے کرتے ہیں۔ غم خواری میں بھی کرائے دار ہی کام آتے ہیں غرضیکہ ہر کام کرائے پر ہو جاتا ہے۔ یہ جدید زمانے کی ترقی کی برکتیں ہیں۔

پچھلے دنوں ہم بیمار پڑے (زیادہ اور دیر تک) تو معلوم ہوا کہ بچپن میں جو سنا کرتے تھے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے، وہ کتنا درست تھا۔ اس وقت تندرستی کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے آپ کا احساس شدید ہو جاتا ہے کہ

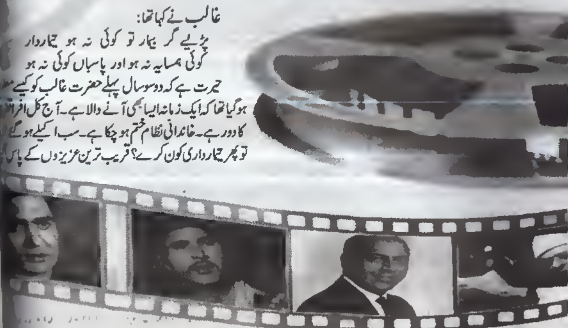

واقعی تندرستی ہزار نعمت ہے۔

دوسرے ملکوں کا ذکر چھوڑیے مگر اپنے ملک میں بیمار پڑنا سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اگر کوئی غریب ہے تو اس کو مناسب دوا دارو بھی میسر نہیں۔ نہ دوائیوں کے لیے پیسے، نہ ڈاکٹروں کے لیے فیس۔ آج کل ہر اسپیشلسٹ ایک بار معائنے کے لیے ایک ہزار روپے وصول کرتا ہے اور صبح سے شام تک کم از کم پچاس مریض ضرور بھگتا دیتا ہے۔ اور صبح سے شام تک لاکھوں کی کمائی ہے۔ مگر شاید انکم ٹیکس والوں کو اس کا علم نہیں ہے یا پھر وہ بہ وقتِ ضرورت استعمال کے لیے صرف نظر کرتے ہیں۔ غریب یہ رقم کہاں سے لائے یہی اس کا مقدر ہے۔

اسپیشلسٹ کتنا ہی معروف اور بڑا کیوں نہ ہو، ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل ہمارے ہاں زیادہ تر ڈاکٹروں کی ڈاکٹری "شاید" کے اصول پر چل رہی ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر کے پاس جائیں۔ وہ آپ سے فیس لے لے گا مگر نسخے کے بجائے ایک ٹیسٹ یا کئی ٹیسٹ کرانے کا کاغذ آپ کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ آج کے ڈاکٹروں کو دیکھ کر پُرانے زمانے کے ڈاکٹر بہت یاد آتے ہیں جو اسپیشلسٹ تو نہ تھے مگر ہر مرض کا علاج کر دیتے تھے۔ ٹیسٹ نے ڈاکٹروں کا کام آسان کر دیا ہے۔

ہم نے پرچی دیکھ کر کہا "ڈاکٹر صاحب، مگر مجھے یہ تکلیفیں تو نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "ہزاروں مرض انسان کے جسم کے اندر چھپے ہوتے ہیں اس لیے سب ٹیسٹ ضروری ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب ہمیں تو کبھی یہ شکایت ہی نہیں ہوئی۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "ڈاکٹر میں ہوں یا آپ؟ پاکستان میں اٹھارہ کروڑ ڈاکٹر ہیں۔ ہر شخص خود کو ماہر ڈاکٹر سمجھتا ہے۔ آپ ٹیسٹ تو کرائیے پھر دیکھیں گے۔"

ٹیسٹ، ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ۔ آج کل کے ڈاکٹروں کے ہتھیار ہیں جنہیں وہ مریضوں پر آزماتے ہیں اور جس طرح میڈیکل کی ابتدائی تعلیم میں چوہوں اور مینڈکوں پر تجربے کیے جاتے ہیں، اس طرح آج کل کے ڈاکٹر اپنے مریضوں پر تجربے کرتے رہتے ہیں۔ دیکھیے کیا اچھا کام ہے، تجربہ کا تجربہ اور آمدنی کی آمدنی۔

ڈھیر سارے ٹیسٹ کرانے کے بعد ان کی رپورٹیں لے کر ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے۔ دراصل رپورٹوں میں جو لکھا تھا، کوشش کے باوجود وہ اصطلاحیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام رپورٹیں دیکھیں اور کہا "مبارک ہو، تمام رپورٹس کلیئر ہیں۔ آپ کو ان میں سے کوئی بیماری نہیں ہے۔ مگر بہتر ہو کہ آپ فلاں اسپیشلسٹ کے پاس بھی چلے جائیں تو اور بھی اطمینان ہو جائے گا یا مرض کا علم ہو جائے گا۔"

ہم فلاں اسپیشلسٹ کے پاس گئے۔ وہ بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ انہوں نے ہماری بات سن کر فوراً چار ٹیسٹ لکھ دیے اور کہا کہ یہ بہت ضروری ہیں۔ ان میں بعض بہت مہنگے تھے۔

جب رپورٹس لے کر ان کے پاس گئے تو وہ مسکرائے او[ر] کہا "مبارک ہو، آپ کو وہ شکایات نہیں ہیں جن کا خطرہ [تھا] لیکن بہتر ہو کہ احتیاطاً آپ ایک چھوٹا سا آپریشن کرا لیں یا پھر زیادہ عرصے تک دوائیں کھائیں، اب جو آپ پسند کریں۔"

ہم نے سوچا کہ طویل عرصے دوائی استعمال کرنے کے بجائے دو تین دن کا آپریشن کرا لیں۔ جب ہماری بچیوں کو علم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی اور کہا کہ ڈاک[ٹر] صاحب، جب آپریشن کے بغیر ہی کام چل سکتا ہے تو آ[پ] آپریشن کیوں کرتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب بولے "یہ تو ان کی اپنی مرضی ہے۔ م[یں] نے تو دو آپشنز بتائے تھے۔"

انہوں نے ہمیں دوائیاں لکھ دیں مگر یہ بھی کہہ دیا کہ ا[گر] آپ فلاں فلاں ڈاکٹر سے بھی مل لیں تو مزید اطمینا[ن] ہو جائے گا۔

یہ ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ ہمیں دوسری لیبارٹری [سے] کرانے تھے۔ مجبوراً کرائے مگر ڈاکٹر صاحب سے شکوہ ضر[ور] کیا کہ ہمارے جسم میں اتنا کم خون ہے، وہ بھی آپ ڈا[کٹر] حضرات اتنی فراخ دلی سے نکلوا رہے ہیں۔

انہوں نے ہمیں لیکچر دیا کہ انسان کے جسم میں کتنے لی[ٹر] خون ہوتا ہے اور جب ٹیسٹ کے لیے خون نکالا جاتا ہے [تو] قدرت فوراً اس کی کمی پوری کر دیتی ہے۔

یہ سب رپورٹس بھی کلیئر تھیں۔ درجنوں ٹیسٹ ہو جا[نے] کے بعد بھی مرض کا سبب اور اصلی مرض سمجھ میں نہیں آیا تھا اس لیے انہوں نے ہمیں ایک اور ڈاکٹر کے پاس بھیج د[یا]۔ ہماری سمجھ میں تو یہ آیا کہ ڈاکٹروں اور لیبارٹری والوں [کی] ایک یونین ہے جنہیں مریض نما انسانوں کو بے وقوف بنا کر کما تا ہے۔ وہ سب مل کر مریضوں کے ساتھ تجربہ [اور] مذاق کرتے رہتے ہیں، جب تک ٹیسٹ مکمل ہوتے، ہم بہ فضل اللہ کی قدرت سے تندرست ہونے لگے تھے۔

[ڈاکٹ]روں کی اسکیم قدرت نے ناکام بنا دی تھی۔

[پ]رائیویٹ ڈاکٹر ایک زمانے میں خاص مخلوق سمجھی جاتی [تھی]، جہاں مقررہ وقت پر آپ کا معائنہ ہو جاتا تھا مگر اب [ہ]زار روپے فیس دینے کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے آپ [سوا]لی ہیں اور ڈاکٹر آپ کے مالک۔ گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا [ہے۔] پرائیویٹ ڈاکٹر کے کلینک پر ایک جنرل اسپتال کا [گم]ان گزرتا ہے۔ ہر طرف مریض ہی مریض۔ لگتا ہے سارا [شہر] اس مرض میں مبتلا ہے۔ کئی گھنٹے انتظار کرانے کے بعد [مریض] کی باری آتی ہے اور ڈاکٹر منٹوں میں چند سطریں لکھ کر [اس] کو فارغ کر دیتا ہے۔

ڈاکٹروں کی ایک مخصوص ہینڈ رائٹنگ ہوتی ہے جسے وہ [ہ]ی پڑھ سکتے ہیں۔ یعنی وہی مثل ہے کہ لکھیں موسیٰ اور [پڑھی]ں خدا۔ شاید اس لیے تاکہ انہوں نے جو لکھا ہے اس کی [نق]ل کوئی نہ نکال سکے۔

[ا]ی ایم ایچ کے ایک ڈاکٹر کو جب ہم نے خوش خط لکھتے [دیکھ]ا تو دل خوش ہو گیا۔ ہم نے بہت تعریف کی اور کہا کہ جیسے [اسکول]وں میں تختی لکھی جاتی تھی کہ خوشخط لکھا جائے اس طرح [آپ] نے شاید انگریزی کی تختی لکھی ہے۔

[و]ہ یہ سن کر بہت خوش ہے اور اس کے بعد ہم سے بے [تکلف] بھی ہو گئے۔ ان کا نسخہ اتنا صاف اور خوش خط تھا کہ [بعد و]الے دوسرے ڈاکٹر اس میں غلطیاں نکالتے تھے کہ یہ [دوا] تو غیر ضروری ہے لیکن یاد رکھیے کہ جب تک آپ کسی [ڈاکٹر سے] علاج کرا رہے ہیں، اس کو زمین پر اللہ کا خلیفہ جانیے [اور اس] کی ہر ہدایت پر عمل کیجیے۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ [جیسے ڈا]کٹر کی ہدایات کی طرح ہم سب اللہ اور قرآن کی [ہدایات] کی پابندی بھی اسی طرح کرنے لگیں تو کتنا اچھا ہو۔

[پط]رس بخاری نے سالہا سال پہلے ایک مضمون لکھا تھا [ج]س کا عنوان تھا "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" اگر [وہ] زندہ ہوتے تو اس عنوان سے ضرور مضمون لکھتے کہ [مجھے] ان ڈاکٹروں سے بچاؤ۔"

مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ امریکا کے صدر اوباما اور [ا]ن کا زمانہ ہے۔ ان کی بات نہ مان کر ہم خطرہ کیسے [مو]ل لے سکتے ہیں؟

☆☆☆

[آئی]ے کچھ پُرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔

[قی]ام پاکستان کے بعد جن دو عظیم گلوکاروں نے پاکستان [آنے] کو ترجیح دی ان میں ایک تو بڑے غلام علی خاں تھے [اور دوسر]ی خاتون گلوکارہ روشن آرا بیگم تھیں۔ پاکستان آنا ان دونوں کو راس نہ آیا کیونکہ قیامِ پاکستان کے بعد کی تباہی اور افراتفری میں ماحول موسیقی... گلوکاروں کے لیے سازگار نہ تھا۔ نہ تو موسیقی کی سرپرستی کرنے والے لوگ تھے اور نہ ہی لٹے پٹے لوگوں کو اتنی فرصت اور استطاعت تھی کہ موسیقی کی محفلیں سجا سکتے۔ صرف ریڈیو پاکستان ہی ایک ادارہ تھا جہاں سے فن کاروں کو برائے نام معاوضہ ملا کرتا تھا اور بیوروکریٹس موسیقی اور فنونِ لطیفہ کے قدر داں بھی نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ جب ریڈیو نے ہفتے میں استاد بڑے غلام علی خاں کے گانوں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے انکار کر دیا تو وہ بددل ہو کر ہندوستان چلے گئے جہاں ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور انہیں مال و زر سے نوازا گیا۔

دوسری عظیم گلوکارہ جنہوں نے پاکستان آنے کو ترجیح دی تھی اگرچہ قدر دانی تو ان کی شان کے شایان یہاں بھی نہیں کی گئی مگر انہوں نے ہر صورت میں پاکستان رہنے کو ترجیح دی اور ساری زندگی یہیں گزار دی۔ روشن آرا بیگم نے مستقل رہائش لالہ موسیٰ میں اختیار کی۔ پروگراموں کے لیے وہ لاہور آتی رہتی تھیں۔

روشن آرا بیگم کے آبا و اجداد کافی عرصہ تک پٹنہ میں رہے۔ خاندان کا ایک حصہ کلکتہ میں آباد ہوا۔ روشن آرا بیگم وہیں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا اصلی نام وحید النساء تھا۔

موسیقی کا انہیں ابتدا ہی سے شوق تھا۔ ابتدائی موسیقی کی تربیت انہوں نے استاد ممتاز حسین لڈن خاں سے حاصل کی تھی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے چند فلموں میں بھی کام کیا تھا اور فلموں کے لیے گلوکاری بھی کی تھی۔

فلموں میں اداکاری اور گلوکاری انہوں اس وقت ترک کی جب انہوں نے استاد عبدالکریم کی شاگردی اختیار کی جنہیں سنگیت رتن کا لقب دیا گیا تھا۔ استاد عبدالکریم مسلمان لڑکیوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کے حق میں نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان لڑکیاں شادی کرنے کے بعد موسیقی سے کنارہ کش ہو جاتی تھیں۔

روشن آرا بیگم نے انہیں یقین دلایا کہ وہ کبھی موسیقی اور گلوکاری نہیں چھوڑیں گی۔ اس وعدے پر استاد نے انہیں شاگرد بنانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

کلاسیکی گلوکارہ کے طور پر انہوں نے کئی استادوں سے سیکھا۔ ایک پولیس افسر احمد خاں نے ان سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ موسیقی نہ چھوڑنے کی شرط پر روشن آرا بیگم نے یہ شادی کی تھی۔ احمد خاں کا انتقال جولائی 1977ء میں ہوا۔ اس وقت تک انہوں نے اپنے وعدے کو نبھایا۔

دلیپ کمار

احمد خاں بذاتِ خود موسیقی کے قدرداں اور دلدادہ تھے۔ انہوں نے ملکۂ موسیقی کی سوانح حیات کے نام سے روشن آرا بیگم کی سوانح عمری بھی لکھی...... وہ اپنی بیوی سے عشق کی حد تک پیار کرتے تھے۔ یہ کتاب دوبار شائع ہوئی۔ دوسری اشاعت کے موقعے پر اس کے کچھ حصے حذف کردیے گئے جن میں ان کی ذات کے حوالے سے واقعات بیان کیے گئے تھے ....ریڈیو پاکستان کے پاس روشن آرا بیگم کے تمام نغمات محفوظ ہیں۔

روشن آرا بیگم کو مختلف راگ راگنیوں پر عبور حاصل تھا لیکن وہ عموماً مندرجہ ذیل راگوں میں گاتی تھیں۔

1۔ بسنت، کیدارا اور ملہار، مارو بہاگ، سدھ کلیان۔

یہ ان کے پسندیدہ راگ تھے۔

پیا من آ دت ناہیں چین

ان کا پسندیدہ راگ تھا اور ہر محفل میں وہ یہ ضرور سناتی تھیں۔ یہ ان کا بہترین راگ تھا۔ ان کے استاد عبدالکریم خاں نے انہیں بہت شوق سے یہ راگ سکھایا تھا جو زندگی بھر ان کا بھی دل پسند راگ رہا۔

روشن آرا بیگم کلاسیکی موسیقی کی عاشق تھیں۔ وہ آل پاکستان میوزک کانفرنس کی بنیادی رکن تھیں۔ وہ فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے اور فن کاروں کے حق میں آواز اٹھاتی رہیں۔

پھر لوگ حیران ہوتے ہیں کہ لاہور جیسے موسیقی اور فنونِ لطیفہ کے مرکز کو چھوڑ کر انہوں نے لالہ موسیٰ کے چھوٹے سے قصبے میں کیوں سکونت اختیار کی تھی۔ لالہ موسیٰ میں رہ کر بھی تمام بڑے شہر کے فنی مراکز سے ان کے رابطے تھے جب انہیں مدعو کیا جاتا تھا تو وہ پاکستان کے ہر شہر میں جا کر موسیقی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے معیار کے مطابق مجالس میں ہی شریک ہوتی تھیں۔

ان کا معمول یہ تھا کہ علی الصباح اُٹھتی تھیں اور نماز پڑھ کر اپنے پالتو پرندوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتی تھیں۔

وہ ان خوش قسمت فن کاروں میں شامل ہیں جنہیں زندگی میں ہی عروج اور القاب سے نوازا گیا۔ سب سے پہلے ان ہی کو پرائڈ آف پرفارمنس ملا تھا۔ وہ پاکستانی ثقافتی وفد کے ساتھ بیرونی ملکوں میں بھی جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ انہوں نے کئی بار افغانستان اور بھارت کے بھی دورے کیے اور میوزک کانفرنسوں میں شرکت کی۔ معلومات محمد اطہر مسعود نے یکجا کی ہیں۔ ہر میوزک کانفرنس میں انہیں سب سے زیادہ داد ملتی تھی اور ہر فن کار ان کی عظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ درحقیقت ملکۂ موسیقی کے خطاب کی حق دار تھیں۔ بڑے سے بڑے موسیقار، گلوکار ان کے پرستار تھے۔ ملکۂ ترنم نور جہاں بھی ان کی عظمت کی قائل تھیں۔

افسوس کہ اب یہ لوگ رہے اور نہ ہی موسیقی اور فنونِ لطیفہ کی قدردانی۔ جدید ترقی نے پرانی تہذیب و ثقافت اور روایات کو فراموش کر دیا ہے اور فن کاروں کے مراکز ایک ایک کر کے ختم ہو رہے ہیں۔

☆☆☆

موسیقی کی بات چلی ہے تو کچھ سازوں کی بھی بات ہو جائے۔

مشرقی موسیقی میں طبلے کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ طبلے کے بغیر ہماری موسیقی نامکمل ہے تو درست ہوگا۔ کلاسیکی اور اب جدید موسیقی کے ساتھ بھی طبلہ استعمال کیا جاتا ہے۔

طبلہ دراصل دو الگ الگ حصوں پر مشتمل ہے، ان دو میں سے ایک کو دایاں اور دوسرے کو بایاں کہتے ہیں۔ طبلے کی مقبولیت اور پسندیدگی کی ایک وجہ اس کی آواز ہے، طبلے کی آواز کو مختلف آوازوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ڈھولک، ڈھولکی بھی ایک اسی قسم کا ساز ہے، اچھی ڈھولکی خریدنا

کا کام ہے۔ لاہور میں نتھو خان اور پاپا نیا ڈھولکی بنانے کے ماہر ہیں۔ دور دور سے شوقین ان سے ڈھولکی بنوانے کے لیے آتے ہیں اور مہنگے داموں خریدتے ہیں۔ بسے خاں اور امام دین بھی ماہر ڈھولکی ساز ہیں۔

ڈھولکی بنانے والوں کا مرکز لاہور کی ہیرا منڈی ہے۔ اس کے گرد و نواح میں بھی ساز بنانے والے پائے جاتے ہیں۔ سازندے جن گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں بڑے فخر سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ڈھولکی ڈھائی پونے تین سو سال قبل ایجاد ہوئی تھی اور مخصوص خاندان تک محدود ہے۔ ڈھولکی بنانے والے خاندان اپنے خاندان کے لوگوں کے علاوہ کسی کو نہیں سکھاتے۔ کچھ لوگ نال، ڈھولک، ہارمونیم بنانے میں خاندانی بار ہیں۔

آج کل کلاسیکی موسیقی کا رواج کم ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ خاص آمدنی کما لیتے ہیں۔ ڈھولکی اور طبلہ یورپ اور امریکا بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ خریدار کی مرضی کے مطابق ساز بنا دیتے ہیں۔ اختر حسین اور بشیر احمد اس فن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ طبلہ یا ڈھولکی بنانے کے لیے خاص قسم کی جلد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ برسہا برس چلتی ہے، ہر طبلہ ساز اپنے فن کی وجہ سے الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ جب تک طبلے کی آواز میٹھی اور سریلی نہ ہو اس کی داد نہیں دی جاتی۔ شہروں میں آ کر اور کاروبار کرنے کے ساتھ ساتھ طبلہ ساز اپنے آبائی گاؤں کو نہیں بھولے، جس پر انہیں فخر ہے۔

طبلے کے اندر مخصوص جگہ پر سیاہی لگانا بھی ایک فن ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی آواز میں جدت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر قسم کی آوازیں اس کے ذریعے پیدا کی جاسکتی ہیں۔ پاپ موسیقی میں بھی طبلے کی آواز شامل کر کے اسے آرکسٹرا کا حصہ بنا لیا گیا ہے۔ حاجی اختر علی کی دکان اس سلسلے میں بہت شہرت رکھتی ہے۔ بشیر احمد وغیرہ باقاعدگی سے اس شخص کی قبر پر خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں جس نے ان کے بڑوں کو فن سکھایا تھا۔ یہ جگہ ڈھولکی کہلاتی ہے جہاں ہر طبلہ ساز زیارت کے لیے جاتا ہے۔ پنجاب گھرانے کے میاں نبی بخش کلیار والے ان کا نام ہے۔ انہیں سب اپنا گرو سمجھتے ہیں ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔

☆☆☆

ہر سال جنوری میں معروف گلوکار، اداکار اور پلے بیک کے ایل ("کندن لال") سہگل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

فلم ''لاکھوں میں ایک'' کا پوسٹر

انہوں نے طویل زندگی نہیں پائی، فلموں سے وہ پندرہ سال تک وابستہ رہے۔ بولتی فلموں کے تو آغاز ہی سے ان کی آواز نے دھوم مچادی تھی۔ انہوں نے صرف 42 سال عمر پائی لیکن اس مختصر عرصے میں بھی لافانی شہرت حاصل کی۔ برصغیر کے گلوکاروں میں سہگل کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

یوں تو برصغیر میں بہت ماہر اور نامی گرامی گلوکار پیدا ہوئے لیکن جو سوز و گداز اور درد سہگل کی آواز میں تھا، وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

سہگل جموں میں پیدا ہوئے تھے یا جالندھر میں، اس بارے میں اختلاف ہے۔ انہیں بچپن ہی سے بھجن گانے کا شوق تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ مندروں میں جا کر بھجن گایا کرتے تھے۔ ان کے والد تحصیل دار تھے اور انہوں نے صوفی سلیمان یوسف کے آستانے میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہیں انہیں موسیقی کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ سہگل بڑے ہوئے تو ریلوے میں ٹائم کیپر کے طور پر کام کرنے لگے۔ انہوں نے آشا رانی نامی لڑکی سے شادی کی۔ یہ نوکری چھوڑ کر وہ کلکتہ چلے گئے جہاں وہ نیو تھیٹرز کے بانی سے ملے۔ لیکن اس سے پہلے وہ 80 روپے ماہوار پر سیلز مین کے طور پر ریمنگٹن کمپنی کے لیے کام کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں ان کی ملاقات بی این سرکار سے ہوئی جنہوں نے انہیں اپنی کمپنی میں

اداکار اور گلوکار کے طور پر سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ اس زمانے میں نیو تھیٹرز میں پی سی بورال، تمر برن اور پنکج ملک جیسے موسیقار کام کر رہے تھے۔

سہگل استاد فیاض خاں سے موسیقی اور گلوکاری سیکھنا چاہتے تھے۔ استاد نے انہیں بتایا کہ وہ پہلے ہی اتنا جانتے ہیں کہ شاگردی کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری آواز میں قدرتی ردھم ہے۔ بہتر ہے کہ تم کسی پیشہ ور استاد سے نہ سیکھو۔ یہ حقیقت ہے کہ قدرتی طور پر سہگل کو سُر اور تال سے واقفیت تھی بلکہ وہ ان پر عبور رکھتے تھے۔

اس زمانے میں آرکسٹرا چند سازوں پر مشتمل تھا۔ سازندے کہا کرتے تھے کہ سہگل کی آواز میں اس قدر مٹھاس اور دلکشی ہے کہ سننے والا سنتا ہی رہ جاتا ہے۔

سہگل نے گیت، غزل اور فلمی گانے گائے۔ غالب کی غزلیں جو انہوں نے گائی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان کا گایا ہوا ہر گانا ہٹ ہو جاتا تھا اور اسٹریٹ سانگ بن جاتا تھا۔ جو غزلیں انہوں نے گائیں، ان میں یہ شامل ہیں۔

1۔ بقدرِ شوق اقرار وفا کیا۔
2۔ عشق خود مائل حجاب ہے آج
3۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا (غالب)
4۔ میں انہیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں (غالب)
کاش وہ مے پئے ہوتے
5۔ وہ آکے خواب میں...... (غالب)
6۔ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی (غالب)
7۔ لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے (غالب)
8۔ کون ویرانے میں دیکھے گا بہار (امیر مینائی)

وہ ہمیشہ معروف اور مستند شعرا کی غزلیں ہی گاتے تھے۔

اداکار کی حیثیت سے سہگل کی پہلی فلم "محبت کے آنسو" تھی۔ اس کے بعد انہوں نے زندہ لاش، اور صبح کا ستارہ میں کام کیا۔ انہوں نے نابینا گلوکار کے سی ڈے کے ساتھ کام کیا اور شہرت پائی۔

انہوں نے جن فلموں میں کام کیا، ان میں چند یہ ہیں۔

1۔ یہودی کی لڑکی
2۔ راج رانی میرا

مگر اصل شہرت انہیں فلم "دیوداس" سے ملی۔ پریذیڈنٹ، دھوپ چھاؤں، بنجارن، زندگی، شربت سنگرہ، دشمن، لگن، کاروانِ حیات، ہاتفی، پروانہ، تان سین بھی ان کی یادگار میں شامل ہیں۔ میری بہن میں ان کے گانے ناقابلِ فراموش ہیں۔ شراب نوشی کی کثرت نے ان کے پھیپھڑے بے کار کر دیے تھے۔ آخری زمانے میں تو وہ دن رات پیتے تھے جس کی وجہ سے وہ 42 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کی آخری فلم "شاہجہاں" ہے جس کا ہر گانا ہٹ تھا، خصوصاً

یہ نہ جانا، ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ

زمانے سے ان کی شکایت بے جا ہے کیونکہ زمانے تو انہیں دولت، شہرت، مقبولیت، سب کچھ دیا تھا مگر شراب خانہ خراب نے انہیں بہت خراب کیا اور کہیں کا نہ چھوڑا۔ ان کی جیسی آواز پھر کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اگرچہ مکیش، کلیم اور سی ایچ آتما نے ان کی نقل کرنے کی کوشش کی مگر کر سکے لہٰذا انہوں نے سہگل کا انداز چھوڑ دیا۔ اس کے کسی نے سہگل کی آواز اور گائیکی کے انداز کی نقل کرنے کی جرأت نہیں کی۔ سہگل کو خداداد آواز اور گائیکی کی صلاحیتیں تھیں۔ کوئی دوسرا ان جیسا پیدا ہوا نہ شاید ہوگا۔

آواز کے سوز کے علاوہ ان کی اداکاری میں بھی اداسی اور رنج و غم کا غلبہ تھا۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہی ایک دکھی انسان کا خیال آتا تھا۔ اس پر ان کی غم زدہ آواز۔ وہ اداکاری کریں تو ان کے چہرے کے درد بھرے تاثرات اور شخصیت کی اداسی ہی بہت کافی تھی۔

سہگل کے بارے میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے لیکن ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس عظیم اداکار اور گلوکار کو نئی نسل سے متعارف کرانا بھی ضروری ہے۔

☆☆☆

وقت بھی کس قدر خاموشی مگر تیزی سے گزرتا ہے۔ اداکارہ رانی کی وفات کل کی بات معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی وفات کو انیس سال گزر چکے ہیں۔

رانی کی اداکاری کی کہانی بھی عجیب ہے۔ عام طور پر پہلی فلم فلاپ ہو جانے کے بعد دوسرا چانس نہیں ملتا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابتدائی فلمیں فلاپ ہو جانے کے باوجود رانی فلموں میں ہیروئن کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔ دراصل ان کی شخصیت اور صلاحیتوں کے باعث وہ فلموں پے در پے ناکامیوں کے باوجود مصروف رہیں یہاں تک کہ دنیا کو ان کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنا پڑا اور وہ ایک معروف اور کامیاب ہیروئن بن گئیں۔ انہیں ایک آسانی یہ تھی کہ وہ اچھی رقاصہ بھی تھیں اور کئی فلموں میں انہوں نے بہت اچھے رقص کا مظاہرہ کیا تھا۔

آج پاکستان کی کامیاب، مقبول اور یادگار فلموں میں فلم "شبنم" کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی اور بہت پسند کی گئی تھی۔ مقصد یہ ہے کہ نئی نسل بھی پرانی فلموں کے کاموں سے واقف ہو سکے۔ فلم شبنم کا نام ہیروئن کے نام پر تھا کیونکہ فلم میں ہیروئن کا نام بھی شبنم تھا۔ یہ فلم کا مرکزی کردار تھا جس میں رانی نے بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ فلم 1965ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ محمد علی اس فلم میں ہیرو کے کردار میں تھے۔ یہ دونوں ہی بہت اچھے اور باصلاحیت فنکار تھے جس کی وجہ سے فلم میں اداکاری کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ فلم ہے جس سے رانی کی کامیابیوں کا آغاز ہوا تھا۔

اس فلم کے ہدایت کار ایس اے حافظ اور موسیقار اے حمید تھے جن کے فلمائے ہوئے گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ اس فلم کی کاسٹ میں زیبا اور کمال بھی تھے۔ فلم میں کامیڈی پیدا کرنے کے لیے کمال اور زیبا کی جوڑی نے بہت اچھا تاثر پیدا کیا تھا۔ "شبنم" میں ہندوستان کے نامور اور پرانے اداکار کمار نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ کمار صاحب نے محبوب کی فلم "الہلال" میں مرکزی کردار ادا کیا تھا اور اپنے زمانے کے بہت مقبول ہیرو تھے۔ وہ ہدایت کار ایس اے حافظ کے والد تھے۔

اس فلم کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ اداکار لہری جو اس زمانے میں بہت معروف کامیڈین تھے، اس فلم میں انہوں نے کیریکٹر ایکٹر کا کردار نبھایا تھا۔ فلم کے آخری حصے میں انہوں نے ولن کی حیثیت سے کام کیا تھا اور بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ فلم شبنم 1965ء کے آخر میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی اور بہت کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ فلم شبنم اب سی ڈی میں دستیاب ہے، اس کو کبھی ٹی وی پر بھی پیش نہیں کیا گیا۔

شبنم ایک غریب لڑکی کی کہانی ہے۔ یہ دو دوستوں کی کہانی سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ وہ اپنی ماں (زینت) کے ساتھ رہتی ہے۔ بچپن میں اس کا رشتہ کمال (شکیل) کے ساتھ طے ہو چکا تھا۔ شبنم اس ناتے سے کمال سے بہت محبت کرتی تھی۔ شکیل اب شہر میں رہتا ہے اور ایک صحافی ہے جہاں اس کی ملاقات اخبار کے مالک (کمار) کی بیٹی فریدہ (زیبا) سے ہوتی ہے اور وہ زیبا کی محبت میں گرفتار ہو کر یہ بھول جاتا ہے کہ بچپن کی منگیتر اس کی منتظر ہے۔ لہری نے کمار کے بھانجے کا کردار ادا کیا ہے۔ وہ جب کمار کے گھر آ کر رہتا ہے تو زیبا کو پسند کرنے لگتا ہے لیکن کمار صاحب زیبا اس کو پسند نہیں کرتے۔ وہ فریدہ اور شکیل کے بارے میں کمار صاحب کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔

محمد علی کمال کا دوست ہے اور ایک مشہور سرجن بھی ہے۔ ایک بار وہ آپریشن کرنے راولپنڈی جاتا ہے۔ شبنم کی ماں شکیل کو یاد دلاتی ہے کہ شبنم اس کی منگیتر ہے اور اب ان دونوں کی شادی ہو جانی چاہیے۔ شکیل اس کو بتاتا ہے کہ وہ شہر میں کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہے اس لیے شبنم سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ باتیں شبنم بھی سن لیتی ہے اور مایوس ہو کر گھر سے نکل کر دریا میں کود جاتی ہے جہاں اسلم اس کو بچا لیتا ہے۔ شبنم کو اسلم سہارا دیتا ہے۔ یہاں شبنم کو معلوم ہوتا ہے کہ شکیل اس کا گہرا دوست ہے ایک دن اسلم موقع پا کر فریدہ سے اظہار محبت کرتا ہے مگر وہ انکار کر دیتی ہے اور شبنم کو بتاتی ہے کہ وہ دراصل شکیل کو پسند کرتی ہے۔ انور، کمال (حبیب اللہ) کو شبنم کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ مگر وہ اس کی بات پر یقین نہیں کرتے۔ انور انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انور حبیب اللہ فائر کرتا ہے تو شکیل درمیان میں آ جاتا ہے۔ شکیل کی زندگی بچانے کے لیے اسلم اس کا آپریشن کرتا ہے مگر انور اپنی شیطانی سے پھر بھی باز نہیں آتا اور عین آپریشن کے وقت آپریشن روم کا سوئچ آف کر دیتا ہے۔ شبنم یہ دیکھ لیتی ہے اور سوئچ آن کرنے کی کوشش کرتی ہے تو انور اس کو بھی گولی مار دیتا ہے۔ اس کشمکش میں انور اس پہاڑی سے گر کر ہلاک ہو جاتا ہے جس پر اسپتال ہے۔ شبنم کا بھی آپریشن ہوتا ہے اور شکیل کا آپریشن بھی کامیاب ہوتا ہے۔ اسلم کی کوششوں سے شکیل اور شبنم کی شادی طے ہو جاتی ہے۔

اس فلم کی موسیقی اے حمید نے بنائی تھی جس کے چند گانے بہت مقبول ہوئے تھے، مثلاً

1۔ چن لیا میں نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا
پیار کرنا یہ دل کہتا رہا، کہنے دیا
2۔ کیا خبر تھی تم ملے تو زندگی مل جائے گی
زندگی کو زندگی کا راز داں رہنے دیا
3۔ لے ڈوبا زندگی کو طوفان زندگی کا
4۔ او صنم، تیری یاد میں ہم یوں ہی مریں گے تیری قسم۔
5۔ جو کسی کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں
6۔ ہم جس پہ مر مٹے ہیں وہ قاتل تم ہی تو ہو۔

اس فلم میں ملکۂ ترنم نور جہاں، سلیم رضا، منیر حسین اور احمد رشدی نے گلوکاری کی تھی۔ فیاض ہاشمی اس کے مکالمہ نگار تھے۔ فلم کی کہانی فلم ساز راشد مختار نے لکھی تھی۔ جو کہانی تحریر کی گئی ہے۔ وہ دراصل کہانی کا مختصر خلاصہ ہے۔ سچ تو یہ ہے

بھاٹی دروازہ 1946 میں

کہ یہ ایک موثر اور کامیاب فلم تھی۔ سبھی اداکاروں نے اپنے کردار بہت خوبی سے نبھائے تھے۔ ایک اُلجھی ہوئی کہانی کو مناسب اسکرین پلے کی مدد سے ایک کامیاب فلم میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ یہ ایک اجتماعی کوشش تھی جس میں ہر فرد نے اپنا حصہ ادا کیا تھا۔

☆☆☆

معروف افسانہ نگار اے حمید (مرحوم) کو پھولوں، درختوں اور قدرتی مناظر کے علاوہ امرتسر اور لاہور سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ انہوں نے ان دونوں شہروں کی پُرانی یادوں کو اپنے حافظے، مشاہدے اور دوسروں سے حاصل کردہ معلومات کی بنا پر زندہ جاوید کردیا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے ان کی پُرانی تہذیب وثقافت کی تاریخ رقم کردی ہے۔

وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے دوسرے پُرانے اور باخبر لوگوں سے بھی مدد لیا کرتے تھے۔ ظاہر لاہوری لاہور کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں۔ جب اے حمید نے ان سے معلومات حاصل کرنی چاہیں تو انہوں نے زبانی بتانے کے بجائے تحریری طور پر یہ دلچسپ اور معلوماتی داستان لکھ کر دی ہے جس میں حیرت انگیز انکشافات اور معلومات کے علاوہ ایسی کہانیاں بھی ہیں جو شاید آپ نے پہلے نہ سنی ہوں۔ یقین نہ آئے تو مندرجہ ذیل واقعات ملاحظہ کیجیے۔

لاہور دنیا کے ان خوش نصیب شہروں میں شمار ہوتا ہے جن پر علم وادب، عقل ودانش، درس وتدریس، فنکاری، ہنرمندی اور روحانی فیوض وبرکات کے انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اس شہر کے کوچہ وبازار میں گلاب جیسے چہروں کی مہکتی سانسوں کے جھونکے زندگی میں تازگی کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اس شہر کی بستیوں، محلوں اور دروازوں میں ''بھاٹی دروازہ'' اپنے کمال وجمال میں منفرد حیثیت ہے، اسے چیلسی کا نام دینے والوں نے حسن تخیل کے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اس دروازے کی فصیل کے علماء، بادشاہ، شاعر، فنکار، موسیقار اور دانش مند عظمتوں کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ میں نے اسی دروا کے اندر آنکھ کھولی، اس وقت گردوپیش کی فضا، ماحول وقوع، آج کل سے بالکل مختلف تھا، تحصیل بازار دروازے تک گلیاں، بازار، محلے، کوچے، مین با صدیوں سے ایک ہی منظر پیش کررہے ہیں، محلہ سمیاں ستھاں، محلہ جلوتیاں، میدان بھاٹیاں، محلہ نیاریاں ذیلداراں، چومالہ، محلہ پڑنگاں، بازار حکیماں، اونچی نور محلہ، محلہ جوگیاں، مشتی ملاحاں وغیرہ تو وہی تنگ وتا گلیوں کے ساتھ مدتوں سے اپنی بے پناہ رونقوں کے آباد ہیں۔ مگر کہیں کہیں عمارتوں کے کے ناک نقشے بدل ہیں۔ البتہ بھاٹی دروازے کے باہر کا حسن آبادی کی بھیڑ میں کہیں کھو گیا ہے۔ جب میرے بچپن کے قہقہے دروازے کی گلیوں کے درودیوار سے ٹکرانے دروازے کے باہر رنگوں اور خوشبوؤں کی پھوار میں اور حسن کے احساس کی فضا، نغمگی کے موتی بکھیرتی دروازے کے باہر صرف ایک سینما تھا جسے میلا رام کا کہتے تھے۔ اس سے آگے حضرت علی ہجویریؒ کا آستانہ ذکر وفکر کی مدہم صداؤں میں دن رات روحانیت کی بکھیرتا تھا۔ دوسری جانب میلا رام کا کپڑے کا کارخا اس وسیع وعریض کارخانے کے ساتھ لال کوٹھی تھی یہ کو کنال پر پھیلی ہوئی تھی، جدید طرز تعمیر کا خوبصورت نمو اب وہاں کتب فروشوں کی دکانیں اور حزب الاحناف کا ایک مسجد اور مولانا ابوالبرکات کا مدفن ہے۔ کپڑے کارخانے کی جگہ بلند عمارتیں، کاروباری مرکز اور بینک ہیں۔ لال کوٹھی کا کچھ حصہ سڑک میں شامل کرلیا گیا ہے۔ عمارتوں کی جگہ گھوڑوں اور تانگوں کے اصطبل تھے ا بوسیدہ عمارتیں تھیں۔ بعد میں یہاں ولنگڈن ٹا پیراماؤنٹ ٹاکیز کے نام سے دو سینما بن گئے۔ جنہیں لوگ آج تک منڈوے ہی کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر طفیل حسین بخاری مرحوم کی رہائش گاہ اور کلینک اور دوسری نئی عمارتیں بن گئیں، اب یہ ساٹھ ستر سال ایک خوبصورت عمارتوں کی بستی ہے۔

دروازے کے باہر سڑک کے دونوں طرف ٹین کی چھتوں والی دکانیں تھیں۔ جن میں زیادہ تر

ں کی تھیں۔ پیراماؤنٹ سینما کے ساتھ ایک چھوٹی سی ہر تھی۔ اس سے آگے بکر منڈی تھی۔ جہاں صبح وشام ریاں فروخت ہوتی تھیں۔ دوسری جانب پھجی شاہ کا تھا۔ جو سارا سال ہی اسی جگہ رہتا، بڑے بڑے میلوں پر تا اور پھر اسی جگہ آکر خیمے لگ جاتے...... سامنے ں اور لاہوری تانگوں کا اڈا تھا جہاں سے ٹمٹمیں سانده، وال کوٹ اور دوسرے چھوٹے موٹے دیہاتوں کو یں اور تانگے سرکلر روڈ پر ریلوے اسٹیشن، دہلی دروازہ جاتے تھے۔ سلطان پورہ، چاہ میراں کوٹ، خواجہ سعید ٹے موٹے دیہات تھے جو لہلہاتے کھیتوں کے

رڈز امریکن ایکٹریس لاہور ریلوے اسٹیشن پر

ں آباد تھے۔ البتہ باغبانپورہ شالیمار باغ کے باعث ا شہر تھا اور میلہ چراغاں کی دھوم پورے برصغیر میں مرتسر سے دہلی تک کے لوگ کاروبار کے لیے آتے انیں سجاتے تھے۔ ایک حسین باغ، نہر اور باولیاں تو گرد گول دائرے کی شکل میں تھیں، اڑھائی لاکھ کی شہر اس وقت بھی باغات کا شہر کہلاتا تھا، بھاٹی کے باہر کا ماحول اور حسن بے پناہ تھا، اس کے سڑکیں ہیں، بہت کم چوڑی تھیں، صرف تانگے ور کاریں سادے شہر میں صرف چند لوگوں کے

لکشمی مینشن

پاس تھیں جن کا اس طرف گزر کم ہوتا تھا، لوگ سائیکلوں کو دلہن کی طرح سجا کر دلی خوش کرلیتے تھے۔ باغ کشادہ تھا اس کے درمیان ایک نہر تھی اور ساتھ ایک خوبصورت چھوٹی سڑک تھی۔ نہر کا لنک بڑی نہر کے ساتھ تھا جو میاں میر نہر کے نام سے مشہور تھی۔ نہر میں صاف شفاف پانی بہتا تھا، لوگ اس نہر پر نہاتے تھے۔ بچے پانی میں چھلانگیں لگاتے تھے۔ دوپہر میں قرب وجوار کی غریب عورتیں اس نہر پر کپڑے دھوتی تھیں۔ جب عورتوں کے کپڑے دھونے کا وقت ہوتا تو لوگ اس طرف سے کم گزرتے، مرد چھوٹی سڑک سے آتے جاتے، باغ کے بڑے بڑے درخت، ٹھنڈی چھاؤں، پھولوں سے لدے ہوئے پودے، روشوں پر سے گزرنے والوں کے سادہ دماغوں اور شفاف دلوں کو مہکاتے تھے۔

بچے باغ میں کھیلتے، بوڑھے صبح آٹھ نو بجے صفیں اور دریاں بچھا کر محفل آراستہ کرلیتے اور پھر ایک پڑھا لکھا بزرگ ہاتھ میں گل بکاؤلی، ہیر، یوسف زلیخا اور دیگر منظوم داستانیں لے کر آجاتا، خوشی کی ایک لہر اور بھنبھناہٹ سی مسرتوں کی صدائیں اُٹھتی، وہ بیٹھتا تو ساری محفل ہمہ تن گوش ہوجاتی اور پھر اسے بتایا جاتا کہ کل وہاں کہانی ختم ہوئی تھی جہاں ہمالہ دیوتی نے شہزادے اور گل بکاؤلی سے ملاپ کیا تھا۔ بات وہیں سے شروع ہوجاتی، ایک سناٹا چھا جاتا، نزدیک بچے آکر شور مچاتے تو انہیں سختی کے ساتھ وہاں سے بھگا دیا جاتا، کوئی دردناک مقام آتا تو ساری محفل رونے لگتی، ایک مرتبہ ساری محفل رو رہی تھی، ناک بہہ رہے تھے، ہلکی ہلکی چیخیں نکل رہی تھیں۔ ایک اجنبی گزرا تو وہ بے چارہ یہ منظر دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کیا ہوا؟ ایک بزرگ نے رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا کہ ''گل بکاؤلی کو جنوں نے سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر جیل میں بند کردیا ہے۔'' جہاں یہ محفل جمتی اس کے

سامنے بابے گھدو شاہ کا مزار ہے۔ جہاں گاما پہلوان رستم زماں کا اکھاڑہ تھا جو اَب بھی ہے، صبح وشام بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان وہاں زور کرتے۔ شام سے پہلے کشادہ باغ میں نوجوان کبڈی کھیلتے، صبح کاذب کے وقت نوجوان یہاں آکر کسرت کرتے، ڈنڈ بیٹھک لگاتے، جان بنانے کا، پہلوانی کا جسم کو خوبصورت بنانے کا شوق انتہا درجہ پر تھا۔

بھاٹی دروازے کے باہر باغات میں مولسری کے درخت عام تھے۔ دورویہ مولسری کے درختوں کی قطار تھی، اس وقت شہر کے لوگ صبح بہت جلدی اُٹھنے کے عادی تھے۔ سحر کی سپیدی کے تسلط سے بہت پہلے مسلمان دریا پر جانے کے عادی تھے۔ مزدور منڈیوں کو جاتے تھے، لوگ اپنے اپنے عقیدوں کے مطابق کلمہ کلام پڑھتے گزرتے، مگر ایک صدا مشترک تھی۔ جو صبح کے انوار کی بارش میں اُٹھتی "سب کا بھلا، سب کی خیر، سب کا بھلا، سب کی خیر" ہر سمت خوشبوؤں کے بل کھاتے ہوئے ہیولے اُڑتے تھے۔ بازار حکیماں میں، گلی کانڈیاں میں، میں نے ہوش سنبھالا، ایک دن بڑا شور وغول برپا تھا، میں پہلی مرتبہ گلی سے باہر نکل کر بازار کی رونق دیکھنے گیا یہ امام بخش پہلوان کا جلوس تھا۔ ایک اژدحام تھا، یہ گونگا پہلوان اور امام بخش پہلوان کی دوسری کشتی تھی، اس سے پہلے گونگا پہلوان نے امام بخش پہلوان کو پچھاڑ دیا تھا۔ گونگا اس وقت عین عالم شباب میں تھا اور امام بخش پہلوان کی عمر کچھ زیادہ تھی، بڑا شہ زور، طاقتور پہلوان تھا۔

گلیوں میں میونسپل کمیٹی کی جانب سے لکڑی کے پول گاڑ کر لیمپ جلائے جاتے تھے۔ کمیٹی کا عملہ ہر شام لیمپ میں تیل ڈال کر لیمپ جلا جاتا، لیمپ نہ چوری ہوتا تھا نہ پولوں کو کوئی نقصان پہنچاتا تھا۔ چور تو ہر دور میں ہوتے ہیں۔ مگر اتنے بالغ نظر چور نہیں تھے۔ بڑے بازاروں میں بڑے بلند لکڑی کے پول نصب ہوتے تھے۔ بچوں کی پہنچ سے بلند ایک ہینڈل اور گراری ایک لوہے کی تار سے منسلک ہوتی تھیں۔ شام کمیٹی کا عملہ آتا اور ہینڈل کو گھما کر لیمپ نیچے لے آتے تیل ڈال کر اور جلا کر پھر گراری گھما کر اوپر کر دیتے۔ رات بھر لیمپ جلتے محرم پر سبیلیں لگتیں، سبیلوں کی آرائش اور مشروبات کے مقابلے ہوتے۔ ہندو بھی سبیلیں لگاتے تھے۔ نذر و نیاز کا سلسلہ بہت زیادہ تھا۔ کجیاں ٹھوٹھیاں، بچوں میں تقسیم ہوتی تھیں۔ کجیوں میں مشروب، ٹھوٹیوں میں میٹھے چاول یا کھیر ہوتی تھی۔ بچے سارا دن گلیوں میں بھاگتے دوڑتے پھرتے اور ملوٹھی کھاتے پیتے رہتے۔

میلہ چراغاں، یا عرس حضرت مادھو لال حسین مسلمانوں کے اہم ترین تہواروں میں ہوتا تھا۔ کئی ہفتے پہلے تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ گھروں کی صفائی، سفیدی، نئے لباس شروع ہو جاتی۔ میلہ قریباً ہفتہ بھر رہتا، ویسے تو تین تھے۔ مگر دو دن پہلے ہی شروع ہو جاتا اور تین دن بعد رونق رہتی۔ باغ کے اندر باہر دکانوں، خیموں، بولیوں کا ہنگامہ اور خلق خدا کا اژدحام ہوتا تھا۔ امرتسر سے مٹھائی کی جو دکانیں آتی تھیں، ان پر ہوتا تھا۔ میلے پر خلق خدا سارے برصغیر سے آئی تھی ایک دو ہفتہ کے لیے بہت زیادہ پُر رونق ہو جاتا تھا۔ دوسرے کو تحفے تحائف اور مٹھائیاں بھیجتے تھے۔ میلہ سامنے بھی پوری شان و شوکت سے لگتا تھا۔ جب میں مرتبہ میلہ دیکھا، دس آنے خرچ کرنے کے لیے لے تین آنے میں گھر واپس لے آیا۔ باغ کے سامنے مرمر کا حوض تھا، فوارہ تھا اور پانی سڑک کے نیچے سے بہ کے اندر آ جاتا تھا۔ کھنڈرات سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ساتھ پردے لگے۔ اس کے بعد درمیان میں سڑک جسے مسمار کر دیے گئے۔ مگر باغ کی بیرونی فصیل کے آج بھی پائے جاتے ہیں۔ اب بھی میلہ لگتا ہے۔ مگر ہوتا ہے۔ باغ کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہوتا ہے مگر میلے کی صرف رسم پوری ہوتی ہے۔ اس دور بہت سستی تھیں۔ کوڑیاں (کوڈیاں) بھی سکے کے استعمال ہوتی تھیں۔ مزاروں پر کوڈیوں کے چڑھائے جاتے تھے۔ داتا دربار کی دکانوں پر عام طور پر بکتی تھیں اور مزار کے اندر اکثر کوڈیاں بکھری رہتی تھیں کوڈیوں کا ایک گھنڈا ہوتا تھا۔ میں پنساری کی دکان پر کوڈیاں دے کر کھانے کی کوئی چیز خرید لیتا تھا۔ لیکن ہوش سنبھالنے کے دور میں ہی کوڈیوں کا لین دین ختم ہو کوڈیوں کے ہار بھی بنتے تھے جنہیں کوکلیرے کہتے تھے پیسے کے دو دھیلے، چار دمڑیاں اور تین پائیاں ہوتی دو پیسے کا ایک ٹکہ ہوتا تھا۔ چار پیسے کا آنہ ہوتا تھا۔ دونی، اٹھنی اور روپیہ یہ خالص چاندی کے سکے ہوتے تھے۔ ان پونڈ بھی عام لوگوں کے پاس ہوتا تھا۔

یہ سونے کا ہوتا تھا۔ آٹا ایک روپے کا بائیس سیر پچیس سیر تک بکتا تھا۔ سونے کی قیمت سترہ اٹھارہ روپے تھی۔ اسی تناسب سے باقی تمام اشیا اور اجناس کی ہوتی تھی۔ اس دور میں تانگے اور سائیکلوں کے چالان ہو تھے تانگے کا کرایہ بھاٹی دروازے سے بڑے ریلوے تک ایک دو پیسے ہوتا تھا۔ تین سواریاں بٹھانے کی اجاز تھی۔ چوتھا کوچوان ہوتا تھا۔ بہت کم لوگ قانون شکنی کر

طور پر حق نہ ہونے، وردی نہ پہنے ہونے، ہوتا تھا۔ کوچوان کی وردی میونسپل کمیٹی کی پگڑی، خاکی کوٹ نما قمیص اور شلوار پگڑی کی تختی پر کوچوان کا رجسٹرڈ نمبر ہوتا تھا۔ ہوتا تھا۔ رئیسی تانگے بھی بہت تھے، کے پاس ہوتی تھیں۔ جن کے آگے دو گھوڑے جتے ہوتے تھے۔ سائیکل کا چالان رات میں لیمپ نہ ہونے اور دو آدمی بیٹھنے ساتھ پمپ نہ ہونے پر ہوتا تھا۔

اور ورزش کا شوق بہت زیادہ تھا۔ کہتے تھے جس کی مٹی نہیں لگی وہ بھاٹی دروازے کا رہنے والا ہی زماں کا اکھاڑہ مشہور تھا۔ صبح وشام زور کرنے تماش بینوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان دنوں گاما امام بخش پہلوان، چھوٹے جوڑوں میں گاما پہلوان کا الدین، جیجا کھیسے والا، بھجی ٹونی، حسینا دفتری، مین، بالا جھور اور بیسیوں چھوٹے موٹے تھے۔ دنگل ہر ہفتے ہوتے تھے۔ بڑے دنگل منتو ہوتے تھے۔ کھیلوں میں کشتی کو اولیت کا درجہ حاصل دوسرے نمبر پر تھی۔ گلی ڈنڈے کے میچ اور پتنگ کی لڑائی، بٹیروں کی لڑائی، مینڈھوں کی ٹکریں، جوت کر گھوڑوں کی دوڑ کے میچ اسی طرح ہوتے آج کل کرکٹ اور ہاکی کے میچ۔ حصہ لینے والوں کی اور بھاٹی دروازے سے تعلق رکھتی تھی۔ بھاٹی کی ہر گلی میں اپنے دور کے معروف پہلوان ہوتے درویش اور جتی ستی لوگ تھے۔ ان کا یقین تھا کہ کا راز پاکیزگی میں ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ناپاک اکھاڑے میں اُترنے والے کو چوٹ لگ جاتی ہے۔ بھاٹی دروازہ عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی بستی تھی۔ میں بازار حکیماں میں فقیر خانہ سے منفرد صاحب علم ہوتے رہے۔ محلہ جوگیاں کے قریب میاں شہباز کی اہل علم وفن کی آماجگاہ تھی۔ ادبی، علمی اور شعری اسی بیٹھک پر منعقد ہوتی تھیں۔ یہ میرے بچپن کا دور آنے جانے والوں کو دیکھتے ضرور تھے مگر ان کی اور علم وفضل سے بے خبر تھے۔ شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی محلہ سمیاں میں رہتے تھے۔ ان کی حویلی آج بھی ہے۔ مفتی صاحب اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ عرب کے ہیڈ تھے۔ ان کے فتاویٰ کئی جلدوں میں طبع ہائیکورٹ کے جج فقہی مسائل میں ان سے مشورہ لیتے تھے پھر وہ یہاں سے ریٹائرڈ ہو کر کلکتہ یونیورسٹی چلے گئے۔ ادبی، علمی اور شعری محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب علامہ اقبال، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج اور دیگر شاعر اور ادیب، علم وادب کی شمع روشن رکھے ہوئے تھے اور محفلیں اسی بازار حکیماں میں منعقد ہوتی تھیں۔ بعد میں حکیم احمد شجاع نے مفتی صاحب پر ایک جامع مضمون بھی لکھا۔ مفتی صاحب کے بیٹے مفتی انوار الحق ریاست بھوپال میں وزیر مالیات تھے۔ دیوانِ غالب کا نسخہ حمیدیہ انہوں نے ہی مرتب کیا تھا جو آج تک والئ بھوپال کے محل میں محفوظ ہے۔ پاکستان کے نامور افسانہ نگار اور ڈراما نویس رحمان مذنب مفتی صاحب کے خاندان سے ہیں، فقیر خانہ سے تعلق رکھنے والوں میں فقیر وحید الدین نے روزگار فقیر کے عنوان سے علامہ اقبالؒ پر دو جلدوں پر جو مواد پیش کیا ہے، وہ غیر معمولی ہے۔ منفرد ہے اور نادر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی خاندان میں جناب امجد علی بھی ہیں جو پاکستان کے وزیر خزانہ بھی رہے اور امریکا میں پاکستان کے سفیر رہے کے علاوہ یورپ کے سفر میں وہ علامہ اقبالؒ کے ہم سفر تھے۔ مشہور فلمی شاعر تنویر نقوی بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایام بارگاہ مبارک بیگم مشہور رہے۔ یہ سر مراتب علی کی اہلیہ تھیں۔ فقیر خانہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مشہور رائٹر آغا اشرف کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے اور بھی بہت سے ادیب اور شاعر اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ برصغیر کے معروف افسانہ نگار اور صحرا نورد کے خطوط کے خالق جناب دلاور حسین، مرزا ادیب کا تعلق بھاٹی دروازے سے ہے۔ اسی طرح ہر گلی ہر بازار کی مسجد میں علماء اور مشائخ بھی موجود تھے۔ مگر اونچی مسجد کے معروف خطیب مولانا غلام مرشد نے اس علاقے میں رشد وہدایت کی شمع روشن کر رکھی تھی، اس کا جواب نہیں تھا۔ بعد میں وہ شاہی مسجد کے خطیب بھی رہے۔ مگر بھاٹی دروازے کے لوگوں میں دینی اور ملی جذبہ روشن رکھنے میں ان کی ذات گرامی کا نام زندہ رہے گا۔

ایک نامور وکیل شیخ گلاب دین تھے۔ مسلمانوں کے سماجی اور سیاسی معاملات کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یہ سر محمد شفیع، سر فضل حسین، علامہ سر محمد اقبالؒ کے ہم عصر تھے۔ اس دور کی معروف شخصیت تھے۔ اس دور میں موری ممبری (میونسپل کمیٹی کے الیکشن) کا بڑا چرچا تھا۔ بڑی بھاگ دوڑ ہوتی اور بھاٹی دروازہ کے اندر پہلوانوں کی بیٹھکوں پر باداموں کی بوریاں پہنچ جاتی تھیں۔ موری ممبری میں بہت سے ناموں کے ساتھ خواجہ فیروز الدین وکیل کا بڑا نام مشہور تھا۔ یہ معروف

موسیقار خواجہ خورشید انور کے والد تھے۔ میاں بشیر ڈیلا دار، میاں مبارک علی خیمہ سازاں کا نام بھی مشہور تھا۔ سیاست دانوں میں حنیف رامے بھاٹی گیٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ معروف ماہر اقتصادیات ڈاکٹر محبوب الحق کے بزرگ بھی اسی دروازے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد مسلم ماڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس طرح سیکڑوں سماجی اور سیاسی شخصیتیں بھاٹی گیٹ کی مٹی کے خمیر سے اُبھرتی اور ڈوبتی رہیں۔

جس دور میں، میں نے ہوش سنبھالا، خاموش فلموں کا دور تھا، زیادہ انگریزی فلمیں لگتیں جو مار دھاڑ سے بھرپور ہوتی تھیں۔ اکثر پچیس پارٹ کی طویل فلمیں ہوتی تھیں۔ ٹارزن، پیڈرو بہادر، کے نام جنگل فلموں کے حوالے سے عام تھے۔ برصغیر میں بھی سیریل فلمیں بنتی تھیں۔ ان میں حاتم طائی مشہور تھی۔ یہ ایسی فلمیں ہوتی تھیں کہ لوگ شام کا کھانا کھا کر سنیما ہال میں داخل ہو جاتے اور صبح کی اذان کے بعد فلم دیکھ کر باہر آتے، ٹکٹ دو آنے کا ہوتا تھا۔ اکثر پردیسی رات گزارنے کے لیے سنیما میں داخل ہوتے اور رات اندر ہی کبھی سو جاتے اور کبھی اُٹھ کر فلم دیکھنا شروع کر دیتے۔ صبح اُٹھتے، ہاتھ منہ دھو کر کام پر چلے جاتے۔ میاں رشید کاردار جو بھاٹی گیٹ کی مشہور شخصیت اور فلمی دنیا کی قابلِ قدر ہستی تھی۔ لاہور میں فلموں کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔ چند خاموش فلمیں بھی بنائیں اور بعد میں بہت سی دوسری فلمیں بنائیں۔ ان میں باغی سپاہی بہت مشہور تھی۔ اس کے ہیرو گل حمید تھے جو اس دور کے خوبصورت ہیرو تھے۔ اس نے بمبئی اور کلکتے کی کئی فلموں میں بھی ہیرو کا پارٹ ادا کیا۔ گل حمید کی آخری مشہور فلم خیبر پاس تھی۔ یہ اتنا بہادر ہیرو تھا کہ فائٹ اور ایکشن نیچرل طور پر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ قلعہ شاہی کے نزدیک شوٹنگ ہو رہی تھی۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر آنا تھا اور گھوڑے سے چھلانگ لگانی تھی۔ وہ مضبوط اور ماہر شہسوار تھا اور گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آیا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے سے پکی سڑک پر چھلانگ لگا دی، وہاں موجود عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ مردوں کے رنگ اُڑ گئے۔ گل حمید مسکرا رہا تھا، سڑک پر پھسلنے سے اس کی چپل کے آدھے آدھے تلوے اُڑ چکے تھے۔ گل حمید گلے کی بیماری میں مبتلا ہوا اور پشاور کے قریب اپنے گاؤں چلا گیا۔ اس کی ہیروئن کو بر کو جدائی کا بڑا دکھ ہوا۔ وہ بمبئی سے پشاور اس کے گاؤں پہنچ گئی مگر جب کو بر گاؤں کے اندر داخل ہو رہی تھی، تو گل حمید کا جنازہ گاؤں سے باہر آ رہا تھا۔

میاں کاردار نے لاہور میں فلموں کا آغاز کیا تو بہت سے اداکار اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے پردہ اسکرین پر اُبھرے، ان میں خاص اہمیت ایم اسماعیل مرحوم کو حاصل ہے۔ انہوں نے ساٹھ سال فلمی دنیا میں گزارے، فلموں میں کام کیا، مرتے دم تک شہرت کے آسمان پر جگمگا رہے۔ مشہور ڈراما نگار اور اسکرین پلے لکھنے کے ماہر، ہر کے مشہور فلم ڈائریکٹر بابو صادق بھی اسی ٹیم سے اُ[illegible] تھے۔ درد کے ہیرو نصرت کاردار بھی مشہور تھے۔ محمد ا[illegible] خان جو ایم اسماعیل کے شاگرد تھے، ساٹھ سال فلم انڈ[illegible] میں شہرت کی بلندیوں پر رہے اور ظہور راجا اس دور کی فلم مرزا صاحباں کے ہیرو بھی بھاٹی دروازے کے تھے کے حوالے سے اتنے نام ہیں کہ اگر صرف نام ہی لکھ[illegible] جائیں تو کئی صفحے درکار ہوں۔

مشہور گلوکار محمد رفیع جو بین الاقوامی شہرت رکھتے وہ بھاٹی گیٹ کے اندر اونچی مسجد کے قریب گلی کے کاروبار کرتے تھے۔ اس دکان کے اندر پیچھے ایک لگا رکھا تھا اس پردے کے پیچھے ایک ہارمونیم رکھا رہتا تھا سے فارغ ہو کر باجے کی سُر ہمیشہ چھیڑی رہتی تھی، بڑا پاکیزہ اور نیک لڑکا تھا، ایک مرتبہ گلا خراب ہو گیا، ہر ایک گلے کا علاج پوچھتا تھا۔ ایک دوست نے شرارت سے کہ یار گلے پر سوجی کا پراٹھا پکا کر باندھو۔ سوجی لا کر ا[illegible] گوندنا شروع کر دیا۔ جب اسے تنور والے کے پاس لے گیا تو تنور والا بہت ہنسا اور کہا کہ تمہیں اتنا بھی پتا نہیں سوجی کا پراٹھا نہیں پک سکتا۔ چلو بھاگو...... یہ اس کی سا[illegible] تھی اور اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا کرم کہ اسے زمین سے آسما[illegible] پہنچا دیا۔ ایسا گلوکار صدیوں میں پیدا نہ ہوگا۔ اس وقت عمر بھی محمد رفیع کے برابر تھی۔ میرے اچھے دوستوں میں تھا۔ بچپن میں جب کچھ شعور بیدار ہوا تو اس وقت گائیک توکل خاں محلہ جوٹیاں کے آغاز میں ایک [illegible] کرائے پر رہے۔ جب ہم باجے کی آواز سنتے تو وگو[illegible] سیڑھیاں چڑھ کر انہیں دیکھنے جاتے تو وہ گا رہے ہوتے ایک نام اور مشہور تھا تاجی...... یہ استاد منظور کہا[illegible] گا کر لوگوں پر جادو کر دیتا تھا، اس کے بعد اس کے شا[illegible] بخش ظہور نے گلوکاری کے حوالے سے برصغیر میں نا[illegible] کیا۔ محمد شفیع ناگی کا نام بھی ان دنوں مشہور تھا۔ ریڈیو آ[illegible] نظام دین بھی بھاٹی گیٹ میں کچھ دیر رہے۔ مشہور مو[illegible] طفیل فاروقی بھی بھاٹی گیٹ کے تھے اور اس طرح اگر گیٹ کی پوری ہستیوں کا ذکر کیا جائے تو ایک کتاب ہو سکتی ہے۔ ابھی کرکٹ میں حفیظ کاردار اور امتیاز [illegible] ذکر نہیں ہوا۔

جاری

پراسرار بندے

عائشہ جونیجو

خدا کی خدائی میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ کیسی کیسی پر اسرار ہستیاں موجود ہیں کس کو پتا۔ ایسی پر اسرار شخصیتیں خال خال ہی نظر آتی ہیں مگر ان کی چھاپ دل پر مہر ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ۔

[illegible] افراد کا قصہ

دنیا کی تاریخ پراسرار لوگوں کے تذکروں سے بھری [illegible] ہے۔

یہ لوگ اپنے زمانے میں بھی پراسرار تھے اور برسوں [illegible] جانے کے باوجود ان کا اسرار ابھی تک واضح نہیں [illegible] ہے۔ ان کے کارنامے عام انسانوں سے مختلف تھے۔ [illegible] انداز مختلف تھے اور ان کی زندگی مختلف تھی۔

ان میں اکثر ایسے تھے جن کی شناخت بھی نہیں ہو سکی۔ [illegible] ان چند پراسرار لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

Mousieur Chouchani

[illegible] ایک حیرت انگیز کردار تھا۔ اس کی موت 1968ء [illegible] ہوئی ہے۔ یعنی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ اس کے باوجود اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کون تھا۔

اس کا ظہور دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ میں ہوا تھا۔

فزکس کے چند طالب علم ایک پارک میں بیٹھے فزکس کے کسی فارمولے میں الجھے ہوئے تھے کہ ایک دبلا پتلا لیکن روشن آنکھوں والا بوڑھا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہی چوچانی تھا۔

''میرے بچو! تم لوگ کس مسئلے میں الجھے ہوئے ہو۔'' اس نے دریافت کیا۔

''بڑے میاں، ہم ایک مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں جو تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''چلو کم از کم بتا ہی دو۔''

لڑکوں نے اس پراسرار شخص کو وہ پرابلم بتا دی۔ اس نے ذرا سی دیر میں وہ مسئلہ حل کر دیا۔ فزکس کے وہ سارے طالب علم حیران رہ گئے تھے۔

''آپ کون ہیں جناب!'' اب لڑکوں نے بہت احترام سے دریافت کیا۔

''چو چانی!'' اس نے اپنا نام بتایا ''کل تم لوگ پھر مل جانا، میں تمہیں فزکس پڑھا دیا کروں گا۔''

پھر وہ پارک کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ طالب علم پھر اسی پارک میں جمع ہو گئے۔ چو چانی اپنے وقت پر نمودار ہوا اور اس نے فزکس کے کچھ اور مسائل سمجھا دیے۔

اس بار ایک لڑکے نے اس سے کہا ''جناب، آپ اپنا ایڈریس بتا دیں تاکہ آپ کو آنے کی زحمت نہ ہو، ہم خود آپ کے پاس پہنچ جایا کریں۔''

''میرا کوئی ایڈریس نہیں ہے۔'' چو چانی نے مسکرا کر کہا ''اب میں دو دنوں کے بعد آؤں گا۔''

اتفاق سے دو دنوں کے بعد فلسفے کا ایک طالب علم بھی فزکس کے طلبا کے ساتھ چلا آیا تھا۔ جب اس نے چو چانی کو بتایا کہ وہ فلسفے کا طالب علم ہے تو چو چانی نے اسے بھی فلسفے پر ایک لیکچر دے دیا۔

اور اس وقت پتا چلا کہ یہ شخص تو فزکس کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی جانتا ہے۔

چو چانی پورے تین برسوں تک طالب علموں کو فزکس، فلسفہ، نفسیات، لٹریچر اور تاریخ پڑھاتا رہا تھا۔ اس سے پڑھنے والوں میں اس وقت کے مشہور ترین لوگ بھی تھے۔

لیکن کمال یہ ہے کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے؟

کئی بار اس کا تعاقب کر کے اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ہر کوشش ناکام رہی۔ وہ تعاقب کرنے والوں کو غچہ دے کر غائب ہو جاتا تھا۔

کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا خاندان کہاں ہے؟ آیا وہ دنیا میں اکیلا ہے یا اس کے گھر والے بھی ہیں۔ اگر ہیں تو وہ کون لوگ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ چو چانی کے ہزاروں شاگرد تھے اور ہر علم میں اسے دسترس حاصل تھی۔ وہ کسی سے ایک پائی بھی معاوضے کے طور پر نہیں لیتا تھا۔

اس طرح اس پراسرار شخص کی آمدنی کے ذرائع بھی کو معلوم نہیں ہو سکے تھے۔ اس کی موت کا سال لوگوں کو طرح یاد رہ گیا تھا کہ اس کی لاش اسی پارک میں پڑی ہوئی تھی جہاں وہ پہلی بار فزکس کے طالب علموں کے سا نمودار ہوا تھا۔

Poetoaster

جنوری کی سرد صبح، بالٹی مور میری لینڈ کا قبرستان۔ قبر۔ ہر طرف گہری دھند چھائی ہوئی۔ 19 جنوری 949 قبرستان کے گیٹ سے ایک آدمی آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبر کے پاس آتا ہے۔

اس آدمی کا حلیہ بھی عجیب ہے۔

اس نے ایک فلیٹ ہیٹ پہن رکھا ہے۔ سیاہ ر ایک لانبا سا اوورکوٹ اس کے جسم پر ہے۔ اس کے ایک میں شراب کی ایک بوتل ہے۔

اس پراسرار آدمی کو دیکھنے والا ایک بوڑھا ہے جو اپنی بیوی کی قبر پر پھول چڑھانے کے لیے آتا ہے۔ بوڑھے کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اور اس کا قبرستان کے پاس ہی ہے۔

اسی لیے اسے قبرستان آنے میں کوئی پریشانی ہوتی۔ وہ بوڑھا اس پراسرار اجنبی کو حیرت سے دیکھتا ہے اجنبی کو اس بات کی پروا نہیں ہے کہ کون اسے دیکھ رہا ہے۔

وہ پو کی قبر کے پاس آ کر کھڑا ہوتا ہے۔ شراب کی کھولتا ہے۔ تھوڑی سی شراب پی کر بقیہ بوتل وہیں قبر پاس رکھ دیتا ہے۔

کچھ دیر تک گردن جھکائے کھڑا رہتا ہے۔ پھر آ آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے باہر چلا جاتا ہے۔

بوڑھے کے لیے یہ سب کچھ بہت حیرت انگیز ہے۔

وہ گھر آ کر اپنے بیٹوں کو بتاتا ہے لیکن کوئی دھیان نہیں دیتا۔ اس قسم کے واقعات ہوتے ہی رہتے ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

بوڑھے کو وہ آدمی کئی دنوں تک دکھائی نہیں حالانکہ بوڑھا اپنی عادت کے مطابق روزانہ قبرستان جاتا ہے اور ایک صبح ایسے ہی سرد موسم میں وہ پراسرار اجنبی دکھائی دے جاتا ہے۔

وہ فروری کی انیس تاریخ ہے۔

بوڑھے کو یہ تاریخ اس لیے یاد رہی کہ اس کی شادی سالگرہ کا دن تھا۔ وہ گھر آ کر پھر اس پراسرار اجنبی کا ذ ہے۔ اس بار اس کے بیٹے کسی حد تک اس معاملے میں

یں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

بوڑھا اپنے ایک دوست سے اس اجنبی کا تذکرہ کرتے بتاتا ہے کہ ''میرا خیال ہے کہ وہ اجنبی انیس ہی تاریخ ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اس لیے جب وہ پچھلی بار دکھائی دیا تھا تو انیس جنوری'' بوڑھے نے بتایا ''پھر وہ انیس فروری کو دکھائی دیا۔''

''کیا دوسری بار بھی وہ شراب کی بوتل اپنے ساتھ لایا'' دوست نے پوچھا۔

''ہاں، دوسری بار بھی۔'' بوڑھے نے بتایا۔

''چلو، تو پھر انیس مارچ کی صبح میں بھی تمہارے ساتھ ان چلوں گا۔'' اس کے دوست نے کہا۔

انیس مارچ کی صبح دونوں بوڑھے قبرستان میں تھے۔ ں کہر آلود ٹھنڈی صبح کہ وہ اجنبی پھر دکھائی دے گیا۔ اس کا حلیہ تھا۔ فلیٹ ہیٹ، اوورکوٹ اور ہاتھ میں شراب کی

وہ کسی پر دھیان دیے بغیر سیدھے پو کی قبر کے پاس گیا۔ کھڑے ہو کر اس نے آدھی بوتل شراب پی اور بقیہ بچی شراب کی بوتل پو کی قبر کے پاس رکھ کر قبرستان کے گیٹ باہر چلا گیا۔

دونوں دوست حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف رہ گئے تھے۔

''خدا جانے یہ کیا سلسلہ ہے؟'' بوڑھے کے دوست کہا ''چلو، ایک مقررہ تاریخ پر قبر پر آنا تو سمجھ میں آتا ہے شراب کی بوتل کیوں رکھ کر چلا جاتا ہے؟''

''اور آدمی شراب پی کر بقیہ آدمی کیوں چھوڑ جاتا

''کیوں نہ اگلی انیس کو اس کے پاس چل کر اس سے کہا جائے؟'' دوست نے مشورہ دیا۔

پھر اپریل کی انیس تاریخ آ گئی۔

موسم اب بھی سرد تھا لیکن قابلِ برداشت تھا۔ اس بار آدمی کو دیکھنے کے لیے بوڑھے اور اس کے دوست کے چار اور بھی تھے جو ایک پراسرار شخصیت کو دیکھنے کے میں چلے آئے تھے۔

وہ پراسرار اجنبی معمول کے مطابق اپنے وقت پر نمودار اس بھی اس کا وہی لباس تھا۔ وہی انداز، وہی حلیہ۔ وہ طرح آہستہ آہستہ پو کی قبر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ل کے مطابق اس نے بوتل سے شراب پی اور جب

ایک دن جب کہ مولانا جلال الدین رومیؒ گزر رہے تھے، شمس تبریزؒ نے مولانا سے سرِ راہ دریافت کیا کہ مجاہدہ اور ریاضت کا کیا مقصد ہے؟

مولانا نے فرمایا ''اتباعِ شریعت۔''

شمس تبریزؒ نے کہا ''یہ تو سب ہی جانتے ہیں لیکن اصل مقصد علم و مجاہدے کا ہے کہ وہ انسان کو منزل تک پہنچا دے اور پھر حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا

علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل از آں علم بہ بود بسیار

(ترجمہ: جو علم تجھے تجھ سے نہ لے لے، اس علم سے جہالت بہتر ہے)

ان جملوں سے مولانا اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً شمس تبریزؒ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔

(ماخوذ از مثنوی مولانا رومؒ)

تلاش: نبیلہ اظہر، کراچی

آدمی بوتل رکھ کر واپس جانے لگا تو یہ لوگ اس کے سامنے آ گئے۔

لیکن ان میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو سکی کہ وہ اس سے کچھ پوچھ سکیں۔ اس نے جب ذرا سی فلیٹ ہیٹ اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا تو وہ سب بوکھلا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔

اس شخص کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان آنکھوں سے آگ نکل رہی ہو۔ آگے آنے والے بری طرح خوف زدہ ہو گئے تھے، پھر وہ اطمینان کے ساتھ ان کے درمیان سے نکلتا چلا گیا۔

ایسا نہیں ہوا کہ وہ دکھائی نہ دیا ہو۔

اگلے مہینے یعنی مئی کی 19 تاریخ کو وہ پھر پو کی قبر پر آ گیا۔ حالانکہ اب گرمی کا موسم تھا لیکن اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

اس بار اس کا راستہ گھیرنے کے لیے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی لیکن اس بار بھی کسی میں اتنی ہمت نہیں

ہوسکی تھی کہ اس کا راستہ روک سکے یا اس سے کچھ پوچھ سکے۔

البتہ کچھ لوگوں نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن وہ اس کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ وہ قبرستان کے گیٹ سے باہر نکل کر اس طرح غائب ہوگیا تھا جیسے فضا میں تحلیل ہوگیا ہو۔

چونکہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ لوگ اس کے نام سے بھی ناواقف تھے اس لیے شناخت کے لیے Poe Toaster کہا جانے لگا تھا۔

وہ برسوں تک اسی طرح پو کی قبر پر ہر انیس تاریخ کی صبح شراب کی بوتل ہاتھ میں لیے آتا ہوا دکھائی دیتا رہا۔ اس کے بعد وہ اچانک غائب ہوگیا۔

کہاں گیا، کیوں گیا، کوئی نہیں جانتا۔ یہ بھی ایک ایسا بھید ہے جس کے بارے میں آج تک کچھ نہیں معلوم ہوسکا ہے۔

Babushka Lady

یہ ذکر ہے ایک ایسی خاتون کا، جس کی شناخت بھی نہیں ہوسکی تھی لیکن اسے بابوشکا لیڈی کا نام دے دیا گیا تھا۔ بابوشکا دراصل خواتین کا ایک ہیٹ ہوتا ہے جیسے روسی خواتین استعمال کرتی ہیں۔

چونکہ اس خاتون نے ویسا ہی ہیٹ پہن رکھا تھا اسی لیے اسے بابوشکا لیڈی کے نام سے یاد کیا جاتا رہا تھا۔

یہ واقعہ 1963ء کا ہے۔

دنیا کے سب سے طاقتور ملک امریکا کا سب سے طاقت ور شخص یعنی صدر امریکا کینیڈی کی سواری گزر رہی ہے۔ اچانک ایک طرف سے گولی چلتی ہے اور کینیڈی کا قتل ہوجاتا ہے۔

یہ ایک خوفناک واردات تھی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ کسی کو اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔ اسی عالم میں یہ عورت اپنے ہاتھ میں کیمرا لیے دکھائی دیتی ہے۔

اس کے سر پر وہی بابوشکا ہیٹ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس بھگدڑ اور خوف و ہراس کے باوجود اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بہت سکون کے ساتھ تصویریں کھینچتی رہتی ہے۔

گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ پولیس والے بھاگتے پھر رہے ہیں۔ صدر کینیڈی کو اسپتال لے جایا گیا ہے لیکن وہ عورت اسی جگہ کھڑی رہتی ہے۔

اس کی بھی تصویریں کیمروں میں آجاتی ہیں لیکن اس کا چہرہ اس لیے نہیں پتا کہ وہ چہرہ ہیٹ میں چھپا ہوا ہے۔

بعد میں جب انتظامیہ کو ہوش آتا ہے تو اس عورت کی تلاش شروع ہوتی ہے لیکن وہ اب کہیں غائب ہوچکی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اس عورت کے پاس اس قتل کا ثبوت موجود ہے کیونکہ اس نے تصویریں اتاری ہیں۔ اسے کہاں اور کیسے تلاش کیا جائے؟

پورے امریکا میں اس عورت کی تلاش کا کام شروع کردیا گیا۔ اشتہارات دیے گئے۔ اسے انعام کی پیشکش کی گئی کہ وہ بس ایک بار سامنے آجائے لیکن وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوچکی تھی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی تصویریں کھینچنے کا کیا مقصد تھا؟ یہ تصویریں اس نے کہاں استعمال کی ہوں گی۔

پھر برسوں گزر گئے۔

اور ایک دن اچانک اسی قسم کا ہیٹ پہنے ایک عورت حکام کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ وہی عورت ہے۔ وہ اس دن اتفاق سے اسی سڑک سے گزر رہی تھی کہ وقت یہ حادثہ ہوا۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ اتنی دہشت زدہ ہوگئی تھی کہ اس سے بھاگا بھی نہیں جا رہا تھا اسی لیے وہ ایک ہی جگہ جم کر رہ گئی تھی۔ جب اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ اس نے جو تصویریں اتاری تھیں، وہ کہاں ہیں۔

تو اس نے صاف انکار کردیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس کوئی کیمرا نہیں تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھی، بعد میں پتا چلا کہ ایک فراڈ عورت تھی اور صرف شہرت کی خاطر اس نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔

بہرحال بابوشکا لیڈی اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی ایک راز ہی رہیں۔

جوبا۔

یہ ایک عجیب نام ہے اور کردار بھی بہت عجیب حب الوطنی کے جذبے سے سرشار۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ ہے کون؟

یہ کہانی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہ نام اس وقت آیا جب امریکا نے عراق میں اپنی فوجیں اتاریں۔ جو نتیجہ ہوا، وہ تو پوری دنیا کے سامنے ہے لیکن ایک امریکی فوجی کے پراسرار طور پر مارے جانے کے بعد جوبا کی شہرت پورے عراق میں پھیل گئی۔

اس امریکن فوجی کو جوبا نے مارا تھا۔ امریکی حکام کو یہ باور کرادیا گیا تھا کہ اس فوجی کو اسی نے مارا ہے۔

اس واقعے کے بعد اس کی تلاش شروع ہوئی لیکن جوبا کا سراغ نہیں لگ سکا۔ اسی دوران دو اور امریکن فوجی مار دیے گئے اور ان کی ذمے داری بھی جوبا نے قبول کرلی۔

اب تو اس کی تلاش کی مہم اور تیز ہوگئی۔ امریکن فوجیوں کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ کوئی اس طرح ان کے ساتھیوں کو ہلاک کرتا چلا جائے۔

دو اور قتل ہوگئے۔ یہ قتل بھی جوبا نے کیے تھے۔ پھر عراق کے ایک قصبے سے ایک آدمی کو جوبا ہونے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

اس نے یہ اعتراف بھی کرلیا کہ وہی جوبا ہے۔

اسے سزا سنادی گئی لیکن سزا سنانے کے دو ہفتوں بعد دو اور فوجی مار دیے گئے اور یہ قتل بھی جوبا نے کیے تھے۔

اب تو ایک ہنگامہ مچ گیا کہ جس کو سزا دی گئی ہے، اگر وہ جوبا ہے تو پھر یہ کون ہے جو امریکن فوجیوں کو مار رہا ہے۔

ایک بار پھر جوبا کی تلاش شروع ہوئی۔ اس بار یہ تلاش بہت زور شور سے ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ جاسوس مقرر کردیے گئے۔ خود عراق کے کئی آدمیوں کو لالچ دے کر اس بات پر تیار کرلیا گیا کہ وہ حکام کو جوبا کا سراغ لگا کر دیں۔

بالآخر ایک اور جوبا پکڑا گیا۔ اس نے بھی اعتراف کرلیا کہ وہی جوبا ہے اور اس نے بتایا کہ اس نے کہاں کہاں اور کن کن مقامات پر امریکی فوجیوں کا خون کیا ہے۔

اس جوبا کی گرفتاری کے بعد امریکن فوجیوں نے ابھی اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ دو اور امریکن مار دیے گئے۔ اس بار بھی یہ کارروائی جوبا کی تھی۔

اب ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی۔ کون ہے یہ جوبا! جواب تقریباً ساٹھ ستر امریکی فوجیوں کو مار چکا ہے اور ہر گرفتار ہونے والا اپنے آپ کو جوبا ہی ظاہر کرتا ہے۔

آخر کیوں؟

کیا جوبا ایک کردار ہے یا امریکی فوجیوں کے خلاف ایک تحریک۔ اگر کردار ہے تو شاید کبھی ہاتھ آجائے، شاید کبھی اس کو سزا مل جائے۔

لیکن اگر وہ ایک تحریک ہے تو پھر تحریکیں اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتیں۔

D.B.Cooper

لوگ نہیں جانتے کہ یہ اس کا نام بھی تھا یا نہیں یا صرف فرضی طور پر اسے ڈی بی کوپر کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک پراسرار انسان تھا۔

یہ واقعہ 24 نومبر 1971ء کا ہے۔

طیارہ اپنی منزل کی طرف محوِ پرواز تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ موسم کی رپورٹ بھی اچھی تھی۔ طیارے کے مسافر گرماگرم کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کہیں بھی ایسے آثار نہیں تھے جن سے یہ اندازہ ہوسکے کہ جہاز میں کسی قسم کی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ جہاز کی ائرہوسٹس مسافروں کی گرم جوشیوں کا جواب اپنی مسکراہٹوں سے دے رہی تھیں کہ اچانک ایک آدمی کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔

''سب میری طرف متوجہ ہوں۔'' اس نے آواز لگائی ''میرا نام جی بی کوپر ہے۔''

اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اسی لیے سب کو اس کی طرف متوجہ ہونا ہی تھا۔ اس زمانے میں معاشرے میں تشدد کا اتنا رواج نہیں ہوا تھا۔ چاہے وہ مشرقی معاشرہ ہو یا مغربی۔

اور جہاز میں سفر کرنے والے جس طبقے کے لوگ ہوتے ہیں، وہ عام طور پر لڑائی بھڑائی سے پرہیز ہی کیا کرتے ہیں اسی لیے جب انہوں نے اچانک ایک مسافر کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا تو سب بری طرح خوف زدہ ہوگئے۔

''معاف کیجیے خواتین و حضرات!'' کوپر نے کہا ''میں آپ لوگوں کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔'' اس کا لہجہ بھی بہت شائستہ اور سلجھا ہوا تھا۔

''کیا تم جہاز کو اغوا کرنا چاہتے ہو؟'' ایک مسافر نے اس کے نرم لہجے سے ہمت پاکر سوال کیا۔

''ارے نہیں۔'' کوپر مسکرادیا ''وہ بڑے لوگوں کے کام ہیں۔ میں بے چارہ تو ایک غریب، معمولی سا انسان ہوں۔''

''تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''پیسے۔'' کوپر نے کہا ''آپ حضرات اور خواتین اپنی ساری رقم نکال کر میرے اس تھیلے میں ڈال دیں۔'' اس نے اپنی جیب سے پلاسٹک کا ایک بڑا سا بیگ نکال کر ایک خوفزدہ ائرہوسٹس کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

وہ ائرہوسٹس سہمی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''گھبراؤ نہیں۔'' کوپر نے کہا ''میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ تم یہ بیگ لو اور لوگوں سے رقم لے لے کر اس میں رکھنا شروع کردو۔ جس طرح چرچ کے چندے لیے جاتے ہیں، شاباش!''

''اور اگر کوئی نہ دے تو؟'' ائرہوسٹس نے پوچھا۔

''پھر تو مجبوری ہے۔'' کوپر کا چہرہ سخت ہوگیا تھا۔ اب جو بولا تو اس کی آواز میں بے رحمی شامل تھی ''میں انکار کرنے والے کو یہیں ڈھیر کردوں گا۔ کیونکہ میں صرف شوقیہ طور پر

جہاز میں بیٹھ کر لوٹ مار نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر یہاں تک آیا ہوں۔"

اس کے لہجے کی سختی نے لوگوں کو مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔

ائر ہوسٹس ہر ایک سے رقم اکٹھا کرتی جا رہی تھی کہ اچانک ایک آدمی نے ائر ہوسٹس کو پکڑ لیا۔

اس نے بڑی پھرتی سے ائر ہوسٹس کو ڈھال بنا لیا تھا۔

"کوپر! اپنا ریوالور پھینک دو۔" اس آدمی نے کہا "ورنہ میں ائر ہوسٹس کی گردن توڑ دوں گا۔"

"توڑ دو۔" کوپر بے رحمی سے بولا "تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ ائر ہوسٹس میری بیوی یا محبوبہ ہے کہ میں اس کا خیال کروں گا لیکن پھر یہ سوچ لو کہ اس کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟"

اس آدمی کے پاس اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ ائر ہوسٹس کو چھوڑ دے۔ اس نے ائر ہوسٹس کو چھوڑ دیا۔

ائر ہوسٹس نے خوفزدہ ہو کر پھر سے اپنا کام شروع کر دیا۔

پھر اچانک کوپر کے ریوالور سے ایک گولی نکلی اور اس آدمی کے بازو میں پیوست ہو گئی جس نے ائر ہوسٹس کو پکڑا تھا۔ وہ آدمی بری طرح چیخ رہا تھا۔

"بس خاموش رہو۔" کوپر غرایا "یہی گولی میں تمہارے سینے میں بھی مار سکتا تھا لیکن صرف تھوڑی سی سزا دی ہے۔ اگر یہاں کوئی ڈاکٹر ہے تو اس کی مرہم پٹی کر دے۔"

اتفاق سے ایک سرجن اپنے اوزاروں کے ساتھ اسی طیارے میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس زخمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ تم ائرپورٹ اتر کر بچ جاؤ گے؟" ایک عورت نے کوپر سے پوچھا۔

"نہیں میڈم! میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کسی ائرپورٹ پر اترنے کی حماقت کروں۔" کوپر نے کہا۔

"پھر کیا کرو گے تم؟"

"میڈم، یہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے۔" کوپر نے کہا "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

بے چارہ زخمی اپنی مرہم پٹی کروا کے ایک طرف ہو گیا تھا۔

ائر ہوسٹس نے سارے مسافروں سے حاصل کردہ رقم تھیلی میں بھر کر کوپر کے حوالے کر دیے۔ کوپر نے تھیلی کو دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا "اچھا دوستو، میں نے آپ لوگوں کو زحمت دی۔ اب میرے چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

سب اس سر پھرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اس نے ائر ہوسٹس سے پیراشوٹ طلب کیا۔ پیراشوٹ باندھا اور اڑتے ہوئے طیارے سے کود گیا۔ یہ تو ایک پہلو ہوا، دوسرا پہلو اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔

کوپر طیارے سے کود تو گیا لیکن وہ زمین پر [پہنچا] نہیں۔

ہے نا حیرت کی بات۔

اتفاق ہے کہ اس نے جہاں طیارے سے چھلانگ لگائی، وہ فوجی علاقہ تھا۔ یہ چونکہ دن کا وقت تھا، اس لیے اس کے پیراشوٹ کو اترتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔

سب ہی حیران ہو رہے تھے کہ یہ کون شخص ہے؟ جو اس طرح پیراشوٹ سے نیچے آ رہا ہے۔ اس کو دوربینوں کے ذریعے آبزرو کیا جانے لگا۔

پیراشوٹ سیدھے فوجی چھاؤنی کی طرف آ رہا تھا۔ اس لیے فوجی بڑے اطمینان سے اس کے اترنے کا انتظار کر رہے تھے۔

لیکن اچانک ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا اور پیراشوٹ قریبی جنگل کی طرف اترنے لگا۔ فوری طور پر فوجیوں کو اس کی طرف دوڑایا گیا لیکن اترنے والے کا کوئی پتا نہیں چلا۔ کوئی سراغ نہیں ملا، پورے جنگل کے چپے چپے کی تلاشی لے لی گئی لیکن نہ تو پیراشوٹ سے اترنے والے کا اور نہ ہی اس کے پیراشوٹ کا۔

آس پاس کی آبادیوں کی بھی تلاشی لے لی گئی لیکن کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ دوسری طرف ائرپورٹ پر مسافروں نے جب کوپر کے بارے میں بتایا تو سب حیران رہ گئے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ مسافروں کی فہرست میں اس کا نام ہی نہیں تھا یعنی اس نام کا کوئی مسافر طیارے میں سوار نہیں ہوا تھا۔

اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاز میں جتنے مسافر سوار ہوئے تھے۔ ان کی گنتی مکمل تھی یعنی جتنے سوار ہوئے تھے، اتنے ہی اتر بھی گئے تو پھر یہ کوپر کون تھا، کہاں سے آیا تھا؟

یہ معما بھی ابھی تک لاینحل ہے۔

Man in Iron Mask

یہ دنیا کے سب سے پراسرار اور سب سے بدنصیب انسان کا نام ہے۔ نام کہاں، یہ اس کی صفت ہے۔ اس شخص پر نہ جانے کتنی بار لکھا جا چکا ہے۔

ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ راز ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھا۔

وہ شخص اپنی زندگی میں بھی پراسرار رہا اور اپنی موت کے بعد بھی پراسرار ہے۔

یہ کہانی دنیا کے بدنصیب ترین شخص کی کہانی ہے۔ یہ واقعہ ہے سولہویں اور سترہویں صدی کے درمیان کا۔ کیونکہ اس کی موت نومبر 1703ء میں ہوئی تھی۔

فرانس میں اس وقت کنگ لوئس کی حکومت تھی۔ فرانس کی ایک جیل میں ایک ایسے قیدی کو لایا گیا جس کے چہرے پر لوہے کی نقاب چڑھی ہوئی تھی اور صرف اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

اس قیدی کو بادشاہ کے حکم پر وہاں لایا گیا تھا۔

معمول کے مطابق جب اندراج کرنے کے لیے اس کا نام اور شناخت وغیرہ پوچھی گئی تو لانے والوں نے جواب دیا "نہیں، اس کی کوئی شناخت نہیں ہے۔ بادشاہ کے حکم پر اسے الگ کوٹھری میں رکھا جائے گا۔ کوئی شخص اس کے قریب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ صرف کھانا اور پانی اس کے کمرے میں پہنچا کر واپس آ جائے۔"

یہ تھا بادشاہ کا حکم اور ایک ایسا قیدی جس کے چہرے پر لوہے کی ایسی نقاب تھی جو کسی صورت اتر نہیں سکتی تھی۔ اس شخص کو فرانس کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔

اور ہر جگہ اس کے ساتھ یہی صورتِ حال ہوتی تھی۔ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ خود وہ بھی بالکل خاموش رہتا تھا۔

کسی نے اسے بولتے ہوئے نہیں سنا۔

یا تو وہ گونگا تھا، یا پھر وہ خود ہی کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ شاید وہ حکومت کا کوئی اہم عہدے دار ہے، جسے کسی قسم کی سزا سنائی گئی ہے لیکن ایسا کوئی اہم عہدے دار غائب بھی نہیں ہوا تھا، سب اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔

اس کے بارے میں بے تحاشا قیاس آرائیاں کی گئیں۔ کون تھا وہ، بادشاہ نے اسے قید کیوں کروایا تھا۔ اس کی شناخت کیوں چھپائی گئی تھی؟

کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بادشاہ سے اس کے بارے میں سوال کر سکتا۔ ایک طرف تو یہ صورتِ حال تھی، دوسری طرف یہ بھی تھا کہ بادشاہ اس کی صحت کی طرف سے فکرمند رہتا تھا۔

جب ایک بار وہ شخص بیمار پڑا تو بادشاہ نے اپنے خاص طبیب سے اس کا علاج کروایا تھا لیکن اس طبیب کو بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا مریض کون ہے؟

کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ شاید وہ شخص کسی بہت بڑے راز سے واقف ہے اور بادشاہ اس سے وہ راز اگلوانا چاہتا ہے، اس لیے اسے قید میں رکھا ہوا ہے۔

لیکن وہ شخص راز اپنے سینے میں دفن کر چکا ہے۔ وہ بادشاہ کو بتانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ خیال اس لیے ناقابلِ قبول ہوا کہ اگر بادشاہ کا کوئی راز اس کے پاس ہوتا تو بادشاہ اسے قید میں رکھنے کا جھنجٹ نہیں پالتا۔ ویسے ہی اس کو ہلاک کروا دیتا، کون پوچھنے والا تھا۔

تو پھر یہ کون تھا؟

وہ شخص برسوں تک فرانس کی مختلف جیلوں میں قید رہا اور کوئی بھی اس کی صورت دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ بالآخر نومبر 1703ء میں اس آہنی نقاب پوش کی موت واقع ہو گئی۔

اب اس حوالے سے ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی موت کے بعد بادشاہ نے اس کے استعمال میں رہنے والی ہر چیز یا تو دفن کروا دی یا جلوا دی۔

انتہا یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ سارا کام خود اپنی نگرانی میں کروایا تھا۔ اور آخرکار خود اس آدمی کی لاش بھی جلا دی گئی تھی۔

اور وہ بے چارہ اپنی آہنی نقاب سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک پراسرار کردار بن کر رہ گیا کہ وہ کون تھا؟ اس کردار کو سامنے رکھ کر نہ جانے کتنی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔

کتنی فلمیں بن چکی ہیں لیکن یہ معما ابھی تک حل نہیں ہو پایا ہے اور شاید کبھی حل بھی نہ ہو۔

Green Children of Woolpit

یہ کہانی بارہویں صدی کی ہے۔

لیکن تاریخ لکھنے والوں نے اسے بھی زندہ رکھا ہے۔

اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کی ہیں۔

وولپٹ برطانیہ کا ایک قصبہ ہے۔ اس زمانے میں یہ ایک صاف ستھرا علاقہ تھا۔ لوگ کھیتی باڑی کیا کرتے یا اور دیگر کام کرتے۔

زندگی مشینی اور تیز رفتار نہیں ہوئی تھی۔ سب ایک دوسرے کو جانتے بھی تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک رہا کرتے۔

یہ واقعہ اسی قصبے کا ہے۔

ایک صبح جب لوگ گھروں سے اپنے اپنے کام کے لیے نکلے تو انہوں نے دو بچوں کو دیکھا۔ دونوں گیارہ اور بارہ برس

سے زیادہ کے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ ان دونوں کی شباہتیں ایک جیسی تھیں جو یہ بتا رہی تھیں کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اس طرح رو رہے تھے جس طرح والدین سے بچھڑ جانے والے بچے رویا کرتے ہیں۔

یہاں تک تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔

خاص بات یہ تھی کہ دونوں کی جلد انتہائی گہرے سبز رنگ کی تھی۔ جیسے پورے جسم پر گہرے سبز رنگ کا پینٹ کر دیا گیا ہو۔

یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔

گہرے سبز رنگ کی جلد ایک انہونی سی بات تھی۔ پورے قصبے کو اس کی خبر ہوگئی۔ پورا قصبہ ہی ان دونوں کو دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہوگیا۔

پھر جب ان سے بات کی گئی تو پتا چلا کہ وہ انگریزی نہیں جانتے۔ بلکہ وہ ایک ایسی زبان بول رہے تھے، جو قصبے والوں کی سمجھ سے بالکل باہر تھی۔

وہ جس معصوم نگاہوں سے قصبے والوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور روئے جا رہے تھے، قصبے والوں کو ان پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے یہ بے چارے کون تھے، کہاں سے آئے تھے؟

انہیں جب کھانے کے لیے دیا گیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اس موقعے پر مقامی چرچ کے پادری نے قصبے والوں سے کہا ''دیکھو، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں بچے کسی اور سیارے سے آئے ہیں۔ انہیں خدا کا تحفہ سمجھو۔ ان کی قدر کرو، ان کا خیال رکھو اور یہ جان لو کہ خدا ہم سے خوش ہے اسی لیے اس نے ان دونوں کی پرورش کے لیے ہمارے قصبے کا انتخاب کیا ہے۔''

ان دونوں کے لیے اسی وقت قصبے کا ایک گھر مخصوص کر دیا گیا۔ ان دونوں کو وہاں لے جایا گیا اور قصبے کے کچھ مردوں اور عورتوں نے اب بچوں کی پرورش کی ذمے داری قبول کر لی۔

ایک مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں کو جو کچھ کھانے کے لیے دیا جاتا، وہ کھانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یقیناً ان کی خوراک مختلف ہو سکتی تھی۔

لیکن کیا تھی، قصبے والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کئی دنوں کے بعد جب ایک عورت نے ان بچوں کے سامنے [illegible] کے گلاس رکھے تو انہوں نے دودھ پی لیا تھا۔

ایک مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ان سے بات کیسے کی جائے؟ کیونکہ جو کچھ وہ بولتے تھے، وہ قصبے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور جو قصبے والے بولتے تھے، وہ ان بچوں کے سروں سے گزر جاتا تھا۔

بالآخر قصبے کے ایک آدمی نے ان دونوں کو انگریزی سکھانے کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔

چونکہ وہ بچے کچھ زیادہ عمر کے ہو چکے تھے اسی لیے انہیں کوئی نئی زبان سکھانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے باوجود اس آدمی نے ہمت نہیں ہاری اور ان دونوں کو انگریزی سکھاتا رہا۔

پانچ سال گزر گئے۔

ان پانچ برسوں میں قصبے والوں نے انہیں اپنی اولاد کی طرح قبول کر لیا تھا۔ قصبے کے ہر گھر میں ان کا آنا جانا تھا۔

دونوں انتہائی خوبصورت تھے اور قصبے والوں کا یہ خیال صحیح نکلا تھا کہ دونوں بھائی بہن تھے۔ انگریزی سیکھ جانے کے بعد انہوں نے یہی بتایا تھا۔

اپنے بارے میں انہوں نے یہ بتایا کہ ان کا تعلق ایک ایسی سرزمین سے ہے جو زمین کے نیچے ہے اور اندھیروں کی دنیا کہلاتی ہے۔

وہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہوتا اسی لیے ان دونوں کی جلدیں اتنے گہرے سبز رنگ کی ہیں۔ ان دونوں نے یہ بھی بتایا کہ دونوں بھائی بہن گھر سے کھیلنے کے لیے نکلے تھے کہ نہ جانے کیسے یہاں آ گئے۔

انہیں اپنے والدین اچھی طرح یاد تھے۔ انہیں یاد کرتے کرتے وہ اداس ہو جایا کرتے۔

قصبے والوں کا یہ خیال تھا کہ شاید ان دونوں کی زندگی اسی قصبے میں گزرے گی لیکن ایک دن وہ دونوں اچانک غائب ہو گئے۔

ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔ جس طرح وہ آئے تھے۔ اسی طرح واپس چلے گئے۔ شاید اپنی اسی زمین دوز دنیا میں، جہاں سورج کا گزر نہیں ہوتا۔

نہ جانے کیسے کیسے بھید یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ کیسے کیسے لوگ ہمارے اطراف میں ہیں۔ ایسے پراسرار لوگ جن کے لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون ہیں۔ اور ان کی زندگی کیا ہے؟

یہ بات تو یقینی ہے کہ ابھی بھی اَن گنت بھید ہیں جن تک انسانی اذہان کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔

◇

شہریوں کا شہر

ایس جی یزدانی

سفر وسیلہ ظفر ہی نہیں وسیلہ معلومات بھی ہے۔ اس شہر کا سفر کرکے معلومات کا خزانہ ہاتھ آیا۔ لوگ کس طرح قانون کا احترام کرتے ہیں اور احترام قوانین کیسے زندگی کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔ اس کا ادراک ہوا۔ وہ ملک جہاں پانی ضائع کرنا قابل دست اندازی پولیس ہے۔ جہاں اگر بجلی چلی جائے تو حکومت ہرجانہ ادا کرتی ہے۔ جہاں پہنچ کر مسلمانوں نے عظیم الشان مساجد کی تعمیر کی، جہاں کا نظام قابلِ تعریف ہے مگر اس دیس میں وہاں کے اصل باشندوں کو ہی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

[illegible]

آسٹریلیا پر مضمون لکھنے کا شوق مجھے ملبورن پہنچ کر ہوا۔ ملبورن اپنے فرزند عذیر راحیل کے پاس اہلیہ کے ساتھ ہم ماہ کے وزٹ ویزا پر اگست 2005ء میں گیا تھا۔ وہاں میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ گھومنا پھرنا مطالعہ اور مشاہدہ بھی کچھ کرنے کو تھا۔ کتابیں پڑھنے کا شوق لائبریری کی سمت لے جاتا۔ سارا سارا وقت مطالعے میں گزار دیتا۔ وہیں مجھے آسٹریلیا میں ساٹھ ہزار سالوں سے آباد ایب اوریجن قوم پر لکھی گئی کتابوں کے بھی درشن ہوئے۔ شروع شروع میں ان کتابوں کا سرسری سا جائزہ لیتا رہا پھر تجسس نے سر اُبھارا تو اس قوم کی تاریخ کا دلجمعی سے مطالعہ شروع کیا۔ ابتدا میں صرف اس قوم کی تاریخ سے دلچسپی رہی لیکن جب مطالعہ کچھ وسیع ہوا تو میں ایب اوریجن کی کہانی سے بھی آگے

بڑھتا چلا گیا کہ آسٹریلیا ہے کیا؟

آسٹریلیا کی سرزمین تو ازل سے ہی قائم تھی مگر انسان نہ تھے، انسانی قدم انڈونیشیا کے جزائر سے اس طرف بڑھے اور یہی یہاں کے قدیم باشندے قرار پائے۔ بعد میں انہیں ایب اوریجن قوم کہا گیا۔ ان لوگوں کی آمد تب شروع ہوئی جب آئس ایج کا زمانہ باقی تھا۔ پوری دنیا برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔

یاد رہے کہ آئس ایج کو ختم ہوئے بھی 15 ہزار سال ہو چکے ہیں مگر یہ سرزمین باقی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ یہ دورانیہ تقریباً ساڑھے چار سو سال پر محیط ہے۔ ویسے جنوب میں کسی طلسماتی جزیرے کا ذکر قصے کہانیوں میں موجود تھا۔ چین، ہندوستان اور عرب میں ایک عجیب و غریب سرزمین کی کہانی سنائی جاتی رہی تھیں کہ اس طلسماتی جزیرے کی مٹی سونے کی ہے۔ وہاں پریاں رہتی ہیں، بھوت پریت اور چڑیلیں ہیں۔ وہاں جابر عورتیں حکومت کرتی ہیں۔

آسٹریلیا جنوب کے پانیوں میں تن تنہا ہے سب سے چھوٹا براعظم اور سب سے بڑا جزیرہ ہے اس کی زمینی سرحد کسی بھی ملک سے نہیں ملتی۔ اس کا سب سے قریبی ہمسایہ ملک شمال میں تیمور ہے جبکہ مغرب میں براعظم افریقا ہے اسی لیے اسے لونلی پلانٹ بھی کہتے ہیں۔

ڈھونڈنے والوں نے اس سرزمین کو سولہویں صدی میں تلاش کیا۔ جب اس تلاش کی خبر یورپی ممالک میں پھیلی تو وقفے وقفے سے جہاز راں یہاں آنے لگے لیکن وہ ٹھہرتے نہیں، واپس چلے جاتے تا آنکہ اٹھارویں صدی کی آخری دہائی سے کچھ قبل برطانوی جہاز راں جیمس کک یہاں پہنچا تو برطانیہ کی لاٹری نکل آئی۔ برطانیہ کو ان دنوں اپنے مجرموں کے ٹرانسپورٹیشن میں مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اب تک وہ اپنے جرائم پیشہ اور سزایافتہ مجرموں کو امریکا بھیجا کرتا تھا۔ لیکن امریکا آزاد ہو گیا تھا اور اس نے برطانوی مجرموں کو اپنے یہاں رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ آسٹریلیا کی صورت میں برطانیہ کو متبادل جگہ مل گئی۔ چنانچہ 80 سالوں تک وہ مجرموں کو یہاں بھیجتا رہا۔ یہاں مجرموں اور قیدیوں کے لیے کالونیاں بنائی گئیں اور دیکھ بھال و انتظامی امور کے لیے عملہ اور گورنروں کو مقرر کیا گیا۔

انیسویں صدی کے نصف میں یہاں بے تحاشا سونے کی کانیں دریافت ہوئیں اور 50 سالوں کے اندر اندر ہزاروں ٹن سونا نکالا گیا۔ سونے کی دریافت کا سن کر لوگوں کا یہاں تانتا بندھ گیا۔ چنانچہ لاکھوں کی تعداد میں طالع آزما یہاں آ پہنچے اور یوں ایک غیر آباد بستی آباد ہوتی چلی گئی۔ 1945ء سے 1980ء تک 52 لاکھ سے زیادہ لوگ یہاں آئے ان میں اکثریت برطانیہ، اٹلی، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک کی ہے۔ ان کے علاوہ بھی 140 مختلف ممالک سے لوگ آ کر آباد ہوئے۔

1850ء میں کراچی کی بندرگاہ سے 3 اونٹ اور چند پٹھان بھی یہاں لائے گئے۔ ان کی جفاکشی دیکھ کر قندھار اور بلوچستان سے مزید اونٹ اور پٹھان منگوائے گئے۔ چونکہ آسٹریلیا کا وسطی اور جنوب مغرب کا ایک بڑا حصہ خشک ریگستانی اور چٹیل ہے، ان اونٹوں کے کارواں کو سواری، سامانِ رسد اور بار برداری کے لیے ضروری سمجھا گیا اور ایک کالونی سے دوسری کالونی تک سامان لانے لے جانے کا کام انہیں سونپا گیا۔ یہ لوگ افغان سے غان کہلانے لگے۔ آدھی صدی سے زیادہ عرصہ وہ اپنے کام سے لگے رہے اور جب ٹرین کی آمد ہوئی تو انہی کے ٹریک پر لائنیں ڈالی گئیں اور ٹرین کا نام غان ٹرین رکھا گیا جو 1980ء تک قائم رہا۔ یہ پٹھان جن جگہوں پر رہے وہاں کچی مسجدیں بھی بنائیں۔

آسٹریلیا میں سب سے پہلی مسجد ریاست جنوبی آسٹریلیا میں Marree کے مقام پر تعمیر ہوئی۔ یہ 1861ء کا زمانہ تھا، ایک مسجد 1890ء میں جنوبی آسٹریلیا کے صدر مقام ایڈیلیڈ میں تعمیر ہوئی، یہ مسجد اب شاندار پکی مسجد ہے۔ ایک مسجد Marree سے شمال مشرقی ریاست نیو ساؤتھ ویلز کے Broken Hill میں 1891ء میں بنائی گئی۔ گویا ڈیڑھ صدی قبل اس ملک میں ہمارے بھائی بند پہنچ کر اپنا مقام بنا چکے تھے اس لیے اس ملک کو ایک نظر دیکھنے کا شوق عرصے سے تھا یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی موقع ملا، اس سفر پر روانہ ہو گئے۔

یہ سفر کتنا پُرلطف تھا، لگے ہاتھوں اس کا ذکر بھی کرتا چلوں۔

وہ دن 14 اگست 2005ء کا تھا جب ہماری صبح ملبورن ائرپورٹ پر ہوئی۔ 12 اگست کی شب کراچی سے اہلیہ کے ساتھ ہم ملبورن کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ جہاز نے ہمیں دوسرے دن صبح بنکاک پہنچایا۔ وہاں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا رکنے کے بعد دوپہر کو ہانگ کانگ پہنچے۔

جہاز سے اُتر کر لاؤنج پر جانا تھا جو اوپر کی منزل پر تھا۔ یہاں بھی بخشا نہیں گیا۔ بہرحال نام کے لیے ہی باڈی سرچ اور آئرن بار کے دروازے سے گزر کر کھڑا ہوا تو ارشاد ہوا کہ اوپر لاؤنج پر تشریف لے جائیں۔ ہینڈ کیری بیگ کندھے سے لٹکایا اور دوسرے کندھے پر اہلیہ کا بیگ لیا اور ہم لوگ خودکار سیڑھی کے ذریعہ اوپر پہنچے۔ اوپر پہنچے تو لاؤنج اچھا کھلا کھلا سا لگا۔ ائرپورٹ پر ہوائی جہازوں کو پرواز کرتے اور اُترتے دیکھ سکتے تھے۔ لاؤنج کی چوڑائی زیادہ نہیں تھی لیکن لمبائی کہ بس دیکھتے رہ جائیں۔ ایک لمبا سیدھا پلیٹ فارم تھا اور بہت آگے جا کر سیدھے ہاتھ کو مڑتا تھا۔ پلیٹ فارم کے درمیان میں خودکار زینے تھے چاہیں تو قدموں سے چل کر جائیں، چاہیں تو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے راستہ طے کریں۔

لاؤنج کے پلیٹ فارم میں جگہ جگہ پر کرسیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ ڈیرہ جمایا اور اطمینان کا سانس لیا۔ ہر تھوڑی دوری پر ٹائلٹ بنے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے تازہ دم ہو کر سوچا کہ پہلے کچھ کھا پی لیا جائے۔ اہلیہ نے بتایا کہ دو پراٹھے اور بھنا گوشت ٹفن کیریئر میں ہے بس پینے کے لیے پانی لے آئیں۔ میں نے آدھے لاؤنج کا چکر لگایا لیکن پینے کے پانی کا کوئی نلکا یا کوئی اور بندوبست نظر نہیں آیا۔ عجیب کوفت ہوئی۔ چند سے پوچھا تو کورا جواب ملا "معلوم نہیں۔" دل کہتا تھا کہ اب ایسا بھی کیا ہے کہ اتنے بڑے لاؤنج میں پینے کے لیے پانی کا بندوبست نہ ہو لیکن دیکھتی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ سوچا کہ یہاں بوتل ہی کے پانی سے کام چلتا ہے۔ چلتے چلتے ایک طرف کو گیا چند دکانیں تھیں۔ ایک دکان میں چینی گڑیا سے پوچھا تو اس نے جھٹ سے ایک چھوٹی بوتل نکالی اور کاؤنٹر پر رکھ دی۔ پوچھا کتنے پیسے؟ جواب ملا، 2 یوایس ڈالر۔ میں نے سوچا کہ میرے سننے میں غلطی ہوئی ہے تو پھر پوچھا۔ اس بار اس نے دو انگلیاں دکھا کر کہا 2 ڈالر یو ایس مجبوراً ہانگ کانگ کا تبرک لیا اور دو ڈالر کاؤنٹر پر رکھ کر واپس ہوا۔ راستے میں مجھے کسی کی... کسی فلم میں مرحوم رنگیلا کا تکیہ کلام تھا کہ 3 سال تک ہانگ کانگ کے نلکے کا پانی پیا ہے۔ رنگیلا مرحوم نے بھی ائرپورٹ سے باہر سڑک پر لگے نلکے کا پانی پیا ہوگا۔ واپس اہلیہ کے پاس پہنچا تو ساتھ لائی ہوئی جائے نماز پکڑے کھڑی تھیں، کہنے لگیں۔ "پہلے ظہر کی نماز پڑھ لی جائے۔" میں نے تائید میں گردن ہلائی اور متبرک پانی کی بوتل بیگوں کے پاس رکھ دی۔ بوتل پر نظر پڑی تو اہلیہ نے کہا کہ بڑی بوتل لے آتے۔ میں نے جواب میں کہا کہ یہ تبرک ہے، بس دو گھونٹ پر گزارہ کرنا ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے... کہ 120 روپے کا پانی ہے۔ بھوک کوئی خاص نہیں تھی مگر پیٹ پوجا کیے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ خیر سوچا نماز اور

مشاہیر عالم کی نظر میں اسلام
حضور اکرمؐ کی شخصیت

جارج برنارڈ شا:

دین محمدیؐ اپنی حیات آفرینی کے باعث میری نظر میں ہمیشہ قابلِ تکریم رہا ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس میں تغیرات عالم کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت دکھائی دیتی ہے اور جو ہر دور میں جاذبِ توجہ ہے۔

میں نے دین محمدیؐ کے بارے میں یہ پیشگوئی کی ہے کہ جس طرح دورِ حاضر کا یورپ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے، اسی طرح مستقبل میں یہ سب کے لیے قابلِ قبول ہو جائے گا۔

جان ولیم ڈریپر:

جسٹینین کی موت 569ء میں ہوئی اس کے چار سال بعد عرب میں مکّے کے مقام پر وہ انسان پیدا ہوا جس نے بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ نسلِ انسانی کو متاثر کیا۔

اے آر گب:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ کی اصلاحات سے عورت کا عام رتبہ بہت بلند ہو گیا۔

اے جے ٹائن بی:

اہلِ اسلام میں نسلی منافرت کا عدم وجود اسلام کا ممتاز ترین کارنامہ ہے اور عصرِ حاضر کے حالات کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کی اس خوبی کی نشر و اشاعت کی جائے۔

لامارٹین:

اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی کمی اور حیرت انگیز نتائج، نابغۂ انسانی کے تین معیار تسلیم کر لیے جائیں تو تاریخ حاضر کی کون سی عظیم ہستی ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں پیش کرنے کی جرأت کی جا سکتی ہے؟ فلسفی، خطیب، مقنن، سپہ سالار، جس نے افکار و تصورات کو تسخیر کیا، جس نے ایسے عقائد دیے جو عقل و استدلال کی میزان پر پورے اُترتے ہوں، جس نے وہ مذہب عطا کیا جس میں اصنام کا وجود تک نہیں، جس نے بیس ارضی سلطنتوں اور ایک روحانی سلطنت کی اساس رکھی۔ یہ ہیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم پوچھتے ہیں کہ کون سا انسان ہے جسے عظمت انسانی کے کسی بھی معیار کی رو سے آپ سے عظیم تر قرار دیا جا سکے؟

انتخاب: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

کھانے سے فارغ ہوکر آرام سے سگریٹ کا کش لگاؤں گا۔
ہم دونوں نے قصر نماز ادا کی اور روٹی کھا کر دو دو گھونٹ پانی پی کر ''سیر'' ہوگئے۔ کھانا کھاتے وقت اِدھر اُدھر دیکھا تو کسی مسافر کو بھی سگریٹ نوشی کرتے نہیں پایا۔ میں سمجھ گیا یہ نو اسموکنگ زون ہے۔ ذرا ٹہل کر دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی بورڈ آویزاں ہوگا لیکن کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ شیشے کا ایک الگ تھلگ کمرا نظر آیا جہاں بند ہوکر لوگوں کو سگریٹ نوشی کرتے دیکھا۔ میں بھی دروازہ کھول کر اندر چلا گیا اور اندر شیشے کے پاس کھڑے ہوکر سگریٹ پینے لگا۔ کمرے میں مردوں کے علاوہ تین لڑکیاں بھی تھیں جو شوق پورا کررہی تھیں۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ ''چھپ'' کے پینے سے بہتر ہے کہ نہ پیئوں۔ بس جہاز پر سوار ہونے سے قبل ایک بار اور آؤں گا اور بس۔

واپس آیا تو اہلیہ کو کرسیوں پر نیم دراز پایا۔ میں بھی الگ جاکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کراچی چھوڑے ہوئے ابھی وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ خیال گھر کی طرف چلا گیا، کچھ گھنٹے پہلے ائر پورٹ پہنچے تھے۔ وہاں یاد آیا کہ سوٹ کیسوں کی چابیاں گھر بھول آیا ہوں۔ چابیوں کے ہینگر میں لٹکتی رہ گئی ہیں۔ جان پدر شکیل نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں، میں گھر سے چابی لے آتا ہوں۔'' ہاں نا میں وہ نکل گئے۔ گلستان جوہر ہی تو جانا تھا۔

کچھ دیر جب ہوگئی تو دوسرے بچوں نے جو خدا حافظ کہنے آئے تھے، سچ مچ کا خدا حافظ کہہ کرائر پورٹ کے اندر بھیج دیا۔ اندر پہنچے تو دیکھا مجمع نہیں ہے۔ اِکّا دُکّا لوگ کاؤنٹر اور لائن میں ہیں۔ خود ہم دونوں چیکنگ بار سے گزر گئے۔ ٹرالی کا سامان بھی گزر گیا۔ ٹرالی مین ساتھ تھا۔ آگے بڑھے، دو صاحبان ایک کاؤنٹر پر کھڑے تھے، ان میں جو سینئر تھے انہوں نے السلام علیکم کہا۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ ٹکٹ اور پاسپورٹ لیا، دیکھا اور واپس کرتے وقت پوچھا۔ ''آسٹریلیا کیوں جارہے ہیں؟'' بتایا وہاں صاحبزادے رہتے ہیں، گھومنے جارہے ہیں۔ پھر میں نے گزارش کے انداز میں کہا کہ ہمارا سامان سیدھا ملبورن ائر پورٹ پر اُتارا جائے۔ انہوں نے جواب میں کہا۔ ''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا، اطمینان سے سفر کریں۔''

میں نے مزید کہا کہ میں چابیاں گھر چھوڑ آیا ہوں، اگر بکس کھول کر سامان چیک کرنا ہو تو ذرا توقف سے کام لیں گے۔

انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔ ''ضرورت نہیں پڑے گی۔''

میں نے دل کو تسلی دی کہ اب ملبورن ائر پورٹ پر ضرورت پڑی تو تالا توڑ دیں گے۔ نماز پڑھنے کی جگہ نظر آئی تو ہم دونوں عشا کی نماز پڑھنے چلے گئے۔

نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا PIA کا ایک پورٹر مجھے تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے اسے دیکھا اور مسکرادیا پھر اُٹھ کر قریب آگیا، وہ بولے ''آپ......!'' میں نے جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی اپنا نام بتایا اور چونکہ چابیوں کا گچھا میں نے دیکھ لیا تھا لہٰذا چابیاں لے کر شکریہ ادا کیا۔ میں فون کرکے کنفرم کردینا چاہتا تھا۔ ایک صاحب PCO لگائے بیٹھے تھے، وہاں سے فون کیا اور بتادیا۔ پھر میں نے پوچھا ''چابی لانے والے کو کچھ......'' میرا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ جواب میں بتایا گیا کہ مجھے کچھ نہیں دینا ہے۔ اب صرف خدا حافظ ہی کہنا باقی تھا، سبھوں کو ہم دونوں کی طرف سے خدا حافظ اور تمام آنے والوں کی طرف سے بھی خدا حافظ کہا گیا۔ ٹیلی فون کا بل 2 منٹ کی گفتگو کا ایک سو روپیہ، خیر مجبور کو سبھی لوٹتے ہیں۔ میں نے ادا کردیا لیکن ذرا تنبیہ بھی کی تو صاحب بُرا مان گئے اور بک بک کرنے لگے۔ ایک اور صاحب کہیں سے آگئے۔ مجھ سے احوال پوچھا۔ میں نے جو بات تھی بتادی۔ وہ صاحب فون والے کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے اور پھر سو کی جگہ پچاس روپے پر بات ختم ہوگئی۔

عصر کے وقت عصر کی قصر ادا کی۔ کسی کسی گیٹ کے کاؤنٹر پر اب ذرا چہل پہل زیادہ نظر آنے لگی تھی۔ پلیٹ فارم کے دونوں طرف کے گیٹوں پر بھی لوگ جمع تھے۔ میں نے کارڈ پر کتنا اس کے گیٹ کا نمبر نہیں پڑھا تھا۔ اس لیے کہ سامنے ہی ایک گیٹ کے کاؤنٹر پر ملبورن لکھا ہوا دیکھا تو سمجھا کہ اسی گیٹ سے گزر کر جہاز پر جانا ہے۔ کچھ دیر بعد سگریٹ کا کش لگا کر واپس آیا تو سامنے کاؤنٹر پر عملہ پہنچ چکا تھا اور مسافر بھی اکھٹا ہونے لگے تھے۔ ہم دونوں نے بھی بیگ اُٹھائے اور مجمع میں شامل ہوگئے۔ کاؤنٹر کھلا تو لوگ لائن میں لگ گئے، ہم بھی لائن میں آگے بڑھتے رہے۔ اپنی باری پر اطمینان سے کارڈ حوالے کیا۔ ایک خاتون جلدی جلدی کام نمٹا رہی تھیں۔ ایک کارڈ پنچ ہوگیا تو نہ جانے کیا خیال کیا اور دوسرا کارڈ پڑھنے لگیں۔ جلدی سے پہلا کارڈ بھی واپس کیا اور کہا کہ یہ گیٹ نہیں ہے۔ میں اُلجھن میں پڑ گیا دوسرے صاحب جو کاؤنٹر پر موجود تھے، ان سے کہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا، آگے ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایک خاتون تھی اس نے کہا کہ آئیں، میرے ساتھ...... جلدی کریں، وقت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر تیزی سے ایک طرف کو چل پڑیں۔

میں بھاری بیگ اُٹھائے اس کے پیچھے دوڑا اور اہلیہ سے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلتی آئیں۔ وہ مجھ سے آگے تھی، کافی آگے جاکر وہ مڑ گئی اور جب میں وہاں پہنچا تو وہ نظروں سے اوجھل ہوچکی تھی۔ میں نے مڑنے سے قبل پلٹ کر اہلیہ کو دیکھا اشارے سے اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر میں آگے بڑھا۔ اس خاتون کو آگے ایک جگہ کھڑے پایا۔ خیر سے جب کاؤنٹر پر پہنچے تو خود ہی خاتون نے پنچ کیے ہوئے بورڈنگ کارڈز ہاتھ میں تھمائے اور کہا کہ جلدی جائیں۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سرنگ نما گلیارے میں داخل ہوکر جہاز پر سوار ہوگئے۔

اطمینان کرنے کے بعد آس پاس نظریں دوڑائیں۔ اب گورے پسنجروں کی تعداد زیادہ تھی۔ جہاز کے اندر کی فضا بدل گئی تھی۔ ہمیں احساس ہوگیا کہ اب ہم ''مشرق'' سے ''مغرب'' میں آگئے۔ میزبانی کا شرف اب گوروں اور گوریوں کو حاصل ہے۔ جہاز کو سوا چھ بجے پرواز کرنا تھا لیکن تاخیر ہوتی رہی۔ جہاز بہت بڑا تھا لیکن مسافروں کی تعداد کم تھی۔ خدا خدا کرکے پرواز کی باری آئی۔ گھڑی کا وقت تبدیل نہیں کیا تھا۔ ہانگ کانگ کے وقت کے مطابق رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کی ٹرے ملی۔ پورے جہاز میں ہم میاں بیوی واحد پسنجر تھے جنہیں سب سے پہلے کھانے کا سامان ملا۔ تعجب ہوا کہ ایسا کیوں ہے، کھانے کے ڈبے پر نظر پڑی تو انگلش میں لفظ حلال لکھا ہوا نظر آیا۔ بات یہی سمجھ میں آئی کہ ڈبے بدل نہ جائیں اس لیے ہمیں نمٹا یا گیا۔ کھا پی کر اطمینان کیا اور وضو کرکے مغرب اور عشا کی نمازیں بیٹھے بیٹھے ادا کیں۔ ٹیک لگا کے سونے کی کوشش کی اور اونگھتے، سوتے جاگتے سفر جاری رہا۔ سیٹیں خالی پڑی تھیں کچھ لوگ دو دو تین تین سیٹوں پر لمبا لیٹے تھے۔

جب ناشتا ملنے لگا تو گھڑی دیکھی، صبح تو نہیں ہوئی تھی شاید ہم آسٹریلیا کے اوپر محو پرواز تھے۔ خیر ناشتا کیا، وہی حلال ڈبا سب سے پہلے ہمیں ملا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد نمازِ فجر ادا کی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہم ملبورن کے ہوائی اڈے پر اُتر رہے تھے۔ ملبورن کے ائر پورٹ پر ایک بڑے ہال میں چند کاؤنٹر لگے ہوئے تھے۔ لوگ لائن میں کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم میاں بیوی بھی ٹرالی دھکیلتے ہوئے لائن میں لگنے جارہے تھے کہ ایک یونیفارم میں ملبوس افسر نے روکا اور پوچھا ''ڈیکلریشن کارڈ پُر کرلیا ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہوتا ہے؟'' تو اس نے ایک الگ تھلگ کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا بہت سارے کارڈز رکھے ہوئے ہیں۔ ایک کارڈ اُٹھایا تو معلوم ہوا کہ ٹک لگا کر اسے پُر کرنا ہے جس میں مختلف قسم کی چیزوں کی ڈکلریشن کا اندراج تھا۔ اس میں ایک خانہ یہ بھی تھا کہ کھانے پینے کی کوئی چیز ساتھ لائے تو نہیں؟ ہم نے دونوں کارڈز پر ''نہیں'' کا ٹک لگایا اور کاؤنٹر کی طرف چل دیے۔ کاؤنٹر اب قریب قریب خالی پڑا تھا۔ ہمارے کاغذات چیک کیے گئے اور OK کردیا۔

آگے بڑھے تو سامان کنویر بیلٹ پر ڈالا اور دوسری طرف سے نکال لیا۔ کاؤنٹر پر دو اشخاص ڈیوٹی پر تھے۔ آخری گھڑی میں ایک نے اہلیہ کا پرس کھولنے کو کہا تو اس میں سے 5/4 لیموں نکلے۔ اس نے کہا کہ یہ کھانے کی چیز ہے۔ کارڈ پر آپ نے ڈکلیئر کیا ہے کہ کھانے پینے کی کوئی شے نہیں ہے۔ جواب دیا کہ یہ کھانے کی تو ہے لیکن یہ تو قدرتی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ضبط ہوگا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''آپ کے بیگ میں کوئی پھل وغیرہ تو نہیں؟''

1928ء میں ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا تو راجا محمود آباد نے میرے کان میں کہا کہ اب ہم بائیکاٹ کے مظاہرے کے لیے کوئی نیا طریقہ سوچیں۔ ہم نے طریقہ سوچ لیا۔ ہم نے ''سائمن واپس چلے جاؤ'' کے پوسٹر لکھ کر غباروں اور پتنگوں کے ساتھ باندھے۔ لکھنو کے تعلق داروں نے کمیشن کے افراد کو قیصر باغ میں چائے کی دعوت دی تھی۔ جب وہ لوگ باغ میں چائے پی رہے تھے تو میں نے اپنے مکان کی چھت سے پتنگ بڑھانے شروع کیے۔ پھر غبارے اڑا دیے۔ اتفاق سے ہوا کا رُخ موافق تھا۔ غبارے مہمانوں کے درمیان جاگرے۔ جب پتنگیں مطلوبہ بلندی تک بڑھیں تو میں نے ڈوریں کاٹ دیں اور یہ بھی مہمانوں میں جاگریں۔ تعلقدار تو بہت گھبرائے لیکن کمیشن کے برطانوی ممبروں نے اس دلچسپ طریقۂ احتجاج سے بہت لطف اُٹھایا۔ شام کو پولیس میرے دروازے پر کھڑی تھی لیکن ان کے پاس وارنٹ نہیں تھے۔ میں نے مزاحمت کی اور وہ وارنٹ لینے چلے گئے لیکن لوٹ کے نہ آئے۔

اقتباس: چوہدری خلیق الزماں، بقلم خود
مرسلہ: نعمان فیض پوری، جہلم

اب جھوٹ کیا بولتا، بتایا کہ تین کلو آم ہیں۔اس نے وہ بھی نکلوا لیے، اللہ اللہ خیر صلا۔ٹرالی دھکیلتے ہوئے باہر نکلے تو سامنے ہی بیٹے اور بہو کو دیکھا۔

ائرپورٹ شہر سے 30/25 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ائرپورٹ سے باہر نکلے تو سردی کا احساس ہوا تھا۔ہماری یوم آزادی کی صبح یعنی 14 اگست کی صبح ہم ملبورن میں تھے۔

ملبورن کے بارے میں میرا پہلا تاثر عین خوشگوار احساسات کا حامل رہا۔ائرپورٹ سے گھر تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا۔راستے میں ہریالی اور ترتیب سے تراشے ہوئے سبزہ زاروں نے دل موہ لیا۔کشادہ سڑکیں، بیچوں بیچ چوڑی سفید پٹیاں اور چوڑی پٹیوں کی دائیں اور بائیں جانب وو دو تین تین گاڑیوں کی آمد ورفت کے ٹریکس۔ان کے بعد ایک ایک کم چوڑی پٹی جو سائیکل سواروں کے لیے، پھر دونوں جانب ایک اور سفید پٹی جہاں کاریں کھڑی کی جاسکتی ہیں۔اس پٹی کے ساتھ گرین بیلٹ جس پر گھاس لگی ہوئی تھی اور چھوٹے درخت،اس کے بعد فٹ پاتھ اور فٹ پاتھ کے بعد رہائشی مکانات کی باﺅنڈری وال۔باﺅنڈری وال کے اندر بھی سبزہ اور پھول کے پودے لگے ہوئے تھے، سارے مکانات ایک سیدھ میں، ایک ہی طرح کے دکھائی دے رہے تھے۔لال اینٹوں کی دیواریں اور لال ٹائلز کی چھتیں۔

میں اپنے بیٹے کے پاس کوبرگ کے علاقہ میں رہائش پذیر ہوا۔مکان کے سامنے بیرواسٹریٹ ہے جو بل اسٹریٹ سے ملتی ہے۔ بل اسٹریٹ لمبی شاہراہ ہے جو مشہور سڑک سڈنی روڈ کو کراس کرتے ہوئے گزرتی ہے۔

یہاں سردیوں کا موسم اپریل سے شروع ہوجاتا ہے اور اگست تک رہتا ہے۔چنانچہ جاتی سردیوں میں ہم ملبورن میں تھے لیکن ان جاتی ہوئی سردیوں میں بھی لحاف کے اوپر کمبل اور ہیٹر جلا کر رات کو سونا پڑتا تھا۔ہم جیسے لوگوں کے لیے وہاں مئی اور جون کی سردیاں گزارنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔اوپر سے گرج چمک کے ساتھ بارش۔اگرچہ بارشیں لگاتار نہیں ہوتی تھیں لیکن جتنی دیر بھی رہتیں موسم کو اور بھی سرد بنا دیتی تھیں۔بارش کا یہاں کوئی خاص موسم نہیں، کبھی بھی کسی بھی وقت بارش ہوسکتی ہے۔ستمبر کی پہلی تاریخ سے موسم بہار شروع ہوجاتا ہے لیکن سردی دسمبر تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ویسے وہاں کے لوگوں کے لیے 30 ڈگری گرمی شدید گرمی ہوتی ہے۔لوگ گھر چھوڑ کر ساحلوں، جھیلوں اور فارم ہاﺅس کی طرف نکل پڑتے ہیں۔30 ڈگری سے زائد گرمی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔صرف ان کے لیے ہی نہیں بلکہ نباتات کے لیے بھی۔میرے قیام کے دوران کئی بار مضافات کی جھاڑیوں اور جنگلوں میں خطرناک آتشزدگی کے حادثات رُونما ہوچکے تھے۔احتیاطاً شہر کے اندر گھاس پھوس کو کاٹ کاٹ کر برابر کرتے رہتے ہیں ورنہ خود بہ خود آگ لگ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔گھروں اور گھروں کے سامنے گرین پلیٹ کی گھاس کی کاٹ چھانٹ کی ذمے داری مکینوں پر ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر گھر میں گھاس کاٹنے کی مشین ضرور ہوتی ہے۔

ملبورن نام ہے ایک صاف ستھرے خوبصورت مقام کا، جگمگاتی جھلملاتی روشنیوں کا۔بادلوں، بارشوں اور ٹھنڈی ہواؤں کا۔یہ شہر ہے سرسبز وشاداب مناظر کا۔خوبصورت رنگ برنگے پھولوں، پودوں اور درختوں کا۔خوبصورت پرندوں کا۔ بڑے بڑے باغوں پارکوں کا، جھیلوں کا، سرسبز وادیوں کا۔دنیا کے 140 ملکوں سے آکر بس جانے والے گورے، سانولے اور کالے لوگوں کا۔ان کی تہذیبوں ثقافتوں، روایتوں، زبانوں اور مذاہب کا۔امن پسند، صلح جو، اپنے کام سے کام رکھنے والے شہریوں کا۔ملکی قوانین کی حددرجہ پاسداری کرنے والے اصول پسند اور ترقی یافتہ لوگوں کا۔

قدم قدم پر تھانے نظر نہیں آتے، نہ ہی کہیں پولیس کی ٹوپی نظر آتی ہے اور نہ ٹریفک پولیس۔لگتا ہے پورا شہر ایک خودکار نظام کے تحت چل رہا ہے جہاں روزمرّہ کے تمام کام ایک اصول، سلیقے اور خوبصورت طریقے سے انجام پذیر ہورہے ہیں۔ایسے شہر اور شہر کے ماحول میں کس کا جی یہاں رہنے کو نہیں چاہے گا۔ 1991ء کے ایک بین الاقوامی سروے کے مطابق اس شہر کو دنیا کا "Most Livable City" کا خطاب ملا تھا۔

یہ شہر ریاست وکٹوریہ کا صدر مقام ہے۔ملکہ وکٹوریہ کے نام پر ریاست کا نام وکٹوریہ پڑا۔ملکہ کا وزیراعظم ملبورن ایک لائق وزیراعظم تھا اور ملکہ کا اتالیق بھی، اسی کے نام پر یہ خوبصورت شہر ملبورن ہے۔

ملبورن مشرقی سمندر سے قریب آسٹریلیا کے جنوب میں Port Philips Bay کے کنارے واقع ہے دریائے یارا کوہ اعظم فاصل کے جنوبی پہاڑی سے شروع ہوکر تقریباً 240 کلو میٹر کا راستہ مغرب اور پھر جنوب طے کرتا ہوا ملبورن سے گزرتا ہوا Port Philips Bay میں گرتا ہے۔یہ شہر دریائے یارا کے دونوں طرف آباد ہے۔ملبورن ایک مصروف بندرگاہ بھی ہے جہاں جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے لیے بہت سے گھاٹ ہیں اور بند بنے ہوئے ہیں۔

ملبورن شہر کے مضافات کا پھیلاؤ شمال کی جانب 70 کلو میٹر اور مشرق سے مغرب کی طرف 50 کلو میٹر تک ہے۔یہ پھیلاؤ ایک عظیم آسٹریلیا کے خواب کو پورا کرتا ہے جہاں ہر شخص کو رہنے کے لیے اپنا گھر ملے۔ابھی اس کی آبادی کا تناسب ایک ایکڑ اراضی پر صرف 16 نفوس پر مشتمل ہے۔اس کے مقابلے میں پیرس اور لندن میں ایک ایکڑ میں بالترتیب 48 اور 56 افراد اوسطاً آباد ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ 1835ء میں ایک تجارتی انجمن کے سربراہ جان بیٹ نے 2 لاکھ 2 ہزار ایکڑ زمین ایک ایب اوریجن کنبے سے محض چند کمبلوں کے جوڑے، چھری چاقو اور قینچیوں، عینکوں، تولیہ، کپڑوں اور پچاس پونڈ آٹے کے عوض حاصل کیا تھا۔شروع میں ملبورن کی آبادی دریائے یارا کے شمال مشرقی کنارے پر آباد ہوئی جو، اب ملبورن سٹی کہلاتا ہے بعد میں دوسرا کنارا آباد ہوا جو زیادہ تر رہائشی علاقہ ہے۔ دریائے یارا کے دونوں کناروں کو ایک خوبصورت آہنی پل ملاتا ہے۔

ملبورن کی آبادی تقریباً 35 لاکھ ہے۔جو مختلف نسلوں، قومیتوں، مذہبوں اور تہذیبوں کے حامل لوگوں کی ہے۔اس آبادی میں 25 فیصد وہ لوگ شامل ہیں جن کی پیدائش اس سرزمین پر نہیں ہوئی ہے۔ایب اوریجن کی آبادی اس ریاست میں 20 ہزار اور ملبورن میں 12 ہزار کے قریب ہے جو اپنی کمیونٹی سینٹر میں الگ تھلگ رہتے ہیں۔ملبورن شہر میں مختلف نسلی گروپ کی آمد سے یہاں 42 فی صد لوگوں کی گھریلو زبان انگلش نہیں بلکہ ان کی اپنی مادری زبان ہے۔

ملبورن سٹی تجارتی مرکز ہے۔یہاں بلند و بالا اسکائی اسکریپرز، ٹاورز اور گلاس ہاؤسس ایستادہ ہیں۔ Rialto Tower کرہ جنوب میں کوالالمپور کی جڑواں عمارت Petronas کی تعمیر سے قبل سب سے بلند عمارت تھی۔ اپنے ڈیزائن اور شیشے کی دیواروں کی وجہ سے یہ عمارت دیکھنے کے لائق ہے۔یہ جڑواں ٹاور ہے۔ایک میں 55 منزلیں اور دوسرے میں 40 منزلیں ہیں۔نیچے 5 منزلہ تہ خانے میں انڈر گراؤنڈ پارکنگ لاٹ ہے۔اوپر 55 ویں منزل میں Observation ڈک ہے اور چھت پر کمنی کیشن سینٹر قائم ہے۔Collins اسٹریٹ جو ایک مصروف تجارتی سینٹر ہے اسی اسٹریٹ پر یہ ٹاورز بنائے گئے ایک اور بلند رہائشی ٹاور ہے۔یہ 91 منزل عمارت تمام کی تمام تر رہائشی ہے اور رہائشی اعتبار سے دنیا میں سب سے بلند عمارت ہے۔ان کے علاوہ اور بھی کمرشل بلند و بالا عمارتیں ہیں۔ دور سے یوں لگتا ہے کہ تمام بلند و بالا عمارتیں ملبورن سٹی کے ایک کونے میں ایستادہ ہیں۔ یہیں پر Crown انٹرٹینمنٹ کمپلکس ہے جس میں ہوٹل ریسٹورنٹ اور کسینو ہیں۔ کسینو میں تین سو میزیں ہیں اور دو ہزار [illegible] جوئے کی مشینیں ہیں۔ایک سینما ہال، [illegible] خانے اور شاپنگ سینٹر بھی ہیں۔

دریائے یارا کے شمال میں [illegible]
سے قریب دریا [illegible] [illegible]
میٹر لمبا اور پانی کی سطح [illegible]
ملبورن کے اندرونی شہر [illegible]
اور سڑکوں کے ذریعے اس شہر کے مغرب میں [illegible]
[illegible] اور 80 کلو میٹر دور جنوب مغرب میں Geelong سٹی تک بہ آسانی آمدورفت کا ذریعہ بناتا ہے۔یہ پل Westgate پارک کے اوپر سے گزرتا ہے جو ایک بڑا تفریحی مقام ہے۔

دریائے یارا پر ایک اور پُل ہے جس کا نام Bolte Bridge ہے۔اس کے نیچے ایک سرنگ ہے جو پانی کے اندر راستہ بناتی ہے۔اس پُل کے اوپر سے گزرتے وقت 2 ڈالر ٹیکس دینا پڑتا ہے۔پُل کے اوپر ہی کیمرا اور مشینیں نصب ہیں اور گزرنے والی گاڑیاں ایک مخصوص کارڈ کو گزرتے وقت اپنی کار کے ونڈ اسکرین سے لگاتی ہیں۔ایک Beep کی آواز ہوتی ہے گویا ٹیکس منہا ہوگیا جو

> ## مشاہیر عالم کی نظر میں اسلامؐ
> ## حضور پرنور کی شخصیت
> ### معروف مفکر باسورتھ اسمتھ کا خراج عقیدت
>
> آپ کے اخلاص کا سب سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے؟ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخر تک اپنے لیے اسی ٹائٹل (یعنی پیغمبری) کا دعویٰ کیا جس سے انہوں نے ابتدا کی تھی اور جسے بلند و بالا فلسفہ اور سچی ترین عیسائیت بھی قبول کرتی ہے، مجھے پورا یقین ہے، ایک دن سب اتفاق کرلیں گے کہ آپ پیغمبر ہیں، خدا ہی کے پیغمبر۔
>
> انتخاب: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

تنخواہ سے یا بینک اکاؤنٹ سے وصول ہو جاتا ہے۔

ملبورن شہر میں بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز اور سپر اسٹورز اور شاپنگ سینٹرز قائم ہیں۔

شاپنگ سینٹرز میں North land, Target, High point اور Mayer, chadstone شاپنگ سینٹرز قابلِ ذکر ہیں۔ سپر اسٹورز میں K-Mart, Safeway اور Coles, Bilo, Regected وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی برانچز پورے ملبورن اور شہر سے باہر بھی قائم ہیں۔ مشہور سڈنی روڈ پر چھوٹی دکانیں ہیں جہاں ہر طرح کی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

یہاں ہر سامانِ فروخت پر قیمتیں لازماً لکھی ہوتی ہیں خواہ اشیا کی قیمت ایک ڈالر ہی کیوں نہ ہو۔ دودھ کی چھوٹی بوتلیں ہوں یا انڈوں کے کنٹینرز، سبھوں پر آخری استعمال کی تاریخیں درج ہوتی ہیں۔ خریداری میں بھی ڈسپلن کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ آپ اپنی پسند کی چیزیں ٹرالی یا باسکٹ میں رکھ کر کاؤنٹر پر چلیں۔ اگر لائن ہے تو لائن میں لگ جائیں اور کاؤنٹر سے تین چار فٹ کھنچی لکیر پر کھڑے ہو کر انتظار کریں۔ ہر خریداری کی رسید کٹتی ہے، سیلز ٹیکس کی ادائیگی لازمی ہے جو رسید پر ہی کٹ جاتی ہے۔ ہر ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے یا متصل پارکنگ لاٹ ہوتی ہے جہاں پانچ سو سے ڈیڑھ دو ہزار تک گاڑیاں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ سبزیوں، ترکاریوں، پھلوں اور مچھلیوں کی بڑی بڑی مارکیٹیں ہیں۔ وکٹوریہ مارکیٹ جو بہت پرانی مارکیٹ ہے اور فٹس کرے مارکیٹ بنی، دونوں میں چیزیں نسبتاً تازہ اور باکفایت ملتی ہیں۔ فٹس کرے مارکیٹ کے اطراف میں مشرق بعید کے لوگ زیادہ بستے ہیں جو سبزی پسند اور مچھلی زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ یہاں طرح طرح کی سبزیاں دستیاب ہوتی ہیں جو ہمارے ملکوں کی ہی معلوم ہوتی ہیں، پھل بھی ہر طرح کے دستیاب ہیں۔ شریفہ، کیلے، انناس وغیرہ ہمارے یہاں سے زیادہ بڑے ہوتے ہیں اور لذیذ بھی۔ کاجو، پستہ، اخروٹ، بادام، چیری بہت سستے ہیں مگر آم مہنگے ہیں اور ذائقے کا معیار ہمارے یہاں سے بہت ہی کم ہے۔ مچھلیاں بھی طرح طرح کی ہیں۔ یہاں کی ٹونافش مشہور مچھلی ہے۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کے علاوہ گوشت دکانوں میں بھی ملتا ہے۔ زیادہ تر دکانیں لبنانیوں یا ترکوں کی ہیں۔ ایسی دکانوں کے سائن بورڈ عربی میں بھی ہوتے ہیں اور لفظ حلال عربی اور انگریزی زبانوں میں نمایاں طور پر لکھے جاتے ہیں۔ گوشت کے بڑے بڑے شیشے کے شوکیس میں بند رکھے جاتے ہیں۔ ڈپارٹمنٹل اسٹورز کے اشتہارات گھر گھر پہنچائے جاتے ہیں جن پر مصنوعات کی تشہیر دلفریب رنگوں میں ڈسکاؤنٹ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ قومی تہوار یا خاص خاص دنوں کے مواقعوں پر اشیا کی قیمتیں بہت ہی کم کر دی جاتی ہیں۔ کرسمس کے موقع پر تو ریٹ بہت ہی کم کر دیے جاتے ہیں۔ دس ڈالرز کی اشیا دو ڈالر تک فروخت کی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی زبردست سیل لگتی ہیں۔ یہ سیل عموماً کسٹم میں ضبط شدہ اشیا کی ہوتی ہے۔ قیمتیں بہت کم ہوتی ہیں اس لیے تفریح کے ساتھ ساتھ لوگ خریداری بھی کرتے ہیں۔

یہاں پچھلے کئی سالوں سے اشیا کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوا ہے حالانکہ پیٹرول کی قیمتوں میں اُتار چڑھاؤ یہاں بھی ہوتا ہے۔ پیٹرول کی قیمت ہمارے یہاں کے حساب سے 50 یا 52 روپے فی لیٹر ہے۔ یہاں کے لوگ اصلی سونے کے زیورات شاید بالکل نہیں پہنتے۔ اشتہارات میں خوبصورت ڈیزائنوں کے زیورات ہوتے ہیں لیکن آٹھ قراط سے بارہ چودہ قراط تک ہی سونا ہوتا ہے۔ عام طور پر عورتیں نقلی موتی کے بنے ہار، بندے استعمال کرتی ہیں یا چین گلے میں ڈال لیتی ہیں۔ عام لباس جینز کی پینٹ اور بلاؤز ہے۔ بلاؤز اور جینز کے درمیان کا حصہ کھلا رہتا ہے یا اونچی نیچی تراش خراش کے اسکرٹ پر بلاؤز پہن لیتی ہیں۔ البتہ بزرگ خواتین فُل اسکرٹ میں نظر آتی ہیں۔ کسی خاتون کو بار بار دیکھنا جرم ہے۔ اُس کی ایک کال پر پولیس فوراً حاضر ہو جائے گی۔ یہاں کسی جرم کے سلسلے میں پولیس کو آگاہ کرنا اچھے شہری کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ پولیس جائے واردات پر پہنچ کر آپ کا شکریہ ادا کرے گی اور بس۔ نہ تھانہ، کچہری، نہ گواہی۔ آپ نے آگاہ کر دیا بس بات ختم ہو گئی۔

یہاں بڑے بڑے گھروں میں بوڑھے میاں بیوی اکیلے رہتے ہیں۔ ان کے بچے اگر ہوں گے بھی تو کہیں اور رہتے ہوں گے۔ سوسائٹی میں شادی شدہ جوڑے کم ہیں۔ فرینڈ شپ عام ہے۔ بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ اکٹھے زندگی گزارتے ہیں۔ اس طرح کی زندگی میں آپس میں اگر نہیں نبھی تو الگ ہو جاتے ہیں، نہ کچھ لینا نہ کچھ دینا۔ بچّوں کی پیدائش بہت ہی کم ہے۔ مورلینڈ سٹی کونسل کے تین وارڈ کی کل آبادی 2001ء میں ایک لاکھ اکتیس ہزار تھی اور شرح پیدائش 1996ء سے 2001ء کے دوران 0.2 فی صد نہ کے برابر۔ یہ بھی شاید مسلمانوں کی وجہ سے ہو۔ مورلینڈ کونسل کی کل آبادی جو ایک لاکھ اکتیس ہزار ہے، ان میں 4 سال تک عمر کے بچے صرف 7954۔ 5 سے 17 سال کے 18,041، 18 سے 24 سال کے 13,913۔ 25 سے 34 سال کے 24222۔ 35 سے 49 سال کے 27201۔ 50 سے 59 سال کے 11,844۔ 60 سے 85 سال کے 27,296 لوگ تھے۔ بوڑھوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ آسٹریلیا کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے طویل عمر کے باشندوں میں شمار ہوتا ہے۔ آسٹریلیا پانچواں ملک ہے جہاں کی اوسط عمر 80.3 سال ہے باوجودیکہ 22 فی صد لوگ موٹاپے کا شکار ہیں۔ سنڈے ہیرالڈ جو یہاں کا مشہور اخبار ہے، اپنی 27 نومبر 2005ء کی اشاعت میں انکشافات کرتا ہے کہ ملبورن کے مضافات میں رہائش پذیر Myra Leviston نامی خاتون کی عمر 112 سال ہے جو ابھی بھی ایکٹو زندگی گزارتی ہے، یہ 1894ء میں پیدا ہوئی جو ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ تھا۔ یہ خاتون آسٹریلیا کی 40 خواتین سے بڑی ہیں جن کی عمریں 105 سے اوپر ہیں۔ دنیا کی معمر ترین خاتون الزبتھ بولڈن جو امریکا کے ممفس کی ہیں، ان سے صرف 4 سال چھوٹی ہے۔

آسٹریلیا پاکستان کے معیاری وقت سے 5 گھنٹے اور گرمیوں میں 30 اکتوبر سے 27 مارچ تک 6 گھنٹے آگے ہے۔ 30 اکتوبر سے 27 مارچ تک روشنی بچاؤ اسکیم کے تحت ایک گھنٹا آگے کر دیا جاتا ہے۔ ریاست مغربی آسٹریلیا نے دو بار احتجاج کیا کہ ایک گھنٹا آگے نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں ریفرنڈم بھی ہوا۔ ویسے مغربی آسٹریلیا مشرقی ریاستوں سے تین گھنٹے پیچھے ہے۔

آسٹریلیا کے لوگ آرٹ، کلچر، ناچ گانے، کھیل کود اور سیر و تفریح کے بہت دلدادہ ہیں۔ کئی مقامات مخصوص ہیں جہاں تقریبات کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ آئے دن ملک اور بیرونِ ملک سے آرٹسٹ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آتے ہیں۔ آرٹ گیلریوں میں آرٹ کے نادر نمونے موجود ہیں۔ شہر میں کئی جگہوں پر ایب اوریجن آرٹ کے نمونے آج کے دور کے رنگ و روغن سے بنائے گئے ہیں۔ یہاں پورا مغربی کلچر نظر آتا ہے۔ عام لوگ خصوصاً نوجوان گانوں اور ڈانس کے رسیا ہیں، ہزاروں کی تعداد میں گانے سنتے ہیں اور ڈانس کرتے ہیں۔ شہر میں کسینو، نائٹ کلب اور دوسرے کلب ہیں جنہیں انٹرٹیمنٹ سینٹرز کہتے ہیں۔ اخبارات میں حتیٰ کہ ٹی وی پر بھی فحش اور عریاں اشتہارات آتے ہیں۔ انٹرٹیمنٹ کے نام سے اشتہارات کے مطابق چند ساعت کی رفاقتوں سے لے کر شب بسری کے لیے سینٹر قائم ہیں۔ ہم جنس پرستی روا ہے بشرطیکہ عمر سترہ سال سے کم نہ ہو، ان کے لیے Gay سینٹرز قائم ہیں۔

یہاں والدین اپنی اولاد پر اپنی مرضی اور روک ٹوک نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر اولاد کی عمریں اٹھارہ سال یا اس سے تجاوز کر گئی ہوں۔

ملبورن شہر اور اس کے اطراف میں بہت ساری قابلِ دید جگہیں ہیں۔ تین Zoo ہیں۔ یہاں کا سفاری Zoo بہت پھیلا ہوا ہے اور گاڑیوں میں بیٹھ کر نظارہ کرتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا ایکوریم بھی ہے جس میں طرح طرح کے سمندری جانور رکھے ہوئے ہیں۔ رائل ملبورن Zoo آسٹریلیا کا سب سے قدیم چڑیا گھر ہے۔ دنیا بھر کے Zoo میں تیسرے نمبر پر ہے۔

آپ ملبورن میں اگزیبیشن سینٹر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وکٹورین پولس میوزیم، ملبورن میوزیم، یونیورسٹی آف ملبورن دیکھنے کے لائق ہیں۔ رائل بوٹانک گارڈن میں بہت طرح کے پودے ہیں جس کا شمار دنیا کے بہترین بوٹانیکل گارڈن میں ہوتا ہے۔ یہ دریائے یارا کے بازو میں ہے۔ کبھی دریا اس زمین سے ہو کر گزرتا تھا لیکن دریا کے رُخ بدلنے کے بعد اب پانی جمع ہو کر جھیلوں اور بڑے گڑھوں کی صورت میں بہت دلفریب مناظر پیش کرتا ہے۔ آپ کیپٹل تھیٹر، اسٹیٹ لائبریری، وکٹوریہ، چائنا ٹاؤن اور وہ جگہ جہاں 1829ء تا 1841ء تک قریباً ایک سو لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا، دیکھ سکتے ہیں۔ ملبورن میں امیگریشن میوزیم بھی ہے، پوسٹ ماسٹر گیلری بھی ہے اور ایک میوزیم فلم اور TV کے حوالے سے بھی ہے۔

تفریح کے لیے سٹی بس ٹور اور ٹرام بھی ہیں جو سارا دن آپ کو مختلف جگہوں کی سیر کراتے پھریں گے۔ اس کے علاوہ ڈبل ڈیک بس بھی چلتی ہے جو خاص خاص جگہوں پر ٹھہرتی ہے مثلاً رائل ملبورن Zoo، کوئن وکٹوریہ مارکیٹ، وکٹوریہ میوزیم، وکٹوریہ آرٹ سینٹر، وغیرہ وغیرہ۔ اگر دریا کی سیر کرنا ہے تو ملبورن ریور کروس میں بیٹھ جائیں۔ ایک گھنٹے کا سفر دریا کے چڑھاؤ میں پھر بہاؤ میں۔ اس کے علاوہ اسٹیم بوٹ اور کشتیاں بھی کرایہ پر ملتی ہیں۔

بچّوں کی تفریح کے بہت سارے مقامات ہیں۔ ملبورن ایکوریم بچّوں کے لیے اچھی تفریحی اور معلوماتی جگہ ہے۔ فرش سے چھت تک پانی میں مچھلیاں اور دوسری سمندری حیاتیات، قدرتی مناظر کے پس منظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے علاوہ بچّوں کو رائل ملبورن زو، لونا پارک، سائنس میوزیم اور پلانیٹیریم کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اسٹیم

تفریحی ٹرین اور چلڈرن سٹی فارم کی بھی سیر کرائی جاتی ہے۔

ملبورن پارکوں، باغوں، سبزہ زاروں اور کھیل کے میدانوں کا بھی شہر ہے۔ البرٹ پارک جو دریائے یارا کے کنارے ہے ایک خوبصورت جگہ ہے۔ رائل پارک بھی خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں پہلی ستمبر سے موسم بہار شروع ہوتا ہے۔ ہر طرف پودے اور درخت رنگ برنگ پھولوں سے لد جاتے ہیں۔ پھولوں کی بڑی ورائٹی دیکھنے کو ملے گی۔ گرمیوں میں زیادہ تر پھول جھڑ جاتے ہیں۔ لوگوں کو گلاب لگانے کا بہت شوق ہے۔ رنگ برنگے گلاب خوب بڑے بڑے ہوتے ہیں لیکن گہرے سرخ رنگ کے گلاب کے سوا کسی میں خوشبو نہیں ہوتی۔ سڑکوں کے کنارے لگے درختوں پر بھی موسم بہار میں مختلف قسموں کے پھول کھلے نظر آتے ہیں۔ سفید، گلابی اور زرد رنگ کے پھولوں سے بھرے.... درخت جن کی پتیاں جھڑ چکی ہوتی ہیں، عجیب بہار دکھاتے ہیں۔ ایک درخت پر گلابی رنگ کا پھول بچوں کی دودھ کی بوتل صاف کرنے والے برش کی طرح دیکھا۔ چھ آٹھ انچ کی ڈنٹھل پر پانچ ڈیڑھ انچ پلاسٹک کی سوئیوں کی طرح گلابی گلابی پھول درخت میں بھرے نظر آئے۔ یہاں کارواں پارک بھی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خیموں میں لوگ رات بسر کرتے ہیں۔ اگر خیمہ نہیں ہے تو کرایہ پر بھی دستیاب ہیں۔ یہاں کے کھیل کے میدان بہت مشہور ہیں۔ یارا پارک کھیل کے میدانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس سے مراد مشہور زمانہ ملبورن کرکٹ گراؤنڈ، ملبورن پارک، نیشنل ٹینس سینٹر، اولمپک پارک اور چند دوسرے اسپورٹ گراؤنڈ اور خالی سبز میدان ہیں۔

ملبورن واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ ایک خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں 270 مختلف انواع واقسام کے پرندے دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ تعداد پرندوں کی اقسام کا صرف تیسرا حصہ ہے۔ یہاں کوّے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک کالا کوا جو ہماری طرف پائے جاتے ہیں اور ایک نسبتاً چھوٹا سفید مائل کالے رنگ کا ہوتا ہے۔

ملبورن کرکٹ گراؤنڈ سہ منزلہ اور بہت مضبوط اسٹیڈیم ہے۔ یہاں لگ بھگ ایک لاکھ تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ یہاں کئی گیلریز بھی ہیں جن میں کرکٹ، فٹ بال کے بڑے بڑے کھلاڑیوں کی قد آدم تصویریں آویزاں ہیں۔ نمایاں کارکردگی کے ریکارڈز بھی موجود ہیں۔ ایک بلے پر ٹاپ ٹمین بیٹسمینوں کے دستخط ہیں جن میں گواسکر اور میاں داد کے بھی دستخط ہیں۔ یہیں ایک بڑے سے کینوس پر ایک سو ساٹھ سال کے مختلف اہم کھیلوں کی جو اس گراؤنڈ میں کھیلے گئے، پینٹنگ بھی ہے۔ پاکستان کے عمران خان کو ایکشن میں دکھایا گیا ہے۔

اس گراؤنڈ کے سامنے ہی ٹینس کورٹ بھی ہے ا تیراکی کی جگہ بھی۔ کار ریس، سائیکل ریس اور گھڑ دوڑ میدان بھی یہاں سے تھوڑی دور ہیں۔

ملبورن کا ساحلی علاقہ بھی اچھا ہے۔ اگرچہ پانی بہت زیادہ نہیں لیکن تیراکی اور نہانے کے قابل ہے۔

ملبورن شہر سے تقریباً ایک سو بیس کلومیٹر دور بلارٹ نامی مضافات ہے۔ انیسویں صدی کے نصف میں یہاں قریب ہی سونا دریافت ہوا تھا۔ وہ جگہ یادگار کے طور پر محفوظ کرلیا گیا ہے جہاں کا سارا پُرانا سیٹ اَپ جوں کا توں ہے۔ یہاں سونے کی کھدائی سے لے کر گولڈ بار بنانے تک کے تمام مراحل کی یادگار قائم ہے۔ یہاں داخلہ فیس ذریعہ ہے۔ گروپ کی صورت میں گائیڈ کے ساتھ مختلف جگہوں کی سیر کرتے ہیں۔ یہ گائیڈ آپ کو کان کی کھدائی، چھاننے کا کارخانہ، سونا گلا کر ڈھالنے کی جگہ کی سیر کرا ہیں۔ سونا دراصل دو طریقوں سے نکالا جاتا تھا۔ ایک کھدائی کر کے بڑے بڑے سونے کے ٹکڑے حاصل ہو تے اور دوسرا طریقہ پتھروں میں چمٹا ہوا سونا ہوتا ہے، ا مشینوں کے ذریعے پیس کر کے چھانا جاتا تھا۔ یہاں سو کی کان میں بھی آپ جاسکتے ہیں۔ یہاں 1854ء میں ہوا اس کو بھی ڈرامے کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ کے علاوہ اس زمانے کی وردیوں میں ملبوس سپاہیوں کا ما پاسٹ، فلیگ لہرانا اور سلامی دینا شامل ہے۔ وہیں پاس سونے کا میوزیم بھی ہے جہاں سونے کی کان کنی سے اشیا نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔ پتھروں پر لگے سونے نمونے ہیں۔ ایک کمرے میں ویڈیو کے ذریعے کان کنی مختلف مراحل دکھائے جاتے ہیں۔ یہاں ہزاروں ڈ مالیت کا ڈھلا ہوا سونا بھی نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔

پارا ندی جو ملبورن کو دو حصوں میں تقسیم کرتی میٹھے پانی کا نہایت اہم ذریعہ ہے۔ پانی بہت حساب خرچ کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا ہوا ہے۔ گھروں میں گیزر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن ا سے زیادہ پانی نہیں بہاتے ورنہ جرمانہ ہوجاتا ہے۔

گھر کے بازو میں اٹلی کا جوڑا رہائش پذیر تھا جس سے ملاقات ہوتی، وہ پانی کا رونا روتا نظر آتا۔ اس کے باغ کیاریوں کے پودے کم پانی کے سبب مرجھا رہے

والوں کا اتنا زیادہ احترام کہ نلکے سے پانی نہیں ڈالتے تھے۔ اور دوسری چیزوں کو ٹب میں دھو کر بچا ہوا پانی پودے ڈالتے تھے۔

اسی طرح بجلی کی بچت پر زور ہوتا ہے۔ تمام اسٹریٹ دونوں جانب پول لیمپ جلتے ہیں لیکن گھروں کے باہر لائٹ غائب رہتی ہے۔ پورے گھر میں ہلکے پاور کا بلب جلتا ہے جو رات کے دس گیارہ بجے سے صبح تک روشنی کرتا ہے۔ لوگ گھروں میں کھیل تماشا یا شور شرابا نہیں کرتے بلکہ تفریحی مقامات پر چلے جاتے ہیں۔ رات خاموش اور سکون سے گزرتی ہے۔

شہر میں گندگی نہ ہونے کی وجہ سے کیڑے مکوڑے اور مچھر نہیں ہوتے۔ یہاں لوگ سکون کے دن گزارتے ہیں البتہ گرمی برداشت نہیں ہوتی۔ 30 ڈگری سینٹی گریڈ کے اوپر گرمی میں ان کی چیں بول جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جنگل میں آگ لگ گئی اور بڑی تیزی سے پھیل گئی، اس آگ میں بجلی کی سپلائی میں خلل آ گیا۔ یہ صرف ملبورن کے ایک حصے میں ہوا۔ لوگ گرمی سے بے حال ہوگئے۔ ہم لوگ تو اتنی گرمی کے عادی تھے لیکن بچے جو وہاں پیدا ہوئے، ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا وہ رات ہم لوگوں نے ہوٹل میں گزاری۔ طبیعت بہت محظوظ ہوئی جب گورے اور گوریوں کو ... کرتے ہوئے دیکھا۔ بجلی جب آ گئی تو ہم لوگ گھر واپس آئے۔ ہوٹل کا خرچہ ہوا، وہ الیکٹرک سپلائی والے فوراً واپس کرنے آگئے۔

موسم کبھی اتنا دلفریب ہوتا ہے کہ گھر بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بس ہم لوگ ایک دن خوبصورت موسم میں گاڑی میں بیٹھے اور قریب چھ سو کلومیٹر دور سڈنی روڈ پر ہو لیے اور ریاست وکٹوریہ پار کر کے نیو ساؤتھ ویلز میں پہنچ گئے۔ وہاں ہم لوگ جندا بائین (Junabaync) جھیل کی سیر کو نکلے۔ یہ جھیل ملبورن سے شمال کی جانب واقع ہے۔ اس جھیل کی کہانی راول ڈیم سے ملتی جلتی ہے۔ جھیل کے اطراف تقریباً سات ہزار لوگ 140 سالوں سے آباد تھے، جہاں ڈیم بنایا گیا جس کے نتیجے میں ساری بستی زیرآب آگئی۔ کبھی کبھی گرمیوں میں جب پانی کم ہوجاتا ہے تو ان کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ یہ جھیل 8 کلومیٹر لمبی اور ... چوڑی ہے جس میں 7 جزیرے ہیں۔ یہ جھیل ... کی مشہور مچھلی ٹراؤٹ کے لیے مشہور ہے۔ واٹر ... اور کشتی رانی کے شوقین بھی یہاں آتے ہیں۔ ... میں موٹر بائیکنگ، رائڈنگ اور گھڑسواری ہوتی ہے۔ سردیوں کے موسم میں پانی جم جاتا ہے اور تقریباً 12 لاکھ لوگ پہاڑوں اور وادیوں میں برف اسکائی کا مزہ لینے آتے ہیں۔ پورا علاقہ سرسبز الپائن جنگلوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہم لوگ گرمیوں میں وہاں گئے تھے۔ وہاں رہائش کے لیے بہت سارے کاٹیج بنے ہوئے ہیں جن کا کرایہ گرمیوں میں ایک دن کے لیے دو سو ڈالرز اور سردیوں میں ہزار ڈالر تک پہنچ جاتا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ اپنے اپنے خیموں میں رہتے ہیں۔ ایک ہوٹل بھی ہے، ہم لوگ گئے تو سڈنی روڈ سے لیکن واپسی شارٹ کٹ کی خاطر پہاڑی راستہ اختیار کیا اور مسلسل تین چار گھنٹوں تک خوف میں مبتلا رہے۔ راستہ چونکہ پہاڑی کاٹ کاٹ کر بنایا گیا تھا تو دوسری طرف عمیق کھائی۔ راستے میں نہ کوئی رسٹنگ پلیس، نہ ہوٹل نہ لوگ، نہ بستی۔ ہماری ناواقفیت تھی جو اس راستے پر چل پڑے تھے اور قسمت اچھی تھی کہ راستہ خیر سے گزر گیا۔

شاہراہوں کے کنارے پچاس، سو کلومیٹرز کی دوری پر ریسٹ ہاؤس بنے ہیں جہاں ٹھہر کر مسافر آرام کرتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس میں گیس کے چولہے، صاف پانی اور واش روم کی سہولتیں ہوتی ہیں۔ رہنے کے لیے کوئی کمرا نہیں ہے البتہ ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں اور بینچ لگے ہیں۔ لائٹ بھی ہے۔ اسی طرح تھوڑی تھوڑی دوریوں پر پیٹرول پمپس اور ساتھ میں جنرل اسٹورز ہیں جہاں بسکٹس، چپس، چاکلیٹ ٹافیاں، آئس کریم، جوسز اور پانی کی ٹھنڈی بوتلیں ملتی ہیں چونکہ ہر چیز کے پیک پر قیمت لکھی ہوتی ہے اس لیے زیادہ قیمت وصول کرنے کا رواج نہیں ہے۔

شہر میں مارکیٹ کی رونقیں باہر والوں سے ہیں۔ انگریز اور یورپی لوگ سپر مارکیٹ جاتے ہیں جہاں ہر چیز مل جاتی ہے۔ چھوٹی دکانیں لبنانیوں، ... ترکیوں، افغانز اور مشرقی بعید کے لوگوں کی ہیں ... کپڑے اور ... کی دکانیں انڈین چلاتے ہیں۔ گوشت، بیکری، ... وغیرہ کے کاروبار ترکیوں اور لبنانیوں کے دم سے ہیں۔ چینی ریسٹورنٹ اور جنرل اسٹور چلاتے ہیں۔ مچھلی، سبزیوں اور پھل فروٹ مشرق بعید کے لوگوں کی دکانوں میں ملتی ہیں۔ ویسے یہ سب چیزیں سپر اسٹور میں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ یہاں سگریٹ پینے والوں کے لیے پرابلم ہے۔ دو چار قسم کے سگریٹ جو وہاں بنتے ہیں، عام مل جاتے ہیں لیکن باہر کے سگریٹ بلیک سے ملتے ہیں کیونکہ وہاں سگریٹ امپورٹ نہیں ہوتے۔ بلیک کے سگریٹ مخصوص دکانوں میں چھپا کر بکتے ہیں۔ سگریٹ کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں، ہمارے روپے کے

حساب سے دوسو سے لے کر ہزار روپے پیکٹ کی قیمتیں ہیں۔ ہندوستانی دکانوں میں گٹکا عام مل جاتا ہے لیکن وہ بھی بہت مہنگا۔

انگریز اور یورپی ڈاکٹروں اور انجینئروں کے علاوہ انڈین، پاکستانی اور ترکی ڈاکٹر اور انجینئر یہاں کام کرتے ہیں۔ ان کے کلینک بھی ہیں۔ آسٹریلین سٹیزن کے لیے دوا علاج مفت ہے۔ باہر والوں کو علاج میں کافی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ یونانی، اٹالین اور لبنانی حجامت کی دکانیں چلاتے ہیں۔ شراب عام دستیاب ہے۔ انگریزوں اور یورپی باشندوں کے علاوہ چینی، مشرق بعید کے لوگ اور انڈین میں شراب نوشی عام ہے جبکہ اِکا دُکا لبنانی اور ترکی بھی شراب پیتے ہیں۔ عام طور سے سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمان شراب نہیں پیتے۔

ایک دلچسپ احوال فلپ آئی لینڈ کے پینگوئن کے Parade کا ہے جسے دیکھنے کے لیے شام ڈھلے ٹکٹ لے کر ساحل پر جانا پڑتا ہے۔ ملبورن کے نزدیک مغرب میں فلپ آئی لینڈ ہے جسے سمندر کے اوپر سے آہنی پُل سے ملا دیا گیا ہے۔ اسی آئی لینڈ میں مغرب اور جنوب میں سمر لینڈ ساحل ہے۔ ساحلی ریت کے بعد مٹی کا ڈھیر جنگلی جھاڑیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان ہی ڈھیروں اور جھاڑیوں کے نیچے دنیا کے چھوٹے قد و قامت کے پینگوئن کا ڈیرہ ہے۔ وہ یہاں رات بسر کرتے ہیں۔ سارا دن سمندر کی تہوں میں غوطہ مار کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ ساحلی کناروں کی اونچی زمین پر پھیلے ہوئے پارک کو نیشنل نیچر پارک کہتے ہیں۔ ہزاروں سال سے رہائش پذیر پینگوئن سورج طلوع ہونے سے پہلے سمندر میں چلے جاتے ہیں اور شام کو واپس آنا شروع ہوتے ہیں۔ اسی واپسی کے منظر کو دیکھنے لوگ یہاں آتے ہیں۔ لوگوں کا یہ مشغلہ آج کا نہیں، تقریباً ایک سو سال سے جاری ہے۔ اس وقت بھی جب پُل نصب نہیں ہوا تھا، لوگ لانچوں اور کشتیوں میں سفر کر کے وہاں پہنچتے تھے۔ شروع شروع میں ساحلی کنارے کے اوپر لوگوں نے مکانات اور گیسٹ ہاؤس تعمیر کرائے تھے۔ شوقین لوگ کمبل اور کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں ڈیرہ ڈالتے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور شور شرابے سے یہ معصوم جانور بہت ڈسٹرب ہوتے تھے اور نقل مکانی کر کے وہاں سے چلے گئے۔ کچھ جنگلی کتوں اور لومڑیوں کا شکار ہو گئے تو پھر حکومت نے ان کے تحفظ کی ذمے داری کو محسوس کرتے ہوئے اس زمین کو پارک میں تبدیل کر دیا۔ اور باڑھ باندھ دی۔ مکانات گرا دیے گئے۔ ساحلی علاقوں کو خاموش زون قرار دیا یوں فلپ آئی لینڈ نیچر پارک کا قیام عمل میں آیا۔ 1960ء میں ساحل پر بینچ رکھ دیے گئے جہاں خاموشی سے بیٹھ کر پینگوئن کے پریڈ کو دیکھ سکتے ہیں۔ ساحل کے اوپر ریسٹورنٹ اور اسٹور قائم ہو گئے اور ٹکٹ کے ذریعے وقت مقررہ پر ویو پوائنٹ پر لوگوں کو جانے لگا۔ ہم لوگ بھی ٹکٹ لے کر بینچوں پر بیٹھ گئے۔ مغرب سے پہلے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ ہم بھی ساحل کی طرف دیکھتے رہے کہ کب دیدار ہو۔ کیمرا، سگریٹ جلانا، لائٹر، ٹارچ روشن کرنا منع ہے۔

پینگوئن کی آمد شروع ہوئی۔ دو دو، چار چار کی ٹولی میں ساحل کے پانی میں اُبھر کر کنارے آنے لگے پھر گئے۔ جو آ گئے وہ فوجیوں کی طرح لائن لگا کر آہستہ آہستہ ایک ڈسپلین کے ساتھ جھاڑیوں کے نیچے غائب ہو گئے۔ تماشا ختم پیسا ہضم۔ ہم لوگ بھی اُٹھ گئے اور جانے کے لیے سیڑھیوں کے بعد نیچے کی جانب واش روم اور پہلے تختہ بچھا کر پلیٹ فارم بنا ہوا ہے اس پر چادر بچھا کر ہم لوگ مغرب کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ گزرنے والے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے کہ یہاں کوئی اور تماشا ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ جو سمجھتے تھے کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں، وہ گزر گئے لیکن کچھ لوگ تجسس کے مارے کھڑے دیکھنے لگے۔

میں نے پانی کی کمی کا ذکر کیا تھا جس کی وجہ سے لوگ اپنے پودوں کو زیادہ پانی نہیں دے سکتے، نلکے میں پانی رہتا ہے لیکن قانون کی پاسداری ہے۔ ضرورت سے زیادہ پانی نہیں بہا سکتے۔ اکثر گھروں میں بارش کا پانی جمع کرنے کا طریقہ بنایا ہوا ہے۔ چونکہ وہاں چھت عام طور پر ٹائل یا کھپریل کی ہوتی ہیں، بارش کے پانی کو پرنالے کے ذریعے بڑے بڑے ٹینکوں میں پانی جمع کر لیا جاتا ہے اور اس سے اپنے لان کو سیراب کرتے ہیں۔ بارش کا یہاں کوئی وقت مقرر نہیں، کبھی بھی اور کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ مہینا بہار کا موسم ہے جب ہر طرف ہریالی اور لان میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ پھول کے بڑے درخت بھی ہوتے ہیں جن میں لال پیلا اور نیلے رنگ کے پھول کھل جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ لیموں استعمال کرتے ہیں، ان کے گھروں میں لیموں کا پودا ہوتا ہے جو بارہ مہینے پھل دیتے رہتے ہیں۔ سرخ اور بڑے بڑے گلاب لہلہاتے ہیں جن میں خوشبو نہیں ہوتی

جاری

ڈنگ

حاذب احتشام

ایک معمولی سا واقعہ جو تقریباً ہر ملک میں رونما ہوتا ہے مگر اس واقعے نے ملک کی تقدیر بدل دی، ایک انقلاب کا پیغام بنا اور ساؤتھ افریقا میں آزادی حاصل کرنے کا بِگل بن گیا۔ اس واقعے پر کئی فلمیں بنیں، بہت سارے ناول لکھے گئے۔ انہی ناول میں سے ایک ناول کا خلاصہ، ایک دردناک حقیقت۔

غربت و عصبیت کی کوکھ سے جنم لینے والا ایک واقعہ

وہ کھڑکی سے باہر جھانکا اور اُڑتی ہوئی گرد کو چھٹتے ہوئے دیکھنے لگا۔ یورپین اپنے پیچھے بس یہی کچھ چھوڑ جاتے تھے، اپنی کار سے اُڑتی ہوئی سرخ گرد۔ بنگلا خالی ہو چکا تھا اور اب کسی دوسری فیملی کے استقبال کے لیے بالکل

تیار تھا۔ اگلی فیملی بھی پچھلی فیملیوں کی طرح کینیا میں دو سال یا ممکن ہے چار سال قیام کرے اور پھر واپس امریکا، انگلینڈ، جرمنی، فرانس یا جہاں کہیں سے بھی آئی ہو، چلی جاتی ہے۔ کچھ فیملیاں اسے یاد تھیں اور کچھ کو وہ بھول جانا چاہتا تھا۔ مثلاً پہلی فیملی کو، جس کی اس نے خدمت کی تھی لیکن یہ آزادی سے پہلے کی بات تھی جب کوئی گورا کسی افریقی سے جیسا سلوک چاہتا، کرتا۔

ٹیٹو کے پیچھے، کہیں کسی خالی کمرے میں، دیوار گیر الماری کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ وہ اس خیال سے مڑا کہ ممکن ہے، میم صاحب نہ آ گئی ہو لیکن وہ تو کوہے تھا، جو جھاڑو سے الماری کی صفائی کر رہا تھا۔ گزشتہ کل کھڑکیاں دھوئی گئی تھیں اور اس نے فرش کو بھیڑ کی کھال سے خوب رگڑ رگڑ کر بالکل آئینے کی طرح چمکایا تھا جس پر یورپین بچہ خوش ہو کر ہنسنے لگا تھا اور اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے اس کے ساتھ لگا رہا تھا۔

نئے آنے والوں کو یہ دکھانے کے لیے کہ وہ اور اس کا مددگار کوہے گھر کو صاف ستھرا رکھنے کا ہنر جانتے ہیں، گھر کی صفائی بے حد ضروری تھی کیونکہ نئی میم کسی بھی وقت آ کر دیکھ سکتی تھی۔ وہ پہلے بھی گوروں کی خدمت کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ انہیں کس وقت کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس نے کھڑکی کی چوکھٹ سے تھوڑا سا رنگ ناخن سے کھرچ دیا اور جیب میں رکھی، بیس شیلنگ کی نوٹوں کی گڈی کی سرسراہٹ اپنی ران پر محسوس کرنے لگا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ گڈی نکال لی اور جیسے اس کی رگوں میں آسودگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ یہ ایک مہینے کی تنخواہ اور دو مہینے کا بونس تھا۔ اس سے وہ اپنے بچوں کے اسکول کی فیس ادا کر سکتا تھا اور پھر اتنی رقم بچ جاتی کہ وہ اپنے لیے ایک نئی شرٹ خرید سکتا اور آج یا کل رات سنیما بھی جا سکتا تھا۔ وہ سنیما کا بہت شوقین تھا حالانکہ وہ انگریزی اتنی زیادہ نہیں سمجھتا تھا اور فلموں میں انگریزی بہت فراٹے سے بولی جاتی تھی لیکن اب وہ دن دور نہیں کہ سواہلی زبان میں فلمیں بننے لگتیں جب سواہلی زبان میں فلمیں بننے لگیں گی تو خوب دیکھے گا۔ رنگین تصویریں، بھاگتی ہوئی کاریں، جہاز، طیارے، آگ، اونچی اونچی عمارتیں اور مار اماری۔

کوہے خاموشی سے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا لیکن ٹیٹو کو اس کی آمد سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ اسے سونگھ لیتا تھا۔ کوہے اپنے بالوں میں جو تیل استعمال کرتا تھا اور جو تیل اپنے بازوؤں پر مالش کرتا تھا، اس کی بو پکے ہوئے آم جیسی تھی۔ اگر وہ کسی قریبی کمرے سے بھی گزرتا تو وہ بتا سکتا تھا کہ کوہے اِدھر سے گزرا تھا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے؟" کوہے نے پوچھا۔

وہ سترہ سال کا تھا، ٹیٹو سے دس سال چھوٹا مگر شیخی باز تھا اور اکھڑ لہجے میں بات کرتا تھا "تم کھڑکی پر کیوں کھڑے ہو؟ میں تو تمہیں بہت دیر پہلے یہاں چھوڑ گیا تھا۔"

ٹیٹو نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا "کیا تم نے ساری الماریاں صاف کر دیں؟"

"ساری...... اب میں شہر جا رہا ہوں۔" اس نے جھاڑو دیوار سے ٹکا دیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر بیس شیلنگ کے نوٹوں کی گڈی نکال لی۔

"یہ ڈھیر سارے پیسے ہیں۔" ٹیٹو نے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ کوہے نے اس سے پہلے اتنی رقم نہیں دیکھی تھی۔ شہر میں یہ اس کی پہلی نوکری تھی اور اس نے پہلی بار گوروں کی خدمت کی تھی۔ کوہے نے بے پروائی سے شانے اُچکائے اور گڈی واپس جیب میں رکھ لی "چلو، شہر چلیں۔" وہ بولا۔

ٹیٹو نے نفی میں سر ہلایا "پہلے میں کھانا کھاؤں گا اور پھر تھوڑا سوؤں گا، کل شہر جاؤں گا۔"

"پیسوں کے ہوتے ہوئے تمہیں نیند کیسے آئے گی؟"

"کیونکہ میں اپنی ذات کے علاوہ دوسری چیزوں کے بارے میں بھی سوچتا ہوں۔" ٹیٹو نے جواب دیا "تمہیں بھی سوچنا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ تم سب سے پہلے ڈاک خانے اور اپنا سیونگ اکاؤنٹ کھول لو۔ اس کے بعد شہر جاؤ۔"

"مجھے پیسے بچانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کبھی نہ کبھی تم شادی کرو گے، تمہارے بچے ہوں گے اور انہیں کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ تمہیں انہیں اسکول بھی بھیجنا پڑے گا۔ اس میں بہت پیسے لگتے ہیں۔"

"تم بالکل میم صاحب جیسی باتیں کرتے ہو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

کسی عورت سے اس کا موازنہ سخت توہین آمیز تھا۔ ٹیٹو اپنا غصہ پی گیا کیونکہ کوہے نوجوان تھا۔ اس کی عقل کچی تھی اور پھر اس کے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔

"جب وقت آئے گا تو میں بیوی اور بچوں کی فکر کروں گا۔" کوہے نے کہا "اس وقت تو میں شہر جا رہا ہوں۔ رات میں سنیما دیکھوں گا اور اس کے بعد بازارِ حسن چکر لگاؤں گا۔"

ٹیٹو کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ کوہے بازارِ حسن بہت جاتا تھا۔ ٹیٹو صرف دو مرتبہ وہاں گیا تھا اور کہا تھا کہ اب نہیں جائے گا۔ وہاں کی عورتیں اس کے گاؤں کی عورتوں جیسی نہیں تھیں۔ ان کی سر منڈے ہوئے نہیں تھے اور ان کے رنگے ہوئے منہ سے شراب کی بو آتی تھی۔ کوئی خوش ذائقہ بیئر کی نہیں، یورپ کی وہسکی کی بو۔ اس نے وہسکی بھی پی تھی۔ صرف ایک بوتل میں اس کے مہینے کی تنخواہ صاف ہو گئی تھی اور وہ دن بھر مریضوں کی طرح پڑا رہا تھا۔

"پہلے پوسٹ آفس جاؤ۔" اس نے کہا "اتنے پیسے دنوں کے بعد دیکھنے کو ملیں گے۔ بازارِ حسن جانے کے بعد تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔"

لیکن وہ جانتا تھا کہ کوہے اس کی بات نہیں سن رہا تھا اور اس گڈی میں سے کچھ بھی نہیں بچے گا جس سے آج اس کی جیب اتنی پھولی ہوئی تھی۔ وہ اداسی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ یہ میم صاحب بہت اچھی تھی جو چلی گئی۔

"تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟" کوہے نے پھر پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں چاہتا تھا کہ یہ لوگ نہ جائیں۔ کون جانے اگلی فیملی کیسی ہو گی؟" اس نے اداسی سے کہا اور پُر خیال نظروں سے کوہے کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

دونوں ایک ہی قبیلے، ایک ہی برادری کے تھے۔ اس لحاظ سے کوہے اس کا بھائی ہوتا تھا لیکن ٹیٹو ایک باپ جیسی ذمہ داری محسوس کرتا تھا کیونکہ وہی اسے لے کر شہر آیا تھا اور نوکری دلائی تھی۔ "تم نہیں جانتے کہ یہ لوگ کتنے مہربان ہیں کیونکہ تم نے کبھی یورپ والوں کے ہاں کام نہیں کیا ہے۔"

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر اسے اس گوری فیملی کے بارے میں بتانے لگا جس کی اس نے پہلی بار خدمت کی تھی۔ "ایک روز میں نے گلاس میں پانی پی لیا اور میم صاحب نے دیکھ لیا۔ وہ بے حد خفا ہوئی۔ اس نے وہ گلاس اُٹھا کر باہر پھینک دیا اور اس کے پیسے میری تنخواہ سے کاٹ لیے۔"

"تم یہ بات مجھے پہلے بھی بتا چکے ہو۔" کوہے نے کہا۔

ٹیٹو نے اثبات میں گردن ہلائی "پھر تو تم نے ان میں محسوس کر لیا ہو گا اور پھر سوچنے کی حماقت نہیں کرو گے کہ سب یورپ والے اچھے ہوتے ہیں، جیسے یہ میم صاحب تھی جو ابھی یہاں سے گئی ہے۔"

"وہ اچھی کیسے ہو گئی؟ کیا اس لیے کہ اس نے ہمیں پیسے دیے۔ لیکن ہم نے کام کیا تھا۔ ہے کہ نہیں؟ ٹیٹو، میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم صرف چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دیتے

دوستی

جب تم کسی سے دوستی کر لو تو پھر اس
میں شک مت کرو اور نہ کسی سے مشورہ کرو
اور نہ کسی سے اس کے بارے میں سوال کرو
ممکن ہے کہ تمہیں اس کا دشمن مل جائے
اور وہ اس میں وہ عیوب بتائے جو اس
میں نہ ہوں اور تم میں تفریق پیدا ہو جائے
(حدیث شریف)

(شاہینہ نیازی بھکر)

ہو۔ گلاس میں پانی پینا...... کیا تم اپنی بیوی کے بارے میں بھول گئے؟"

"بیوی......؟" ٹیٹو نے نرمی سے دُہرایا۔ یوں گویا یہ اس کے لیے بالکل نیا لفظ ہو...... یا یوں گویا اس نے یہ لفظ طویل عرصے سے نہ سنا ہو۔ "تم میری بیوی کا ذکر کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تم "اچھی" میم صاحب کا ذکر کر رہے ہو۔" کوہے نے کہا "اور اس لیے کہ شاید تم بھول گئے ہو کہ جو کچھ بھی ہوا، اس کی ذمے دار یہی "اچھی" میم صاحب تھی۔"

ٹیٹو کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ کوہے کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ لیکن اس کے اندر جیسے کوئی شے حرکت کرنے لگی۔ ایک عجیب سا احساس کروٹیں لینے لگا۔ اس میں بلا کی تپش تھی۔ اس تپش سے اسے اپنا سر بھاری محسوس ہونے لگا اور منہ خشک ہو گیا، زبان پر جیسے کانٹے پڑ گئے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچایا اور پھر گویا ہوا "کیا ہوا تھا کوہے! تم کس واقعے کا ذکر کر رہے ہو؟"

کوہے دیر تک اسے گھورتا رہا پھر لب کھولے "ٹیٹو، ہم بھائی جیسے ہیں۔ ہے کہ نہیں، اگر تمہیں کچھ یاد نہیں تو میں تمہیں یاد دلانا بھی نہیں چاہتا۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک بھائی دوسرے بھائی کے بارے میں جانتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا۔ اس بھائی سے بھی نہیں......" اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار سے ٹکا ہوا جھاڑو اٹھا لیا اور مزید ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

ٹیٹو کھڑکی سے اسے پختہ روش کو پار کر کے ان جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہوتے دیکھتا رہا، جو اس احاطے کو سرونٹ کوارٹرز سے جدا کرتی تھیں۔ پھر جب اس نے کومبے کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو اپنی جگہ سے حرکت کی اور ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر اس جگہ رکھ لیا جہاں سے وہ جلن پھیلی تھی...... اور اب ایک آگ سی اس کے پیٹ اور سینے میں دہکنے لگی تھی اور جیسے پگھل پگھل کر اس کی آنتوں میں اُترنے لگی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تاکہ شدت کرب سے اس کی چیخیں نہ نکل جائیں۔ وہ انتظار کرتا رہا اور جب کومبے کے کمرے کا دروازہ بند ہوگیا تو وہ کھڑکی سے ہٹ گیا تاکہ کومبے اسے نہ دیکھ سکے۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ کومبے جاچکا ہے تو وہ بنگلے سے نکل آیا اور دروازے میں قفل ڈال کر چابی اپنی جیب میں رکھ لی جہاں وہ نئی فیملی کے آنے تک محفوظ رہتی۔

☆☆☆

اس کے پیٹ کی آگ اب مدھم تھی لیکن اس نے اس کی بھوک کی شدت میں اضافہ کردیا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ہانڈی میں رکھے ہوئے بھات کو گرم کرنے کی زحمت نہیں کی بلکہ پیالے میں انڈیل کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے کمرے کا دروازہ بند کردیا اور بستر پر لیٹنے کے بعد ایک باریک سا کمبل اپنے شانے تک کھینچ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت دیر ہوگئی اور نیند نہ آئی تو اس نے کروٹ بدل کر کمبل کو اپنے سر کے اوپر کھینچ لیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اس کی بیوی کا نام رتھ تھا۔ یہ نام اس کے باپ نے گوروں کے خدا کی کتاب میں موجود کسی کے نام پر رکھا تھا جبکہ ٹیٹو کے باپ نے کہا تھا "ہم لوگوں کے نام ایسے نہیں ہوتے، کوئی دوسری لڑکی دیکھو۔ اس کے علاوہ اس کا قد چھوٹا ہے، وہ زیادہ بچوں کی ماں نہیں بن سکے گی۔"

لیکن اب قدریں بدل رہی تھیں اور کوئی بھی شخص خود اپنی دلہن کا انتخاب کرسکتا تھا۔ ٹیٹو نے اپنے لیے رتھ کو چنا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں ایک عجیب سی جاذبیت تھی اور وہ جسمانی اعتبار سے بھی بہت پُرکشش تھی۔ ٹیٹو نے رتھ کو اپنا کر اپنے باپ پر ثابت کردیا تھا کہ وہ غلطی پر تھا۔ رتھ اس کے چار بچوں کی ماں بن چکی تھی اور پانچواں بھی تولد ہوچکا تھا۔ ہر سال، دس چاند کے بعد جب وہ اپنے گاؤں جاتا تو رتھ ایک نومولود اس کے حوالے کر دیتی۔ اس کے ساتھ ہوتا تو اس کا

دل ہر وقت خوشیوں سے لبریز ہوتا اور وہ وہاں سے واپس نہ جاتا بلکہ سوچتا تک نہ تھا کہ اسے واپس بھی جانا ہے۔ رتھ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اسے چٹائی پر لیٹے لیٹے رتھ کی آنکھوں میں جھانکنا اور ان میں اُترتی ہوئی چاہت کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ کبھی اس سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن گاؤں میں کوئی کام نہیں ملتا تھا اور وہاں رکنے کا مطلب یہ کہ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہوتی۔ اسے ہر حال میں شہر واپس جانا پڑتا تھا جہاں وہ کما سکتا تھا اور اس پیسے سے بچوں کے لیے کپڑے خرید سکتا تھا، کھانا مہیا کرسکتا تھا اور اسکول فیس دے سکتا تھا۔ اس کے پانچ بچے تھے اور وہ جانتا تھا کسی روز چھ ہوجائیں گے، پھر سات، پھر آٹھ اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ وہ گننا نہیں چاہتا تھا۔ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سوچتا تو اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ وہ ان کے لیے کپڑے کہاں سے خریدے گا؟ اسکول کی فیس کہاں سے دے گا؟ اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ کیا آسمان برسیں گے؟ سب کچھ انسان ہی کو تو کرنا پڑتا ہے ورنہ بھوکا مرنا پڑتا ہے....... اس نئے دور میں تعلیم بہت ضروری تھی۔ اسے اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا تھا تاکہ وہ بڑے ملازمتیں حاصل کرسکیں اور گوروں کی طرح رہ سکیں۔

ایک دن میم صاحب نے اس سے، اس کی فیملی کے بارے میں پوچھا تھا "ٹیٹو، کیا تمہاری بیوی کبھی شہر آئی؟"

"نہیں میم صاحب!" اس نے احترام سے جواب دیا تھا "وہاں سے بس میں یہاں تک آنے کے لیے بہت پیسے لگتے ہیں۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ وہ یہاں آئے؟ بولو، کیا تم چاہتے ہو کہ وہ یہاں آکر ہم سے ملے، گھومے پھرے؟" میم صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

اس کی گہری نیلی آنکھیں براہِ راست ٹیٹو کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ ٹیٹو نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ میم صاحب کو کیا پتا کہ وہ رتھ کو شہر لانے کا کتنا متمنی تھا۔ رتھ شہر آنے والی پہلی عورت ہوتی۔

"ہاں میم صاحب! میرا دل بہت چاہتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر وہ ضرور آئے گی، ٹیٹو!" میم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ آکر یہاں ایک ہفتہ رہ سکتی ہے۔ میں تمہیں بس کا کرایہ دوں گی اور جیب خرچ بھی دوں گی تاکہ تم اسے شہر میں گھما پھرا سکو، سینما دکھا سکو۔"

☆☆☆

جس دن رتھ آنے والی تھی، اس دن وہ اسے لینے نیروبی کے بس ٹرمینل پہنچ گیا تھا۔ اس کا دل شدتِ جذبات سے بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے رتھ کو دیکھنے کی بہت خوشی تھی اور وہ اسے شہر دکھانے اور اچھی اچھی جگہوں پر لے جانے کے بارے میں سوچ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ پھر بس آگئی تھی اور جب اس نے رتھ کو بس سے اترتے دیکھا تو اس کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ رتھ کا منڈا ہوا سر، ایک صاف گہرے نیلے اسکارف سے بندھا ہوا تھا جو اس کے لباس کے ہم رنگ تھا اور اس کے پیروں میں جوتے تھے۔ گاؤں کی عورتیں جوتے نہیں پہنتی تھیں لیکن اس نے رتھ کو بتایا تھا کہ شہر میں سب لوگ جوتے پہنتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ رتھ نے کافی کے باغات میں اوور ٹائم کیا ہوگا اور ان پیسوں سے جوتے خریدے ہوں گے۔ بس سے اُترتے وقت اس کی آنکھیں سہمی سہمی سی تھیں۔ پھر وہ اسے ان سہمی سہمی سی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔

"میں سب سے چھوٹے کو لے آئی ہوں۔" وہ بولی "میں اسے چھوڑ کر نہیں آسکتی تھی۔"

اب تک ٹیٹو نے اس کے سینے سے لگی ہوئی ننھی سی گٹھری پر غور نہیں کیا تھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اس کے جوتوں پر پڑی تھی اور پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔ اب اس نے اس ننھی سی گٹھری کو دیکھا۔ اس کا بچہ...... نیا بچہ...... جسے اس نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل کسی تتلی کی مانند خوشی سے پھڑپھڑانے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے خوف سے لرزنے لگا۔ یوں جیسے کسی زہریلے کیڑے نے اس تتلی کو دبوچ لیا ہو۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی خوشیوں پر ڈنک مار دیا ہو۔ کیا میم صاحب خفا ہوگی؟ اس نے صرف اس کی بیوی کو آنے کی دعوت دی تھی لیکن اب شاید وہ یہ دیکھ کر ناراض ہو کہ بچہ بھی ساتھ آگیا تھا۔

جب اس نے بنگلے کے دروازے پر دستک دی تو مارے گھبراہٹ اور پریشانی کے اس کا خون جیسے پانی ہوگیا اور پھر اس نے رتھ کو میم صاحب کے آگے کردیا۔ اسی وقت اس کا بچہ زور زور سے رونے لگا۔ ٹیٹو نے صاحب کے چہرے پر ناگوار شکنیں ابھرتی ہوئی دیکھیں لیکن میم صاحب مسکرائی اور رتھ سے مصافحہ کیا۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں شفقت اُتر آئی تھی۔ پھر اس نے بچے کے سر پر نرمی سے ہاتھ پھیرا اور اپنے بچے کو گود میں اُٹھا کر اس کو دکھانے لگی۔ ان لمحات میں ٹیٹو نے محسوس کیا کہ وہ

منجانب ربِ ذوالجلال

کوہستان لبنان کے ایک بزرگ دمشق کی جامع مسجد کے حوض میں گر گئے۔ لوگوں نے انہیں بعد دشواری باہر نکالا۔ نماز کے بعد ایک شخص ان بزرگ کے پاس آیا اور بہت ادب کے ساتھ سوال کیا کہ حضرت، یہ تو بتائیے کہ جناب کی آج کی اور پہلی حالت میں اس قدر فرق کیوں نظر آیا؟ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار میں جناب کے ساتھ سفر کر رہا تھا، ہمارے راستے میں ایک دریا آیا تو جناب نے بغیر کشتی اور پل کے اس دریا کو اس طرح پار کرلیا کہ جناب کے پیروں کے پنجے بھی پوری طرح نہ بھیگے تھے جبکہ آج یہ حالت دیکھی کہ آپ ایک معمولی حوض میں گر گئے اور خود باہر نہ نکل سکے؟ بزرگ نے یہ سوال سن کر کچھ غور کیا اور پھر فرمایا۔

"اس سلسلے میں پیغمبر برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان قابلِ غور ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کبھی میری حالت یہ ہوتی ہے کہ براہِ راست اللہ پاک کی قربت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی واسطہ نہیں بنتے۔ اس فرمان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لفظ "کبھی" ارشاد فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا۔ اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں تم نے سنا ہوگا کہ ایک وقت تو وہ تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں کنویں میں گرایا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو معلوم نہ ہوسکا کہ ان کا پیارا بیٹا کنویں میں گرا دیا گیا ہے اور نہ ان کو معلوم ہوسکا تھا کہ ان کا پیارا بیٹا کہاں ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے سیکڑوں کوس دور سے حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے کی خوشبو سونگھ لی۔

اس حکایت میں حضرت سعدیؒ نے یہ بات بتائی ہے کہ انبیا علیہم السلام اور اولیائے کرام سے جو معجزات اور کرامات ظاہر ہوتی ہیں ان کا انحصار ان کی ذاتی کوششوں یا اپنے کمالات پر نہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ پاک کی طرف سے ہوتا ہے، منبع کمالات خدا ہی کی مقدس ذات ہے۔

(ماخوذ از گلستانِ سعدیؒ) تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

میم صاحب کی اس شفقت اور مہربانی کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکے گا۔

☆☆☆

اس ہفتے اپنی بیوی کی موجودگی میں وہ خود کو کتنا بڑا آدمی محسوس کر رہا تھا۔ سینما میں رتھ اس کا بازو جکڑے ہوئے، بالکل پتھر کی مورت کی طرح بیٹھی رہی تھی۔ سینما کے پردے پر رنگین تصویریں حرکت کر رہی تھیں اور لوگ باتیں بھی کر رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر رتھ کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ حیرت و جوش کی ملی جلی کیفیت نے اس کا خون منجمد کر دیا تھا۔

ایک ہفتہ یوں گزر گیا جیسے ہاتھ سے مچھلی پھسل گئی ہو‘ لیکن وہ اب بھی اسے بہت سارے مقامات دکھانا چاہتا تھا اور ان کی سیر کرانا چاہتا تھا۔ پارلیمانی عمارت اور وہ بڑا سا گھر جس میں صدر رہتا تھا۔ اس نے میم صاحب سے پوچھا کہ کیا رتھ مزید ایک ہفتہ ٹھہر سکتی ہے؟

”مزید ایک ہفتہ ٹیٹو!“ میم صاحب نے کہا ”اس کے بعد اسے ہر حال میں جانا پڑے گا۔ وہاں تمہارے بچے ہیں، کتنے بچے ہیں تمہارے ٹیٹو؟“

”پانچ بیٹے ہیں، میم صاحب!“

”اور جلد ہی چھ ہو جائیں گے۔“

اس نے اثبات میں سرہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ دس چاند کے بعد رتھ کی گود میں ایک نیا بچہ، اس بچے کی جگہ لے لے گا۔ ”ہاں، میم صاحب!“ وہ بولا ”جلد ہی چھ ہو جائیں گے۔“

میم صاحب اپنا سرہلانے لگی۔ اس کی نیلی آنکھوں سے اُلجھن برسنے لگی تھی ”کیا تمہارے باپ کے بھی بہت سارے بچے تھے ٹیٹو!“

”میرے باپ کے سترہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں، میم صاحب!“ اس نے جواب دیا۔

”اُف! یہ تو بہت ہو گئے، ٹیٹو...... بہت، بہت سارے......!“ میم صاحب ایک دم سے بوکھلا اُٹھی تھی۔

”ہاں، میم صاحب...... بہت سارے...... میرے باپ کی دو بیویاں تھیں، لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔“ ٹیٹو نے کہا ”اب میرے ہاں صرف ایک اور بچہ ہو گا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو ٹیٹو! اب زمانہ بدل گیا ہے۔“ میم صاحب نے تائید میں سرہلایا تھا ”تمہارے باپ کی زندگی میں... میرا مطلب ہے، آزادی سے پہلے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ بچوں کے پاس کپڑے ہیں یا نہیں۔ انہیں اسکول جانا ہے یا نہیں۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے ٹیٹو! اب تم لوگوں کو اپنی سوچ بدلنی ہو گی، سوجھ بوجھ سے کام لینا اندھا دھند اس راستے پر نہیں بھاگنا ہو گا جو صرف اور تباہی کی طرف جاتا ہے...... نسل در نسل...... ہاں، ٹیٹو! در نسل۔“

”میں جانتا ہوں، میم صاحب!“ وہ بولا تھا ”میں ہوں کہ مجھے اپنے سب بچوں کو اسکول بھیجنا ہے اس لیے بچے نہ ہوں تو اچھا ہے۔“

”یہاں نئے اسپتال میں ایک کلینک ہے، ٹیٹو!“ و... ”جہاں وہ تمہیں بتا سکیں گے کہ انہیں کیسے روکا جا سکتا ہے“

اسے یاد آیا، اس وقت وہ الفاظ اسے بہت پُراسرا... تھے۔ بہت ہی پُراسرار...... مارے خوف کے اس کا دل لگا تھا۔ وہ ایک دفعہ اسپتال گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک... کو دیکھا تھا، جس کی ٹانگ کاٹ دی گئی تھی، تاکہ اسے م... سے بچایا جا سکتا۔

”ہاں، ٹیٹو!“ میم صاحب کی نیلی نیلی آنکھیں اس... چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور لہجے میں ملائمت تھی ”اسپتال... ایسے لوگ ہیں جو مجھ سے بھی اچھی سواہلی بولتے ہیں تمہیں بتائیں گے کہ ایسا ممکن ہے۔ اس میں کوئی تکلیف... ہوتی اور اگر تم کبھی اپنا ارادہ بدلنا چاہو تو وہ بھی ممکن ہے۔“

وہ جیسے جیسے بول رہی تھی، اس کے الفاظ اور بھی اور پُراسرار لگنے لگے تھے لیکن یہ میم صاحب بہت اچھی... اس سے بہت شفقت سے پیش آتی تھی۔ وہ اس پر بھرو... تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا خوف دور ہونے لگا ”میم صا... اگر آپ اسے اچھا سمجھتی ہیں، تو میں وہاں جاؤں گا۔“

”میں اسے اچھا سمجھتی ہوں ٹیٹو! اور میرے خیال... تمہیں وہاں ضرور جانا چاہیے۔ وہ تمہیں تصویروں کی مد... سمجھائیں گے تاکہ تم ٹھیک سے سمجھ سکو کہ یہ سب کیسے ہے۔ رتھ کو اپنے ساتھ لے جاؤ تاکہ وہ بھی سمجھ سکے... مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے، ٹیٹو۔ چاہے سنوار لو، ... بگاڑ لو۔“

ٹیٹو نے تفہیمی انداز میں سرہلایا ”میں وہاں ضرور... گا، میم صاحب!“

وہ رتھ کو ساتھ لے کر کلینک گیا۔ وہاں ایک افریقی... نے انہیں وہ باتیں سمجھائیں جن کے بارے میں وہ تصو... نہیں کر سکتے تھے کہ یہ ممکن تھا۔ وہ وہاں سے واپس آیا تو... خوش تھا ”میم صاب، آپ نے ہمیں حیرت انگیز با... ہیں۔“ وہ بولا ”چھٹے بچے کی پیدائش کے بعد میں رتھ کو... لے جاؤں گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رتھ بھی یہی

...ہمیں اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی تو سوچنا... ورنہ وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔“

”تم بہت سمجھ دار ہو، ٹیٹو!“ میم صاحب نے سرہلا کر ...ے کہا تھا ”افسوس یہ ہے کہ بیشتر لوگ اپنی ناک سے ...گے دیکھنا پسند نہیں کرتے اور انجام بھگتتے ہیں، یہ ہٹ دھری ...ل اچھا ہے۔“

☆☆☆

چھٹے بچے کی پیدائش کے بعد رتھ ایک بار پھر شہر آئی تھی ...وہ کام ہو گیا تھا۔ جیسا کہ میم صاحب نے کہا تھا، کوئی ...لیف نہیں ہوئی تھی اور دس چاند گزرنے کے بعد کوئی بچہ بھی ...نہیں ہوا تھا۔ اب ٹیٹو اپنے گاؤں کا ”بڑا آدمی“ تھا۔ صرف ...س وجہ سے نہیں کہ اس کی بیوی شہر گئی تھی، اس وجہ سے بھی کہ ...س کی بیوی نے اسے چھ بچے دیے تھے اور اب اس کے ...ساتھ کوئی ایسی خاص بات ہو گئی تھی کہ اب جب تک ٹیٹو نہ ...چاہے، رتھ کے مزید بچے تولد نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ کتنا خوش ...تھا۔ رتھ بھی بہت خوش تھی کیونکہ جب وہ امید سے ہوتی تھی تو ...چائے اور کافی کے باغات میں کام نہیں کر سکتی تھی لیکن اب وہ ...دیر تک کام کر سکتی تھی اور اب کھانے، کپڑے اور اسکول ...فیس کے لیے پیسے بھی زیادہ جمع ہو رہے تھے۔

ٹیٹو نے کومبے کو بھی اپنی خوش نصیبی میں شریک کرنا چاہا تھا ...بھی اس نے اس سے کہا تھا کہ جب وہ شادی کرنے لگے گا تو ...وہ اسے کلینک لے جائے گا اور اسے ایک ہی دن میں وہ ...باتیں معلوم ہو جائیں گی جنہیں جاننے میں ٹیٹو کو کئی سال لگے ...لیکن کومبے اس کی بات سن کر ہنس پڑا تھا۔

”جب میری شادی ہو گی تو میری بیوی کے ڈھیر ...سارے بچے ہوں گے۔“ وہ بولا تھا۔

”زیادہ بچے پیدا کرنا حماقت ہے، کومبے!“ اس نے ...غصے سے کہا ”اتنے ہی بچے ہونے چاہئیں جن کی تم پرورش ...کر سکو۔“

”تم احمق ہو، ٹیٹو!“ کومبے بولا ”تم گوروں کی طرح ...سوچنے لگے ہو۔“

”احمق تم ہو، کومبے۔ احمق نوجوان! میری بات غور سے ...سنو۔ یہ ایک نئی نسل ہے، نئی قوم ہے۔ جو کچھ ہمارے باپ دادا ...کے لیے ٹھیک تھا، ہمارے اور ہمارے بچوں کے لیے ٹھیک ...نہیں ہے۔ ان کا تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے تاکہ یہ ...اس ملک کے لیڈر بن سکیں۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا ...کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر میری طرح نوکر بنے اور تم کیا ہو، کومبے؟ ...ایک مزدور...... کیا تم اپنے بیٹوں کو بھی یہی بنانا چاہتے ہو؟“

کومبے کی چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے جس سے ٹیٹو نے اندازہ لگایا کہ اس نے اپنی توہین محسوس کی ہے اور اسے خوشی ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے اس کی فطری نرم دلی غالب آ گئی اور اس نے سوچا کہ اسے اتنے سخت الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہیے تھے لیکن کومبے نے زبان کھولی تو اسے احساس ہوا کہ اس کے وہ الفاظ کومبے کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

”میں وہ بات نہیں کر رہا ہوں ٹیٹو!“ وہ بولا ”تم اسکول اور تعلیم کی بات کر رہے ہو۔ میں تمہاری بیوی کی بات کر رہا ہوں اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے اس کے ساتھ، کیا کیا تھا اور اس کی وجہ سے تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

”مجھے کیا ہوا ہے، کومبے!“ ٹیٹو نے حیرانی سے پوچھا۔

”اب تم مرد نہیں رہے۔“

ٹیٹو اپنا سر پیچھے پھینک کر زور زور سے ہنسنے لگا ”تمہیں بس اتنا ہی معلوم ہے۔ اب میں پہلے سے زیادہ مرد ہوں۔“

یکایک کومبے اس سے بھی زور زور سے ہنسنے لگا ”تم بہت بڑے احمق ہو، ٹیٹو! تم اپنے قبیلے کی روایات کو بھول رہے ہو۔ شوہر کے سوا کوئی دوسرا مرد کسی بچے والی عورت سے نہیں مل سکتا ورنہ وہ مرد نہیں رہتا۔ اور کوئی بھی عورت اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کسی دوسرے مرد سے نہیں مل سکتی کیونکہ اس طرح بھانڈا پھوٹ جائے گا کہ بچہ اس کے شوہر کا نہیں ہے۔“

”میں یہ ساری باتیں جانتا ہوں، کومبے لیکن ان باتوں کا ہمارے موضوع سے کیا تعلق ہے؟“ ٹیٹو نے حیرت سے پوچھا۔

”اب تمہاری بیوی کے کوئی بچہ نہیں ہے اور تم نے اس کے ساتھ جو خاص ترکیب آزمائی ہے، اس کی وجہ سے اس کے ہاں ولادت نہیں ہو گی۔“

ٹیٹو اپنی کیفیت پر قابو پا کر جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ کومبے ابھی نوجوان ہے۔ اس نے سوچا۔ اس کا شعور کچا ہے۔ اس نے صرف بازاری عورتوں کو دیکھا ہے۔ جب اس کی بیوی آ جائے گی تو یہ ان دونوں کا فرق سمجھ جائے گا۔ وہ میرے قبیلے کا ہے، میرا بھائی ہے۔ میں اس کی باتوں کا بُرا نہیں مانوں گا۔“

☆☆☆

لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس گفتگو کے چند ہی دنوں کے بعد کومبے چھٹی لے کر گاؤں چلا گیا اور ہر چند یہ کہ

ٹیٹو کو اپنا اور کومبے کا بھی کام کرنا پڑ رہا تھا اور اس کی معروفیات دوچند ہو گئی تھیں، اس کے باوجود کومبے کے کہے ہوئے وہ الفاظ گویا بار بار اچھل کر اس کے دماغ پر ٹھوکریں مارنے لگے تھے۔ اس نے رتھ کے بارے میں سوچا، اس کی آنکھوں کے بارے میں سوچا، جو اس کی جانب دیکھتے ہوئے چمک اُٹھتی تھیں۔ وہ اس کی مختصر مترنم ہنسی سن سکتا تھا، تصور کی آنکھوں سے اسے کافی کے باغات میں کام کرتے ہوئے، اس کی مضبوط ٹانگوں کو دیکھ سکتا تھا۔

وہ پانچ مہینے سے گاؤں نہیں گیا تھا اور رتھ کو دیکھنے، اس کی مترنم ہنسی سننے اور اس کی آنکھوں کی چمک کا نظارہ کرنے کی آرزو اس کے اندر پھن کاڑھنے لگی تھی۔ اگر کومبے چھٹی پر نہ ہوتا تو وہ میم صاحب کے پاس جاتا اور اس سے کچھ دنوں کے لیے گاؤں جانے کی چھٹی لے لیتا لیکن بنگلے کا یہ دستور تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی ملازم چھٹی پر جاسکتا تھا۔ پھر جب اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ رتھ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا تو میم صاحب نے اس سے کہا تھا کہ وہ لوگ ایک ماہ کے لیے شکار پر جارہے ہیں اور بنگلا بند کردیا جائے گا۔

''کل تک رک جاؤ۔'' میم صاحب نے کہا ''اور جانے سے پہلے گھر کی صفائی کردینا۔ اس کے بعد جاسکتے ہو۔''

اس نے بے حد جانفشانی سے بنگلے کی صفائی کی تھی۔ ہر شے کو رگڑ کر چمکایا تھا اور جب گاؤں جانے کے لیے بس پر سوار ہوا تھا تو خوشی پنجرے میں بند کسی پنچھی کی طرح اس کے سینے پر پھڑ پھڑانے لگی تھی اور اس کی حدت سے اسے اپنا جسم تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ایک بے حد طویل سفر تھا اور یہ طوالت اس کی بے چینی اور بے کلی میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ جب بس بلندی کو سر کرنے لگی تو سورج کچھ ہی دیر پہلے غروب ہوا تھا اور بارش شروع ہوگئی۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ جب تک بس دریا والی سڑک کو عبور نہ کرلے، بارش کی شدت میں اضافہ نہ ہو لیکن وہاں تک پہنچنے کے باوجود وہ کچی سڑک کیچڑ کے باعث اتنی خستہ ہو چکی تھی کہ وہ آگے جانے کے قابل نہ رہی۔ اب صرف بیٹھ کر انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن ٹیٹو سے صبر ممکن نہ تھا۔ اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ نے اسے بے کل کردیا۔ وہ بس سے اُتر پڑا اور اس دھواں دھار بارش اور کیچڑ میں چل پڑا۔ وادی میں پانی اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہا تھا لیکن وہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اس کی ہڈیاں یخ ہو گئیں اور دانت مسلسل بجنے لگے۔

☆☆☆

جب وہ گاؤں کے نزدیک پہنچا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ سارے گاؤں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ مینڈکوں کے ٹرانے اور جھینگروں کے بولنے کی آواز پر چھائے مہیب سناٹے کو درہم برہم کر رہی تھیں۔ بارش بھیگا ہوا آسمان، چاند کے بغیر روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔ ساری کائنات گویا گیلی گیلی تاریکی سے لتھڑی ہوئی تھی۔ ابھی مرغ کے بانگ دینے میں کئی گھنٹے تھے۔

وہ چپکے سے گھر میں رینگ گیا اور اس نے اس کمرے کا رُخ کیا جس میں بچے سو رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے رک کر سردی سے کانپتے ہوئے، بھات سالن اور رتھ کے بدن سے اُٹھتی ہوئی محبت کی میٹھی میٹھی ملی جلی بو کو سونگھنے لگا۔ اپنے گیلے کپڑے اُتار کر فرش پر، ایک کونے میں ڈال دیے اور نرم نرم اور گرم گرم سی تاریکی میں اپنے بچوں کی سانسوں کی مدھم مدھم سی سرسراہٹ سننے لگا۔ پھر تاریکی میں راستہ ٹٹولتے کرتے ہوئے اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ تاریکی میں سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک اسٹول تھا اور اس کے پہلو میں لکڑی کا ایک صندوق جس کا ڈھکن تسبیح کے دانوں سے مزین تھا۔ رتھ اس میں کپڑے اور وہ جوتے رکھتی تھی جو اس نے شہر جاتے خریدے تھے۔ اس سے ایک ہی قدم کے فاصلے پر وہ چار پائی جس پر وہ سوتی تھی۔

وہ آہستہ سے اس کے سامنے جھک گیا اور پیار بھری سرگوشیاں کرنے لگا۔ وہی سرگوشیاں جو رتھ صرف اس سے سننے کی توقع رکھتی تھی۔ اسے خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کی آمد متوقع نہیں تھی۔ صرف چند ہی روز قبل کومبے گاؤں آیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ دونوں بیک وقت گاؤں نہیں آسکتے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے کو خیال آیا اور اس نے سوچا، کومبے یہ جان کر کتنا خوش ہوگا گورے شکار پر چلے گئے تھے اور وہ ایک مہینے تک واپس جائے گا۔ وہ رتھ کے مزید قریب ہو گیا اور اسکارف ڈھکے ہوئے، اس کے منڈے ہوئے سر کو چھونے کی کوشش لیکن اس کی انگلیاں بالوں کو محسوس کرنے لگیں۔ نرم، گھنے بال...... اسے یوں محسوس ہوا گویا کسی بچھو نے مار دیا ہو۔ بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی نے تیزی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ شاید میں عجلت اور وارفتگی دوسرے کے گھر میں گھس گیا ہوں، اس کے ذہن میں کوندگئی۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور جونہی ایک قدم اس کا برہنہ پاؤں صندوق سے ٹکرا گیا اور وہ جیسے پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ پھر وہ جھک کر صندوق کے ڈھکن ...تے ہوئے، تسبیح کے دانوں کو محسوس کرنے لگا اور وہ ...اس کی انگلیوں کے لمس سے گویا انگاروں کی مانند دہکنے ...۔ اس پورے گاؤں میں کسی کے پاس بھی ایسا صندوق ...تھا۔ سوائے اس کی بیوی کے۔ وہ ایک بار پھر پتھر کے ...میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے سارے احساسات فنا ہو چکے ...۔ صرف ایک سانس تھی جو آ اور جا رہی تھی۔ پھر اس نے ...کی میں کسی کو حرکت کرتے محسوس کیا۔ ساتھ ہی ایک سہمی ...ی سی سرگوشی ابھری ''ابھی کوئی آہٹ ہوئی ہے...... ...... جاؤ، جلدی......'' وہ رتھ کی آواز تھی۔

پھر اسے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اگرچہ وہ اس ...کی میں دیکھ نہیں سکتا تھا، پھر بھی اس نے دیکھا، کوئی چٹائی ...چیتے کی سی پھرتی سے اُٹھا اور سنسناتے ہوئے تیر کی ...کمرا عبور کرکے جھونپڑے سے نکل گیا۔ ٹیٹو سکتے کے ...میں اپنی جگہ کھڑا، تسبیح کے دہکتے ہوئے دانوں کو ٹٹولتا رہا ...ان کی جلن کو اپنے رگ و پے میں سرایت کرتے ہوئے ...س کرتا رہا۔ پھر جیسے اس کے اندر شعلے سے لپکنے لگے اور ...میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اچانک وہ کسی عقاب کی ...اپنی بیوی پر جھپٹا۔ اس بیوی پر، جو اس کی خیال میں ...اس کی تھی۔ اس کی آہنی انگلیاں رتھ کے حلق کی پھڑکتی ...رگ پر جم گئیں۔ اس نے رگ کو تنتے اور کسی دیے کی لو کی ...بھڑکتے اور پھر...... اور پھر...... ڈوبتے ہوئے محسوس کیا، ...وہ ساکت ہو گئی۔

...دیا بجھ گیا...... تاریکی گہری ہو گئی...... باہر آسمان رو رہا ...

وہ ساکت ہیولے پر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گھور اندھیرے ...سی اندھے کی مانند گھورنے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے حرکت ...اور خاموشی سے دوسرے کمرے میں رینگ گیا جہاں اس ...ے کپڑے چھوڑے تھے۔ بارش کے پانی سے شرابور پتلون ...جاتے ہوئے وہ مارے سردی کے کپکپانے لگا اور پھر بھیگی ...پہنتے ہوئے، اس کے دانت بجنے لگے پھر اس نے ...ے پہنے اور بارش اور تاریکی میں نکل گیا۔

☆☆☆

...اب وہ دریا والی سڑک پر پہنچا تو بارش کی دھند میں، اس ...س کو وہیں موجود پایا۔ جس کے پہیے کیچڑ میں دھنسے ...ے۔ اب بھی دھواں دھار بارش ہو رہی تھی اور سورج ...کے کوئی آثار نہیں تھے۔ آسمان پر سیاہ گھٹائیں پھیلی ...تھیں۔ وہ خاموشی سے بس میں سوار ہو گیا۔ کسی نے بھی ...توجہ نہیں دی۔ ان میں سے ہر کوئی ان طویل صبر آزما لمحات کے دوران رات میں بس سے اُترتا چڑھتا رہا تھا۔

بارش دن بھر ہوتی رہی، پھر تھم گئی۔ سڑک کے خشک ہونے میں مزید ایک دن لگ گیا۔ تیسرے دن بس اسٹارٹ ہوئی اور اس کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس دوران ٹیٹو کا جسم بخار سے پھنکنے لگا تھا اور زبان کوئلے جیسی محسوس ہونے لگی تھی۔ بس رکی تو دو آدمیوں نے اسے سہارا دے کر اُتارا۔ اتفاق سے کومبے وہاں موجود تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ اسے ہر طرف ایک آگ سی لگی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جو دھیرے دھیرے راکھ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے خشک حلق میں پانی انڈیلا جاتا تو پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہونے لگتی اور سارا پانی باہر آ جاتا۔ وہ سردی اور بخار سے کانپتا رہا اور اس تمام عرصے میں مسلسل زور شور سے بارش ہوتی رہی۔

پھر ایک روز وہ جاگ گیا۔ اب وہ آگ کہیں نہیں تھی۔ بارش کے پانی میں بجھ گئی تھی یا دریا اسے بہالے گیا تھا لیکن دریا تو بہت دور تھا اور کئی روز سے بارش بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی عورت اس کے لیے پانی لے کر آئی۔ اس نے اس بڑھیا سے بات کرنا چاہی لیکن کر نہیں پایا اور سو گیا۔ خواب میں اسے پھر کوئی عورت نظر آئی۔ وہ سمجھا کہ وہ اس کی ماں ہے لیکن اس کی ماں کو مرے ہوئے تو مدت ہو چکی تھی۔ شاید وہ اس کی بیوی تھی۔

اس کی بیوی کہاں تھی؟ اس کے لیے پانی لے کر کیوں نہیں آئی تھی؟ ایک بیوی کا فرض ہے کہ اپنے بیمار شوہر کا خیال رکھے۔ اگر کسی کی بیوی نہیں ہوتی تو اس کی ماں اس کا خیال رکھتی ہے اور اگر ماں بھی نہ ہو تو خود اسے اپنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اب اس نے بڑھیا کو پہچانا۔ وہ کومبے کی ماں تھی۔ وہ کومبے کے گھر میں تھا۔ اگلی مرتبہ وہ جاگا تو اس کے پاس کومبے بھی تھا لیکن آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی وہ پکے ہوئے آم جیسی اس کے تیل کی بو پا گیا اور اس کا جی متلانے لگا۔ پھر جب یہ کیفیت گزر گئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اپنی زبان کو حرکت دینے میں ناکام رہا۔

''تم بہت دن سے بیمار ہو۔'' کومبے نے کہا اور اسے بتانے لگا کہ دو ہفتے پہلے اسے بس سے اُتار کر لایا گیا تھا۔

اس نے اسے پانی پلایا اور جب اس کی زبان گیلی ہو گئی تو وہ اسے حرکت دینے میں کامیاب ہو سکا ''وہ لوگ مجھے گھر کیوں نہیں لے گئے؟'' اس نے نقاہت سے پوچھا ''میری بیوی کہاں ہے؟''

کومبے کی آنکھوں سے ایک عجیب سی کیفیت جھانکنے

گئی۔ اتنی عجیب کہ اگر ٹیٹو کے جسم میں تھوڑی سی بھی سکت ہوتی تو وہ اچھل کر بیٹھ جاتا اور اس اجنبی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرتا۔

"کیا تمہیں یاد نہیں؟" اس کی سماعت سے کومبے کی آواز ٹکرائی لیکن وہ نیند کی وادیوں میں اُترنے لگا تھا۔

اس نے جاگتے رہنے اور سوچنے کی کوشش کی۔ اسے بنگلے کی کھڑکیوں کی صفائی اور فرش کی دھلائی یاد آگئی۔ بنگلے میں قفل ڈالنا یاد آیا۔ پھر ٹکٹ خرید کر بس میں سوار ہونا اور کھڑکی سے بارش کا نظارہ کرنا یاد آیا۔ پھر کیچڑ اور سردی یاد آئی اور پھر وہ بڑھیا یاد آئی۔ کومبے کی ماں...... جو اس کے لیے پانی لائی تھی۔ اس نے بند آنکھوں سے، پپوٹوں کے اس پار، کومبے کو اپنے اوپر جھکتے ہوئے دیکھا "میں تھوڑی دیر بعد واپس آؤں گا۔ پھر ہم باتیں کریں گے۔" اس کی سماعت سے کومبے کی آواز ٹکرائی اور پھر اس پر غنودگی طاری ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

اگلی مرتبہ ہوش آیا تو اس نے فوراً ہی آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ کومبے سے باتیں کرنے سے پہلے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ کومبے اس وقت کمرے میں نہیں تھا لیکن وہ ہوتا تو اسے خبر ہوجاتی۔ اسے کومبے کی کہی ہوئی بات میں عیاری محسوس ہوئی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا، یہ عیاری کیسی تھی اور اس سے کیا یاد کرنے کی توقع کی جارہی تھی۔ تاہم وہ کچھ سوچنے کی مہلت چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی آکر اس کے پاس کھڑا ہوگیا۔ یہ کومبے نہیں تھا۔ چنانچہ ٹیٹو نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نظر اسی بڑھیا پر پڑی۔ وہ جھکی اور اسے پیالے میں کوئی سوپ پلانے لگی۔ پھر سیدھی کھڑی ہوکر مخاطب ہوئی "میں کومبے کو بلا کر کہتی ہوں کہ تم جاگ گئے ہو؟"

"رکو۔" وہ نقاہت سے ایک ہاتھ اُٹھا کر بولا "اس تیمارداری کا بہت بہت شکریہ لیکن ایک بات بتاؤ، میری بیوی کہاں ہے؟"

بڑھیا کی آنکھیں سکڑ گئیں "کیا کومبے نے تمہیں نہیں بتایا؟"

"نہیں، اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

"تمہارے گاؤں آنے سے تین دن پہلے وہ مرگئی۔" بڑھیا نے جواب دیا "رات میں سوئی اور دن میں نہیں اُٹھی۔"

بخار واپس آگیا اور اس کے شعلے اسے چاٹنے لگے اور اس کا جسم پسینے سے تر ہونے لگا۔ لیکن پھر کئی دنوں کے بعد یہ کیفیت ختم ہوگئی اور وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ پھر ا[...] مہینے سے بھی زیادہ مدت کے بعد وہ واپس شہر جانے کے [...] ہوسکا تھا اور میم صاحب اس کی بیوی کی موت کا سن کر [...] افسردہ ہوگئی تھی۔

☆☆☆

یہ ایک سال پہلے کی بات تھی۔ اس نے کومبے سے [...] سے بھی اپنی بیوی کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن آج کومبے نے [...] انداز سے اس کا ذکر چھیڑا تھا کہ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔

وہ کمبل ہٹا کر اُٹھ بیٹھا اور ایک موم بتی جلا کر [...] سرہانے ایک ڈبے پر رکھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات [...] نو بجے تھے۔ اس وقت کومبے فلم دیکھ رہا ہوگا۔ اس کے بعد [...] بازارِ حسن چلا جائے گا۔ کاش اسے کومبے کی بات پر غصہ نہ [...] اور وہ دوستوں کی طرح ساتھ شہر جاتے...... تو وہ بھی [...] وقت فلم دیکھ رہا ہوتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اس نے اپنے [...] دو تین مرتبہ دھیرے سے جھٹکا۔ سارے خیالات آپس [...] گڈمڈ ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ آج نہیں پیش آیا تھا۔ [...] سال پہلے پیش آیا تھا۔ بس آج صرف وہ واقعہ اسے یاد آ[...] تھا۔ کومبے شروع سے سب کچھ جانتا تھا جبھی اس نے آ[...] تھا۔ "بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک بھائی دوسرے کے بارے میں جانتا ہے لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس بھائی بھی نہیں......!"

ٹیٹو بہ آہستگی بستر سے نکل کر دروازے تک گیا [...] کے پٹ کھول دیے۔ رات کی ہوا خنک تھی۔ آسمان پر [...] بہت بڑا چاند روشن تھا۔ اس کی روپہلی چاندنی میں، ستا[...] کی روشنی مدھم پڑگئی تھی۔ یہ ویسی رات نہیں تھی، جب [...] دھار بارش ہورہی تھی اور وہ پانی میں شرابور اپنی بیو[...] ملنے کی آس میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اب ا[...] آگیا...... سب کچھ یاد آگیا...... ہانڈی میں چھوڑے بھات، سالن اور اس کے بچوں کے جسم کی ملی جلی بو۔ پکے ہوئے آم جیسے تیل کی بو، جو اس کی بیوی کے جسم اس کے جسم کو چھوگئی تھی اور اس طرح چمٹ گئی تھی کہ بار[...] پانی بھی اسے دھو نہ سکا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... آنسو، جو ا[...] اپنی بیوی کی موت پر بھی نہیں بہائے تھے، وہ آنسو ا[...] رہے تھے۔ ایک بھائی کی غداری پر بہہ رہے تھے۔ سینہ پھولنے اور پچکنے لگا۔ اب وہ سمجھ گیا کہ اس کے اسے کیا کرنا تھا۔

بھنور جال

محمد ایاز راہی

انگریزوں کے دورِ حکومت میں، ایامِ غلامی میں رونما ہونے والا ایک غیرت مند عورت کی حمیت کا قصہ، وہ بہادری میں صوبہ سرحد کی پہچان بنی۔ آج بھی پشاور سے پاڑے تک اس واقعے کی گونج سنی جاسکتی ہے۔ لوگ فخریہ اس قصے کو بیان کرتے ہیں۔

ماضی قریب کا ایک سبق آموز دلچسپ واقعہ

بیسوی صدی کی دوسری دہائی اپنے آخری دموں پر تھی۔ برطانوی عہد کا سورج نصف النہار پر تھا۔ صوبہ سرحد ہزارہ کی حسین وشاداب وادی پکھل بھی انگریزوں کی عملداری میں تھی اور وادی پکھل کا قدرتی حسن انسانی ہاتھوں کی دست برد سے محفوظ تھا۔ ندی سرن کا صاف شفاف اور صحت بخش پانی آبِ حیات کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کی مچھلی اپنی لذت

کے لیے دور دور تک مشہور تھی۔ کوہ تنگلائی چیڑ، دیار اور دیودار کے قیمتی خزانے سے معمور تھا جس کی خوشبودار اور نفیس لکڑی اپنی مثال آپ تھی۔ اس پُرسکون فضا اور تازگی سے بھرپور آب وہوا نے اپنے مکینوں کو تندرستی اور توانائی کا انمول تحفہ دے رکھا تھا۔ لوگوں کا رہن سہن، کھانا پینا اور پہناوا بھی انتہائی سادہ تھا۔ لامحدود خواہشات کی رنگینی وپیچیدگی کا ان کی زندگی میں کوئی گزر نہیں تھا۔ اسی سادگی نے ان کے کردار وگفتار کو جرأت وہمت سے نواز رکھا تھا۔ گاؤں کی پُرمشقت زندگی لہو گرم رکھنے کا پختہ جواز تھی۔ کوہ تنگلائی کی سربہ فلک بلندی بڑے بڑے سیاہ وسفید پتھروں کی سنگینی اور اونچے نیچے راستوں کی دشواریاں اگر ہمت مرداں کو مہمیز کیے رکھتیں تو دوسری طرف ندی سرن کی رواں گنگناہٹ سیکڑوں قسم کے رنگ بہ رنگ چہچہاتے پرندوں کی بولیاں خوش رنگ وخوش ذائقہ پھلوں کی لذت اور چاروں طرف پھیلے ہوئے سبزۂ بیگانہ نے لوگوں کو کیف وسرور سے آشنا کررکھا تھا۔ پہاڑوں کے یہ غیور باسی طاؤس ورباب کے ساتھ ساتھ شمشیر وسناں کے رمز شناس بھی تھے، رانی کا گھرانا گاؤں کے دو چار خوش حال گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ گاؤں کی مخصوص طرز زندگی میں کثرتِ اولاد خصوصاً بیٹوں کا وجود، ایک بے بہا نعمت سمجھا جاتا ہے بلکہ مختلف کہاوتوں کے پس منظر میں اس کی اہمیت کو جتایا جاتا ہے۔ اسے مضبوطی وسربلندی کی دلیل گردانا جاتا ہے۔ اس ضمن میں رانی کے والدین خاصے سیر چشم تھے، چھ سات بیٹوں کی مسلسل پیدائش کے بعد بیٹی کی خواہش بالکل ایک فطری امر تھا ایسے میں جب رانی نے جنم لیا تو گویا منتیں، مرادیں اور دعائیں مجسم ہوکر جیتا جاگتا وجود بن گئیں جس کی ہر ہر معصوم ادا پر سارا گھر واری صدقے جاتا اور جس کی رونے پر سبھی بے چین ہو جاتے۔ ایک گود سے اُترتی تو دوسری آغوش وا ہوتی تھی۔ گھر کی فضا ننھی رانی کی قلقاریوں سے گونجتی تھی۔ دن رات ایک دوسرے کے تعاقب میں لپکتے بھاگتے اور آگے بڑھتے رہے۔ رانی لاڈ پیار کے مہکتے پھولوں میں تتلی ہمکتی رہی، بچپن نے لڑکپن کا چولا پہنا تو رانی بڑی خودسر ثابت ہوئی جو بے جا لاڈ پیار کا منطقی نتیجہ تھا مگر سارا گھر اب بھی اس کے آگے سرنگوں رہتا۔ اسی طرح ناز اُٹھائے جاتے، بے جا ضد اور نخروں پر خوش ہوا جاتا۔ لفظ نہ، نہیں اور ناممکن سے اسے بالکل آشنا نہیں ہونے دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اڑوس پڑوس اور محلے کی ہم جولیوں سے رانی کا واسطہ پڑا تو اپنی خودسر ہٹیلی عادات کی بنا پر رانی سب پر غالب آتی گئی، اس کا حکمیہ لہجہ، گرم تیہا اور تیکھا انداز تمام سکھیوں، سہیلیوں کو مرعوب کیے رکھتا، رہی سہی معصوم ملکوتی حسن نے پوری کردی تھی خصوصاً ا بڑی دلکش آنکھیں جن میں موتی کوٹ کوٹ کر بھر تھے، یہ ستاروں بھری آنکھیں جس پر جمتیں، اسے کی طرح اپنے سحر میں جکڑ لیتیں۔ لڑکیاں اس رہنے اور اسے خوش رکھنے پر مجبور ہو جاتیں۔ اس کی اور عتاب کا شکار لڑکی تمام سہیلیوں میں اچھوت بن جاتی اور بالآخر اسے رانی کو مناتے ہی بن پڑتی۔ یوں مزاج ایک مخصوص سانچے میں ڈھلتا چلا گیا جس میں غصے اور ضد کے جراثیم جڑ پکڑتے رہے۔ چاند اور رات دن طلوع ہو ہو کے اسے دیکھتے اور سفر کرتے سورج کی تپش نے اگر رانی کے آتشیں مزاج کی پرو اسے پختہ کیا تو چاند کی شیتل چاندنی اور کوملتا اس کے حس مکمل کر روپ سروپ کی بہار بنتی اسے پروان چڑھاتی رانی نے آخرکار جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھا تو شباب تمام رنگوں سمیت قدموں پر جھکا ہوا پایا۔ سبھی رنگ نچھاور ہوئے مگر اس کا خودسر مزاج یہاں بھی حاوی ہی طرہ یہ کہ یہ رنگ دبنے کے بجائے کچھ اس بے طرح ا کی صورت ابھر نکھر گئے کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جا خاندان کے نوجوان لڑکوں کی پرشوق نظریں بے اختیا رانی پر اُٹھتیں مگر رانی کی بے نیازی اور سرد مہری ان نگاہوں کے پُر نوچ ڈالتی۔ سپاٹ لہجے کے روکھے پن صنف مخالف کے جذبوں پر اوس پڑ جاتی۔

☆☆☆

ندی سرن کے اس پار دو کوس کے فاصلے پر شہر کی ب وحید خان کا گاؤں آباد تھا۔ وحید خان کا گھرانا رانی خاندان سے دوپار کا رشتہ رکھتا تھا۔ کبھی کبھار کسی بڑی تقر کے موقعے پر دونوں خاندانوں کے افراد مل بیٹھتے تو ٹوٹے پھوٹے ادھورے تعلق کی تجدید کا باعث بنتے مگر صرف بڑوں کی حد تک۔ وحید خان کے والد گاؤں کے امام تھے۔ بڑے سلیم الطبع شخص تھے۔ مذہبی کتب کے ساتھ دیگر کتابوں کے مسلسل مطالعے نے انہیں سلاست ر کا درس دیا تھا چنانچہ وہ گاؤں بھر کی ایک مقبول محترم اور متنازعہ شخصیت تھے۔ مذہبی تقدس کے علاوہ بھی لوگ دل ان کی عزت کرتے تھے۔ کسب معاش کے طور پر انہوں دکان کا سہارا لے رکھا تھا۔ وحید خان ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ اور بیٹے کے لیے دکان کی آمدنی معقول تھی کیونکہ معا رنگوں سے قطعی ناآشنا، گاؤں کی سادہ زندگی، بے جا خرچ

وظ تھی۔ وحید خان کے والد کا واحد مقصد اپنے کو اعلیٰ تعلیم دلانا تھا۔ ان کی بھرپور توجہ اور لگن نے کو ابتدائی تعلیم سے بہ خوبی روشناس کردیا تو اگلے کے لیے انہوں نے بیٹے کو شہر بھیجنے کا فیصلہ کیا جہاں میں داخلے کی کوشش کرنا تھی اس کے لیے ایک رشتے پاس قیام کا انتظام کیا گیا۔ بھلے وقتوں کی ساعتیں کے اپنوں نے وحید خان کو سچا پیار دیا، پہلے پہل ماں ن وحید خان کے ساتھ شہر میں رہی اور پھر بادل اکلوتے لخت جگر کو سمجھا بجھا کر گاؤں لوٹ آئی۔ وحید رصہ تو بے قراری کا شکار رہا پھر رفتہ رفتہ نئے ماحول ی ہوتا چلا گیا۔ گھر اور گھر سے باہر کے ہم جولیوں کی نئی نے اسے اپنے اندر جذب کرلیا۔ علم سے دلچسپی اور لگاؤ، رثے میں ملا تھا۔ چھٹیوں میں گاؤں آتا تو گاؤں کی اور جفاکش زندگی اسے جرأت وعمل کا سبق دیتی یوں وہ کے ساتھ ساتھ عمل اور جرأت کی خوبی اپناتا گیا مگر علم کا ل اس کی اوّلین ترجیح بن چکا تھا چنانچہ وہاں سے وہ تکمیل ہوا تو والد کی خواہش اور ہدایت پر اس نے کا رُخ کیا۔

زمین اپنے محور پر شب وروز کے قدم اُٹھاتی مہ وسال طے کرتی گھومتی رہی۔ لاہور اور پھر علی گڑھ کی اہوں نے اگر اس کی علمی تشنگی کو بہت حد تک دور کیا تو ہی اسے عقل وفہم کی نعمت سے بھی مالا مال کیا، جذبات اور تفہید کو اوّلیت دینا اس کا وتیرہ بن چکا تھا۔ تعطیلات ؤں آکر اکثر لوگوں کو فہم وفراست کی عملی مثال دینے کی ل کرتا، لوگ بھی اس کے اخلاق وکردار اور حسنِ صورت کے قائل تھے۔ وحید خان تعلیم کے رسمی مراحل طے گاؤں واپس ہوا تو گھر میں گھی کے چراغ جلائے ے۔ ماں کی آنکھیں جگمگا اُٹھیں، باپ کے چہرے پر کامیابی مرانی کے پھول کھل اُٹھے۔ اکلوتے بیٹے کو زیورِ علم سے ستہ کرنے کا خواب کسی حد تک پورا ہو چکا تھا۔ گاؤں کے اندہ وپسماندہ ماحول میں علم کی روشنی لیے باوقار، بردبار خان کسی دیوتا کی طرح لگ رہا تھا۔ ہر آنکھ میں اس کا ام اور ہر گھر میں اس کا چرچا تھا۔ گاؤں کے چوپال میں ی اکثر وہ موضوع ہوتا کہ بڑا پڑھا لکھا انسان ہے۔

☆☆☆

رانی کے ہاں اس کے بھائی کی شادی تھی۔ شادی سے آدھ روز پہلے جہاں دیگر ہنگاموں نے سر اُٹھایا۔ وہاں نزدیک کے رشتے داروں کو بھی رانی کے گھر آن بٹھایا۔ وحید خان کی ماں بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے ہمراہ آئی۔ ہونہار بیٹے کو قبیلے برادری سے متعارف کرانے کی شعوری اور دانستہ کوشش بھی شاید ذہن میں کہیں کارفرما تھی۔ وحید خان کے مردانہ حسن کے گرد علم کی مقدس روشنی ہالہ کیے ہوئے تھی، وہ سبھی کی توجہ کا مرکز تھا۔ رانی کی نظریں اس پر پڑیں تو زندگی میں پہلی بار اس کی نگاہیں لڑکھڑا گئیں۔ خاندان کے بزعم خود بنے سنورے لڑکوں کے برعکس وحید خان اسے کچھ اور طرح کا لگا صرف اسے ہی نہیں چھوٹوں بڑوں سب کو وہ بڑا منفرد اور کشش سے بھرپور لگ رہا تھا۔ علم کے سرور میں ڈوبی مخمور آنکھیں۔ متانت سے جھکا ہوا سر۔ ادب کی چاشنی لیے نستعلیق گفتگو۔ دھیما خواب آلود لہجہ۔ چال ڈھال نشست وبرخاست مکمل شرافت کی آئینہ دار۔ چہرے کے خدوخال پاکیزہ فطرت کے گواہ۔ اپنی ذات سے قدرے غافل مردانہ حسن اور خوبیوں کا یہ جیتا جاگتا پیکر جسے رانی اپنی لاعلمی کی بنا پر کوئی نام نہیں دے سکی تھی لیکن اس کی بے پناہ کشش نے رانی کا سادہ مگر پُربہار وپُروقار حسن اثر کر چکا تھا، خصوصاً بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں کا جادو جس کا کوئی توڑ کوئی اپائے وحید خاں کے پاس نہیں تھا۔ گویا عشق کے دیوتا کیوپڈ کا تیر دونوں کے دلوں میں ترازو ہو چکا تھا۔

وحید خان گھر لوٹا تو اسے اپنے وجود میں اِک خلا سا محسوس ہوا۔ مرد اور عورت دونوں ازل سے ہی ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے انسانی وجود میں آئے ہیں۔ وحید خان کے اندر اپنی ذات کا مدت سے سویا ہوا یہ تشنہ احساس ایکا یک بڑی شدت سے اُبھر کر سامنے آیا اور اسے بے کل کر گیا۔ رانی جو سارے گھر میں کسی آزاد پنچھی کی طرح اُڑتی پھرا کرتی تھی۔ اب وحید خان کے تصور میں جکڑی بے بسی سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ گھر میں رانی کا طور بدلا مزاج کے رنگ ڈھنگ نے مسلسل خاموشی کی چادر اوڑھی تو اس کی ماں سوچ اور الجھن کا شکار ہوئی۔ بوڑھی اور جہاں دیدہ نگاہیں کھوئی ہوئی اکلوتی بیٹی کا سراغ ڈھونڈنے میں لگ گئیں۔

وحید خان کی بے تابی جب حد سے بڑھنے لگی تو سلیم الطبع ذہن نے علم وعقل کی مدد سے اسے ٹوٹنے پھوٹنے سے بچایا اور اظہار کی سیدھی راہ دکھائی۔ ایک روز ماں کو کسی بات پر بے حد خوش دیکھا تو ہمت کرکے دل کی بات بالآخر کہہ ڈالی۔ بڑے سلیقے اور سعادت سے اپنی طلب کی نشاندہی کی۔ اکلوتے اور پھر ہونہار بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کا ارمان خود بیٹے کے لبوں پر مچلتا دیکھا تو ماں خوشی سے نہال ہوگئی۔ یوں لگا جیسے برسوں پہلے کے ننھے منے وحید نے ان سے کسی خوش نما

کھلونے کی فرمائش کی ہو۔ ماں نے بے چین بیٹے کو دل سے لگایا اور یہ رنگین کھلونا لا کر دینے کا پختہ وعدہ اور عزم کیا۔ کچھ دن گزرے تو وحید خان کی ماں نے رانی کے ماں باپ کے آگے جھولی پھیلائی۔ وہ انکار نہ کرسکے کہ ایسا خوبصورت و نیک سیرت بر بیٹی کے لیے پھر یقیناً کہیں نہ ملتا۔ خصوصاً ماں کی نظروں نے بیٹی کے چہرے پر کھیلتے اُبھرتے رنگوں کو دیکھا تو بہت کچھ سمجھ بوجھ لیا جہاں دیدہ نگاہوں نے آخرکار کھوئی ہوئی بیٹی کا سراغ پا ہی لیا۔ خودسر بیٹی کو گردن نیچے ڈالتے دیکھا تو ماں کو اس پر بے حد پیار آیا۔ ساتھ ہی یہ اطمینان بھی ہوا کہ کسی کو خاطر میں نہ لانے والی ہٹیلی، خودپرست بیٹی اب اپنے گھر کی ہو جائے گی۔

اور پھر تین ماہ بعد ہی ڈھولک پہ تھاپ پڑی۔ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری رانی سہاگ کا جوڑا پہنے شرم اور خوشی کے ملے جلے رنگوں میں نہائی ہوئی تھی۔ چہرے پر پھیلی ہوئی دھنک عجب بہار دے رہی تھی۔ سہیلیوں نے خوشی اور چھیڑخانی کے بہانے اسے خوب خوب ستایا اور پھر رخصتی کے گیت گا کر اسے وداع کیا۔ ماں باپ کی دعائیں، پندونصائح اور بھائیوں کا مان بھی ہمراہ تھا۔

رانی کا ڈولا وحید خان کے ہاں اُترا تو وحید خان کے دل اور گھر کا آنگن سج سنور کر جھوم اُٹھا۔ وحید خان کے والدین بہت مسرور تھے۔ سمدھیانے سے جھولی بھر لانے کی خواہش خوشی میں ڈھلی تو سارے گھر کو گلستاں بنا گئی جس کی مہک اور خوشبو انوکھی تھی۔ اپنی ذات کی بھرپور تکمیل کا احساس وحید خان کو شانت کر گیا۔ تنہائیاں گنگنا اُٹھیں۔ سانسیں حنا کی خوشبو میں رچ بس کر مشامِ جاں کو معطر کر گئیں۔ دن وصل بھری راتوں کے امین بنے خواب کی طرح گزر رہے تھے۔ شہد بھرے لمحات قطرہ قطرہ زندگی میں اُتر رہے تھے اور رانی تو جیسے دیوانی ہو اُٹھی۔ مثل مشہور ہے کہ مرد جب ہارتا ہے تو شکست تسلیم کر لیتا ہے لیکن عورت جب ہارتی ہے تو اپنا سب کچھ مقابل کے سپرد کر دیتی ہے اور رانی تو اس بُری طرح سے ہاری کہ اپنا وجود ہی کھو بیٹھی، صرف وحید خان کا سراپا ہی حقیقت لگنے لگا۔ اپنا تن من وحید خان پر وار کے بھی رانی ہار نہ محسوس کرتی، اسے فتح کا ہی یقین ہوتا۔ اس کا انگ انگ محبوب شوہر کے رنگ میں رنگنے کے لیے بے تاب رہتا۔ وحید خان کو اس کی تنک مزاجی، گرم مزاجی اور غصے سے مغلوب ہونے کا احساس ہوا تو اس نے رانی کے مزاج کو اعتدال پر لانے کے لیے اسے عقل و فہم کا درس دینا شروع کیا۔ وحید خان پیار سے رانی کو رڑاں (پشتو میں روشنی) کہہ کر پکارتا تو رانی خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرتی اکثر کسی بات پر جھنجلا جاتی تو وحید خان کا پیار بھرا تا دیبی فقرہ اسے سیدھی پر لاتا۔ ''رڑاں۔ عقل سے کام لو''۔ ''رڑاں، خود پہ قابو رکھنے کی کوشش کرو رڑاں!'' ''رڑاں پھر وہی نادانی، وہ بے ڈھنگی'' محبوب شوہر کی یہ ذہنی تربیت رانی کا من تیزی سے قبولتا گیا اور رانی بڑی حد تک خود پر قابو پانا سیکھ گئی۔ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانے کی اہمیت اس پر واضح ہونے لگی اطوار میں تبدیلی آنے لگی کہ آخرکار اسے محبوب شوہر کی نظروں میں سرخرو ہونا تھا۔

☆☆☆

شادی کے دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔ رانی کو میکے کی یاد نے گھیرا تو ایک روز علی الصباح وحید خان نے اسے ساتھ لیا اور سسرال روانہ ہوا۔ اونچا نیچا سنسان پہاڑی راستہ در پیش تھا۔ وحید خان نے احتیاطاً ایک بڑا سا چھرا لباس کے اندر چھپا لیا۔ رات سسرال میں گزارنے کے باوجود دوسرے دن سسرال کے گھر سے نکلتے نکلتے بھی خاصی دیر ہو گئی۔ علاقے میں آزادی کے ترانے گونج رہے تھے۔ انگریزوں سے جنگ جاری تھی۔ انگریزوں کی مدد کے لیے راجے مہاراجے تن من دھن سے لگے ہوئے تھے۔ اپنے ہی ہم وطنوں کو غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے وہ مسلسل جتن میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاقے میں بھی پولیس چوکی بنادی گئی تھی

وحید خان کے گاؤں سے باہر کچھ فاصلے پر بھی پولیس چوکی تھی۔ گاؤں کا ایک ہی راستہ تھا جو اس چوکی کے آگے سے گزرتا تھا انہی دنوں چوکی میں ایک نئے سکھ نگران کا تقرر ہوا تھا جو جبر و ظلم کے باعث علاقے میں بدنام ہو چکا تھا۔ وہ مختلف علاقوں میں نوکری کر چکا تھا مگر کسی دیہات میں یہ اس کی پہلی تعیناتی تھی۔ اپنے مذموم اور غلط ارادوں میں اب تک کی مسلسل کامیابی نے اسے حد سے زیادہ نڈر اور مُبرا اعتماد کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس نے دیہات کے ماحول اور لوگوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، کسی کو بھی خاطر میں نہ لانا اس کی عادت بن چکی تھی۔ لوگ اس سے نالاں اور بیزار تھے مگر خاموش تھے۔

رانی اور وحید خان نے بڑی تیزی سے سفر شروع کیا مگر اندھیرا تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ راستے میں وحید خان نے رانی سے سکھ نگران کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ایک جگہ ایک خیال نے اسے روک لیا، کہنے لگا ''دیکھو رڑاں اگر سکھ نگران نے کہیں میری تلاشی لی تو یہ چھرا عذر بدتر از گناہ بہانہ بسیار ثابت ہوگا لہٰذا یہ چھرا تم اپنے لباس میں چھپا کر رکھ لو۔''

رانی نے پُرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے چھرا اپنے لباس میں رکھ لیا۔ دونوں چوکی کے قریب پہنچے تو سکھ نگران باہر ہی کھڑا تھا۔ نوخیز و نوعمر جوڑے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خباثت کی سیاہی چھا گئی۔ اس نے بڑے درشت لہجے میں انہیں پکار کر روکا اور بڑے کٹ کھنے انداز میں وحید خان سے مخاطب ہوا۔ وحید خان، رانی کی وجہ سے مصلحت اندیشی پر مجبور تھا۔ اس نے بڑے رسان سے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر سکھ نگران بدنیتی پر آمادہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اور کچھ نہیں تو وحید خان کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور ہوگا کیونکہ اس علاقے میں ہتھیار رکھنا ایک عام سی بات تھی۔ مگر تلاشی لینے پر بھی اسے ناکامی ہوئی تو جھنجلا گیا۔ آخر اس نے نقص امن کا بہانہ بنایا کہ تم دونوں بچے ہو تمہاری حفاظت میری ذمے داری ہے لہٰذا اب تمہیں صبح ہی چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس پر وحید خان کے تیور بدلے تو سکھ نگران نے مزید بہانہ کیا کہ اچھا میں تمہارے بڑوں کو اطلاع کرتا ہوں کہ آ کر تمہیں لے جائیں، اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں بند کر دو۔ سپاہی انہیں اندر لے جانے لگے تو وحید خان نے بڑے آہستہ مگر مضبوط لہجے میں رانی کو مخاطب کیا ''دیکھو رڑاں۔ عقل سے کام لینا۔ ہوش و حواس برقرار رکھنا۔''

دونوں کو الگ الگ کمروں میں بند کر دیا گیا۔ رانی کمرے میں بچھی واحد چارپائی کے پاس کھڑی مسلسل سوچ رہی تھی، آنے والے وقت کی سنگینی اسے مضطرب کیے ہوئے تھی، اس کی چھٹی حس مکمل طور پر بیدار اور چوکنی تھی۔ گہری خاموشی یقیناً کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

رات کے دوسرے پہر نشے میں مست سکھ نگران رانی کے کمرے کی طرف جانے لگا تو ایک پُرانے اور ادھیڑ عمر کے سپاہی نے دبے الفاظ میں اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے اسے بڑی بُری طرح جھڑک دیا اور کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر کے چٹخنی کو مضبوطی سے چڑھا دیا۔ رانی نے اسے دیکھا تو بری طرح چونک اُٹھی۔ دشمن کی نیت سمجھتے ذرا دیر نہ لگی۔ اس کا جسم اور ذہن غصے سے سلگ اُٹھا مگر پھر وحید خان کی ذہنی تربیت کام آئی۔ اس نے تیزی سے صورتِ حال پر غور کیا اور ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ سکھ نگران خباثت سے مسکرایا تو اس نے بڑی نرمی سے کہا ''دیکھو صاحب، میں اس وقت بے بس ہوں جو تم چاہو گے وہی ہوگا مگر میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔''

سکھ نگران نے رانی کو تر نوالہ بنتے دیکھا تو اس کی باچھیں کھل اُٹھیں اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا تو رانی نے اپنے سر سے چادر اُتار کر آگے کی اور کہا ''کم از کم یہ چادر اپنی آنکھوں پر باندھ لو۔''

نشے میں دھت سکھ نگران نے چادر لی اور اسے آوارگی سے ایک دو بار سونگھا، چوما اور آنکھوں پر باندھنے لگا کہ پنجرے میں قید اور جال میں پھنسی یہ چڑیا آخر جائے گی کہاں؟

رانی لپک کر دشمن کی پشت پر پہنچی اور چادر باندھنے میں مدد کے بہانے چادر کو مضبوطی سے باندھا، جلدی جلدی ایک دو گانٹھیں دیں پھر بجلی کی سی سرعت سے سامنے آ کر چھرا نکالا۔ بایاں ہاتھ سختی سے دشمن کے گریبان میں ڈالا اور پے در پے وار شروع کر دیے وہ یکا یک غیرت و حمیت اور جرأت کا مکمل استعارہ بن گئی۔

☆☆☆

باہر سے دوسری مرتبہ دروازہ دھڑ دھڑایا گیا اور اسی پُرانے ادھیڑ عمر کے سپاہی نے قدرے چیخ کر دروازہ کھولنے کا کہا۔ رانی نے بڑی سختی سے انکار کیا اور کہا کہ سنو! تمہارا خنزیر صاحب اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے اور دروازہ میں اب صبح ہی کھولوں گی۔ شور سن کر دیگر سپاہی بھی جمع ہو گئے تھے، سبھی حواس باختہ تھے آخر انہوں نے وحید خان کو مدد کے لیے باہر نکالا۔ وحید خان نے دروازے پر پہنچ کر رانی کو پکارا ''رڑاں' دروازہ کھولو رڑاں، میں ہوں وحید خان!''

رانی نے پھر بھی انکار کیا اور ساری صورتِ حال وحید خان کے گوش گزار کر دی۔ وحید خان نے دو سپاہیوں کو گھر اطلاع دینے بھیجا۔ صبح ہوئی تو ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ جرگے نے رانی کو اپنی تحویل میں لے کر گھر بھیج دیا۔ شہر سے پولیس کی نفری آئی تو جرگے نے بڑے فرنگی افسر کو بلانے اور فیصلہ کرنے کا مطالبہ کیا۔ انگریز آقا بڑا زیرک اور چالاک تھا۔ اپنے اقتدار، انصاف اور سیاسی باہمی انتظام کے مقابل اسے ایشیائی یا مقامی لوگوں سے کوئی غرض نہیں تھی، اس نے حکومت کا اچھا تاثر قائم کرنے کے لیے سکھ نگران کو ہی قصوروار ٹھہرایا تاکہ لوگ اور جرگہ خوش رہیں لیکن قانون کا پیٹ بھرنے کے لیے وحید خان کو معمولی قید کی سزا دی جسے جرگے نے تسلیم کر لیا۔ مگر اس واقعہ نے ایک نئی روش قائم کر دی۔ سرحد کی ہر اس چوکی پر رات کے اندھیرے میں حملہ شروع ہو گیا جہاں دیسی سپاہی تعینات ہوتے۔ آزادی کی اس لہر کو پیدا کرنے کا سہرا رانی کے سر ہے جو آج بھی علاقے بھر میں کسی دیوی کی طرح پوجی جاتی ہے۔ پشاور سے پاڑے تک رانی کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

62

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔اسے ان میں ایك کشش اور ایك للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ......ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد ا[مید] یا دسویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور در بدری کا ایک سلسلہ شروع دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور ا[ن] جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ میری بھانجی اپنے ددھیال جا رہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر زخمی ہو گیا۔ میں زرین کو لے کر سیر کے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچے احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہو سکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرا لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پُرامن وادی تک پہنچا دو تو میں مرشد سے بھی گلو خلاصی کرا دوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کر دیا کہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، مونا وسادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر ش[ہلا] کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ وہ مجھے اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم دیوار پھاند کر اندر پہنچے تھے کہ شہلا نے پستول نکال کر کہا کہ تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ میں نے اسے قابو کیا اور ڈرا کر لیا کہ وہ بینک کا لاکر کھلوانے میں ہماری مدد کرے گی مگر اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اس کے پیروں میں نقلی بم باندھ کر کہ یہ ریموٹ سے پھٹ سکتا ہے اگر تم نے غلط حرکت کی۔ تبھی اس نے عجیب حرکت کی اور اپنا پیر میرے پیروں میں پھنسا کر ''میرے ساتھ تم بھی مرو گے۔'' بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا کہ یہ صرف احتیاطاً کیا ہے کیونکہ گزشتہ بار اس نے دھوکا کیا تھا۔ وہ حالت میں بینک جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو کر کے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کرلایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپکا دی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو مدد لانے کے لیے فرار کرا دیا۔ تب فتح خان، برٹ شا کو آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بلوا لیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا ''نارتھ...... ہگسٹ'' دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی ہیں۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اُتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں پہنچے تو فون آ گیا۔

(اب آگے پڑھیے)

کچھ دیر کے لیے ہم سب ہی ساکت رہ گئے تھے۔ ہم سب ہی مرشد کی آواز اور اس کا لہجہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اسی طرح مرشد میری، سفیر اور وسیم کی آوازیں بھی پہچانتا تھا۔ البتہ عبداللہ کی آواز اس کے لیے اجنبی تھی میں نے شکر ادا کیا کہ ہم میں سے کسی نے بات نہیں کی ورنہ مرشد کی بات کی اسی وقت تصدیق بھی ہو جاتی۔ میں نے عبداللہ کو بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا اور اس نے پُرسکون آواز میں کہا۔ ''مرشد صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اس نمبر پر کوئی شہباز نامی شخص نہیں پایا جاتا ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' مرشد نے پورے اعتماد سے کہا۔ ''مجھے نہ صرف یہ معلوم ہے کہ اس کا اس جگہ سے تعلق ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہے وہ یہاں موجود ہے۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔''

''میں آپ سے بلاوجہ جھوٹ کیوں بولوں گا؟'' عبداللہ نے جھنجلائے بغیر کہا۔ ''ویسے یہ شہباز کون ہے اور آپ یہاں اس کی موجودگی پر اصرار کیوں کر رہے ہیں؟''

مرشد نے عبداللہ کا سوال نظر انداز کیا اور بولا۔ ''سنو شہباز سے کہو مجھ سے بات کرے ورنہ بڑے خسارے میں رہے گا۔''

''جب یہاں کوئی شہباز آیا تو میں اسے مطلع کر دوں گا۔'' عبداللہ نے بیزاری سے کہا اس نے کال کاٹ دی اور میری طرف دیکھا۔

''یہ اچھا نہیں ہوا۔'' سفیر پریشان ہو گیا۔ ''اسے کیسے علم ہوا کہ شہباز یہاں موجود ہے۔''

''اس سے بھی اہم بات کہ اسے اس کوٹھی کا علم کیسے ہوا؟'' وسیم بولا۔

میں سوچ رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے مرشد نے کسی طرح معلوم کر لیا ہے کہ یہ کوٹھی راجا عمر دراز کی ہے۔''

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس صورت میں وہ یوں کال کر کے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ میرا خیال ہے وہ سچ مچ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''ممکن ہے وہ اس طرح یہ جاننا چاہتا ہو کہ شہباز صاحب یہاں ہیں یا نہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

میں اُچھل پڑا تھا۔ ''عبداللہ وہ کسی قسم کا جال بچھا رہا ہے۔ ایک بار اسے یہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا تو وہ پولیس بھی بھیج سکتا ہے۔ پولیس نے مجھے پکڑ لیا تو سمجھو مرشد کے ہاتھ آ گیا۔''

وسیم نے میری تائید کی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''پھر در بدری۔'' سفیر نے گہری سانس لی۔ ''لیکن ان خواتین کا کیا ہوگا؟''

''میرا خیال ہے یہ یہیں رہیں۔'' میں نے کہا اور سفیر کی طرف دیکھا۔ ''ایاز کہاں ہے؟''

''وہ دو دن کے لیے سرگودھا گیا ہوا ہے کسی کام سے، کل تک آ جائے گا۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔ ''کیا اس سے رابطہ کرنا ہے؟''

''نہیں میں پوچھ رہا تھا۔ عبداللہ ہمیں فوری طور پر جانا ہوگا ممکن ہے مرشد پولیس بھیج ہی دے اس صورت میں تم بھی مشکل میں پڑ جاؤ گے میری عدم موجودگی میں تم آرام سے پولیس کو ڈیل کر سکتے ہو۔''

عبداللہ نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے آپ کھانا کھائیں اتنی دیر میں آپ کی روانگی کا انتظام کرتا ہوں۔''

ہم ڈائننگ روم میں آئے جہاں خواتین پریشان بیٹھی تھیں۔ سویرا نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے ڈش اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے کال کر کے میرا نام لیا تھا۔ خیر دیکھ لیں گے کھانا کھاؤ۔''

کھانا خاموشی اور بے دلی سے کھایا جانے لگا۔ سب ہی کھٹک گئے تھے کہ کوئی چکر ہے خاص طور سے خواتین کے چہرے اُتر گئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو ہم ان سے الگ ہو جائیں گے تاکہ وہ ہماری مشکلات میں شامل نہ ہوں۔ عبداللہ چلا گیا تھا۔ بیتو کھانے میں بھی شریک نہیں تھا اس کا مطلب تھا اس کی طبیعت سچ مچ خراب تھی۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اور میں نے عجلت میں کھانا بھگتایا پھر وسیم کو ایک طرف لے گیا۔ ''بیتو کو تیار کرو اسے بھی جانا ہوگا۔''

''اسے تیز بخار ہے۔''

''لیکن اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتے ورنہ پولیس اسے لے جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے پاس شناختی دستاویزات نہیں ہیں۔''

وسیم نے کہا۔ ''اب ہیں، عبداللہ نے بیتو کا آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ بھی بنوا لیا ہے۔''

میں نے اطمینان محسوس کیا۔ ''اس صورت میں ہم اسے یہاں چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ کیونکہ پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے عبداللہ کو چاہیے اسے کوٹھی کا ملازم ظاہر کرے۔''

میں جانے سے پہلے بیتو سے ملنا چاہتا تھا لیکن وہ سو رہا

تھا اس لیے میں صرف دیکھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر سویرا موجود تھی۔ میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ''شہباز کیا بات ہے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟''

میں نے گہری سانس لی اور اسے بتا دیا۔ ''سویرا آنے والی کال مرشد کی تھی۔ تم سمجھتی ہو یہاں مرشد کی کال آنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟''

''میرے خدا۔'' وہ پریشان ہو گئی۔ ''آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں اس سے پہلے کہ....''

''ہم یہی کر رہے ہیں تم فی الحال یہیں رکو گی پھر عبداللہ موقع دیکھ کر تمہیں حویلی بھجوا دے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ متفق ہو گئی۔ ''لیکن آپ کہاں جائیں گے؟''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''فکر مت کرو یہاں ہمارے پاس اور بھی کئی ٹھکانے ہیں۔''

اتنے میں عبداللہ آ گیا۔ ہمیں دیکھ کر ٹھٹکا پھر بولا۔ ''شہباز صاحب روانگی کا بندوبست ہو گیا ہے۔''

وہ کہہ کر چلا گیا میں نے سویرا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم حویلی واپس جا کر میرا انتظار کرنا۔''

اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں لیکن وہ حوصلے سے مسکرائی۔ ''میں یہی تو کر رہی ہوں۔''

مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ دن سویرا کے ساتھ رہوں گا اور پھر اسے حویلی بھیج کر اپنے دشمنوں کی طرف توجہ دوں گا لیکن دشمنوں نے مجھے سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ابھی میں آیا تھا اور اب دوبارہ بھاگنا پڑ رہا تھا۔ سویرا سے مل کر میں باہر آیا۔ سفیر اور وسیم اپنی والیوں کو سمجھا بجھا رہے تھے۔ رخصتی کا المناک سین ہر جگہ نمایاں تھا۔ عبداللہ صبر کے ساتھ نشست گاہ میں منتظر تھا۔ اس نے کہا۔

''عقبی گلی میں ایک منرل واٹر والی گاڑی موجود ہے۔ آپ سب تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر اس کے کیبن میں بیٹھ کر یہاں سے نکلیں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے یہاں کی نگرانی ہو رہی ہے؟''

''اگر نہیں بھی ہو رہی ہے تب بھی ہمیں یہی سمجھنا چاہیے کہ یہاں کی نگرانی ہو رہی ہے۔'' عبداللہ نے کہا اور موبائل نکال کر کسی کو کال کی۔ ''آس پاس کی کیا پوزیشن ہے؟.... ٹھیک ہے کڑی نظر رکھو اگر کوئی نگرانی کرتا نظر آئے تو بے آواز ہتھیار سے اس کی گاڑی ناکارہ بنا دو۔'' اس نے موبائل رکھ کر میری طرف دیکھا۔ ''میں نے اپنے آدمی آس پاس گلیوں میں پھیلا دیے ہیں۔ وہ مشکوک افراد اور گاڑیوں کی تلاش میں ہیں۔''

عبداللہ اب ان کاموں کا ماہر ہوتا جا رہا تھا۔ خیال آیا۔ ''تم اور وسیم مل کر ایک سینٹرل کمانڈ بنا رہے تھے گاڑی میں.... اس کا کیا بنا؟''

''گاڑی تیار ہے اور فارم پر کھڑی ہے۔ آپ لو بھی وہیں جا رہے ہیں۔''

''ہماری روانگی کے لیے کیا انتظامات کیے گئے ہیں''

''یہ سچ مچ منرل واٹر سپلائی کرنے والی وین ہے یہاں منرل واٹر سپلائی کرتی ہے۔ دونوں آدمی اعتماد ہیں۔ لیکن وین کے آگے پیچھے بھی تین گاڑیاں اور ایک در مسلح افراد ہوں گے۔''

''عبداللہ سب باہر ہوں گے تو کوٹھی میں کون ہوگا'' میں نے نقطہ اُٹھایا۔ ''ممکن ہے مرشد کی یہی پلاننگ ہو کہ یہاں سے نکل جائیں اور وہ پیچھے کوئی کارروائی کرے۔''

''آپ فکر نہ کریں یہاں کی سیکورٹی میں کوئی کمی ہوگی۔ راجا صاحب نے اپنے محل سے بھی چھ تربیت یا آدمی بھیجے ہیں۔''

میں مطمئن ہو گیا۔ وسیم اور سفیر بھی آ گئے۔ ہم عقبی میں آئے اور دروازے کے بالکل ساتھ لگی گاڑی میں گئے۔ گلی میں تاریکی تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی وین کا درواز ہو گیا۔ ہمارے پاس اسلحہ تھا تاکہ راستے میں کسی ہنگا صورت حال سے آرام سے نمٹ سکیں۔ ابھی ہم در طریقے سے بیٹھے ہی تھے کہ وین حرکت میں آ گئی۔ اس عقب میں بیس لیٹرز والے منرل واٹر کے کین بھرے ہو تھے۔ جگہ کم تھی اس لیے ہمیں سکڑ سمٹ کر بیٹھنا پڑ رہا تھا۔ نے ایک پستول، ایک پرس اور ایک عدد موبائل میری طر بڑھایا۔ ''یہ آپ کے لیے تیار کیا ہے اس میں سب کے ہیں اور اس کا نمبر سب کے پاس ہے۔''

پرس میں رقم تھی۔ ''یہ تم نے اچھا کیا، عبداللہ بتا رہا کہ کمانڈ وین تیار ہے؟''

''بالکل تیار ہے۔''

''نادر علی کے ممکنہ ٹھکانے کی نگرانی کا کیا بنا؟''

''نادر علی سچ مچ وہاں موجود ہے اور اب مستقل کوٹھی میں رہتا ہے۔ پتا یہ چلا ہے کہ اس کے اور مرشد اختلافات شدت اختیار کر گئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اس میں اُٹھ آیا ہے۔ عبداللہ کا ایک آدمی بھکاری کے روپ مستقل وہاں کی نگرانی کر رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میری عدم موجودگی سے یہا

معاملات پر کوئی فرق نہیں پڑا۔''

سفیر نے مجھے گھورا۔ ''شوبی تم کس چکر میں ہو، کہیں ا کے ساتھ رخصتی کا ارادہ تو نہیں ہے؟''

''سارے منڈے لگ گئے کام سے۔'' میں نے سرد بھری۔ ''ویسے تم نے آئیڈیا اچھا دیا ہے۔ ایسا کرتے ہیں ا کو بھی بلا لیتے ہیں اور پھر ہم کہیں نکل جائیں گے۔''

''اپنے ابا جی کو بھول رہا ہے گنجا کر دیں گے۔'' سفیر یاد دلایا۔

وسیم دروازے کے ساتھ لگا کسی سوراخ سے باہر جھانک رہا تھا اس نے مڑ کر کہا۔ ''پیچھے تو کئی گاڑیاں ہیں ان میں سے دو عبداللہ کی ہیں اور باقی پتا نہیں کن لوگوں کی ہیں؟''

سفیر بولا۔ ''مجھے یقین ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی ی یا گاڑی مرشد کی ضرور ہوگی۔''

''سوال یہ ہے کہ اس نے فون کیوں کیا؟'' میں نے چ کر کہا۔ ''کیا وہ ہمیں کوٹھی سے نکالنا چاہتا تھا؟''

''سامنے کی بات ہے۔'' سفیر نے کہا۔ ''باہر اس کے گے ہمارے منتظر ہوں گے۔''

''اور ہم نے باہر نکل کر اس کی توقع پوری کر ی؟'' میں نے کہا۔ ''کیا یہ عقل مندی ہے؟''

''اگر یہ عقل مندی ہے تو جناب اس میں برابر کے یک ہیں۔'' سفیر نے یاد دلایا۔

''بس یار دوستوں کی عقل مندیوں میں بھی شریک ہوتا ہوں مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔'' میں نے نکالے۔ منرل واٹر وین اب ایک شاہراہ پر آ گئی تھی یہاں پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں۔ یہ پتا چلانا ناممکن تھا ان میں سے کون ہمارے پیچھے ہے اور کون نہیں ہے؟ اگر م کسی ویران سڑک پر ہوتے تو پتا بھی چلتا۔ ''آگے کچھ عقل بیٹھے ہیں اس شاہراہ پر نکل آئے ہیں یہاں کیسے پتا چلے گا درجنوں گاڑیوں میں سے کون سی پیچھے ہے؟''

''میرا خیال ہے یہ عبداللہ کی ہدایت کے مطابق کام کر ہیں۔'' وسیم نے کہا اور اسی لمحے میرے موبائل کی بیل ی۔ عبداللہ کال کر رہا تھا اس نے کہا۔ ''جناب منرل واٹر کی ی کے پیچھے ایک نیلی کار ہے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ بس یہی گاڑی ہے؟''

''جی جناب یہ ہماری گلیوں سے نکلی ہے اور پانچ منٹ میرے آدمی اسے ناکارہ کر دیں گے۔ اس وقت وین ایک ل میں مڑے گی اور ایک جگہ رکے گی آپ وہیں اتر ئیں گے۔''

''میں سمجھ گیا اور وہاں سے روانگی کیسے ہوگی؟''

''اس سڑک پر بے شمار ٹیکسیاں ہوں گی آپ لوگ تین الگ الگ ٹیکسیوں میں روانہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے فاصلہ رکھیں گے اس طرح پتا چل جائے گا کہ مزید تعاقب کیا جا رہا ہے یا نہیں۔''

عبداللہ کا پلان بہترین تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس قسم کے حالات کے لیے اس نے پہلے سے پلان سوچ رکھا تھا اور موقع آنے پر عمل کر رہا تھا۔ وسیم عقب میں دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ ''نیلی گاڑی گئی وہ اچانک گھوم کر گرین بیلٹ پر چڑھ گئی ہے۔''

''عبداللہ کے آدمی نے اس پر بے آواز ہتھیار آزمایا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''فائر کی آواز نہیں آئی ہے۔ اب تیار ہو جاؤ، وین رکے گی اور ہمیں فوراً اُترنا ہے اسلحہ چھپا لو۔''

ایک چھوٹی خودکار رائفل وسیم کے پاس تھی وہ اس نے جیکٹ میں کر لی۔ میرے اور سفیر کے پاس بس پستول تھے۔ وین رکنے سے پہلے وسیم نے ہمیں ان کے اضافی میگزین بھی دے دیے۔ اسی لمحے وین رکی اور ہم تینوں نیچے اُتر آئے۔ وسیم نے وین کے دروازے پر ہاتھ مارا تو وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ کمرشل اسٹریٹ تھی اور یہاں مارکیٹ تھی۔ رات کے دس بجے اور شدید سردی کے باوجود یہاں خاصی رونق تھی۔ ایک طرف بہت ساری ییلو کیبس کھڑی تھیں۔ اس سڑک پر بھی کئی گاڑیاں تھیں جو مین روڈ سے اندر آئی تھیں اور ممکن ہے ان میں سے کوئی وین کا تعاقب کر رہی ہو۔ میں نے مختصر الفاظ میں انہیں عبداللہ کا پلان بتایا۔ ''اب ہمیں الگ الگ ٹیکسیوں میں سفر کرنا ہے فارم ہاؤس کس نے دیکھا ہے؟''

''میں نے اور وسیم نے۔'' سفیر نے جواب دیا۔

''بس تو میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔'' میں نے ایک نزدیکی ییلو کیب کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں نے جان بوجھ کر رفتار سست رکھی تھی۔ وسیم اور سفیر مجھ سے پہلے ہی دو ٹیکسیوں تک پہنچ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی میں نے بھی ایک ییلو کیب والے بڑے میاں سے کہا۔ ''چاچا چلنا ای۔''

''کتھوں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''اُدھر جی ٹی روڈ تے۔'' میں نے کہا اور اندر بیٹھ گیا۔ اس نے خاموشی سے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ وطنِ عزیز کے دیگر شہروں کے مقابلے میں راولپنڈی اسلام آباد کے ٹیکسی ڈرائیور حیل و حجت نہیں کرتے.... اور نہ کرائے کے نام پر کھال اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھار کہانی سنا کر ہمدردی کے نام پر اضافی رقم سمیٹنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ وہ

بھی سب نہیں کچھ ڈرائیور ایسے ہیں۔ میں نے سفیر اور وسیم کی ٹیکسیوں کی نشان دہی نہیں کی تھی وہ ویسے ہی ان کے پیچھے تھا۔ ذرا دیر بعد ہم جی ٹی روڈ پر تھے یہاں پہلی تیز روشنی والی اسٹریٹ لائٹس تھیں۔ میں اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کون سی گاڑی مستقل ہمارے پیچھے لگی ہے؟ مگر فی الحال ایسی کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ گاڑیاں مستقل مڑ رہی تھیں یا آگے نکل رہی تھیں کوئی مستقل مزاجی سے تعاقب کرتی نہیں دکھائی دی تھی۔ جی ٹی روڈ پر آنے کے بعد میں نے سفیر کو کال کی۔

"کیا صورتِ حال ہے؟"

"ابھی تو معاملہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔"

میں نے وسیم کو کال کی اس نے بھی کلیئر کی رپورٹ دی۔ میں نے کہا۔ "پھر بھی احتیاطاً تھوڑا پہلے رک جانا میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"جی میں سمجھ گیا۔" اس نے جواب دیا۔

"سفیر کو بتا دو۔"

ہم پشاور کی طرف جا رہے تھے۔ راولپنڈی سے باہر جی ٹی روڈ پر کئی چھوٹے بڑے شہر آتے تھے۔ ہمیں ٹیکسلا سے پہلے کہیں رکنا تھا۔ جگہ میرے علم میں نہیں تھی۔ اس لیے میں عقب کے ساتھ وسیم اور سفیر کی ٹیکسیوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ مگر تینوں تقریباً ایک ہی رفتار سے جا رہے تھے۔ اس لیے ٹیکسیوں کا فاصلہ آپس میں برابر ہی تھا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ مرشد نے اس طرح کال کیوں کی تھی؟ یہ قدم خلافِ معمول تھا اگر اسے کوٹھی اور یہاں میرا اسراغ مل گیا تھا تو اس نے خاموشی سے نگرانی کرانے پھر دھاوا بولنے یا مجھے اور میرے ساتھیوں کو اُٹھانے کی کوشش کے بجائے مجھے کال کر کے ہوشیار کر دیا اور ہم فوری طور پر وہاں سے نکل آئے تھے۔ ابھی میں راستے میں تھا اس لیے اس پر سوچنے کے بجائے میں نے آس پاس نظر اور ساتھیوں سے رابطہ رکھنے کا سوچا۔ عبداللہ کو کال کی۔

"تم کہاں ہو؟"

"میں واپس کوٹھی آ گیا ہوں لیکن دو گاڑیاں آپ کے ساتھ ہیں مجھے پل پل کی رپورٹ مل رہی ہے۔"

"تم نے ٹھیک کیا مجھے وہاں موجود لوگوں کی فکر ہو رہی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں احتیاط کے طور پر انہیں کوٹھی کے ایک ایسے حصے میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں سوائے میرے اور کوئی نہیں جا سکتا۔"

عبداللہ کی یہ احتیاطی تدبیر بھی مجھے پسند آئی تھی۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو کوٹھی سے نکال کر مرشد کا وہاں دھاوا بولنے کا ارادہ تھا تب بھی تینوں خواتین آسانی سے اس ہاتھ نہیں آتیں۔ لیکن میرے خیال میں ان تینوں کا بھی وہاں رہنا اب مخدوش ہو چکا تھا۔ مطلع صاف ہوتے ہی انہیں وہاں سے روانہ کر دینا چاہیے تھا۔ سویرا کو تو واپس حویلی جانا تھا مونا اور سعدیہ کسی صورت نہیں مانتیں۔ ان کے لیے یہیں کو بندوبست کرنا تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو انہیں فارم ہاؤس پر ہی لیتے۔ لیکن فی الحال تو ہمیں دیکھنا تھا کہ ہم خود بھی محفوظ ہیں نہیں۔ نصف گھنٹے بعد مجھے وسیم کی کال آئی۔ "میں ٹیکسی سڑک سے اُتار رہا ہوں آپ سفیر کی ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے یہیں آئیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

آگے کوئی گاڑی سڑک سے اندر کی طرف مڑتی دکھائی دی۔ پھر سفیر کی ٹیکسی مڑی تو میں نے بڑے میاں سے کہا۔ "آپ اس ٹیکسی کے پیچھے موڑ لو اور یہ جہاں رکے وہیں روک لو۔"

اس پر بڑے میاں نے پہلی بار مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "کوئی چکر تے نہیں اے۔"

"تسی فکر ای نہ کرو کوئی چکر نہیں اے۔" میں نے اسے تسلی دی تو اس نے بادلِ ناخواستہ ٹیکسی کو اس کچے راستے پر موڑ دیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وسیم کی ٹیکسی کوئی فرلانگ بعد رکی ہوئی تھی اور سفیر والی ٹیکسی اس کے پاس رک رہی تھی۔ بڑے میاں نے اپنی ٹیکسی ان سے ذرا دور روک دی اور مجھے بولا۔ "مینوں فارغ کرو جی۔"

"کتنے ہوئے؟" میں نے اُترتے ہوئے پوچھا۔

"دو سو دیدو۔" اس نے ہچکچا کر کہا تو میں نے پرس سے دو سو نکال کر اسے دے دیے۔

"اللہ تینوں خوش رکھے۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور ٹیکسی ریورس کر لی۔ اس دوران میں باقی دو ٹیکسیاں بھی واپس جا رہی تھیں اور وسیم سفیر میری طرف آ رہے تھے۔ جب تک تینوں ٹیکسیاں مین روڈ پر جا کر مڑیں ہم جمع ہو چکے تھے ابتدائی چاند کی روشنی کافی تھی اور یہاں مکمل اندھیرا نہیں تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"اب کس طرف جانا ہے؟"

"میرے ساتھ آیئے۔" وسیم نے کہا اور ایک خشک کھیت کے کنارے بنی منڈیر پر چلنے لگا۔ کھیت میں کوئی فصل نہیں تھی حالانکہ سیزن تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ اس علاقے میں کاشت کار نہری پانی کے محتاج بھی نہیں تھے۔ صرف گندم لگانے والوں کو بھی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا تھا کہ کسی کا آدھے یا ایک کنال کا پلاٹ خالی پڑا ہو تو وہ اس پر گندم لگا دیتا ہے اور کم سے کم اپنے گزارے کی گندم حاصل کر لیتا ہے۔ جبکہ زمین کی صورت سے یہ زرعی علاقہ لگ رہا تھا۔ بہر حال ہو سکتا ہے مالک کسی وجہ سے گندم کاشت نہیں کر سکا ہو۔ ہم اس منڈیر پر چلتے ہوئے آگے آئے پھر وسیم دوبارہ مین روڈ کی طرف مڑ گیا لیکن اس طرف جانے کا راستہ نہیں تھا کیونکہ آگے ایک بڑے احاطے کی دیوار نے راستہ روک رکھا تھا۔ میں نے کہا۔

"یہاں تو راستہ بند ہے۔"

"تو آ تو یار تیرے لیے دیوار میں بھی راستے کھلوا دیتے ہیں۔" سفیر نے ناموجود مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ تب مجھے دیوار میں ایک چھوٹا سا لوہے کا بنا دروازہ دکھائی دیا۔ پہلے کم روشنی کی وجہ سے نہیں دکھائی دیا تھا۔ دروازے میں اندر باہر دونوں طرف سے کھلنے والا تالا فکس تھا۔ وسیم نے ایک عدد چابی برآمد کی اور اس سے تالا کھول لیا۔ ہم اندر آئے جگہ جگہ روشن گارڈن لائٹس میں ایک خوب صورت باغ نظر آیا۔ یہاں گریپ فروٹس کے بہت سارے درخت لگے تھے۔ کہیں کہیں لوکاٹ اور شہتوت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں سے پھل اُتر چکا تھا۔ کچھ آگے ایک چھوٹی سی دو منزلہ کوٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے جگہ کا معائنہ کیا۔

"تو یہ ہے وہ فارم ہاؤس؟"

"جی جناب اور صرف دس ہزار روپے ماہانہ کرائے پر مل گیا۔ اصل میں مالک جاپان جا رہا تھا اور اسے رقم کی ضرورت تھی اس نے پورے سال کا ایڈوانس لے کر یہ کوٹھی اور فارم کرائے پر دے دیا۔ فرنش بھی ہے۔"

"اور ہمیں کل ہی یہاں سے بھاگنا پڑا تو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے جس اسٹیٹ والے سے لیا ہے اس سے بات کر لی ہے وہ آرام سے اسے پندرہ ہزار کرائے پر اُٹھا دے گا۔"

"تب ٹھیک ہے۔" میں نے کوٹھی کی طرف قدم بڑھائے۔ یہاں کچی زمین نہیں تھی بلکہ پودوں کے درمیان اینٹوں سے پختہ روش بنی ہوئی تھیں۔ ہم گھوم کر سامنے آئے یہاں ایک چھوٹا سا جدید طرز کا لان تھا اور پورچ میں سینٹرل کمانڈو ین، سفیر کی شاندار سفاری جیپ اور میری ہیوی بائیک کھڑی تھی۔ کوٹھی کے اندر باہر روشنی تھی۔ سفیر نے کہا۔

"ہم نے پہلے ہی بہت کچھ یہاں منتقل کر دیا ہے۔"

"کوٹھی خالی ہے؟"

"نہیں یار اندر وہ نمونہ ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔"

"یہ زیادتی ہے جناب۔" اچانک کسی نے کہا لیکن بولنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آواز کسی اسپیکر سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔

"مانی ہے خود کو نمونہ کہنے پر بُرا مان رہا ہے لیکن تم اسے دیکھ کر بتاؤ کہ اسے نمونے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"سفیر صاحب اپنے الفاظ واپس لیں، ورنہ دروازہ نہیں کھلے گا اور آپ کے ساتھ وسیم صاحب اور شہباز صاحب مفت میں پریشان ہوں گے۔ باہر سردی بہت ہے۔"

"مت کھولو ہم دروازہ توڑ کر بھی آ سکتے ہیں۔" سفیر نے لاپروائی سے کہا۔ "لیکن برخوردار تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ابھی میں اپنے الفاظ واپس لے لوں گا تو اندر آ کر دوبارہ تمہیں یہی کہوں گا۔"

"دروازہ کھول دو یار۔" وسیم نے اسے تسلی دی۔ "میں اور شہباز صاحب ہرگز تمہیں نمونہ نہیں کہیں گے۔"

مانی نے خفا ہونے کے باوجود دروازہ کھول دیا تھا۔ یہ الیکٹرانک لاک تھا جسے اندر سے بٹن دبا کر کھولا جا سکتا تھا۔ اس مختصری گفتگو سے ظاہر تھا کہ مانی نہ صرف ہماری آوازیں سن رہا تھا بلکہ ہمیں دیکھ بھی رہا تھا اور ہم تک اپنی آواز بھی پہنچا سکتا تھا۔ شاید صرف داخلی دروازے پر ہی نہیں بلکہ اس احاطے کو پوری طرح کیمروں اور مائک کی زد میں لیا گیا تھا۔ ہم اندر آئے۔ نیچے کوٹھی میں ایک بڑی سی نشست گاہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈائننگ ہال اور کچن تھا۔ سیڑھیوں کے عقب میں اسٹڈی کے لیے مخصوص کمرا تھا لیکن اب یہ کنٹرول روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ مانی نامی نوجوان نے یہیں اپنے تمام کمپیوٹرائزڈ جاسوسی آلات لگا رکھے تھے اور نگرانی کا سسٹم ایک لیپ ٹاپ میں سیٹ کر رکھا تھا۔ کیمرے اور مائک وائرلیس پر کام کر رہے تھے۔ اور یہ سب ایک آلے کی مدد سے لیپ ٹاپ کے وائی فائی سے منسلک تھے گویا مانی اپنے لیپ ٹاپ کو کہیں بھی لے جا کر استعمال کر سکتا تھا۔

مانی دیکھنے میں واقعی ویسا ہی ثابت ہوا جیسا سفیر نے کہا تھا۔ مختصر جسامت اور چھوٹے سے قد کے ساتھ اس نے سر کے چاروں طرف پھیلے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے تھے اور اس کے ننھے سے چہرے پر بہت دبیز شیشے والی عینک

تھی۔ گورا چٹا اور بڑے نازک نقوش والا نوجوان تھا۔ اس نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور چھوٹتے ہی پوچھا۔ ”سر کیا میں آپ کو نمونہ لگتا ہوں۔“

”بالکل بھی نہیں۔“ میں نے کہا اور دل ہی دل میں خدا سے اس جھوٹ کی معافی مانگی جو میں نے اس کے ایک بندے کی دل آزاری کے خیال سے بولا تھا۔ ”جو تمہیں نمونہ کہے وہ خود نمونہ ہوگا میرے خیال میں تم آج کے جینیئس ہو۔“

وہ خوش ہو گیا اور اس نے دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”سر آپ پہلے شخص ہیں جس نے مجھے پہچانا ہے۔“

”آخری بھی یہی ہے۔“ سفیر نے سر ہلایا جس پر مانی نے سراپا فریاد بن کر میری طرف دیکھا میں نے اس کا شانہ سہلایا۔

”چھوڑو یار شوہر بن کر بعض لوگ ایسے ہی ہو جاتے ہیں یہ بتاؤ کہ تم نے یہاں کیا کیا ہے؟“

وہ جوش و خروش سے بتانے لگا کہ اس نے نگرانی کا کتنا شاندار سسٹم بنایا ہے۔ کوئی ایک درجن کیمروں اور اتنے ہی مانٹر کی مدد سے وہ اس پورے فارم ہاؤس کی نگرانی کر سکتا تھا۔ اس کے لیپ ٹاپ پر ان تمام کیمروں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے نگرانی کے لیے ایک خاص سافٹ ویئر بنایا تھا اگر کسی کیمرے کا منظر اسکرین پر نہیں ہوتا تھا اور اس کیمرے کے سامنے کوئی حرکت آتی تو سافٹ ویئر خود بہ خود اس کیمرے کا منظر اسکرین پر لے آتا تھا۔ میں متاثر ہوا تھا۔ ”یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔“

”تھینک یو سر اور یہ سسٹم جس روٹر سے منسلک کیا ہے وہ ایسے کسی لیپ ٹاپ کو یہ ڈیٹا اسی طرح دے سکتا ہے۔ یعنی ایک سے زیادہ افراد فارم ہاؤس کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ بس اس لیپ ٹاپ میں میرا بنایا ہوا سافٹ ویئر انسٹال ہونا چاہیے۔“

”تم واقعی جینیئس ہو۔“ اس بار میں نے دل سے کہا۔

”تھینک یو سر۔“ مانی خوش ہو گیا۔ ”کیا میں آپ کے لیے کافی بناؤں میں کافی بھی بہت اچھی بناتا ہوں۔“

”کیوں نہیں دوست نیکی اور پوچھ پوچھ۔“

مانی کافی بنانے چلا گیا۔ میں، وسیم اور سفیر اوپر آئے۔ اوپر کوٹھی میں دو عدد ٹیرس تھے اور تین بڑے بیڈ روم مع اٹیچ باتھ تھے۔ لیکن مجھے کہیں ہیٹنگ کے لیے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اندر سردی نہیں تھی۔ ”یہاں ہیٹنگ کا سسٹم نہیں ہے؟“

”نہیں کوٹھی سینٹرلی ہیٹڈ ہے۔“ سفیر نے بتایا۔ ”نیچے ایک چھوٹا سا تہ خانہ ہے اسی میں بھٹی لگی ہے پانی بھی اسی سے گرم ہوتا ہے۔ مانی نے آگ جلا دی ہوگی۔“

تبھی اندر سردی کا اثر خاصا کم تھا میں نے مانی کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کہاں سے ہاتھ آیا؟“

”کسی بڑے باپ کی اولاد ہے مطلب یہ کہ باپ سرکاری افسر اور راشی ہے۔ یہ اس سے نالاں ہے۔ ایک دن کچھ لوگ اسے اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ عبداللہ نے درمیان میں مداخلت کی اور اغوا کاروں کو بھاگنا پڑا۔ بس تب سے یہ عبداللہ کے سر ہو گیا۔ پھر عبداللہ کو پتا چلا کہ یہ کمپیوٹر پروگرامنگ اور آئی ٹی کے شعبے کا ماہر ہے۔ سینٹرل کمانڈ وین کے لیے ہمیں ایک آدمی کی ضرورت تھی اس لیے عبداللہ نے اسے رکھ لیا۔ یہ بھی گھر سے بھاگ کر بڑا خوش ہے۔“

”گھر سے بھاگا ہوا ہے؟“ میں چونکا۔

”ہاں‘ ورنہ اس کا باپ کسی صورت اسے ملازمت کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ یہ جس گھر میں رہتا ہے اس میں نصف درجن ملازم ہیں۔“

”اس لحاظ سے یہ زیادہ قابلِ قدر ہے۔“ میں نے سفیر سے کہا۔ ”اور تم اسے نمونہ کہتے ہو۔“

”آج کل ایسے لوگوں کو نمونہ ہی کہتے ہیں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”اگر اس کے باپ نے گم شدگی یا اغوا کی ایف آئی آر درج کرا دی ہو تو؟“

”نہیں اس نے گھر سے نکلنے کے بعد اسے فون کر کے بتا دیا کہ وہ جہاں ہے اپنی مرضی سے ہے اور خوش ہے۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ میں نے وسیم کی طرف دیکھا جو ایک کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کوٹھی پوری طرح فرنشڈ تھی حد یہ کہ کھڑکیوں پر بیش قیمت پردے تک موجود تھے۔ دس ہزار کرائے میں تو یہ کوٹھی فری تھی۔

”ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا ہے۔“ وسیم بولا۔ ”آپ دونوں کا کیا خیال ہے اب ہمیں خواتین کو بھی یہیں شفٹ کر دینا چاہیے؟“

”نہیں اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ عبداللہ کی کوٹھی میں محفوظ ہیں۔ ممکن ہے مرشد کا مقصد انہیں کوٹھی سے نکالنا ہو۔“

سفیر چونک گیا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے وہ یقیناً عورتوں کو نکالنے کی فکر میں ہوگا تب ہی صرف ایک گاڑی نے ہمارا پیچھا کیا اور عبداللہ کے آدمیوں نے آرام سے اسے ناکارہ بنا دیا۔“

”بس تو انہیں اسی جگہ رہنے دو۔ عبداللہ کوٹھی کے

حفاظتی انتظامات سخت کر دے اور ہم یہاں سے اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔“

”ایاز آئے تو اسے بھی یہیں بلا لیتے ہیں اور بیٹو کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو سیدھا ادھر ہی آئے گا۔“

”ایاز کیوں گیا ہے اس نے کچھ بتایا ہے؟“

سفیر مسکرایا۔ ”بھائی کو ہماری صحبت نے متاثر کیا ہے۔ موصوف شادی کی فکر میں ہیں۔“

”شادی کس سے؟“

”شاہین سے اور کس سے۔“

میں شاہین کو تو بھول گیا تھا۔ ”وہ کہاں ہے اب؟“

”تمہیں نہیں معلوم، ایاز اسے اپنے گھر لے گیا تھا اور وہ اس کی ماں کے پاس ہے۔“

”ماں....؟ مجھے تو یاد ہے کہ ایاز کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”وہ اپنی خالہ کو ماں سمجھتا ہے اور ماں کہتا ہے۔ وہ بیوہ ہے اور سرگودھا میں اس کی حویلی ہے۔ جب شاہین کو کہیں منتقل کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو ایاز نے پیشکش کر دی۔“

”ویسے مجھے بھی لگتا تھا کہ وہ شاہین کو پسند کرتا ہے۔“

”بھائی آگ دونوں طرف ہے برابر لگی ہوئی۔“ سفیر نے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ شادی کر کے ہی آئے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں بستر پر دراز ہو گیا اور عبداللہ کو کال ملائی۔ ”حالات کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں ابھی تک کوئی چیز معمول سے ہٹ کر سامنے نہیں آئی ہے۔“

”راستے میں گاڑی کو ہٹ کرنے کے بعد تمہارے آدمیوں نے دیکھا تھا کہ اس میں کون ہے اور پھر ان کی مدد کو کون آتا ہے؟“

”نہیں وہ کام کر کے وہاں سے نکل گئے تھے۔“ عبداللہ نے کسی قدر ندامت سے کہا۔ ”آپ کہہ رہے ہیں تو مجھے خیال آ رہا ہے ان کی نگرانی کرنی چاہیے تھی۔“

”کوئی بات نہیں آدمی ہر پہلو پر تو نظر نہیں رکھ سکتا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”مرشد کی طرف سے دوبارہ کال آئی؟“

”نہیں اس کے بعد سے کوئی کال نہیں آئی۔“

میں فکرمند ہو گیا۔ ”عبداللہ کوئی چکر ہے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، خواتین کو اسی خفیہ جگہ رکھو اور اپنے آدمیوں کو بھی ہوشیار کر دو۔ ممکن ہے مرشد کا مقصد ہمیں کوٹھی سے ہٹانا ہو۔“

عبداللہ سمجھ گیا۔ ”وہ عورتوں کے چکر میں ہے؟“

”میرا خیال ہے یہ خواتین ہماری کمزوری ہیں اور مشکل یہ ہے کہ وہ دور رہنے پر بھی تیار نہیں ہیں۔“

”گستاخی معاف دور رہنے پر تو حضرات بھی تیار نہیں ہیں۔“

میں نے وسیم اور سفیر کی طرف دیکھا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو بھائی، واقعی یہ کون سا دور رہنے پر تیار ہیں۔“

سفیر نے وسیم سے کہا۔ ”لے بھائی ہماری چغلیاں ہو رہی ہیں۔“

”ایاز کا نمبر ہے تمہارے پاس؟“

”جی وسیم صاحب نے جو موبائل آپ کو دیا ہے اس میں ہے۔“

”بیٹو کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بخار اترا نہیں ہے، ڈاکٹر ابھی چیک کر کے گیا ہے اس نے دوائی اور انجکشن بھی دیا ہے۔ امید ہے کل تک بخار اُتر جائے گا۔“

”وہ میرے پاس آنے کی ضد کرے گا لیکن جب تک اس کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتی.... تم اسے وہیں روکے رکھو گے۔ اُٹھ جائے تو میری بات کرا دینا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“

میں نے موبائل رکھا تو مانی ٹرے میں کافی کے مگ اور دوسرا سامان لے آیا تھا۔ مہک بتا رہی تھی کہ یہ نیس کیف گولڈ تھی۔ میں نے پہلا گھونٹ لیا اور بے ساختہ کہا۔ ”واقعی مان گیا تم کافی ماسٹر بھی ہو اگر یورپ چلے جاؤ تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔“

”آپ بلیک پیتے ہیں اگر کریم استعمال کرتے تو میں کریم سے ایسا ڈیزائن بنا کر دیتا کہ کافی کا ڈبل ہو جاتا۔“

”مجھے بنا کر دو۔“ سفیر نے کہا تو مانی نے صاف انکار کر دیا۔

”آپ کو تو بالکل نہیں بنا کر دوں گا آپ نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔“

”مانی بیٹے اتنا ناراض نہیں ہوتے۔“ سفیر نے اسے پچکارا۔ ”وہ تو میں تمہیں پیار سے کہتا ہوں۔“

مانی کا موڈ خوشگوار ہوا تو وہ مان گیا۔ اس نے کریم کا کون نما پاٹ اُٹھایا اور کون سے پھرتی کے ساتھ کافی پر پودے نما ڈیزائن بنا دیا۔ کریم کافی میں فوراً حل نہیں ہوتی... اس لیے یہ ڈیزائن کچھ دیر برقرار رہا تھا۔ سب نے مانی کو حیرت سے دیکھا۔ وسیم بولا۔ ”یار تم تو آرٹسٹ بھی ہو۔“

"شکریہ جناب۔" اس نے شرما کر کہا۔

"سنا ہے تمہاری اپنے ڈیڈی سے اسی وجہ سے نہیں بنی کہ وہ آرٹ وغیرہ کو بکواس سمجھتے ہیں؟" سفیر نے کہا۔

مانی اُداس ہو گیا اور اس نے اپنی مگ سے ایک لمبا گھونٹ لے کر کہا۔ "بالکل جی ان کے نزدیک دنیا میں صرف ایک آرٹ ہے اور وہ ہے دولت کمانا، وہ تو مجھے کمپیوٹر پر بھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے ان کی خواہش تھی کہ میں گریجویشن کرتے ہی سول سروس کا امتحان دوں۔ لیکن میں نے آئی ٹی کے شعبے کا انتخاب کیا اور یو ایس اے سے سافٹ ویئر انجینئرنگ کر آیا۔"

میں دم بہ خود رہ گیا۔ "تم سافٹ ویئر انجینئر بھی ہو؟"

وہ ذرا ٹرامان گیا۔ "کیوں کیا نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں یار کیوں نہیں ہو سکتے میرا تو خیال ہے تم اس سے بھی کئی آگے کی چیز ہو لیکن میں تو تمہیں انٹر کا اسٹوڈنٹ سمجھا تھا۔"

مانی ہنسا۔ "آپ غلط سمجھے ہیں جناب میں پورے پچیس برس کا ہوں۔ دو دن پہلے میرا برتھ ڈے تھا۔"

وہ دیکھنے میں مشکل سے اٹھارہ برس کا لگتا تھا۔ شاید اپنی نہ ہونے کے برابر جسامت اور نازک سے نقوش کی وجہ سے وہ اتنا کم عمر نظر آتا تھا۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی گزشتہ صبح سے جاگ رہا تھا اور پھر اتنا طویل سفر بھی کرنا پڑا تھا۔ کافی پی کر اعصاب سکون میں آئے تو نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ مانی برتن لے گیا تھا۔ سفیر نے محسوس کر لیا اس نے کہا۔ "سو جا یار.... تو تھک گیا ہوگا۔"

"آپ کے کپڑوں کا بیگ میں پہلے ہی لے آیا تھا اس الماری میں ہے۔" وسیم نے کہا۔ وہ اور سفیر بھی چلے گئے میں نے بیگ کھولا اس میں ایک موٹا سوتی پاجامہ اور جرسی کی پوری آستین کی ٹی شرٹ تھی۔ یہ نائٹ سوٹ تھا، میں نے پہنا اور کمبل میں گھس گیا۔ لیکن نیند فوری طور پر میرے نصیب میں نہیں تھی۔ سب کے ساتھ بیٹھا تھا تو خیال نہیں آیا لیکن اکیلا ہوا تو خدشات ذہن میں سانپ بن کر سرسرانے لگے تھے۔ مرشد کو اس ٹھکانے کا علم کیسے ہوا اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے کال کرنے کا مقصد کیا تھا؟ یقیناً اس کا مقصد پورا ہوا تھا اس لیے اس نے دوبارہ کال نہیں کی۔ پتا نہیں کس طریقے سے چل سکتا تھا ممکن ہے وسیم، سفیر یا کوئی اور مرشد کے آدمیوں کی نظر میں آ گیا ہو یا جب میں آ رہا تھا تو ہمارا تعاقب کیا گیا ہو اور مجھے بھی یہی بات قرین قیاس لگ رہی تھی۔ تب ہی مرشد نے پورے یقین سے کہا تھا کہ میں اس کوٹھی میں ہوں اور وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ زیادہ اُلجھن کی بات مرشد کا مقصد تھا۔ اس نے یوں کال کر کے مجھے ہوشیار کیوں کیا؟ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا بس ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ مرشد کا مقصد مجھے اور میرے ساتھیوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ کیا چاہتا تھا؟ کیا یہ ٹھکانہ کسی طریقے سے اس کی نظروں میں آ گیا تھا؟ ہم نے آتے ہوئے ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن کوئی سو فیصد تو نظر نہیں رکھ سکتا ہے۔ ممکن ہے تعاقب کرنے والے اتنے ہوشیار ہوں کہ ہم ان کا پتا ہی نہیں چلا سکے ہوں۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا کہ کہیں فتح خان نے تو مرشد کو میرے اس ٹھکانے کا نہ بتا دیا ہو۔ فتح خان کے بارے میں مجھے شک تھا کہ وہ عبداللہ والی کوٹھی سے آگاہ ہے لیکن اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اب وہ چوٹ کھائے سانپ کی طرح مشتعل تھا۔ وادی میں اس کی ناکامی کے اسباب میں میں بھی شامل تھا اور اب وہ مجھ سے اس ناکامی کا بدلہ لینا چاہتا ہوگا۔ سویرا اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اس لیے اس نے یہ چال چلی اور مرشد کو عبداللہ والی کوٹھی کے بارے میں بتا دیا۔ مرشد کے آدمیوں نے کوٹھی کی نگرانی شروع کر دی ہوگی۔ اس لیے جیسے ہی میں وہاں پہنچا مرشد کو خبر ہو گئی۔

یہ مفروضہ دل کو لگنے والا تھا لیکن یقینی بات نہیں تھی۔ دوسرے مرشد کوٹھی اور وہاں میرے وجود سے واقف ہو گیا تھا۔ اس لیے زیادہ غور کرنا سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات ہو سکتی تھی۔ اصل بات یہی تھا کہ مرشد نے کال کیوں کی؟ ان سوالوں اور سوچوں نے میری نیند اُڑا دی تھی۔ پھر مجھے ایک خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اگر سفیر یا وسیم میں سے کوئی جاگ رہا ہے تو اس سے تبادلہ خیال کر لوں۔ میں اُٹھ کر باہر آیا۔ سفیر بے خبر سو رہا تھا لیکن وسیم اس سردی کے عالم میں کوٹھی کی چھت پر گیا ہوا تھا۔ وہ واپس آیا تو میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا اور اسے اپنے خیالات سے آگاہ کیا، اس نے سر ہلایا۔ "آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے کہ یہ فتح خان کی شرارت ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مرشد نے وہاں کال کیوں کی؟ وہ خاموش رہ کر کہیں زیادہ فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔"

"یہی تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اسے کال کر کے دیکھتے ہیں۔"

"موبائل سے؟" وسیم نے پوچھا۔

"نہیں باہر چلتے ہیں اسلام آباد میں کئی پی سی او ساری رات کھلے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"مانی سے نہ معلوم کریں اس نے یہاں انٹرنیٹ کا سیٹ اپ بھی کیا ہے۔ اس کے پاس ذاتی سیٹلائیٹ انٹرنیٹ کا سسٹم ہے چھوٹا سا انٹینا ہے جو چھت پر لگا ہے۔ اسے وین کی چھت پر بھی لگایا جا سکتا ہے اس کے ماہانہ بل کی ادائیگی عبداللہ نے لے لی ہے۔"

"ٹھیک ہے آؤ پہلے اس سے معلوم کرتے ہیں ویسے انٹرنیٹ سے کالز ہوتی ہیں۔"

مانی سے پوچھا تو اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ "سر جی اتنا سا کام بھی نہ کر سکوں تو پھر میرا فائدہ ہی کیا ہے؟"

"یعنی ہم انٹرنیٹ کی مدد سے کال کر سکتے ہیں اور کوئی اس کال کو ٹریس نہیں کر سکے گا۔"

"کسی کا باپ بھی نہیں کر سکے گا بیشک حکومت بھی کوشش کر لے۔" مانی نے دعویٰ کیا۔ "آپ نمبر بتائیں۔"

میں نے اسے مرشد ہاؤس کے فکسڈ فون نمبر بتائے وہ مجھے زبانی یاد تھے۔ مانی نے انٹرنیٹ پر کچھ دیر کام کیا اور پھر ایک بلوٹوتھ ایئر فون مائک میری طرف بڑھایا یہ کمپیوٹر سے بلوٹوتھ کی مدد سے منسلک تھا۔ جب میں نے اسے کان پر سیٹ کر لیا تو مانی نے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور مجھے بیل جانے کی آواز آنے لگی۔ فوراً ہی کسی نے کال ریسیو کی اور مجھے اسی نستعلیق لہجے والے شخص کی آواز آئی۔ "ہیلو کس سے بات کرنی ہے؟"

"مجھے مرشد سے بات کرنی ہے۔"

"آپ کون بات کر رہے ہیں؟"

"تمہیں نہیں معلوم میں اس کا والد نمبر پانچ جہنم سے بات کر رہا ہوں۔"

"جناب یہ طرزِ گفتگو مناسب نہیں ہے۔" آدمی نے جھنجلا کر کہا۔

"واقعی مرشد کے لیے اتنا شریفانہ طرزِ گفتگو مناسب نہیں ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "بہر حال اصل گفتگو مجھے اسی سے کرنی ہے۔ کال اسے ٹرانسفر کرو اور کال کا سراغ لگانے میں بے کار وقت ضائع مت کرنا۔ اس کا پتا نہیں چلے گا کہ میں کہاں سے کال کر رہا ہوں۔"

"ایک منٹ ہولڈ کریں۔" اس نے کہا اور غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مرشد کی آواز آئی۔ "شہباز بالآخر تم نے مان لیا۔"

"کیا مان لیا؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"اس کوٹھی میں تم تھے۔"

"مرشد اگر اس کوٹھی میں تھا تو اب نہیں ہوں۔ وہ صرف ایک ٹھکانہ ہے اور اب تمہیں وہاں میں یا میرا کوئی ساتھی نہیں ملے گا۔"

"مجھے معلوم ہے وہ راجا عمر دراز کی کوٹھی ہے اور وہاں اس کے ملازمین ہوتے ہیں۔"

"مجھے حیرت ہے تم نے وہاں کال کی اور مجھ سے بات کرنا چاہی۔ تمہارا یہ رویہ مجھے ہضم نہیں ہو رہا ہے۔"

"شہباز میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن فون پر نہیں آمنے سامنے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ اس میں میرے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔" میں نے انکار کر دیا۔ "ویسے تم اس کال کو محفوظ سمجھو۔"

"تمہاری طرف سے تو محفوظ ہے لیکن....." وہ کہتے کہتے رک گیا مجھے حیرت ہوئی اس وقت اس کا لہجہ ململ ہو رہا تھا اور اس میں کہیں بھی کلف یا کروفر نظر نہیں آ رہا تھا۔ "تم اپنا کوئی نمبر دے دو میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

ایسا لگ رہا تھا جیسے مرشد کو اپنی فون لائنوں پر اعتبار نہ رہا ہو اور وہ مجھ سے کسی محفوظ نمبر سے بات کرنا چاہ رہا ہو۔ لیکن یہ اس کی طرف سے دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ اس طرح وہ میرا سراغ لگانا چاہ رہا ہو۔ میں نے کہا۔ "اس کے بجائے تم مجھے اپنا کوئی نمبر دے دو میں اس پر کال کر لیتا ہوں۔"

اس نے ایک موبائل نمبر دیا۔ "دس منٹ بعد اس پر کال کر لینا۔"

میں نے نمبر ایک کاغذ پر لکھا اور مانی کو کال منقطع کرنے کا اشارہ کیا اس نے کال کاٹ دی تو میں نے موبائل نمبر اس کی طرف بڑھایا۔ "دس منٹ بعد اس پر کال کرنی ہے۔"

"موبائل ہے۔" مانی نے کہا۔ "لیکن ہو جائے گی بس کچھ آواز کا مسئلہ ہوگا اگر آواز کچھ دیر کے لیے غائب ہو جائے تو پریشان مت ہوئیے گا اور ذرا رک رک کر بات کریے گا۔"

"رک رک کر کیوں؟" وسیم نے پوچھا۔

"یہ ڈیجیٹل سسٹم ہوتا ہے آواز پیکٹ کی صورت میں سفر کرتی ہے اگر تیز بولیں گے تو زیادہ پیکٹ بنیں گے اور رفتار کم ہو جائے گی۔ آواز کٹنے لگے گی۔ لیکن آہستہ بولیں تو آواز نہیں کٹے گی۔"

مانی نے وضاحت کی اور اپنے کام میں لگ گیا اور میں نے وسیم کو مرشد کی گفتگو سنائی کیونکہ میری بات تو وہ سن رہا

تھا۔اس نے سر ہلایا۔''اس کا مطلب ہے کہ مرشد یا تو کسی چکر میں ہے یا پھر وہ خود کسی چکر میں آ گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''شہباز صاحب دونوں بھائیوں کی علیحدگی اور نادر کا مرشد سے دور رہنا ثابت کرتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔''

''لیکن فاضلی دونوں کے لیے کام کر رہا ہے' اگر کوئی چکر ہوتا تو وہ کسی ایک بھائی کے ساتھ ہوتا۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''ممکن ہے مرشد نے اسے نادر کے ساتھ لگا رکھا ہو کیونکہ آدمی وہ مرشد کا ہی ہے۔''

''ہاں' مرشد ایسا ہی آدمی ہے اپنے بھائی پر بھی اعتبار نہ کرنے والا۔'' وسیم نے سوچ کر کہا۔

''کیا بات کر رہے ہو کیسا بھائی اور کہاں کا بڑا بھائی؛ یہ سب بھیڑیے ہیں جن کا کام ہی کمزوروں کا شکار کرنا ہے۔ان میں رشتوں کا کوئی پاس نہیں ہے، اگر کوئی بھیڑیا کمزور پڑ جائے تو دوسرے بھیڑیے اسے پھاڑ کھاتے ہیں یہی حال ان بھائیوں کا بھی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' ہانی نے لقمہ دیا۔''یہ بہت ہی گھٹیا قسم کے اور ذلیل لوگ ہیں۔''

''تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو نہیں لیکن ڈیڈی ان کے بارے میں بات کرتے رہتے ہیں۔وہ وزارت داخلہ میں ہیں تو مرشد جیسے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔اس لیے وہ ان کے بارے میں جانتے ہیں۔''

میں نے گھڑی دیکھی۔''دس منٹ ہونے والے ہیں۔''

''میں کال ملا رہا ہوں۔'' ہانی نے کہا اور کال ملانے لگا۔کچھ دیر میں بیل جانے لگی اور مرشد نے کال ریسیو کی اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''یہ تم کس نمبر سے کال کر رہے ہو؟''

''کیوں کیا تمہارے موبائل پر نمبر نہیں آ رہا ہے؟''

''نہیں صرف اَن نون لکھا ہے۔''

''میری کالز آئندہ ایسے ہی نمبروں سے آئیں گی اس لیے تم کام کی بات کرو۔''

''شہباز کام کی بات یہ ہے کہ میں اب دشمنی کا یہ چکر ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' مرشد نے کہا۔

''مرشد تم اس قسم کی باتیں پہلے بھی کئی بار کر چکے ہو' لیکن افسوس کہ تمہاری باتیں صرف باتیں ہوتی ہیں اور عملی طور پر تم مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس بار معاملہ مختلف ہے۔'' مرشد نے بُرا مانے بغیر اعتراف کیا۔''تم اچھی طرح جانتے ہو دشمنی کا یہ چکر کس طرح شروع ہوا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ چکر نادر نے شروع کیا؟''

''بالکل ٹھیک .... یہ سب اس کا کیا دھرا تھا، مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کے ساتھ دشمنی میں برابر کا شریک رہا اور تمہارے ساتھ جو ہوا اس میں میرا حصہ بھی ہے لیکن اب میں اس چکر سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''کیا اس لیے کہ اب نادر سے تمہارے برادرانہ تعلقات نہیں رہے....؟'' میرا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔

''تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔''لیکن اب میں اس چکر سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں نے مان لیا کہ تم نکلنا چاہتے ہو لیکن نادر تو مجھے اور میرے ساتھیوں کے بدستور در پے آزار رہے گا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔''جب تک وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا یہ دشمنی کس طرح ختم ہو سکتی ہے؟''

''تم چاہو تو میں اس معاملے میں بھی تم سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں ورنہ میری طرف سے یہ یقین دہانی ہے کہ میں یا میرا کوئی آدمی اب تمہارے یا تمہارے ساتھیوں کے پیچھے نہیں آئے گا۔''

میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔''کس قسم کا تعاون .... کیا تم نادر کو اس دشمنی سے باز رکھ سکتے ہو جبکہ اس سے تمہارے تعلقات بھی نارمل نہیں رہے ہیں؟''

''نادر پاگل ہو گیا۔'' مرشد نے آہستہ کہا۔''تم جانتے ہو جب کتا پاگل ہو جائے تو اس کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے؟''

میں ہنسا۔''تم نے برادر خورد کو فارسی والی مثال دے دی۔بہر حال' یہ تمہارا فیملی میٹر ہے۔اگر تمہارا اشارہ اس طرف ہے کہ نادر کے ساتھ وہی کیا جائے جو پاگل ہو جانے والے کتے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔تو میں تم سے متفق ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ میں اس سلسلے میں تم سے کیا تعاون کر سکتا ہوں؟''

''شہباز میں جانتا ہوں تم نے نادر کی رہائش کا پتا لیا ہے۔اگر تم چاہو تو اسے آسانی سے ختم کر سکتے ہو۔''

''مرشد تم نے میرے بارے میں نہایت غلط اندازہ لگایا ہے۔'' میرا لہجہ سخت ہو گیا۔''جہاں تک کسی کو آسانی سے ختم کرنے کا تعلق ہے اگر میں ایسا مزاج رکھتا تو دشمنی کا یہ

بہت پہلے ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ تم میں سے کوئی دشمنی نبھانے کے لیے زندہ نہ ہوتا لیکن میں قاتل نہیں ہوں۔ میں صرف اپنے بچاؤ کے لیے کسی پر ہاتھ اُٹھا سکتا ہوں۔"

"اس صورت میں نادر کا مسئلہ رہے گا۔"

"تو یہ تمہارا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے تم خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے؟..؟.... نہ تو تمہیں وسائل کی کمی ہے اور نہ حکم کی تعمیل کرنے والے بندوں کی۔"

"شہباز میرے کچھ خاندانی مسائل ہیں جن کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔" وہ بولا۔

"مجھے ان مسائل کا بھی علم ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے مرشد مجھے حیرت ہے کہ آج تم اتنی کھل کر بات کر رہے ہو۔"

"کیونکہ میں پوری نیک نیتی سے بات کر رہا ہوں۔"

"اور میں پوری نیک نیتی سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہاری بات پر بالکل یقین نہیں آرہا.....۔" میں نے کہا۔

"میں نے اس بار بات کرنے سے پہلے اپنی نیک نیتی کا عملی ثبوت دے دیا ہے۔" اس نے کہا۔

میں اس کا اشارہ سمجھ رہا تھا لیکن انجان بنا رہا۔

"وہ کیسے؟"

"اگر میری نیت خراب ہوتی تو میں سرے سے راجا عمر دراز کی کوٹھی پر کال نہ کرتا۔ میں اپنے آدمی بھیجتا اور وہ اس کوٹھی کو بموں سے اُڑا دیتے۔"

"یہ اتنا آسان تو نہ ہوتا لیکن میں تمہاری بات تسلیم کرتا ہوں کہ تم چاہتے تو ایسا بھی کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود ابھی میرا ذہن اس بات کو ہضم نہیں کر سکا ہے۔"

"یہ تو آغاز ہے۔" اس نے کہا۔ "جلد تمہیں یقین بھی آجائے گا۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے بس میں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اب میری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر تم چاہو تو اپنی نیک نیتی کا ایک ثبوت اور دے سکتے ہو؟"

"وہ کیا؟"

"یہ بتا کر کہ تمہیں راجا عمر دراز کی اس کوٹھی کا کس طرح پتا چلا؟"

"فتح خان سے۔" اس نے بلا جھجک کہا۔ "اسی نے بتایا کہ تم ابھی اس کوٹھی میں ہو۔"

"فتح خان۔" میں نے گہری سانس لی۔ "یہ شخص بلا وجہ میرے پیچھے پڑ گیا حالانکہ میں نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی کبھی اس کا راستہ کاٹنے کی کوشش کی۔ مرشد علی کیا تم جانتے ہو کہ پچھلے کچھ عرصے میں تمہیں ہونے والا مالی نقصان کس نے پہنچایا ہے؟"

"میں جانتا ہوں یہ فتح خان کا کام ہے۔" وہ بولا۔ "جس دن بھی وہ میرے قابو میں آگیا اسے ان نقصانات کا حساب دینا ہوگا۔"

اس نے بات مکمل کرتے ہی فون بند کر دیا۔ وسیم اور مانی خاموشی سے میری بات سن رہے تھے۔ میں نے وسیم کو بتایا کہ مرشد کیا چاہتا ہے؟ یک طرفہ گفتگو سے بھی اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا لیکن مرشد کی بہت ساری باتیں اس کے علم میں نہیں آئی تھیں۔ میری بات سن کر اس نے کہا۔ "مرشد کی یہ بات دل کو لگ رہی ہے کہ اس نے کوٹھی فون کر کے اپنی نیک نیتی کا اولین ثبوت دیا ہے۔"

"اس کے باوجود میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ اس وقت وہ کسی وجہ سے مجبور ہے۔"

"وجہ بالکل سامنے کی بات ہے وہ چالاکی سے کام لے کر نادر کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے کیونکہ وہ اس کی راہ کی رکاوٹ بن گیا ہے۔"

"نادر اتنی بڑی رکاوٹ نہیں بنا ہے بلکہ مرشد کی مونوپلی نے باقی خاندان والوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کی آمریت کا تختہ اُلٹ دیں۔ یہ ایک فیملی بزنس ہے۔ تم چاہو تو اسے فیملی مافیا بھی سمجھ سکتے ہو جس میں ایک فرنٹ مین سامنے رہ کر پورا بزنس چلاتا ہے وہ خطرات مول لیتا ہے۔ اس لیے اصل آمدنی کا حقدار وہ ہوتا ہے باقی فیملی ممبر ایک طرح سے حصے دار ہوتے ہیں اور انہیں سال کے سال آمدنی میں حصہ ملتا ہے۔ یقیناً مرشد کے خاندان میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا لیکن اکثر مافیاؤں کے سربراہ بے ایمان ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ وہی ہیں اور جب وہی سب کچھ ہیں تو کسی اور کو حصہ کیوں دیں؟ یہاں سے خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔ گدی نشینوں کے درمیان آپس میں لڑائی کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

وسیم غور سے میری بات سن رہا تھا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ مرشد کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی اتنے طاقتور ہیں کہ مرشد ان کے سامنے مجبور ہو رہا ہے ورنہ وہ انہیں کب کا ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔"

"بالکل' میرا یہی مطلب ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "اب خاندان کے دوسرے لوگ اس چکر میں ہیں کہ مرشد کی جگہ نادر کو گدی پر بٹھا دیں۔ وہ مکمل طور پر معذور ہو چکا ہے اور اس طرح وہ خاندان کے لوگوں کے قابو میں رہے گا۔ مرشد کی طرح بے قابو نہیں ہو جائے گا۔ مرشد اس خطرے کو بھانپ چکا ہے اور فی الحال اس کا سدِباب اس طرح کر رہا ہے کہ نادر کا کانٹا درمیان سے نکال دے۔"

"اس کے لیے بندوق وہ ہمارے کندھے پر رکھ کر چلانا چاہتا ہے؟"

"یہی اصل نقطہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نادر ہماری وجہ سے اس حال کو پہنچا ہے اور وہ ہمارا شدید ترین دشمن ہے اور لازمی بات ہے ہم بھی دشمنی میں کچھ کم جذبات نہیں رکھتے اس لیے اگر نادر مارا جاتا ہے تو نام ہمارا آئے گا۔"

وسیم نے سوچ کر کہا۔ "تب مرشد اسے مار کر الزام ہمارے سر کیوں نہیں ڈال رہا ہے؟"

"یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہے ممکن ہے مرشد ایسا کرتے ہوئے ڈر رہا ہو کہ بات خاندان والوں پر کھل سکتی ہے یا اس کام کے لیے اس کے پاس قابلِ اعتماد بندے نہ ہوں۔"

"بندے تو بہت ہوں گے لیکن مرشد خود کسی پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔" وسیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ "شہباز صاحب نہ جانے کیوں مجھے اس معاملے میں گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔"

"مرشد دھوکے باز آدمی ہے، اس سے کسی قسم کے خلوص کی توقع بیکار ہے۔ اگر اس نے کوٹھی پر دھاوا نہیں بولا تو اس کے پس پشت یقیناً کوئی بڑی چال ہوگی۔" میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "پہلے نیند نہیں آرہی تھی' لیکن مرشد سے بات کر کے مجھے نیند آنے لگی ہے۔"

وسیم مجھے سمجھنے لگا تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ "یعنی آپ کے خیال میں اب خواتین کو اتنا خطرہ لاحق نہیں رہا ہے۔"

"ہاں' ورنہ اس سے پہلے میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ مرشد اصل میں ان کے چکر میں ہے اور ہمیں وہاں سے نکال کر خود دھاوا کرنا چاہتا ہے۔"

"لیکن ہمیں اس معاملے میں بالکل بھی بے فکر نہیں ہو جانا چاہیے۔"

"لازمی بات ہے ہمارا مقابلہ مرشد جیسے مکّار دشمن سے ہے۔ اگر اسے معلوم ہوگا کہ کوٹھی میں عورتیں بھی ہیں تو ہمیں مجبور کرنے کے لیے وہ انہیں بھی استعمال کر سکتا ہے۔"

"بالکل کر سکتا ہے۔" وسیم نے زور دے کر کہا۔ "جب وہ کام فتح خان کر سکتا ہے تو مرشد فتح خان سے کہیں زیادہ مکّار اور کمینہ دشمن ہے۔"

"عبداللہ نے کوٹھی میں کوئی خفیہ جگہ بنا رکھی ہے جس سے صرف وہی واقف ہے۔ اس نے ان تینوں کو فی الحال وہیں رکھا ہوا ہے۔ اگر باہر سے کوئی دشمن کسی طرح کوٹھی میں داخل بھی ہو جائے تو وہ ان کو آسانی سے تلاش نہیں کر سکتا۔"

"اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ انہیں جلد از جلد وہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔"

میں نے وسیم سے اتفاق کیا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن پہلے اس کے لیے یہ یقین کرنا ہوگا کہ مرشد کے آدمی کوٹھی کے آس پاس موجود نہیں ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں جناب۔" وسیم نے سر ہلایا۔ "اب آپ آرام کریں کل میں آپ کو وین دکھاؤں گا۔"

مجھے اب نیند آرہی تھی لیکن سونے سے پہلے میں ایک کام کرنا چاہتا تھا میں نے مانی سے پوچھا۔ "یہاں کوئی اور کمپیوٹر ہے۔ مجھے انٹرنیٹ پر کام ہے۔"

"ایک لیپ ٹاپ اور ہے۔" اس نے کہا اور ایک طرف رکھی چھوٹے سائز کی نوٹ بک اُٹھا لایا۔ "اس میں وائی فائی بھی ہے اس گھر میں بلکہ گھر سے باہر بھی سو میٹر کے دائرے میں آپ انٹرنیٹ استعمال کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ۔" میں نے اس سے نوٹ بک لے لی اور اوپر کمرے میں آگیا۔ میں نے اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولا اور وہ کھل گیا اس کا مطلب تھا کہ فتح خان نے اس کے پاس ورڈ میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ شاید اس نے ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ وہ اپنا کام تو نکال چکا تھا۔ میں نے سب سے پہلے پاس ورڈ تبدیل کیا اور پھر ایمن کو میل کی' اس سے خیریت اور اس مسئلے کے حوالے سے پروگریس پوچھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسی ای میل کمپنی کے میسنجر پر اسی آئی ڈی کے ساتھ مل لاگ اِن ہوں گا وہ مجھ سے بات کر لے گی یا اس کا کوئی فون نمبر ہے تو وہ مجھے ای میل کر دے میں اس سے رابطہ کر لوں گا۔ یہ کام کر کے میں نے نوٹ بک بند کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس بار مجھے چند منٹ بعد ہی نیند آگئی تھی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو ایک طرف کھڑکی کے ہٹے پردے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ میں اُٹھ کر واش روم میں آیا اور وہاں سے فارغ ہو کر سب سے پہلے عبداللہ کو کال کی۔

"کیا حال ہیں سب ٹھیک ہے؟"

"جی جناب' ایوری تھنگ از آل رائٹ۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ سنائیں؟"

"میں ٹھیک ہوں اور یہ تم نے زبردست چیز تلاش کی ہے۔"

"مانی۔" وہ ہنسا۔ "آپ اسے چیز کہہ رہے ہیں بُرا مان جائے گا۔ ویسے ہے بہت کام کا لڑکا۔ آئی ٹی اور کمپیوٹر

سے متعلق کوئی مسئلہ ہو چند منٹ میں حل کر دیتا ہے۔ اس نے کوٹھی کا کمپیوٹرائزڈ سیکورٹی سسٹم بھی آپ گریڈ اور استعمال میں بہت آسان کر دیا۔ اب ہم اس کی مدد سے نائٹ ویژن سینسرز بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

"یہاں بھی اس نے کیمروں اور مائک کی مدد سے بہترین سیکورٹی سسٹم بنا رکھا ہے، ایک آدمی آس پاس ہر جگہ نظر رکھ سکتا ہے۔ کل رات میری مرشد سے بات ہوئی ہے۔"

"مرشد سے۔" عبداللہ نے فکر مندی سے کہا۔ "کیا اس کی کال آئی تھی؟"

"نہیں میں نے کی تھی۔ مانی نے انٹرنیٹ کی مدد سے کال ملائی تھی جس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔"

"کیا بات ہوئی اس سے؟"

"مرشد کا رویّہ بدلا ہوا ہے اور وہ صلح کی بات کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے کوٹھی پر کال کی اور اسے وہاں کا پتا فتح خان نے بتایا اس خبیث نے یہ بھی بتا دیا کہ میں بھی وہیں ہوں۔"

"صلح کی وجہ؟"

"مرشد اور نادر میں کھٹ پٹ ہو گئی ہے۔ گدی نشینی کی خاندانی سیاست کا معاملہ ہے۔ خاندان والے مرشد سے بیزار ہیں اور اس کا تختہ اُلٹ کر نادر کو گدی پر بٹھانا چاہتے ہیں۔"

"اور مرشد کیا چاہتا ہے؟"

"وہ سِرے سے نادر کا پتّا ہی صاف کرنا چاہتا ہے، اس نے کہا ہے وہ اب اس دشمنی سے ہاتھ اُٹھا رہا ہے۔ وہ یا اس کا کوئی آدمی اب ہمارے خلاف کسی کارروائی میں شریک نہیں ہوگا۔"

"کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ ... وہ مرشد کا آدمی ہے۔" عبداللہ بولا۔ "جنابؒ مجھے اس پر بالکل اعتماد نہیں ہے بلکہ مجھے تو شک ہے کہ دونوں بھائی مل کر ڈراما کر رہے ہیں ورنہ فاضلی دونوں کے لیے کیسے کام کر رہا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو رات میں نے وسیم سے بات کی تو یہی ساری باتیں ہمارے ذہن میں بھی موجود تھیں۔ اب تصویر یہ بن رہی ہے کہ مرشد کسی معاملے میں ہمیں استعمال کرنا چاہ رہا ہے اور اسی لیے اس نے جاننے کے باوجود کوٹھی پر حملہ نہیں کیا۔ اس کا امکان ہے کہ وہ خواتین سے لاعلم ہے' لیکن ممکن ہے یہ اس کی چال ہو' وہ ان کو قبضے میں لینے کی فکر میں ہو تا کہ ہمیں مجبور کر سکے۔ تمہیں ان لوگوں کے لیے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ساتھ ہی کوئی ایسا پلان سوچو کہ اگر انہیں کوٹھی سے کہیں اور منتقل کرنا ہو تو یہ کام بہ حفاظت کیا جاسکے۔"

"میں اس پر پہلے ہی کام کر رہا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔ "ممکن ہے ایک دو دن میں یہ کام کر بھی لوں۔ ہاں ایک بات کا ذکر کرنا تو بھول گیا۔ کل رات اجنبی نمبر سے ایک کال آئی۔ بولنے والی عورت تھی اور اس نے ایک موبائل نمبر دے کر کہا کہ آپ اس سے رابطہ کریں۔"

"اس نے اپنا نام بتایا، کال تم نے ریسیو کی تھی؟"

"نہیں منیر تھا، رات میں اس کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ عورت نے کال کرتے ہی پہلے نمبر لکھنے کو کہا اور جب منیر نے نمبر لکھ لیا تو اس نے صرف اتنا کہہ کر کال کاٹ دی۔ شہباز سے کہنا مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کرے۔"

"نمبر بتاؤ۔"

عبداللہ نے نمبر بتایا جو میں نے ذہن نشین کر لیا اور پھر نیچے آیا۔ سغیر اور وسیم کچن میں موجود تھے۔ وسیم انڈے پھینٹ رہا تھا اور سغیر پراٹھے بنا رہا تھا۔ میں چھوٹی سی میز پر آبیٹھا۔ "ماشااللہ کیا سگھڑ پن ہے لگتا ہے، میری غیر موجودگی میں خواتین نے تم دونوں کو خاصا ٹرینڈ کیا ہے۔"

"یہ ہمیں پہلے سے آتا ہے۔" سغیر نے جواب دیا۔ "یہ جو تو شادی سے پہلے کڑھائی اور بروسٹ بناتا رہا ہے کیا اس کا کریڈٹ سویرا کو جائے گا؟"

"وہ الگ بات ہے لیکن اتنی مہارت سے گول پراٹھے بنانا اور یوں انڈا پھینٹنا بغیر ٹریننگ کے نہیں آتا۔"

"اچھا یار جو تو سمجھتا رہے۔" سغیر بھنا گیا۔ "اب خواتین والے سارے کام ہم ہی کریں گے۔"

"بس ایک کام مت کرنا ورنہ ساری دنیا میں شہرہ ہو جائے گا۔" میں ہنسا تو سغیر نہیں سمجھا لیکن وسیم سمجھ گیا اور اس نے قہقہہ مارا تھا۔ سغیر ذرا دیر سے سمجھا اور پھر اس نے جوابِ جاہلاں باشد خموشی مناسب سمجھا۔ ذرا دیر میں ناشتا لگ گیا۔ مانی کو اطلاع ملی تو وہ دوڑا آیا اور آتے ہی شکوہ کیا۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے جنابؒ اگر میں ملازم ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے بچا کھچا کھلایا جائے۔"

"بچا کھچا۔" سغیر دم بہ خود رہ گیا۔ "اوہ بھائی ابھی ہم میں سے کسی نے نوالہ نہیں توڑا ہے۔"

مانی نے سب سے پہلے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ "میں سب سے آخر میں بلائے جانے کو بچا کھچا ہی سمجھتا ہوں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "برخوردار ہر معاملے جینیئس ہے۔"

دیر مناسب نہیں تھی کیونکہ پراٹھے اور انڈے بڑی تیزی سے معدوں میں منتقل ہو رہے تھے اور کچھ دیر بعد میز پر کچھ

رہ جاتا۔ سغیر کتنا ہی سگھڑ سہی لیکن وہ خواتین کی طرح کھانے کی لامحدود سپلائی نہیں دے سکتا۔ ناشتے کا صفایا کر کے میں اور وسیم چائے کے مگ تھامے باہر پورچ میں آئے۔ جہاں کمانڈ وین کھڑی تھی۔ یہ فل سائز وین تھی اور پیچھے سے اس کا کیبن خاصا بڑا تھا۔ وسیم نے ریموٹ سے اس کا دروازہ اِن لاک کیا اور ہم اندر آئے۔ اندر سے وین بالکل اسی طرح کمپیوٹرائزڈ آلات اور اسکرینوں سے سجی تھی جیسی کہ ہم فلموں میں دیکھتے ہیں۔ اس میں ایک طرف بڑی ایل سی ڈی اسکرین تھی اور دوسری طرف دو چھوٹی اسکرینیں تھیں۔ کئی کی بورڈز تھے اور دیوار پر ہی کئی طرح کے جنکشن باکس نظر آرہے تھے۔

"ان آلات کی مدد سے وین کے آس پاس کئی سو گز کی دوری تک نظر رکھی جاسکتی ہے۔ اس کا اپنا کمیونیکیشن سسٹم ہے جو مخصوص آلات کی مدد سے استعمال کیا جاسکتا ہے اور اسے پکڑنا مشکل ہے۔ اس کا دائرہ تین کلومیٹرز تک ہے اس میں آواز اور تصویر دونوں کی ترسیل شامل ہے۔" وسیم نے ایک چھوٹا سا آلہ اُٹھا کر دکھایا۔ یہ بہ ظاہر سر پر پہننے والی فلیش لائٹ کی طرح تھا۔ "اس میں ویڈیو کیمرا ہے، مائک ہے اور ائرفون ہے۔ کیمرے میں نائٹ ویژن کا آپشن بھی ہے۔"

"یہ تو بہت کام کی چیز ہے۔" میں نے تعریف کی۔

وسیم نے کمپیوٹر آن کیا۔ "اس میں چار پروسیسرز والا جدید ترین منی کمپیوٹر نصب ہے جو اس سارے نظام کو کنٹرول کرتا ہے۔ وین میں جتنے سینسرز اور آلات لگے ہیں وہ سب اس سے منسلک ہیں جیسے وین کے اوپر ایک طاقتور دوربین لگی ہے۔" وسیم نے کہا اور ایک کی بورڈ پر چند بٹن دبائے فوراً وین کی چھت سے ہلکی سی آواز آئی اور بڑی اسکرین پر باہر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ "یہ دوربین چھت سے بھی کوئی دو میٹر اوپر چلی جاتی ہے جس سے دور کی چیز بھی دیکھی جاسکتی ہے۔"

میں اسکرین پر باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ فارم ہاؤس کے گیٹ کے اوپر سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وسیم نے منظر کو زوم کیا اور یہ اتنا واضح ہو گیا کہ روڈ سے گزرتی گاڑیوں میں موجود افراد کے چہرے بھی صاف نظر آنے لگے تھے جبکہ وہ یہاں سے کم سے کم ایک فرلانگ دور تھے۔ دوربین کی کارکردگی واقعی بہترین تھی۔ وسیم نے دوربین اندر کی اور پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ "کمپیوٹر میں اس پورے علاقے کا نہایت تفصیلی نقشہ ہے۔ اگر اس وین کو کہیں اور لے جائیں تو اس علاقے کا مکمل نقشہ صرف ایک منٹ میں انٹرنیٹ سے مل جائے گا۔ اس نقشے کی مدد سے کہیں بھی جانا نہایت آسان ہوگا۔"

اس کے علاوہ بھی وین میں اور بہت سارے فنکشن تھے۔ وسیم نے جہاں سے وین کو بنوایا تھا وہیں اس نے پوری وین پر ایک اضافی فولادی شیٹ چڑھوائی تھی اس سے وین کسی حد تک بلٹ پروف ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح کے تھے کہ ضرورت پڑنے پر وین گیس یا دھواں پروف ہو سکتی تھی' اگر اس کے باہر گیس یا دھواں ہو اس کا اثر اندر تک نہیں آئے گا۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ "تم نے سامان کہاں سے لیا؟"

وہ مسکرایا۔ "کوئٹہ کے پاس ایک مارکیٹ ہے' وہاں اس قسم کا بہت سامان بکتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے۔ کیونکہ سرحد پار سے اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ تر آلات میں نے وہیں سے منگوائے ہیں البتہ کمپیوٹر یہیں ایک فرم سے نصب کرایا اور سافٹ ویئرز کا سارا کام مانی نے کیا ہے۔ اس کا آپریٹنگ سسٹم بھی اسی نے ترتیب دیا۔"

وین اچھی چیز تھی اور کسی مہم کے سلسلے میں بہت کام آسکتی تھی۔ ہم باہر آئے اور لان پر رکھی کرسیوں پر آگئے۔ دُھوپ اچھی تھی۔ ہماری گفتگو مرشد اور اس کی کال کی طرف مڑ گئی پھر میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ وسیم نے کہا۔ "یہی بہتر ہے جب تک عبداللہ کوئی ایسا پلان نہ بنا لے جس میں خواتین کو بہ حفاظت وہاں سے منتقل کیا جاسکے انہیں وہیں رہنا چاہیے۔"

"ہاں' ایک نئی بات ہوئی کل رات کوٹھی میں کسی عورت کی کال آئی تھی اس نے اپنا نمبر دیتے ہوئے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔"

وسیم چونکا۔ "کیا عبداللہ والی کوٹھی شاہراہ عام بن گئی ہے جو ہر کوئی وہاں پہنچ رہا ہے۔"

"مجھے شبہ ہے کہ وہ شہلا ہے۔ کال منیر نے ریسیو کی تھی اور عورت نے صرف نمبر و پیغام دے کر کال بند کر دی۔"

"شہلا کا اب ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"تم بھول رہے ہو یار اس کے پاس ہمارا ایک عدد سوٹ کیس ہے اور اس کے خیال میں ہمارے پاس اس کی تصاویر کے کچھ پرنٹ ہیں۔"

"ہاں' یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"تب آؤ ذرا اس سے بات ہو جائے۔ لیکن ضروری نہیں ہے وہ شہلا ہو۔" میں نے اندر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر کال آئی نمبر سونا کا تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سویرا تھی۔

"شہباز کیسے ہیں آپ؟" اس نے سلام دعا کے بعد

کہا۔ ”آپ تو یہاں سے جا کر بھول ہی گئے۔“

”سوری۔“ میں نے معذرت کی۔ ”اصل میں آتے ہی کچھ معاملات میں اُلجھ گیا تھا۔ پھر رات بہت ہوگئی تھی اور ابھی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوئے ہیں۔“

”سوری مت کہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا...... ”زیادہ نہیں..... بس دن میں ایک بار اس بندی کو یاد کرلیا کریں۔“

”بندی کا کوئی نمبر بھی ہونا چاہیے۔“

”ابھی تو موبائل نہیں ہے جو تھا وہ حویلی میں رہ گیا ہے۔“

”بیتو کے پاس ایک آئی فون ہے تم وہ لے سکتی ہو۔“

”نہیں ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”آپ سے بات تو ہو جاتی ہے۔“

میں اس کی جھجک سمجھ گیا۔ ”تم بے فکر ہو کر لے لو، ہم میں اس قسم کی چیزیں مشترک ہیں اور وہ میں نے ہی لیا تھا۔“

”تب ٹھیک ہے۔“

”اس وقت کہاں ہو؟“

”ابھی تو ہم کچن میں آئے ہیں ناشتے کے لیے لیکن زیادہ وقت اس خفیہ کمرے میں گزرتا ہے جہاں عبداللہ بھائی نے ہمیں رکھا ہوا ہے۔“

”یہی کوشش کرو کہ زیادہ تر وہیں رہا کرو اور صرف ضرورت کے تحت باہر آیا کرو کوٹھی سے باہر تو کسی صورت مت نکلنا اور نہ ہی کھلے میں جانا۔“

”ہم یہ ساری احتیاط کر رہے ہیں۔“ سویرا نے کہا۔ ”شہباز تجھے حویلی کب بھیجیں گے مجھے ماں جی اور بابا یاد آرہے ہیں فون پر ان سے بات ہوتی ہے لیکن....“

”بس کچھ دن صبر کرلو پھر تمہیں وہاں پہنچا دیا جائے گا اور ممکن ہے یہ دونوں خواتین بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“

”سچ میں۔“ سویرا خوش ہوگئی تھی۔

”ہاں، کیونکہ تم سب ہی ہمیں عزیز ہو اور سب کی حفاظت کا خیال ہے، ایسا کرو تم ذرا ان دونوں کو ٹٹولو کہ یہ حویلی میں رہ لیں گی کیونکہ یہ آسانی سے جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔“

”میں بات کرتی ہوں ویسے اگر یہ وہاں رہنے کے لیے تیار ہو جائیں تو بہت مزہ آئے گا۔“

”یہ تو ان سے پوچھنے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ کتنا مزہ آئے گا۔“ میں نے ہنس کر کہا اور کچھ دیر بات کر کے فون بند کر دیا۔ مانی کسی جن کی طرح تازہ دم اپنی ڈیوٹی پر حاضر تھا اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ ”تم سوتے کب ہو برخوردار؟“

”رات تین سے صبح آٹھ بجے تک۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرے لیے اتنی نیند کافی ہے اس کے بعد میں سارا دن چاق و چوبند رہتا ہوں۔“

نیند کی کمی کا اثر اس کے ذہن پر نہیں لیکن جسم پر ہوا تھا۔

”مجھے ایک نمبر پر بات کرنی ہے۔“

”اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ اسی سے بات کریں آپ والی نوٹ بک میں بھی اس کا سسٹم موجود۔ آپ کو بس ایک سائٹ پر جا کر لوگ اِن ہونا پڑے گا۔ طریقہ میں ابھی آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔“

اس نے ایک منٹ میں مجھے طریقہ سمجھا دیا اور بلوٹوتھ ہینڈ فری مجھے تھما دیا۔ ”ٹھیک ہے برخوردار لگتا ہے تمہیں بھی پسند نہیں ہے کہ کوئی ہمہ وقت تمہارے سر پر سوار ہو۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”آپ بھی سفیر بھائی کی طرح میرے خلوص کی توہین کر رہے ہیں۔“

”ارے نہیں برخوردار، ویسے صبح تم نے بھی خود کو ملا کہہ کر ہمارے خلوص کی توہین کی تھی۔“

وہ مسکرایا۔ ”میں سفیر بھائی کو چھیڑ رہا تھا۔“

”اگر اس قسم کی نوک جھوک دل پر لیے بغیر کی جائے تو صحت مند ہوتی ہے لیکن اگر تمہیں کوئی بات پسند نہ آئے تو بلاتکلف کہہ سکتے ہو۔“

”مجھے آپ لوگوں کی کوئی بات بُری نہیں لگتی..... سفیر بھائی سے جو لڑتا جھگڑتا ہوں تو وہ صرف اوپر اوپر سے ہے۔“

”بس یہی اہم بات ہے۔“ میں اس کا شانہ تھپتھپا کر اپنے کمرے میں آیا۔ نوٹ بک کھولی اور ویب سائٹ پر آئی ڈی اور پاس ورڈ سے لوگ اِن کیا، اس دوران میں ای میل بھی چیک کیا اور توقع کے مطابق مجھے ایمن کی میل ملی تھی۔ اس نے بھی ایک نمبر بھیجا تھا۔ باقی اتنا پیغام تھا کہ فی الحال ٹھیک ہے اور میری جان بچانے کے لیے کام ہوا ہے۔ میں نے طریقہ کار کے تحت اجنبی عورت کا دیا ہوا ملایا اور فوراً ہی بیل جانے لگی۔ یعنی نمبر آن تھا۔ کچھ دیر بعد عورت نے کال ریسیو کی اور میں پہچان نہیں سکا کیونکہ آواز سے لگ رہا تھا وہ نشے میں ہے۔

”ہیلو کون ہے؟“

”وہی جس سے تم بات کرنا چاہتی تھیں۔“

اس بار وہ سنبھل کر بولی۔ ”شہباز تم....“

میں نے بھی اسے پہچان لیا۔ ”شہلا.... اس نے چاہتی ہو اور تمہیں اس جگہ کا نمبر کس نے دیا؟“

”نمبر مجھے فتح خان نے دیا ہے اور تم جانتے ہو میں کیا چاہتی ہوں؟“

”اگر تم کھل کر بات کرو تو میں جواب دوں۔“

”میری تصویریں۔“ اس نے کہا تو میں چونکا اور انجان بن کر بولا۔

”کون سی تصویریں؟“

”جو تمہارے پاس ہیں۔“ اس کا لہجہ تیز ہوگیا۔

”اپنی تصویروں کا ذکر کرتے ہوئے تم میری ایک چیز بھول رہی ہو جو تمہارے پاس ہے۔“

”وہ بریف کیس۔“ شہلا بولی۔ ”میں نے ابھی تک اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔“

”ایسی کوشش بھی مت کرنا ورنہ اس کے ساتھ خود بھی ضائع ہو جاؤ گی۔ سوائے درست طریقے کے علاوہ اسے اور کسی طریقے سے کھولنے کی کوشش کی گئی تو یہ دھماکے سے پھٹ جائے گا اور آس پاس موجود ہر چیز تباہ کر دے گا۔“

”مجھے اس سے دلچسپی بھی نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”تم میری تصاویر میرے حوالے کرو اور اسے لے جاؤ۔“

”تمہیں کس نے بتایا کہ تمہاری کچھ تصاویر میرے پاس ہیں؟“

”فتح خان نے، اس کی بتائی ہر بات درست ثابت ہوئی ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے فتح خان نے اپنی حماقت سے میرے ہمیشہ کے لیے کھو دیے ہیں۔“

”مجھے سب معلوم ہوگیا ہے اور مجھے ان کی پروا نہیں مجھے تو پروفیسر کے لاکر سے اپنا اور دوسروں کا اسٹف چاہیے تھا وہ میں نے حاصل کرلیا بس تمہارے پاس میری کچھ تصاویر باقی ہیں۔“

میں اسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے پاس اس کی کوئی تصویر باقی نہیں رہی ..... فتح خان سے جو تصاویر حاصل کیں تھیں وہ سب میں نے شہلا کے سپرد کر دی تھیں اور اس نے فوراً انہیں جلا دیا تھا۔ یہ فتح خان کی شرارت تھی وہ دوسروں کو میرے پیچھے لگا رہا تھا۔ پہلے مرشد کو لگایا تھا اور اب شہلا کو بھی یہیں کا نمبر دے دیا تھا۔ ”ٹھیک ہے تصاویر تمہیں مل سکتی ہیں لیکن بریف کیس دو گی تب ہی مل سکتی ہیں۔“

”میں تیار ہوں ہم آج ہی تبادلہ کر سکتے ہیں۔“ اس نے فوراً کہا۔

”تبادلے کے لیے ضروری ہے کہ تم آؤ، میری طرف سے بریف کیس کوئی بھی لے سکتا ہے۔“

”میں... میں کیوں آؤں؟“

”مس شہلا کیا تم چاہتی ہو کہ وہ تصاویر کوئی اور بھی دیکھ لے؟“

وہ چپ ہوئی پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے میں آؤں گی.... لیکن آج نہیں تم مجھے کل کال کرو گے۔“

”ٹھیک ہے میں کل اسی وقت کال کروں گا اور اچھا ہوا تم نے رابطہ کرلیا ورنہ....“

”ورنہ کیا تم مجھ سے خود رابطہ کرتے بلیک میل کرنے کے لیے؟“ اس کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

”نہیں میں ان تصاویر کو ضائع کرنے والا تھا۔ بے شک یہ تمہاری ہیں اور میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میرے ضمیر پر بوجھ بن گئی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے میں نے کچھ عجلت سے کام لیا ہے؟“ اس کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔

”نہیں تم نے ٹھیک کیا ہے ورنہ کیا تم یقین کرتیں کہ میں نے وہ تصاویر ضائع کر دی ہیں؟“

”کبھی بھی نہیں۔“ اس نے بلاتامل کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا ہے۔“

”کل بات کروں گا۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں نے اس سے جھوٹ کہا تھا کہ میرے پاس اس کی کوئی تصویر ہے اور اب میں سوچ رہا تھا کہ تبادلے کے لیے تصویریں کہاں سے پیدا کروں؟ مجھے خیال آیا کہ میں احمقانہ بات سوچ رہا تھا مجھے اصل میں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ شہلا سے بریف کیس کس طرح حاصل کیا جائے؟ اگر وہ بریف کیس لے کر کہیں آجائے تو یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اگرچہ دھوکا تو ہوتا لیکن شہلا خود کون سی شریف تھی اور اس نے موقع ملنے پر مجھے دھوکے دینے میں کون سی کسر چھوڑی تھی اس لیے اگر میں اس کے ساتھ دھوکا کرتا تو یہ بُری بات نہیں تھی پھر دھوکا ان معنوں میں تھا کہ وہ جن تصاویر کا سوچ کر مری جا رہی تھی وہ میرے پاس نہیں تھیں اس لیے میں اسے نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ہاں اس بہانے میں بریف کیس نکلوا لیتا تو یہ میرا فائدہ ضرور بن جاتا۔

وسیم ٹرے میں کافی کے مگ لیے اندر آیا۔ ”بات ہوگئی میں نے سوچا جب تک کافی بنا لوں۔ مانی اچھی بناتا ہے لیکن بُری میں بھی نہیں بناتا۔“

اس کی تصدیق پہلے گھونٹ نے کر دی تھی۔ وسیم بھی اچھی کافی بناتا تھا۔ میں اسے شہلا سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ پُرجوش ہوگیا۔ ”گڈ، ....ین کی پہلی

آزمائش اس موقع پر ہو جائے گی۔“
”دین کی آزمائش کیسے؟“
”میں کوئی پلان سوچتا ہوں۔ وہ بہت چالاک عورت ہے یقیناً چیزوں کے تبادلے کے لیے ایسی جگہ منتخب کرے گی جہاں ہم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکیں یا اس کے ساتھ دھوکا نہ کریں۔“
”کارروائی کا ارادہ نہیں ہے لیکن دھوکا کرنا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ وہ جو تصویریں مجھ سے مانگ رہی ہے وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ یہ بات میں اسے بریف کیس حاصل کرنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔ ویسے میرے خیال میں اس کام کے لیے وین کا استعمال ضروری نہیں ہے۔“
”وہ دیکھ لیں گے ویسے آپ نے بالکل ٹھیک سوچا ہے شہلا اور فتح خان جیسے لوگوں کے معاملے میں ضمیر صاحب کو تھپکیاں دیتے رہا کریں۔ یہ شرافت کی زبان سمجھنے والے انسان نہیں ہیں۔“
”شہلا کو بھی فتح خان نے کوٹھی کا پتا بتایا ہے، وہ اس طرح سے مجھے تنگ کرنے پر اُتر آیا ہے۔“
”شاید وہ اس طرح سے ہمیں ایمن شا کے معاملے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔“
”یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شہلا نے کل بات کرنے کو کہا ہے۔“
”ہمارے پاس کل تک کا وقت ہے۔“ وسیم نے سوچ کر کہا۔
”لیکن جب تک وہ نہیں بتائے کہ تبادلہ کہاں اور کس وقت ہوگا تم کوئی قابلِ عمل پلان کیسے بنا سکتے ہو؟“
”میں اپنے وسائل کا جائزہ لے سکتا ہوں۔“ وسیم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں عبداللہ کی مدد کی ضرورت بھی پڑے گی۔“
میں کچھ کہنے جا رہا تھا کہ موبائل کی بیل نے روک دیا عبداللہ کی کال تھی۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ”تم جس کا ذکر کر رہے تھے اس کی کال آ گئی ہے۔“
وسیم مسکرایا۔ ”بڑی لمبی عمر ہے اس بندے کی۔“
میں نے کال ریسیو کی۔ ”ابھی تمہارا ذکر ہو رہا تھا۔“
وہ ہنسا۔ ”ایک شخصیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا نام لو اور وہ حاضر ہو جاتی ہے۔“
”اس کے برعکس یہ بھی کہتے ہیں کہ لمبی عمر ہے۔ اطلاع یہ ہے کہ وہ عورت شہلا نکلی۔“
”مجھے بھی یہی خدشہ تھا اور اسے بھی یقیناً اس مردود فتح خان نے بتایا ہوگا۔ وہ بیک وقت آپ سے اور راجا صاحب سے دشمنی کر رہا ہے۔“
”فتح خان وہ شخص ہے جس نے میرے اندازے ہمیشہ غلط ثابت کیے ہیں۔ اس وقت بھی یہ کس مقصد کے تحت یہ سب کر رہا ہے، میں اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ یقیناً اس کے کئی مقاصد ہوں گے۔ بہر حال یہ ضمنی بات ہے۔ اصل معاملہ اس وقت یہ ہے کہ شہلا بریف کیس کے بدلے اپنی تصاویر چاہتی ہے، جو میرے پاس سرے سے نہیں ہیں۔“
”تب تبادلہ کیسے ہوگا؟“
”یہی تو کرنا ہے اگر میں اسے کہہ دیتا کہ تصاویر نہیں ہیں تو وہ بریف کیس نہیں دے گی۔“
”بالکل نہیں دے گی۔“
”اس لیے اسے دھوکا دے کر بریف کیس حاصل کرنا ہے۔ اب پلان ایسا تیار کرنا ہے جس سے ہم بہر صورت بریف کیس حاصل کر سکیں، چاہے وہ کتنی ہی چالاکی دکھائے۔“
”میں سمجھ گیا۔ ویسے اس قسم کے کام وسیم صاحب بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔“
”نہیں یار تم بھی کم نہیں ہو تم نے جتنی صفائی سے ہمیں کوٹھی سے نکالا ہے یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔“
”نوازش ہے آپ کی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”میں وسیم صاحب سے بات کر کے اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل تیار کرتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے تم اسے کال کر لو۔“
عبداللہ نے وسیم کو کال کر لی اور وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا وہ سمجھ گیا کہ میں کہیں اور بات کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے انٹرنیٹ کی مدد سے ایمن کا دیا نمبر ملایا۔ اس نے فوری کال ریسیو کی اور چھوٹتے ہی بولی۔ ”تم انٹرنیٹ سے کال کر رہے ہو؟“
”تم جانتی ہو میں نارمل طریقے سے کال نہیں کر سکتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہارے لیے کیا ہو رہا ہے؟“
”میں نہیں جانتی فی الحال میں سب سے الگ تھلگ رکھی گئی ہوں۔ آج صبح ایک ماہر نے جیکٹ کا معائنہ کیا ہے اور اسے بعض آلات سے چیک کیا اس نے تصدیق کی ہے کہ جیکٹ میں نہایت خطرناک بارودی مواد ہے اور اس میں بہت جدید قسم کا کنٹرولنگ سرکٹ بھی موجود ہے۔ اس لیے اسے بے احتیاطی سے چھیڑنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آج دو ماہر برطانیہ سے یہاں پہنچتے والے ہیں وہ جیکٹ کا معائنہ

کریں گے۔“
”مجھے امید ہے وہ اس جیکٹ کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔“
”اور اگر نہیں نکال سکے تو....؟“ ایمن کے لہجے میں سوال نہیں تھا لیکن سوال ضرور تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔
”تم منفی سوچ مت رکھو۔ ایک آدمی کے مقابلے زیادہ آدمی ہوں تو زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔“
”لیکن اس ایک آدمی نے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ مجھے نہیں لگتا کہ میں اس کی مرضی کے بغیر اس جیکٹ سے نجات حاصل کر سکوں گی۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”شہباز نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کوئی مجھے اس جیکٹ سے نجات نہیں دلا سکتا سوائے دو افراد کے۔ ایک تم اور ایک فتح خان۔“
”ایمن اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی ہے۔ کیا برٹش حکومت نے تاوان دینے سے انکار کر دیا ہے؟“
”مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم.... میں جب بھی یہاں کسی ذمّے دار فرد سے معلوم کرتی ہوں مجھے یہی بتایا جاتا ہے کہ کیس حکومت کے ہاتھ میں ہے اور انہیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“
”یقیناً برٹش حکومت کچھ نہ کچھ کر رہی ہوگی۔“
ایمن کچھ دیر خاموش رہی تھی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز اگر وہ کچھ نہ کر سکی؟ فتح خان کو تاوان دینے کا فیصلہ نہیں کیا گیا اور ماہرین مجھے اس جیکٹ سے بھی نجات نہ دلا سکے تو پھر کیا ہوگا؟“
میں ایک لمحے کو چپ کر گیا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ میں اسے بچانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے سوچ کر کہا۔ ”ایمن میں تمہیں یوں بے بسی سے مرتے نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم یقین رکھو تم زندہ رہو گی میں وعدہ نہیں کر رہا بلکہ یہ میرا یقین ہے۔“
”اگر تمہیں یقین ہے تو میں زندہ رہوں گی۔“ وہ ہنسی اور دل سے ہنسی تھی اس کا لہجہ بتا رہا تھا۔ ”اب میں نہیں پوچھوں گی کہ تم کیا کرو گے؟ مجھے معلوم ہے تمہارے بس میں جو ہوا وہ تم کرو گے اور شہباز یقین کرو اگر تم نہیں بچا سکے تب بھی میں خوشی سے اس دنیا سے جاؤں گی، یہ سوچ کر کہ تم آخری لمحے تک مجھے بچانے کی کوشش کرتے رہے ہو گے۔“
میں نے موضوع بدل دیا۔ ”برٹ شا کا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے؟“
”پاپا کی لاش برطانیہ بھیج دی گئی ہے اور اب میں ان کی چکر سے نجات حاصل کر کے جاؤں تو ان کی آخری رسومات ادا کروں۔“ اس کا لہجہ دوبارہ افسردہ ہو گیا۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے ہم باپ بیٹی کی آخری رسومات ایک ساتھ ہی ادا کی جائیں۔“
”پھر مایوسی کی بات۔“ میں نے خفگی سے کہا۔ ”ایمن میں تمہیں اتنا کم حوصلہ نہیں سمجھتا تم تو بہت مشکل مراحل سے گزر چکی ہو۔“
”ہاں.... لیکن میں نے پہلے موت کو یوں بدن پر لپٹا ہوا محسوس کبھی نہیں کیا۔ یہاں موجود لوگوں کا یہ حال ہے کہ میرے کمرے کے پاس سے بھی نہیں گزرتے ہیں، کمرے میں تو بس چند ایک افراد آتے ہیں۔ ایک دو بار میں کمرے سے باہر آئی تو یہاں ایسا خوف پھیلا کہ پھر سفیر نے خود مجھے کمرے تک محدود رہنے کا حکم دے دیا۔ اب میں کمرے سے باہر نہیں جا سکتی۔“
”کیا خیال ہے ڈیوڈ شا کو پتا چل گیا ہوگا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“
”بہ ظاہر تو ایسے کوئی آثار نہیں ہیں لیکن شاید پتا چل گیا ہو۔“
”تم اس طرح مجھ سے بات کر رہی ہو کیا تمہیں بات کرنے کی اجازت ہے؟“
”بالکل یہ مجھ پر پابندی نہیں لگا سکتے.... اتنا تو یہ بھی سمجھتے ہیں کہ میری زندگی و موت کا مسئلہ ہے اور میں کوئی غیر ذمّے دارانہ حرکت نہیں کر سکتی۔“
”اگر تم پر رابطے کی پابندی نہیں ہے تو تم اپنے وکیل کو کال کر کے اس سے پوچھو کہ برٹ شا کی گم شدگی کا معاملہ حل ہونے کے بعد اس کی وراثت کی کیا پوزیشن ہو گی؟“
”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“
”تم معلوم کرو اور اپنا ذہن اُلجھنے سے بچاؤ۔ اس معاملے کو سلجھانا تمہارے بس میں نہیں ہے دوسروں کے ہاتھ میں ہے اس لیے انہیں کوشش کرنے دو اور اپنی توجہ یہ سوچ کر آنے والے معاملات کی طرف رکھو کہ بالآخر تمہیں اس جیکٹ سے نجات مل جائے گی۔“
”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میں اس معاملے میں جتنی دیر کروں گی کسی پیچیدگی کا امکان اتنا ہی زیادہ ہو جائے گا۔“
”گڈ تم سمجھ گئی ہو بس اب یہ کام شروع کر دو اور اگر مجھ سے رابطہ کرنا ہو تو مجھے ای میل کر دیا کرو یا ایک نمبر بتا رہا ہوں، اس پر کال کر کے کہہ دو کہ تم مجھ سے بات کرنا چاہ رہی ہو۔“

میں نے اسے راجا عمر دراز کی کوٹھی کا نمبر دے دیا۔ کیونکہ اب تو یہ مرشد اور فتح خان سمیت میرے تمام دشمنوں کے علم میں آچکا تھا تو ایمن کو دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ”لیکن اسے زبانی یاد کرنا کہیں نوٹ مت کرو۔“

”ٹھیک ہے مجھے یاد ہو گیا۔“ ایمن نے کہا۔ ”تھینک یو شہباز تم سے بات کر کے میرے دل و دماغ پر طاری بوجھ کم ہوا ہے۔“

”ایمن تم میری اچھی دوست ہو اور دوست وہی ہوتا ہے جو ضرورت پڑنے پر کام آئے اور بغیر بلائے آئے۔ تم فکر مت کرو تمہارے لیے میں ایسے کروں گا جیسے اپنے لیے کر سکتا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں اور تم سے میری درخواست ہے کہ میری طرف سے راجا عمر دراز کا شکریہ ادا کر دینا جو اس نے پاپا کی لاش کو اسلام آباد پہنچانے میں مدد دی۔“

”میں کہہ دوں گا۔“ میں نے کہا اسی لمحے میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ بیتو کا نام آرہا تھا۔ ”ٹھیک ہے ایمن میں تم سے پھر بات کرتا ہوں ایک کال آرہی ہے۔“

”ٹھیک ہے بائے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا میں نے بیتو کی کال ریسیو کی۔

”شوبی۔“ اس نے میری آواز سنتے ہی چلا کر کہا۔ ”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا مجھ سے ملے بغیر چلے گئے۔“

”کہاں سے ملتا تم تو پڑے سو رہے تھے۔“ میں ہنسا۔ ”اب طبیعت کیسی ہے؟“

”بالکل ٹھیک ہے میں آپ کے پاس آرہا ہوں پر عبداللہ بھائی اجازت نہیں دے رہا۔“

”وہ ٹھیک کر رہا ہے جب تک تم بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے آرام کرو۔ وہاں تمہیں اچھے اچھے گھر کے کھانے ملیں گے یہاں تو باہر کے کھانوں پر گزارا چل رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں آپ کے ساتھ رہ کر ہم باہر کا بھی کھا لے گا۔ میرا بخار اُتر گیا ہے۔“

”بیتو تم حکم نہیں مان رہے؟“

”آپ حکم دے رہا ہے؟“

”ہاں یہ میرا حکم ہے کہ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے تب تک وہیں رہو۔“

”حکم تو ہم عبداللہ بھائی کا بھی مان رہا ہے۔“ اس نے دبی زبان میں کہا۔ ”پر آپ سے اس لیے بولا کہ آپ عبداللہ بھائی کو بھی حکم دے سکتا ہے۔“

”اسے میں نے ہی کہا تھا۔ یہ موسمی بخار ہے اور ذرا سی بے احتیاطی سے بگڑ سکتا ہے اس لیے تم آرام کرو اور طاقت والی خوراک لو۔ تین چار دن میں جب لگے تو پھر بے شک آجانا۔“

”ٹھیک ہے، شوبی! آپ خوش قسمت ہے، سب سے اچھا کھانا بناتا ہے۔ کل میرے لیے میکرونی...“

”یہ بھی ٹھیک ہے بیٹا چینی کھانے کی پریکٹس ہے تمہاری زندگی میں آنے والی چینی کھانے بنائے۔“

”شوبی۔“ اس نے خفگی سے کہا۔ ”یہ آپ ہم چین کا کیوں سناتا ہے؟“

”چلو اگر تمہیں چین پسند نہیں ہے تو تبت ... ہوں یا کہو تو نیپال کا ذکر کر لوں۔“

”میں آپ سے بات نہیں کرے گا۔“ وہ بولا

”لگتا ہے ابھی سے بات چیت بند کر رہے ہو...“ نے اسے چھیڑا تو وہ سچ مچ ناراض ہو گیا اور پھر اسے تھا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے منوا لیا کہ وہ لازمی میرے پاس آجائے گا اور ان دو دنوں میں لگ کرے گا اور دوا پابندی سے کھائے گا۔ جس وقت یقین دہانی کرا رہا تھا سعدیہ وہاں آگئی اور اس نے موبائل لے لیا۔

”شہباز بھائی یہ جھوٹ بول رہا ہے، ابھی بھی ... سے آرہا ہے اور دوا نہیں کھایا تا۔ اس کے سوا سب کھاتے رہتا ہے۔“ سعدیہ بتا رہی تھی اور پیچھے سے بیتو اس کی سماجت کر رہا تھا۔ ”میں تو کہہ رہی ہوں ڈاکٹر اسے گولیاں کے بجائے انجکشن لگائے تب ہی یہ ٹھیک ہوگا۔“

”دے دی تم کیوں ہمیرا دشمن ہو رہا ہے؟“ عقب ... بیتو چلایا۔

”ٹھیک ہے ذرا اس سے بات کراؤ۔“ میں نے ... سعدیہ نے اسے موبائل دے دیا۔ ”بیتو سادی کیا کہہ ... ہے۔“

”دے دی ٹھیک کہتا ہے ہم سے دوا نہیں کھایا جاتا ... اب وعدہ کرتا ہے پورا آرام کرے گا اور ٹھیک سے دوا کھائے گا۔“

”دو دن بعد آنے والی اجازت منسوخ کی جاتی ... اور اب میں تمہیں عبداللہ کے سپرد کروں گا وہی تمہارا ... سے علاج کرائے گا وہ اسپتال میں داخل کرنے کو کہہ رہا ...“ بیتو گھبرا گیا۔ ”میں اسپتال نہیں جائے گا۔ جیسا آ... بولو گے ویسا ہی کرے گا پکا والا وعدہ۔“

”یہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔“ پیچھے سے سعدیہ نے کہا

... گی۔ میں ہنس رہا تھا بیتو سے بات کر کے ... تھا۔ وہ ایسا ہی معصوم اور سادہ انسان تھا جو ... کے اندر کی ٹینشن ختم کر دیتا تھا۔ الماری ... ٹوپیاں رکھی تھیں۔ میں ایک شال اوڑھ کر ... نشست گاہ میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ... ٹی وی اور دوسری چیزیں بھی کوٹھی کے ساتھ ہی ...

... مالک سب کچھ فراخ دلی سے کرائے داروں پر ... اس سے ملے بھی نہیں، کیونکہ ایجنٹ کے توسط ... کے بھی ایڈوانس کا وہی ذمے دار ہوگا۔“

... کے کھانے کا کیا ہوگا؟“

... نے پیزا منگوا لیا ہے میں صرف ناشتا سپلائی کر ... رہا ہے کافی بنا سکتا ہوں۔“

... ہے صرف کھانے پینے کے لیے کسی کا باہر جانا ... پنڈی اور اسلام آباد کوئی بڑے شہر نہیں ہیں ... وں سے سامنا ہو جانے کا پورا امکان ہے۔“

... یہی سوچ کر میں نے پیزا والوں کو آرڈر کر دیا ... اور جن کو بیگمش ہیں میرے پاس جو چیز کھانے کو ... منگوا سکتے ہیں۔“

... کب تک آئے گا تیرا پیزا؟“ میں نے پیٹ پر ہاتھ ... میرے بنائے ورقی پراٹھے کب کے ہضم ہو چکے ...

... ورقی نہیں تھے بیٹے تم جیسوں کے لیے ورقی بن ... ہیں۔“ اس نے کہا اور ایک ایسا چینل لگایا جہاں سے ... کے ڈانس دکھائے جا رہے تھے ایک بڑے سے اسٹیج ... اور جن خواتین و حضرات رقاص اپنے اپنے فن کا ... رہے تھے۔ اچانک کہیں گھنٹی بجی۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے سفیر سے پوچھا۔

”کال بیل ہے میرا خیال ہے پیزا والا آگیا ہے۔“

... اتنے میں اسٹڈی سے مانی نکل کر باہر کی طرف ... پیزا والا ہی ہے ورنہ یہ اس طرح دوڑ نہ لگاتا۔ اس کی ... مت جانا کھانے میں اسے بیتو کا بھی باپ سمجھو۔“ ... تو میں صبح ناشتے کے موقع پر دیکھ چکا تھا۔ ”یار دماغی ... ہے بھوک تو لگے گی۔“

... سفیر نے میری طرف دیکھا۔ ”بھائی آپ اُلٹی بات ... ہیں بھوک تو جسمانی کام کرنے والوں کو لگتی ہے۔“

... یہی تو غلط فہمی ہے جسم میں سب سے زیادہ توانائی ... استعمال کرتا ہے، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دماغ انسانی جسم کے کل وزن کا تقریباً تین فیصد ہوتا ہے لیکن یہ کل توانائی کا بیس فیصد استعمال کرتا ہے۔“

سفیر کے لیے یہ بات قابلِ ہضم نہیں تھی لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے صرف میری خاطر مان گیا ہو۔ مانی پیزا کے چار پیکٹ اور جمبو سائز کولڈ ڈرنک کی بوتل لیے اندر آیا اور ہمارے سامنے سب میز پر رکھ دیا۔ یہ بڑے سائز کے پیزے تھے۔ سفیر جا کر گلاس لے آیا۔ وسیم اوپر مصروف تھا اس نے کہا کہ اس کا حصہ رکھ دیا جائے وہ بعد میں کھا لے گا۔ اس لیے ہم سب ٹوٹ پڑے تھے۔ مانی اپنا حصہ آدھا کھا کر باقی آدھا اسٹڈی میں لے گیا۔ میں اور سفیر اپنے حصے کا ختم کر کے وہیں صوفے پر قیلولہ کرنے لگے تھے۔ پیزا خاصا بھاری تھا اس لیے پہلے اونگھ آئی اور پھر آنکھ لگ گئی۔ سونے کے دوران ہی کسی نے مجھ پر کمبل ڈال دیا تھا۔ آنکھ کھلی تو کچن سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں میں اٹھ کر وہیں چلا آیا عبداللہ موجود تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”میں آیا تو آپ سو رہے تھے۔“

”کیا حال ہیں؟“

”سب کے حال ٹھیک ہیں۔ ایک پلان بنایا ہے لیکن اس کے لیے آپ کی منظوری کی ضرورت ہے۔“

”پلان کس بارے میں؟“

”خواتین کو کوٹھی سے کہیں اور منتقل کرنے کے بارے میں۔“ عبداللہ بولا۔ وسیم شاید کافی تیار کر رہا تھا۔ سفیر اوپر سو رہا تھا۔ شادی کے بعد اسے نیند بہت آنے لگی تھی۔ جہاں موقع ملتا تو سو جاتا۔

”کہاں منتقل کرنے کا ارادہ ہے؟“

”سیٹلائٹ ٹاؤن میں ایک کوٹھی کرائے پر لی ہے۔ فی الحال وہاں صرف ایک چوکیدار رکھا ہے۔ وہ بھی اعتماد کا آدمی ہے۔ انہیں وہاں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے۔ بیتو اور ایاز ان کے ساتھ ہوں گے۔“

”ایاز آگیا؟“

عبداللہ نے گھڑی دیکھی۔ ”راستے میں تھا سیدھا یہیں آئے گا۔ شاید دو گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔“

وسیم نے کافی تیار کر لی تھی ہم اپنے اپنے مگ اٹھائے نشست گاہ میں آگئے۔ ”پلان کیا ہے؟“

”کوٹھی کے پاس ہی لڑکیوں اور خواتین کا ایک بڑا مدرسہ ہے۔ روزانہ شام کو چھٹی کے بعد سینکڑوں کے حساب سے برقع پوش طالبات وہاں سے نکلتی ہیں۔ ان میں سے بہت ساری ہماری کوٹھی کے سامنے سے گزرتی ہیں۔ اگر یہ تین بھی اسی قسم کے سادہ برقع پہن کر ان میں شامل ہو جائیں

تو کسی نگرانی کرنے والے کے لیے ان کا سراغ لگانا مشکل ہو جائے گا اور وہ آگے کہیں طے شدہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل جائیں گی۔"

میں نے سوچا۔"پلان تو اچھا ہے لیکن گاڑی کا بندوبست باہر سے کرنا پڑے گا۔ ورنہ کوٹھی سے جو گاڑی نکلے گی اس کی نگرانی بھی کی جائے گی۔"

"آپ نے ٹھیک کہا ہے میں اس کا بھی خیال رکھوں گا۔ ہم آخر تک نگرانی کریں گے اور اگر ذرا بھی خطرہ محسوس ہوا تو خواتین کو واپس کوٹھی میں لے آئیں گے۔"

"اچھا پلان ہے اسے بعد میں مزید ری فائن کیا جا سکتا ہے فی الحال مسئلہ شہلا سے بریف کیس کا حصول ہے۔"

وسیم بولا۔"میں نے اس پر خاصا غور کیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی ایسی جگہ تبادلے کا کہے گی جہاں عوام زیادہ ہو اور آنے جانے کے کئی راستے ہوں۔"

"کوئی مارکیٹ پلیس؟"عبداللہ نے سوال کیا۔

"بالکل وہ کسی ویران یا ایسی جگہ آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی جہاں ہم اسے گھیر سکیں۔"

"حالانکہ اسے گھیرنے کا خیال بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔"وہ تو خود دوسروں کو گھیر لیتی ہے۔"

وسیم نے سر ہلایا۔"اللہ بچائے ایسی عورتوں سے۔"

میں نے اس کی تائید کی۔"ویسے میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے۔ کیونکہ ہماری نیت صاف ہے اس لیے نہایت آسانی سے شہلا کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ وہ پبلک پلیس پر تصویریں چیک کر کے تو نہیں بیٹھ جائے گی۔"

"اس صورت میں ہمیں اس کی طرف سے بھی دھوکے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" وسیم بولا۔"بریف کیس میں نے بھی غور سے نہیں دیکھا تھا اور کسی نے تو سرے سے نہیں دیکھا ہے اس لیے اگر اس نے اس سے ملتا جلتا تھما دیا۔"

"تم بیتو کو بھول رہے ہو اس نے بہت غور سے دیکھا ہوا ہے۔ اگر بیتو لینے جائے گا تو شہلا اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔"

"ہاں اسے میں بھول گیا تھا۔" وسیم بولا۔"لیکن اس کی طبیعت خراب ہے۔"

عبداللہ مسکرایا۔"شہباز صاحب نے اس کی کلاس لی ہے دوائی نہیں کھا رہا تھا آج اس نے ٹھیک سے دوا کھائی ہے اور اس کی طبیعت خاصی حد تک ٹھیک ہو گئی ہے امید ہے ایک دو دن میں بالکل فٹ ہو جائے گا۔"

"ضروری نہیں ہے سب کچھ شہلا طے کرے کچھ باتیں

اسے ہماری بھی ماننا ہوں گی۔" میں نے کہا۔"ہمارے وہ بریف کیس ناگزیر نہیں ہے بس ایک امانت ہے جسے کے ملک تک پہنچانا ہے۔ اگر وہ نہیں بھی پہنچا تو اسے کوئی نہیں کھول سکتا لیکن وہ تصاویر شہلا کے لیے ناگزیر ہیں جو ہمارے پاس سرے سے ہی نہیں ہیں۔" وسیم

"لیکن شہلا تو یہی سمجھتی ہے۔" میں نے کہا۔" لیے مجبور اصل میں وہ ہے، ہم نہیں ہیں۔"

"گویا ہمیں بالادست بن کر بات کرنی چاہیے نے کہا۔"اگر وہ دام میں آگئی تو کم سے کم ایک مسئلہ تو حل جائے گا۔"

"واقعی جتنے اِدھر اُدھر کے مسئلے کم ہوں گے ہم اصل مسئلے یعنی مرشد پر اتنی ہی توجہ دے سکیں گے۔" میں سوچ کر کہا۔"یہ فتح خان اور شہلا جیسے لوگ بلاوجہ ہمار پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

"بلاوجہ نہیں جناب، ان کی بھی غرض ہوتی ہے عبداللہ نے کہا۔"ویسے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ فتح خا اتنا خطرناک ثابت ہوگا۔ آپ کو اس نے اتنے عرصے ا قابو میں رکھا۔"

"وہ واقعی حیران کر رہا ہے اور یہ سلسلہ اب تک ہے اب اس نے ایمن کو بارودی جیکٹ پہنا دی۔ گویا نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ برٹ شا سے ہیر نکلوانے میں ناکام رہا تو اس کے بعد کیا کرے گا۔"

"اگر وہ برٹش حکومت سے رقم نکلوانے میں کامیا رہا تب بھی وہ ملک سے باہر نہیں جا سکے گا۔ اس صورت انٹرپول سمیت بہت ساری بین الاقوامی ایجنسیاں اس پیچھے پڑ جائیں گی اور اس کے لیے ان سے چھپنا مسئلہ جائے گا۔"

"میرا خیال ہے فتح خان کے ذہن میں اس کا حل ہوگا۔" میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔"ایک بار فتح خان مجھے بتایا تھا کہ اس کے وسط ایشیا کے ممالک میں بھی تعلقا ہیں اور اگر اسے کوئی مشکل ہوئی تو وہ وہاں بھی جا سکتا ہے۔"

"ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔" وسیم نے سر ہلایا۔"روس افغانستان میں موجودگی کے دوران اس خطے کی مملکتوں کی آ میں دشمنی تھی لیکن اس دوران میں مجرمانہ سرگرمیوں میں ملو افراد کے آپس میں تعلقات خوب پھولے پھلے تھے۔ فتح خا کے جاننے والے وہاں ہو سکتے ہیں۔ درحقیقت روس سمیت پورا خطہ دنیا بھر کے جرائم پیشہ اور دو نمبر کام کرنے والے افر گڑھ بنتا جا رہا ہے کیونکہ یہاں وہ اپنی دولت سمیت

ہے ہیں اور کوئی ان سے پوچھتا نہیں ہے۔ یہی نہیں وہ بلیک الوئیسٹ بھی کر سکتے ہیں۔ یہاں ذرائع اور وسائل لامحدود

عبداللہ نے سر ہلایا۔"سرحدیں ملی ہونے کی وجہ سے خان جیسے آدمی کے لیے آمد و رفت بھی کوئی مسئلہ نہیں ہو ہمارے شمالی علاقے اور قبائلی علاقے سے تو وسط ایشیا بھی قریب پڑتا ہے۔ اس پورے علاقے کی معیشت ہی ہی تعاون پر چل رہی ہے۔ امریکیوں کی افغانستان میں ہوگی بھی ان کے کاموں میں خلل نہیں ڈال سکتی۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔"شہلا کو یہ فتح خان نے بتائی ہے کہ ہمارے پاس اس کی تصویروں کے پرنٹ باقی ہیں جبکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہمارے مزید کوئی پرنٹ نہیں ہے اس نے ہمیں جتنے پرنٹ دیے وہ میں نے شہلا کے حوالے کر دیے تھے اور اس نے انہیں یا تھا فتح خان نے یقیناً شہلا سے اس کی تصدیق کر لی ہوگی اس نے کیوں شہلا سے جھوٹ بولا کہ ہمارے پاس مزید ہیں اور اس وجہ سے شہلا ہم سے رابطہ کر کے بریف کی بات کرنے پر مجبور ہوئی؟"

عبداللہ نے پوچھا۔"آپ کا مطلب ہے کہ فتح خان نے آپ کا فیور کیوں کیا؟"

"بالکل دیکھو اس کا یہ قدم ہمارے حق میں گیا ورنہ ہلا کی طرف سے بلاوجہ بریف کیس کی واپسی کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی اہمیت سے تو فتح خان بھی واقف نہیں ورنہ وہ خود اسے حاصل کر کے کسی سے اس کا سودا کرنے کی کوشش کرتا۔"

"مثلاً کس سے؟"

"اس خطے میں ایسی طاقتوں کی کمی نہیں ہے جو چین کی سی فنی اور فوجی ترقی سے شدید خوف زدہ ہیں اور ان کی ہر ممکن کوشش ہے کہ کسی طرح چین پر دباؤ قائم رکھ سکیں۔ ایسی طاقتوں کے لیے یہ بریف کیس بہت قیمتی چیز ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"آپ کی مراد یقیناً امریکا یا بھارت سے ہے۔"

"چین کے سب سے بڑے دشمن یہی دو ممالک ہیں۔ خوش قسمتی سے فتح خان یا شہلا بریف کیس کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں اس لیے وہ اتنی آسانی سے اسے واپس کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

"اگر فتح خان جانتا ہے کہ ہمارے پاس شہلا کی مزید تصاویر نہیں ہیں تو وہ اسے دھوکا دے رہا ہے۔"

"بالکل وہ اسے دھوکا دے رہا ہے اور ہمارا فیور کر رہا ہے۔" میں نے سوچ کر کہا۔"شاید فتح خان اپنے رویے کا ازالہ کرنا چاہ رہا ہے۔ جو اس نے کچھ عرصے سے میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ روا رکھا ہے۔ ویسے معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔"

"لیکن ساتھ ہی وہ مرشد اور شہلا کو بھی ہماری طرف متوجہ کر چکا ہے۔" عبداللہ نے کہا۔"ممکن ہے اس نے ڈیوڈ شا کو بھی بتا دیا ہو۔"

"شاید... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے نہ بتایا ہو۔ پچھلے کچھ عرصے سے فتح خان بڑی اُلجھی ہوئی چالیں چل رہا ہے جو سامنے آجاتی ہیں تب بھی ان کا سر پیر سمجھ میں نہیں آتا۔ اس وقت بھی وہ کچھ ایسا ہی کر رہا ہے۔"

"وہ مجھے اندھا دھند قدم اُٹھانے والا تو نہیں لگتا ہے۔" وسیم بولا۔

"وہ بالکل بھی ایسا نہیں ہے اس کی کھوپڑی میں شیطان کا دماغ فٹ ہے یہ بات اب میری سمجھ میں آرہی ہے۔" میں نے کہا۔"فتح خان کے معاملے میں ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے ممکن ہے وہ اس بریف کیس کو ٹریپ بنا کر ہمیں پھانسنا چاہتا ہو؟"

"میرا خیال ہے ہمیں اس سے نجات حاصل کر لینی چاہیے۔" وسیم نے گلے پر انگلی پھیری۔

"بعض اوقات میں بھی یہی سوچتا ہوں لیکن نہ جانے کیا بات ہے فتح خان کے خلاف میرے جذبات بھی مار ڈالنے کی حد تک نہیں جاتے ہیں۔"

"میں نے بھی محسوس کیا ہے آپ اسے رعایت دے جاتے ہیں۔" عبداللہ نے سر ہلایا۔

"حالانکہ وہ موقع ملنے پر کوئی کمی نہیں رکھتا...." وسیم کسی قدر تلخی سے بولا۔

"نہیں یار، اس نے بھی کئی مواقعوں پر مجھے چھوٹ دی ہے جیسے ابھی کا واقعہ لو وہ وادی سے فرار ہونے سے پہلے مجھے گولی مار سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ مگر مجھے خاموشی سے چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے ہی برٹ شا مارا گیا تھا اور تم لوگ سوچ سکتے ہو کہ وہ اس کے لیے کتنا اہم تھا۔"

"وہ پاگل ہو گیا ہوگا؟"

"اس نے اپنے ساتھی کو بلا تامل شوٹ کر دیا تھا جس نے برٹ شا پر گولی چلائی تھی۔" میں نے کہا۔ میں نے ابھی تک برٹ شا کے آخری الفاظ خود تک محدود رکھے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بتائے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ

نہیں تھی بس میں فی الحال اس معاملے کو ایک طرف ہی رکھنا چاہتا تھا مستقبل میں کبھی کوئی ایسا موقع آتا تو میں اپنے ساتھیوں کو بتا سکتا تھا۔ مگر فتح خان کے موجودہ رویّے کو دیکھتے ہوئے مجھے خدشہ ستانے لگا تھا کہ کہیں اس کے شیطانی ذہن میں یہ خیال تو نہیں آ گیا تھا کہ برٹ شا نے مرنے سے پہلے مجھے کچھ بتایا ہو۔ اگر اسے یہ خیال آیا ہو گا تو وہ اسے حقیقت سمجھنے لگا ہو گا اور اب اس کا لائحہ عمل اسی کے مطابق ہو گا۔ تو فتح خان میرے بارے میں پھر سے کوئی منصوبہ لے کر سرگرم عمل ہو گیا ہے اور وہ جو کر رہا تھا اس کے پیچھے یہی منصوبہ ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فتح خان مرشد اور شہلا کو آگے کر کے ان کی آڑ میں خود بھی موجود ہو۔

اس معاملے پر غور کرتے ہوئے مجھے لگا جیسے میں کسی بہت ہی پیچیدہ بین الاقوامی جاسوسی کے چکر میں آ گیا ہوں۔ انسانوں کے آپس کے ذاتی معاملات بھی اتنے پیچیدہ ہو سکتے ہیں یہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں جانا تھا۔ اب میں پہلے کی طرح اندھادھند قدم نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ مجھے ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اُٹھانا ہو گا۔ حالات پہلے سے یوں بھی مختلف اور پیچیدہ ہو گئے تھے کہ اب ہمارے ساتھ خواتین بھی تھیں۔ پہلے صرف مونا تھی اور سفیر سے اس کا رشتہ محبت کا تھا اس لیے وہ اس سے دور بھی رہ سکتی تھی۔ مگر اب وہ بیوی تھی اور شوہر سے دور نہیں رہ سکتی تھی جبکہ اس کے اپنا کوئی گھر بھی نہیں تھا یہی حال سعدیہ کا تھا صرف ایک سویرا ابھی بیوی نہیں بنی تھی لیکن وہ بھی یہیں تھی۔ ان کی وجہ سے ہم پر دباؤ آتا تھا اور ہمارا بہت سارا وقت اور توانائی ان کے تحفظ میں صرف ہو جاتی تھی۔ ان کا تحفظ ہماری اوّلین ترجیح ہو سکتی تھی۔ صرف خواتین ہی نہیں بلکہ مجھے بعض اوقات اپنے ساتھیوں کی وجہ سے بھی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ بھی میری کمزوری تھے۔ اکیلا میں مضبوط اور پُراعتماد ہوتا ہوں کہ میری ذات پر جو گزرے گی میں جھیل جاؤں گا۔ کسی کا ساتھ بعض اوقات مجھے کمزور کر دیتا ہے اور میں درست اور بروقت فیصلے نہیں کر پاتا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے میرے ساتھیوں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ اگر وہ نہ ہوتے تو شاید میں کب کا مرشد اور نادر جیسے درندوں کا نشانہ بن چکا ہوتا۔ وہ میرے دست و بازو تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" وسیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا تو وسیم عجیب سے انداز میں مسکرا دیا۔ ایسا لگا جیسے وہ میری سوچ بھانپ گیا ہو۔ پھر اس نے تصدیق بھی کر دی۔

"میرا خیال ہے آپ بھیڑ بھاڑ سے مشکل [illegible] کرتے ہیں؟"

میں نے حیرت ظاہر نہیں کی لیکن اعتراف کر لیا۔ جب گھٹیا دشمن سے مقابلہ ہو تو میں اکیلے میں زیادہ [illegible] محسوس کرتا ہوں۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔" وسیم [illegible] ہلایا۔ "کم سے کم خواتین کے بارے میں میری بھی یہی [illegible] ہے کہ ان کو کہیں دور دراز محفوظ جگہ ہونا چاہیے جس سے [illegible] بھی ناواقف ہوں۔"

اس دوران میں سفیر آ گیا اور اس نے کیتلی سے [illegible] لیے کافی انڈیلی اس نے کہا۔ "لیکن میرے بھائی [illegible] رائے سے کہاں متفق ہوں گی جن کے لیے یہ رائے ہے۔"

"مجھے تو ان سے زیادہ تم نا متفق لگ رہے ہو" میں نے کہا تو سفیر بھنا گیا۔

"ٹھیک ہے تو خود ہی منوانا میرے سر مت مارنا [illegible]"

"لو بھائی ابھی سے بُلا ہو گئی۔" وسیم ہنسا۔ "[illegible] شہباز صاحب آپ بھی اپنے والد صاحب کی بات مان [illegible] تاکہ تینوں ایک ہی جگہ صبر سے رہیں۔"

میں پھر اپنی اور وسیم کی سوچ کی یکساں کا قائل [illegible] یہی میں بھی سوچ رہا تھا کہ ان تینوں کو حویلی بھیج دوں وہاں دشمنوں کی نظروں سے دور اور محفوظ ہوں گی۔ سفیر سمجھ گیا اس نے ملائمت سے کہا۔ "تم بھول رہے ہو سویرا کو وہیں سے اغوا کیا گیا ہے اور وہ دشمنوں کے لیے پہچانی جگہ ہے۔"

"پھر تیرا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟" میں نے [illegible] کی طرف دیکھا۔ "یہ تو طے ہے کہ اب انہیں یہاں نہیں [illegible] ہے۔"

"دیکھ سویرا کو تو حویلی بھیج دے اس کا معاملہ الگ اور حویلی سے زیادہ دیر تک دوری اس کے لیے دوسر[illegible] مسائل کو جنم دے گی میری بات سمجھ رہا ہے ابھی تک مر[illegible] ملک صاحب ہی جانتے ہیں کہ سویرا حویلی میں نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن باقی دو کا کیا کریں" میں نے سوچ کر کہا اس کی بات دل کو لگی تھی۔

"وہ ہمارے ساتھ رہ سکتی ہیں۔" سفیر نے کہا تو [illegible] بار میں بھنا گیا۔

"بات وہیں رہی ان کو ہمارے ساتھ ہی سب [illegible] زیادہ خطرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ انہیں

[illegible] کے لیے منظرِ عام سے بالکل غائب کر دیا جائے۔ وہ [illegible] شمن بلکہ ہماری پہنچ سے بھی دور رہیں۔"

"یہ بالکل مناسب نہیں ہو گا۔" سفیر بڑبڑا کر بولا۔ "[illegible] پہنچ سے کیوں دور رہیں؟"

[illegible]سیم اور میں نے قہقہہ مارا تو سفیر جھینپ گیا۔ "تب [illegible]تے ہیں ان کے ساتھ تجھے بھی چھوڑ دیتے ہیں۔"

"اب تم بکواس کرنے پر اُتر آئے ہو۔" سفیر نے کہا۔ "[illegible] مطلب نہیں ہے۔"

[illegible]سیم کچھ سوچ رہا تھا اس نے کہا۔ "میری ایک تجویز [illegible] دیکھیں خواتین کو خود سے جدا کر کے ملک میں کہیں بھی [illegible] ان کے بارے میں ہمیں تشویش تو رہے گی۔"

"آپ کا مطلب ہے انہیں کہیں باہر بھیج دیا جائے؟" [illegible]اللہ نے پوچھا

"میری یہی تجویز ہے۔ دیکھیں آس پاس کئی ایسے [illegible]ہیں۔ جہاں کا ٹورسٹ ویزہ آسانی سے مل جاتا ہے۔"

"مثلاً چین۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن [illegible]ٹ ویزے پر بھی وہاں لامحدود نہیں رہا جا سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے دو تین مہینے کا ویزہ مل سکتا ہے۔" [illegible]اللہ بولا۔ "آپ کہیں تو میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔"

"یہ بعد میں دیکھیں گے کہ کون سا ملک موزوں ہے" [illegible]لن میں تمہاری تجویز سے متفق ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم [illegible]ف چین ہی نہیں بلکہ مالدیپ، تھائی لینڈ اور اسی طرح ان [illegible]ں کے بارے میں معلوم کرو جہاں پاکستانی اکثر آتے [illegible]اتے رہتے ہیں۔"

"میں بھی اس تجویز سے متفق ہوں۔" خلافِ توقع [illegible]فیر نے بھی کہا۔

"ان کو یہاں سے روانہ کر کے ہم سکون سے اپنے دو[illegible]سرے معاملات نمٹا سکیں گے۔ جیسے بریف کیس والا، پھر ایمن [illegible] معاملہ ہے اور سب سے اہم نادر کا معاملہ ہے۔ ایک بار اس کا کانٹا نکل جائے تو مرشد سے معاملہ کیا جا سکتا ہے۔" وسیم بولا تو میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگرچہ مجھے اس کی امید نہیں ہے مرشد اور نادر ایک ہی [illegible]ل کے زہریلے سانپ ہیں اور یہ موقع ملنے پر ڈسے بغیر نہیں [illegible]رہ سکتے ..... لیکن سانپ ایک کم ہو تو خطرہ بھی کم ہو جائے گا۔"

سفیر نے مجھے غور سے دیکھا۔ "کیا تو مرشد کی بات [illegible]ے متفق ہے کہ نادر کو اس دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔"

"یہ تو میری پُرانی خواہش ہے لیکن یہ کام مرشد کی مرضی کے مطابق نہیں ہو گا۔"

"بالکل ٹھیک وہ ہمیں پھنسانا چاہ رہا ہے لیکن ہم اس کے چکر میں نہیں آئیں گے۔" وسیم نے کہا۔ مانی نے ڈائننگ روم میں جھانکا۔

"یہ بے ایمانی ہے خادم تو سب کی خدمت کرے اور جب اپنی باری آئے تو لوگ اسے بھول جاتے ہیں۔"

"یار تم روتے ہی رہتے ہو۔" سفیر نے کہا۔ "آ کر یہاں بنا لو کسی نے منع نہیں کیا ہے۔"

"جی نہیں شکریہ۔" اس نے خفگی سے کہا اور واپس چلا گیا۔

"ویسے یہ زیادتی ہے۔" میں نے مانی کی تائید کی۔

"دوسرا بیتو آ گیا ہے۔" وسیم ہنسا۔ "ویسے خواتین کے ساتھ کسی کو تو بھیجنا ہو گا تو بیتو چلا جائے یہ اس کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔"

عبداللہ کھڑا ہو گیا۔ "اچھا اب مجھے اجازت ہے میں کل سے اس کام کا آغاز کرتا ہوں۔"

عبداللہ کے جانے کے بعد وسیم نے اُٹھ کر کیتلی سے مانی کے لیے کافی نکالی اور اسے دینے چلا گیا۔ کچھ دیر میں وہ اس کے ساتھ خوش خوش آ گیا اور بولا۔ "شہباز بھائی مجھے لگتا ہے اللہ نے دو کاموں کے لیے مجھے اس دنیا میں بھیجا ہے ایک کمپیوٹر کے لیے اور دوسرا کافی پینے کے لیے۔"

"نہیں برخوردار اس کے علاوہ بھی تم سے بہت سے کام لینے ہیں۔" سفیر نے حسبِ عادت اسے چھیڑا۔ "یہ بتاؤ کبھی پستول، رائفل، مشین گن، بھاری مشین گن اور راکٹ لانچر چلانے کا اتفاق ہوا ہے۔ نشانہ کیسا ہے دستی بم کو نشانے پر پھینک لو گے۔"

مانی نے جلدی سے کافی کا بڑا سا گھونٹ لیا اور کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "ان سب ہتھیاروں کا استعمال کمپیوٹر گیم میں کیا ہے۔ سچ میں تو کبھی دیکھا بھی نہیں ہے اور فائر کی آواز سن کر میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔"

"تب دستی بم کا دھماکا تمہارا ہارٹ فیل کر دے گا۔" وسیم نے کہا۔

"جی بالکل مجھے اس قسم کے معاملات میں معاف رکھیں ہاں جہاں تک کمپیوٹر کا تعلق ہے تو میں آپ کے لیے جان لڑا دوں گا۔"

"تو بس برخوردار تم جا کر جان لڑاؤ۔" سفیر نے اس کا شانہ تھپکا۔

"رات کے لیے جو منگوائیں ذرا اچھی مقدار میں منگوایے گا۔" اس نے جاتے ہوئے کہا۔ "پیزا سے میرا پیٹ

نہیں بھرا۔"

سفیر کی آنکھیں باہر آگئیں اس نے مجھے اور وسیم کو دیکھا۔ "لارج سائز پیزا کھا کر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرا۔"

وسیم ہنسا اور ٹی وی پر دکھائے جانے والے ایک اے سی کے ایڈ کی نقل کی۔ "اس کے چھوٹے سائز پر مت جانا۔"

کچھ دیر ہنسی مذاق کے بعد ہم دوبارہ اصل موضوع پر آگئے۔ "یہ طے ہے کہ انہیں کہیں باہر بھیجنا ہے۔" سفیر نے کہا۔

"بیٹے ان سے پوچھے بغیر طے کر رہے ہو اکیلے میں کیسے نمٹو گے؟"

"ابھی کچھ اور کہہ رہے تھے۔" سفیر جھنجلا گیا۔

"تمہاری کوئی ایک زبان ہے۔"

"اوہ بھائی ڈپلومیسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "اب طریقے سلیقے سے منواؤ تو کیوں نہیں مانیں گی؟"

وسیم ہماری نوک جھوک سے قطع نظر سوچ و بچار میں مصروف تھا۔ اس نے کہا۔ "شہباز صاحب اگر ان کو چین بھیج دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا ہم بھی چینی حکومت کے ایک معاملے میں ملوث ہیں اور اگر ہم بریف کیس واپس کرنے میں کامیاب رہے تو یقیناً چین کی حکومت خوش ہوگی۔"

"وہ دوسرا معاملہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر ہم بیٹو اور خواتین کو چین ٹورسٹ ویزے پر بھیجیں تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ چین نے ٹورسٹوں کے لیے بہت سہولیات رکھی ہیں اور یہ سہولیات پاکستانی سیاحوں کے لیے بھی ہوں گی۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سفیر نے کہا۔ "بریف کیس والا معاملہ الگ ہے اور میرا تو خیال ہے کہ ہمیں بریف کیس مل جائے تو اسے یوں واپس کرنا چاہیے کہ ہم سامنے نہ آئیں ورنہ ممکن ہے کسی اور چکر میں پڑ جائیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "مملکتوں کے لیے راز انسانوں یا ان سے وابستہ کسی بھی جذبے سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے چکروں سے دور رہنا ہی ٹھیک ہوگا۔"

وسیم نے گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہ بریف کیس ہماری اخلاقی ذمے داری ہے لازمی مجبوری نہیں ہے؟"

"بالکل اگر ہم اسے حاصل کر کے چین کو واپس کر دیں تو اپنی اخلاقی ذمے داری پوری کر دیں گے اور اگر نہ کر سکے تو ہم پر کسی قسم کا الزام نہیں آئے گا کیونکہ نہ تو ہم نے اس حوالے سے کسی قسم کی ذمے داری لی ہے اور نہ ہی چین کے رازوں کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ ویسے بھی وہ بریف کیس... محفوظ ہیں۔ اسے سوائے درست لاک کمبی نیشن کے او... طریقے سے کھولنے کی کوشش کی گئی تو یہ دھماکے سے ... جائے گا۔ اس طرح اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے... بریف کیس غلط ہاتھوں میں چلا گیا تو وہ اسے کھول کر اس راز معلوم کر سکتے ہیں۔"

"مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔" وسیم... کہا۔ "حکومتوں کے پاس وسائل لامحدود ہوتے ہیں۔ ان ماہرین کسی نہ کسی طریقے سے بریف کیس کھول سکتے ہیں۔"

"لیکن فی الحال وہ شہلا کے پاس ہے۔" میں... بات ختم کر دی۔ "اب اس سے بات کر کے دیکھتے ہیں۔"

سورج غروب ہو چکا تھا کچن میں ہلکی سی سردی محسو... ہونے لگی۔ وسیم نے کہا۔ "شاید نیچے بھٹی میں آگ کم ہو... ہے میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

"روز کتنی لکڑی ڈالتے ہو بھٹی میں؟" میں... پوچھا۔

"ڈھائی سے تین من۔" اس نے جواب دیا۔ "ابھی... پیچھے شیڈ میں تقریباً تین سو من کے قریب لکڑی موجود ہے... ساری سردیوں کے لیے کافی ہوگی۔"

"یہ تو اچھا ہے۔ میرا خیال ہے یہاں گیس نہیں... گی۔" میں نے کہا۔

"گیس یہاں سے کچھ ہی دور ہے لیکن شاید فار... ہاؤس کے مالک نے خود نہیں لی۔" سفیر نے کہا۔ اس... گھڑی دیکھی۔ "سات بجنے والے ہیں کیا خیال ہے کھا... کے لیے آرڈر کر دوں۔"

"منگوا لو۔" وسیم نے کہا اور تہ خانے کی طرف چلا گ... جہاں بھٹی لگی تھی۔ میں مانی کے پاس آیا جو حسب معمول ا... لیپ ٹاپ پر جھکا ہوا تھا۔ میں اس سے گپ شپ کرنے ک... ارادے سے آیا تھا لیکن ایک موقع پر جب اس نے بتایا کہ... کسی کا ای میل ایڈریس بھی ہیک کر سکتا تو مجھے خیال آیا او... میں نے اس سے پوچھا۔

"کوئی بھی ای میل ایڈریس؟"

"ہاں کوئی بھی۔"

"ایک شخص ہے ڈیوڈ شا کیا تم اس کا ای میل ہیک ک... سکتے ہو؟"

"کس پوزیشن کا آدمی ہے؟"

"یہ سوال کیوں کیا ہے؟"

"آدمی رازداری کی اہمیت کے حساب سے اپنے ا...

...ایڈریس کی سیکورٹی کرتا ہے۔"

...میں نے سوچ کر کہا۔ "سمجھ لو امریکی صدر کے ای میل کی سیکورٹی ہوگی اتنی ہی اس شخص کے ای میل کی بھی ہو... کیا ایسے شخص کا ای میل ہیک کرنا مشکل ہوتا ہے؟"

"نہیں جناب مشکل تو نہیں ہوتا ہے لیکن سیکورٹی کی وجہ ...اسے پتا چل جاتا ہے اس لیے وہ اپنا پاس ورڈ بدل لیتا ہے یا ...ل پھر استعمال ہی نہیں کرتا ہے۔ تو پھر ہیکنگ کا مقصد ہی ...ہو گیا نا۔ اس لیے ہمیں ایسے ای میل ایڈریس اس طرح ...کرنے ہوتے ہیں کہ اس کے مالک کو پتا نہ چلے۔"

"تم کس طرح معلوم کرو گے کہ ڈیوڈ شا کا ای میل ...س کیا ہے؟"

"اس کے لیے آپ کو مزید معلومات دینا ہوں گی اس ...خص کے بارے میں۔"

میں اسے ڈیوڈ شا کے بارے میں بتانے لگا۔ مانی ...کمل گیا تھا جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ "جناب ...کس شخص کے ساتھ پنگا کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ تو اپنے ...مارل سے بہت خطرناک لگ رہا ہے۔"

"یہ پہلے ہی میرے ساتھ پنگے میں ہے۔ اس لیے ...پنگے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

مانی نے کی بورڈ پر انگلیاں چلانا شروع کیں۔ "اس شخص ...لیے بہت محتاط ہونا پڑے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک رات فارم ...اس میں ہیلی کاپٹر اتر آئیں اور اگلے دن میری آنکھ کھلے تو ...میں گوانتاناموبے جیسے کسی قید خانے میں پڑا ہوں۔"

"سمجھ لو تقریباً اتنا ہی خطرناک آدمی ہے۔" میں نے کہا۔

مانی نے چند منٹ میں معلومات کی مدد سے ڈیوڈ شا کا ...ای میل نکال لیا۔ یہ اس کے اپنے نام سے تھا۔ مانی نے ...کہا۔ "ممکن ہے یہ اس کا عام ای میل ایڈریس ہو خاص اس ...کسی اور نام سے بنایا ہو۔"

"اسے تلاش کرنے کا کیا طریقہ ہوگا۔"

"طریقہ بڑا طویل ہوگا لیکن ہمارا کام ہی ایسا ...ہے۔ سب سے پہلے اس ای میل کو ہیک کر کے اس کی کونٹیکٹ ...لسٹ دیکھنا ہوگی ممکن ہے ڈیوڈ شا کا خفیہ ای میل ایڈریس اس ...میں شامل ہو۔"

"چلو پہلے اسے تو ہیک کرو۔" میں نے کہا اور اپنے ...کمرے ...کا رخ کیا۔ ایک محفوظ طریقہ رابطہ ہاتھ آ جانے کے ...میرا ...دل کر رہا تھا کہ مرشد سے چھیڑ خانی کروں۔ میں نے ...ی... سے اس کے موبائل پر کال کی۔ ایک بار اس

خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں

شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

نے کال کاٹ دی لیکن جب میں نے دوسری بار ملائی تو اس نے ریسیو کرلی اور جھنجلائے انداز میں بولا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی گنگناہٹ تھی جیسے وہ پئے ہوئے ہو۔

''کون ہو کیا بات ہے؟''

''میں بات کر رہا ہوں۔'' میں نے اپنا نام لینے سے گریز کیا لیکن اس نے فوراً میرا نام لیا۔

''شہباز ملک تم نے اس وقت کیوں کال کی۔''

''صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ڈیوڈ شا سے تمہارا اب بھی رابطہ ہے یا نہیں۔''

مرشد نے اسے ایک گندی سی گالی دی۔ ''وہ خود کو کیا سمجھتا ہے میں اس کا غلام ہوں کیا؟''

میں ہنسا۔ ''یہ تو ٹھیک سمجھتا ہے اور تم لوگ..... میری مراد ہمارے ملک کی حکمران کلاس سے ہے ان گوروں کے غلام ہی ہو۔ ابھی تم اسے گالی دے رہے ہو لیکن اگر وہ تمہارے سامنے آجائے تو مجھے یقین ہے تم اس کے جوتے چاٹنے سے بھی گریز نہیں کرو گے۔''

''بکواس مت کرو۔'' مرشد غرایا۔ ''کام کی بات کرو میں بہت مصروف ہوں۔''

اس کی مصروفیت کی گنگناتی آواز مجھ تک آرہی تھی۔ مرشد خلوت میں تھا اور اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی۔ مرشد نے اسے بھی بکواس بند رکھنے کا حکم دیا تو وہ زور سے ہنسی۔ وہ مرشد سے بھی زیادہ نشے میں تھی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''ٹھیک ہے تم اپنی مصروفیات دیکھو میں بعد میں کال کرلوں گا۔''

''سنو شہباز! اگر مجھے تم سے رابطہ کرنا ہو تو میں کیسے کروں گا؟''

''فی الحال ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے اس کوٹھی پر دوبارہ کال مت کرنا اب میں وہاں سے رابطے میں نہیں ہوں۔''

''جھوٹ وہ راجا عمر دراز کی کوٹھی ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ تم اس کے آدمیوں سے رابطے میں نہ ہو۔''

''تم آزما کر دیکھ لو ویسے تم فکر مت کرو میں جلد تمہیں دوبارہ کال کروں گا۔''

''ایک منٹ میری بات....'' مرشد نے کہنا چاہا لیکن میں نے کال کاٹ دی۔ میں شال لے کر نیچے آیا اور باہر لان میں نکل آیا۔ سردی غضب کی تھی لیکن اس کا بھی ایک الگ ہی مزہ ہے۔ مالی نے باہر کی روشنیاں آن کر دی تھیں اور ہلکی دھند کی وجہ سے لیمپ لائٹس خواب ناک سا تاثر دے رہی تھیں۔ سفیر کی سردی سے جان جاتی تھی اس لیے اس نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی البتہ وسیم آگیا۔

''سردی کے مزے لے رہے ہیں۔''

''ہاں یار اللہ کی نعمتوں کا شمار ہی نہیں ہے ہر موسم کا بھی الگ مزہ رکھا ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' اس نے کہا اور پھر موضوع بدل دیا۔ ''مس شا کے مسئلے کا کوئی حل سامنے آیا؟''

''ابھی تو نہیں..... سنا ہے آج انگلینڈ سے دو ماہر آکر جیکٹ کا معائنہ کریں گے۔ ویسے اس قسم کے کام بہت رسکی ہوتے ہیں۔ بم ٹریپ ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں ماہر ترین آدمی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ اسے سو فیصد محفوظ طریقے سے ناکارہ بنا سکے گا۔ مجھے لگ رہا ہے بات بالآخر فتح خان پر جائے گی۔ بس یہ طے کرنا ہوگا کہ اس کا مطالبہ پورا کرنا ہے یا نہیں کرنا۔''

''نہ کرنے کی وجہ کیا ہوگی؟''

''حکومتی انا اور کیا ہو سکتا ہے ورنہ یہی ملک چپکے چپکے تاوان ادا کرتے رہے ہیں۔ ہاں اگر بات کھل کر میڈیا تک پہنچ گئی تو پھر ملک کی عزت کا بہانہ کرتے ہیں اور افراد کو قربان کر دیا جاتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے اس میں ڈیوڈ شا بھی ملوث ہو سکتا ہے؟''

''بالکل اس کے لیے یہ جاگیر اور خطاب کا مسئلہ ہے اگر ایمن زندہ رہ گئی تو جاگیر اور خطاب اسے منتقل ہو جائے گا اور ڈیوڈ شا اس معاملے میں خالی ہاتھ رہ جائے گا۔ اس لیے اگر وہ اس معاملے میں ملوث ہو گیا تو ایمن کے لیے آسانی نہیں ہوگی صرف مشکل ہوگی۔''

''ڈیوڈ شا آپ سے بھی معاملہ طے کرنا چاہتا تھا لیکن مرشد نے دھوکا دیا۔ دوسری طرف وہ جانتا ہے ایمن شا سے آپ کی دوستی ہے تو کیا اسس معاملے کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کرے گا؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''درحقیقت مجھے یہی خدشہ ہے۔ وہ مجھ سے بات کرے گا اور مجھے پھر معاہدہ میں جکڑنے کی کوشش کرے گا۔ جیسا کہ اس نے پہلے کیا تھا۔ لیکن مرشد نے وعدہ خلافی کر کے اور اس کے آدمی نے غداری کر کے مجھے معاہدے کی اس زنجیر سے آزاد کر دیا تھا۔''

''اگر اس نے دوبارہ آپ کو وہی زنجیر پہنانے کی کوشش کی تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا۔''

''اس بار میں مکمل طور پر اس کے قابو میں نہیں ہوں گا اس لیے وہ پہلے جیسی بات نہیں کر سکے گا۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''لیکن مجھے ایمن شا کو بچانے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا

...گا کیونکہ میری حفاظت میں ہوتے ہوئے فتح خان نے ...ریپ کیا ہے۔''

''ڈیوڈ شا آپ تک رسائی نہیں رکھتا ہے۔ آپ غائب ...سکتے ہیں جب آپ سامنے نہیں ہوں گے تو وہ کس سے ...بد کرے گا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس ...ورت میں ڈیوڈ شا ایمن کے خاتمے پر تل جائے گا اور اس کا ...ر سوخ کام نہ آیا تو وہ معاملے کو پبلک کر دے گا اس کا ...قصان بھی ایمن کو ہوگا۔ ممکن ہے فتح خان کے خلاف ہماری ...ت کو کارروائی پر مجبور کیا جائے اور وہ کہیں غائب ہو جائے ...س کے بعد بم کو ناکارہ کرنے والا کوڈ کون بتائے گا؟''

''ایک خدشہ اور بھی جس سے تاوان کی ادائیگی سے گریز کیا جا سکتا ہے اگر فتح خان رقم وصول کر کے بھی غلط کوڈ بتا ...ے تو کوئی اس کا کیا بگاڑ سکے گا۔''

''اس صورت میں اس کی تلاش بین الاقوامی پیمانے پر ...ا جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''دوسرے فتح خان جانتا ہے کہ ...یمن کی موت کے بعد مجھ سے دشمنی خونی ہو جائے گی۔ کسی ...یک کا خون ہی اس دشمنی کو ختم کر سکے گا۔ اس لیے مجھے امید ...ہ وہ اس حد تک نہیں جائے گا۔''

''وہ تو ویسے بھی کی جائے گی۔'' وسیم نے کہا۔ ''مغربی طاقتیں اس شخص کے پیچھے پڑ جاتی ہیں جو کسی طرح بھی ان کی ناک نیچی کرے۔''

''مگر ایمن کی موت کی صورت میں معاملہ کہیں زیادہ سنگین ہو جائے گا۔ میں نے سنا ہے ہر سال دنیا کے مختلف حصوں میں اغوا کیے جانے والے مغربی سیاحوں کے تاوان کی ادائیگی چپ چاپ کر دی جاتی ہے اور ایسے کیسز کو منظرِ عام پر آنے نہیں دیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاملہ منظرِ عام پر آنے سے عام طور سے تاوان ادا نہیں کیا جاتا ہے اور نتیجے میں مغوی اغوا کاروں کے ہاتھ مارا جاتا ہے اور ان کی حکومتوں کو دکھاوے کے لیے سہی لیکن کارروائی کرنا پڑتی ہے جو انہیں تاوان سے کہیں زیادہ مہنگی پڑ جاتی ہے اس لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ خاموشی سے تاوان ادا کر دیں۔ کیونکہ وہ نہ اپنے لوگوں کو دنیا کی سیاحت سے روک سکتے ہیں اور نہ اغوا کاروں کو اغوا کرنے سے روک سکتے ہیں۔''

میں اور وسیم ٹہلتے رہے اور مختلف معاملات پر بات کرتے رہے۔ خاصی دیر بعد سفیر نے اندر سے جھانکا۔ ''کیا بات ہے بھائی کیا موسم بہت خوشگوار ہو گیا ہے، اندر نہیں آنا ہے۔''

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

جون 2012ء کے شمارے کی ایک تجسس آمیز جھلک

دشت امکاں

عائشہ فاطمہ کے قلم سے ٹوٹی مالا کے بکھرے موتی اور سحر انگیز لمحات کا اظہار وہ شعلہ بیان جب چپ کے گہرے ساگر میں اتری تو سنانے فسانے سنانے لگے

غزنی تا دہلی

ڈاکٹر ساجد امجد ابتدائی صفحات پر نرم خو شہنشاہ شہاب الدین غوری اور وفادار غلام قطب الدین ایبک کے فکر و تدبر کی بے مثال گہرائی۔

کشکول

کہیں جال پھیلاتے دشمن، کہیں دعاؤں کے دامن دراز...... کہیں زندگی کے نشیب، کہیں خوابوں کے رنگین دسار، مختلف چہروں...... منفرد دردیوں کا دلچسپ سلسلہ

مسافر

لٹتے روپ معاشرتی تلخیوں اور اذیت بھرے لمحات کا پرفریب انداز، جب زندگی رنگوں میں اعلیٰ دکھائی دے اور اگلے ہی پل تمام رنگ بے کیف محسوس ہوں تو ایسے میں مسافر کیا کرے

ایم اے راحت، منظر امام، مختار آزاد، کاشف زبیر، رجنی پٹیل، سلیم انور اور تنویر ریاض کا دلربا انداز

"تم باہر آجاؤ۔" وسیم نے کہا۔ "موسم واقعی بہت خوشگوار ہوگیا ہے۔"

"مجھے معاف رکھو، اس سے بہتر ہے میں مانی کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں۔" سفیر نے کہا اور اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد میں اور وسیم بھی اندر آگئے۔ میں نے مانی سے ڈیوڈ شا کے ای میل کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ ڈیوڈ شا شاید مستقل لاگ اِن ہے اس لیے وہ ابھی تک اپنا کام نہیں کرسکا ہے۔ ہمارے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے ٹی وی دیکھتے رہے پھر کھانا آگیا، وہ کھایا اور دوبارہ لاؤنج میں آگئے۔ میرا سونے کا موڈ ہوا تو میں اوپر چلا آیا۔ شاید یہ گزشتہ کچھ عرصے سے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میں سارا دن آرام کرنے کے بعد لیٹا اور سو گیا۔ صبح بھی دیر سے آنکھ کھلی جسم میں کسلمندی تھی۔ میں گرم پانی سے نہایا تو کسلمندی کسی حد تک ٹھیک ہوگئی تھی، آج ناشتا حلوہ پوری اور بھاجی کا تھا یہ بھی آرڈر کرنے پر آگیا تھا۔ سفیر مجھے دیکھ کر چہکا۔ "موبائل فون کا سب سے اچھا استعمال یہی ہے۔"

"اچھا میں تو سمجھتا تھا بیوی سے بات کرنا ہے۔" میں نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ سفیر نے منہ بنایا۔

"جب آدمی دوبدو گفتگو اور دوسرے امور انجام دے سکتا ہے تو موبائل فون کی کیا ضرورت ہے اس معاملے میں؟"

"یہ بھی ہے۔" میں نے تائید کی۔ "وسیم کہاں ہے؟"

"عبداللہ کی کال آئی تھی اس نے بلایا ہے وہ خواتین کو نکالنے کے منصوبے کو حتمی صورت دینا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں وسیم کو بلایا ہے وہ وین لے گیا ہے۔"

"جتنی جلد یہ کام ہو جائے اچھا ہے اس کے بعد ہم زیادہ بے فکری سے مرشد کی طرف توجہ دے سکیں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن فی الحال میں بے کار ہوں۔"

سفیر نے یاد دلایا۔ "تمہیں ناشتے کے بعد شہلا سے بات کرنی ہے بریف کیس کے لیے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن نہ جانے کیوں میں خود کو فی الحال بے کار محسوس کررہا ہوں۔"

"شاید اس لیے کہ تمہیں کچھ عرصے سے اکیلے کام کرنے کی عادت پڑگئی ہے اور اب سب مل کر کرتے ہیں اس لیے تمہیں اپنا آپ بے کار لگ رہا ہے۔ ویسے دشمنوں کی طرف سے بھی سناٹا ہے۔ فتح خان صرف چھیڑ چھاڑ کررہا ہے اور مرشد نے بھی دشمنی سے ہاتھ اُٹھانے کا اشارہ دے دیا ہے۔ شہلا بریف کیس دینے پر آمادہ ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "لیکن مجھے یقین ان میں سے کسی پر بھی نہیں ہے۔ یہ سب اپنے ہی چکروں میں ہیں۔"

"ٹھیک کہا اور ہمیں ان کے چکروں سے اپنا کام ہے۔" سفیر نے چائے میرے سامنے رکھی۔ "میں بھی جا رہا ہوں کچھ سامان لانا ہے۔"

"عبداللہ کی طرف مت جانا۔" میں نے خبردار کیا۔

سفیر نے سرد آہ بھری۔ "ہاں یار فی الحال تو کوئے جاناں کی طرف جانے پر پابندی ہے۔"

"کیونکہ وہاں سے سوئے دار کی طرف جانے کا پورا امکان ہے۔" میں نے سر ہلایا اور چائے کا کپ لیا۔ "آؤ ذرا شہلا سے بات ہوجائے۔"

"تم کرو میں جارہا ہوں آج دوپہر کے لیے خود لے کر آؤں گا۔" سفیر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ میں نے اسٹڈی میں جھانکا مانی حسبِ معمول کمپیوٹر کے سامنے موجود تھا۔

"کیا ہورہا ہے؟"

"نوٹ کما رہا ہوں جناب۔" اس نے انگلیاں چلاتے ہوئے جواب دیا۔ "دو گھنٹے میں چار سو ستر ڈالرز کما چکا ہوں۔"

"انٹرنیٹ کے ذریعے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں یہاں کمائی کے بہت مواقع ہوتے ہیں۔ اتنا وقت نہیں ملتا ہے ورنہ اس سے بھی زیادہ کما سکتا ہوں۔"

"یعنی فی گھنٹا دو سو پینتیس ڈالرز؟"

"نہیں جناب یہ تو خاص کام ہے ایک سافٹ ویئر کی خامی ٹھیک کی ہے۔ یہی کام کسی کمپنی سے کراتے تو ان کو کم کم بھی دو ہزار ڈالرز دینا پڑتے۔ مجھ سے پانچ سو سے بھی کم میں لے لیا۔ ویسے نارمل میں روز سو سے ڈیڑھ سو ڈالرز کمائے جاسکتے ہیں۔"

"تمہیں ادائیگی کس طرح ہوتی ہے؟"

"انٹرنیٹ پر میرا اکاؤنٹ ہے دنیا کے کسی بھی بینک کے کریڈٹ کارڈ سے مجھے ادائیگی کی جاسکتی ہے۔ اب تو انٹرنیٹ بینک بھی آگئے ہیں۔"

"تم تو ماشاء اللہ کماؤ پوت ہو۔"

"لیکن میرے ڈیڈی اس سے مطمئن نہیں ہیں وہ چاہتے ہیں کہ میں سول سروس میں آجاؤں اور پھر میرے امریکا اور یورپ میں اثاثے ہوں اور سوئس بینک اکاؤنٹ ہو۔" مانی کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ "مانی تم جیسے نوجوان آج کے دور میں قابلِ فخر ہیں کیونکہ ہماری نئی نسل اچھے بُرے

...لی ہے۔"

"میں بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ عبداللہ بھائی اور آپ ...ل گئے جو فطرت کے لحاظ سے اچھے ہیں اور اچھوں ...کرتے ہیں۔"

"فی الحال تو ہم تمہاری قدر کرنے کی پوزیشن میں نہیں" میں نے ندامت سے کہا۔ "الٹا تم سے فری میں کام ...ہے ہیں۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا عبداللہ بھائی نے مجھے ...جاب دی ہے اور مجھے تنخواہ دی جاتی ہے۔ پہلی تنخواہ تو ...نے پیشگی دے دی تھی کیونکہ میں کپڑے تک نہیں لایا تھا ...اپنا کمپیوٹر اور اس کا ضروری سامان لایا تھا۔"

"انٹرنیٹ کام کررہا ہے میں ایک کال کرنے جارہا..."

"جی بالکل کام کررہا ہے۔" اس نے کہا۔

میں اوپر آیا اور لیپ ٹاپ آن کیا۔ شہلا کا نمبر ملایا۔ ...نے کچھ بعد کال ریسیو کی۔ "کون بات کررہا ہے؟"

"کسی نامعلوم نمبر سے کون بات کرسکتا ہے؟" ...کہا۔

"صرف تم نہیں ہو۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔ "مجھے ...سے اور بھی کالز آتی ہیں۔ یہ بتاؤ تم تبادلے کے لیے ...ہو؟"

"ہاں لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم کوئی دھوکا نہیں ...دگی؟"

"یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے۔"

"تمہیں؟" میں نے طنز کیا۔ "جس نے موقع ملنے پر ...مجھے دھوکا دیا۔ اب یہ بریف کیس تمہارے کس کام کا تھا ...جب کمانڈر تمہارے ہاتھ میں آئی تو تم نے بلاتکلف اسے ...تھما لیا۔ دوسرے مجھے شبہ ہے کہ تمہارے پیچھے اب بھی فتح ...ہے اور وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو قابو کرنے کی فکر ...ہے۔"

"میرا اب فتح خان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تبھی اس نے تمہیں راجا عمر دراز کی کوٹھی کا بتایا ہے۔"

"اس نے خود مجھے کال کرکے اطلاع دی تھی۔"

"یعنی اس کے پاس تمہارا نمبر ہے دوسری طرف وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اب اس کا تم سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔"

"ہماری راہیں الگ ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم میں کوئی رابطے کا ذریعہ نہیں رہا ہے۔ اگر تم اعتبار کررہے ہو تو تبادلے کی کیا صورت ہوگی؟"

"تمہیں میری بتائی جگہ آنا ہوگا۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔" اس نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "بریف کیس تم اپنے پاس رکھو تم اس کو کھول نہیں سکتی ہو اور اپنی تصویریں بھول جاؤ۔"

"کیوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "تم ان تصویروں کا کیا کروگے؟"

"وہی جو تم بریف کیس کا کروگی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "شہلا تم بھول رہی ہو مجبور تم ہو میں نہیں اس لیے تبادلہ میری شرائط پر ہوگا۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ تبادلہ آج ہی ہو جائے۔"

"مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں گیارہ بجے کال کرکے بتاتا ہوں کہ تبادلہ کیسے اور کہاں ہوگا؟"

میں نے کال کاٹ کر موبائل سے وسیم کو کال کی۔ "شہلا مان گئی ہے تبادلہ اور اس کا طریقہ کار میں بتاؤں گا اب سے دو گھنٹے بعد۔"

"میں اور عبداللہ طے کرچکے ہیں کہ ہمیں آج ہی خواتین کو یہاں سے نکالنا ہے۔ طریقہ مجھے پسند آیا ہے اب آپ فرمائیں۔"

"اگر تم مطمئن ہو تو کر گزرو۔ یہ بتاؤ کہ بیتو کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک نہیں ہے آج پھر اسے بخار ہے۔ ڈاکٹر آیا ہے دیکھنے کے لیے۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے خود جانا ہوگا بریف کیس لینے کے لیے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "اچھا ایاز آگیا ہے؟"

"نہیں کل اس کی گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ وہ سرگودھا میں ہے اب نکلا ہے وہاں سے میرا خیال ہے دوپہر تک آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے تم اور عبداللہ اس کام پر توجہ دو میں اور ایاز شہلا کا مسئلہ نمٹاتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو سفیر کو بھی کال کرکے اپنی طرف بلوالو وہ باہر نکلا ہوا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے وہ آرام سے امورِ خانہ داری نمٹا سکتا ہے۔"

میں ہنسا۔ "سامان بھی اسی کا لینے نکلا ہے۔ ٹھیک ہے زیادہ بھیڑ بھاڑ سے کام خراب ہوجاتا ہے۔ لیکن ایک مسئلہ

ہے ہمارے پاس جتنی گاڑیاں ہیں وہ سب دشمنوں کی نظر میں آچکی ہیں۔"

وسیم بولا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ہمیں اب اپنی گاڑیاں بدل لینا چاہییں۔"

"ٹھیک ہے اس پر بھی کام کرنا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ میرے پاس ہیوی بائیک جانی پہچانی ہوگئی تھی کم سے کم شہلا اور فتح خان اسے پہچانتے تھے اس لیے میں اس کام میں اسے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ سیاہ وین اس کام کے لیے مناسب نہیں تھی پھر مجھے اس کے سسٹم آپریٹ کرنا بھی نہیں آتے تھے اور اسے وسیم لے گیا تھا۔ اسے آج خواتین کو عبداللہ والی کوٹھی سے نکالنے کے آپریشن میں استعمال ہونا تھا۔ میں نے پوچھا نہیں کہ ان کو وہاں سے نکال کر کہاں لے جایا جائے گا۔ جب کام نمٹ جاتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔ اب مجھے اس کام کے لیے دوسری بائیک کی ضرورت تھی۔ میں نے جیکٹ اور ہیلمٹ لیا اور نیچے آیا اب صرف مانی رہ گیا تھا میں نے اسے اپنی روانگی اور ایاز کی ممکنہ آمد کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں جناب میں ایاز بھائی کو پہچانتا ہوں۔" پھر اس نے اپنا شاید چھبیس انچ کا سینہ پھلا کر کہا۔ "آپ بے فکر ہو کر جائیں میں ہوں یہاں نگرانی کے لیے۔"

"لیکن برخوردار اگر دشمن یا کوئی غیر متعلقہ فرد یہاں گھس آئے تو بلاوجہ کی بہادری مت دکھانا پچھلی طرف سے فرار ہو جانا۔" میں نے کہا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ بائیک پر ہیلمٹ لینے کی وجہ سے میں ناقابلِ شناخت ہوگیا تھا اور اس طرح پورے شہر میں دندنا سکتا تھا۔ لیکن اس بائیک کی وجہ سے مجھ پر شک کیا جاسکتا تھا۔ اب میں اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا میں سیدھا اسی ڈیلر قریشی کے پاس گیا جس سے یہ بائیک لی تھی اس نے مجھ سے پہلے بائیک کو پہچان لیا اور گرم جوشی سے ملا۔ "کیسے ہیں سرکار، آج ایاز نہیں آیا؟"

"وہ شہر سے باہر ہے۔" میں نے کہا اور براہِ راست کام کی بات پر آگیا۔ "مجھے یہ بائیک چینج کرنی ہے۔"

"بائیک بھی چینج ہو جائے گی جناب پہلے چائے پانی تو ہو جائے لسی کا موسم نہیں ہے۔"

"نہیں دوست میرے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "چائے پانی پھر سہی۔"

"ٹھیک ہے جی پھر آئیں۔" وہ کھڑا ہوگیا۔ "کیسی چاہیے اس بار؟"

"نارمل ہو لیکن انجن طاقتور ہو اور کنڈیشن اے ون ہو۔"

"ٹھیک ہے میرے پاس ایک سوزوکی اسپرا ہے۔ بہترین کنڈیشن ہے صرف تین چار مہینے استعمال ہے اور وہ بھی صرف دو ہزار کلومیٹرز۔ ہر چیز نئی جیسی ہے رنگ ہے۔"

بائیک واقعی بہترین کنڈیشن میں تھی۔ میں اسٹارٹ کی تو نصف کک میں اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ اا دوست قریشی اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہا تھا۔ کاغذات بھی مکمل تھے اور وہ ایک دن میں ٹرانسفر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں بائیک چھوڑ کر لے جا رہا ہوں۔ حساب کتاب بعد میں ایاز کر لے گا۔"

"بعد میں۔" وہ ہچکچایا۔ "پر سرکار یہ مناسب نہیں گا۔ اگر سودا آپ کر لو تو بہتر ہے اس کا حساب میں ایاز کر لوں گا۔"

میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے معاہدہ کرا آدھی قیمت ابھی لے لو اور باقی رجسٹری کے بعد۔"

"آپ بے فکر رہو جناب ایسا ہی ہوگا بڑا امت ماا کسی کی چیز ہے بغیر لکھا پڑھی کے نہیں دے سکتے۔"

اس نے قیمت چالیس مانگی تھی اور پینتیس پر گیا۔ معاہدے عام طور سے تیار رکھے ہوتے تھے اس صرف میرا نام اور بائیک کا نمبر وغیرہ ڈالے اور سائن کرا مجھ سے اٹھارہ ہزار وصول کیے اور بائیک مع کاغذات، اور اس کے اوریجنل ہیلمٹ کے ساتھ میرے حوالے دی۔ اپنی بائیک کے بارے میں کہا۔ "اسے بیچنا نہیں کرنا ہے اس کے بدلے کوئی ایسی ہی طاقتور بائیک نکال رکھو لیکن حلیے میں اس سے مختلف ہو۔"

"آپ دیکھ لیں کئی ایسی بائیک ہیں۔"

"یہ بھی ایاز دیکھ لے گا۔" میں نے کہا اور وہاں نکل آیا کیونکہ مجھے ابھی شہلا سے رابطہ کرنا تھا۔ وقت کم رہ تھا میں بائیک دوڑاتا ہوا فارم ہاؤس پہنچا تو اتفاق سے وقت سفیر اور ایاز بھی پہنچ گئے تھے۔ ایاز سینے سے لگ گیا۔

"کیسے ہیں شہباز صاحب آپ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم بہت خوش نظر آ رہے ہو۔"

وہ جھینپ گیا۔ "بس جی خوشی کی خبر ہے۔ میری م نے میرا اور شاہین کا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

"مبارک ہو ویسے اگر تم دونوں میاں بیوی بن جا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔"

"موسی کی تو یہی خواہش تھی لیکن میں ابھی شادی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"ہماری وجہ سے؟"

ہم اندر آ گئے تھے اس نے سر ہلایا۔ "یہ وجہ بھی ہے ی کے بعد بیوی توجہ مانگتی ہے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ایاز تم شادی کرو ر شاہین پر توجہ بھی دو ہمارا ساتھ دینے سے زیادہ یہ کام ری ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ ا اور اس سلسلے میں آپ کی یا کسی اور کی بات بھی نہیں مان ا۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"ایاز یہ خدا کا احسان ہے کہ اس نے اتنی محبت کرنے لے پُرخلوص دوست دیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ آج ہمیں دو اہم کام نمٹانے ہیں۔"

سفیر سچ مچ امورِ خانہ داری کا ہو گیا تھا وہ جیپ سے مان لے جا کر کچن میں رکھ رہا تھا۔ میں ایاز کے ساتھ اوپر یا اور شہلا کو کال کرنے سے پہلے اسے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ بائیک کا سن کر اس نے کہا۔ "یہ آپ نے اچھا کیا یہ بائیک یونیک تھی اور فوراً نظروں میں آجاتی تھی اب جو آپ لائے ہیں اسی شہر میں ایسی ہزاروں بائیک ہوں گی۔ باقی میں دیکھ لوں گا۔ خواتین کو کہاں منتقل کیا جا رہا ہے؟"

"یہ عبداللہ اور وسیم کا دردِ سر ہے۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ میں اپنی ساری توجہ شہلا سے بریف کیس حاصل کرنے پر لگا رہا ہوں اور تم میرے ساتھ ہوگے۔"

"میں سمجھ گیا جناب۔ اب آپ کا پلان کیا ہے؟"

"میرا ارادہ شہلا کو ٹریپ کرنے کا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اسے مری میں نئے بننے والے ملینیم شاپنگ مال میں بلاؤں گا لیکن ہم اسے راستے میں ٹریپ کر لیں گے۔"

"میں سمجھ گیا ہم ہائی وے پر اس کا انتظار کریں گے اور پھر اس کا تعاقب کر کے جائزہ لیں گے کہ کوئی اور تو اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کے بعد کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اسے روک لیں گے۔"

"بالکل یہی سوچا ہے میں نے۔" میں نے سر ہلایا اور انٹرنیٹ سے شہلا کا نمبر ملایا۔ وہ شاید موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"تم نے کیا سوچا تبادلہ کس طرح کرنا ہے؟"

"تبادلہ مری میں ہوگا۔"

"مری؟" وہ چونکی۔ "اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ تبادلہ میری شرائط پر ہوگا تمہیں وہاں ملینیم شاپنگ مال کے سامنے موجود ہونا چاہیے شام کے ٹھیک چار بجے اور تم وہاں تک اپنی سرخ چیری کار میں جاؤ گی۔"

"اس میں کیوں؟"

"تاکہ ہمیں اطمینان رہے کہ تم کسی کو ساتھ نہیں لا رہی ہو اس کار میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے مجھے کب تک وہاں پہنچنا ہوگا؟"

"ٹھیک تین بجے۔" میں نے جواب دیا۔ "یعنی اب سے کوئی چار گھنٹے بعد۔"

وہ چپ ہوگئی پھر بولی۔ "میں آجاؤں گی لیکن شہباز مجھے امید ہے تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔"

"میں دھوکا دینے والا آدمی نہیں ہوں اور شہلا تم اطمینان رکھو میری ذات سے تمہیں نقصان نہیں ہوگا۔ یاد رکھنا ٹھیک چار بجے ملینیم پر، دیکھا ہوا ہے نا تم نے؟"

"ہاں میں نے دیکھا ہے۔" وہ بولی۔

"بس تو وہیں ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا اور کال ختم کر دی۔ ایاز خاموش بیٹھا تھا اس نے کہا۔ "ہمیں جلدی نکلنا ہوگا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ایک چکر ہے شہلا نے تمہاری جیپ دیکھ رکھی ہے اسے دیکھ کر وہ کھٹک سکتی ہے۔ اس لیے تمہارے لیے بھی کوئی دوسرا بندوبست کرنا ہوگا۔"

"سفیر صاحب والی جیپ ٹھیک رہے گی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں فتح خان اسے دیکھ چکا ہے اور اسے ٹریپ بھی لگایا تھا۔ میرا خیال ہے تمہارے لیے بھی بائیک ٹھیک رہے گی۔ اگر ہم کہیں پھنسنے لگیں تو فرار میں بھی آسانی رہے گی۔"

"یعنی دوسری بائیک لینا پڑے گی۔" ایاز نے میری بات پر غور کیا۔

"ہاں ہمیں تمہارے اس جاننے والے قریشی کے پاس جانا پڑے گا۔"

سفیر دوپہر کے کھانے کے لیے پائے اور روٹی لے آیا تھا لیکن ہمارے پاس وقت نہیں تھا اس لیے ہم روانہ ہوگئے۔ میں نے پستول کے ساتھ چھوٹی نال والی شاٹ گن ساتھ لے لی، یہ میری جیکٹ میں آسانی سے آگئی تھی۔ ایاز کے پاس پستول تھا۔ ساتھ ہی اس نے دھویں والے بم رکھ لیے تھے، کہیں فرار کی ضرورت پیش آتی تو یہ بم کام آتے ہیں۔ سفیر کو پروگرام بتا کر ہم نکلے اور پہلے قریشی کے پاس پہنچے۔ ایاز کو دیکھ کر اس نے بلاہچکچاہٹ ایک دن ٹو فائیو اس کے حوالے کر دی اور معاہدے

کی بات بھی نہیں کی۔ صرف دو ہزار روپے ٹوکن کے پکڑائے ایاز نے اس سے کہا۔ ”اگر بائیک پسند آگئی تو کل حساب کرلوں گا ورنہ بائیک واپس کر جاؤں گا۔“

میں نے باہر نکل کر ایاز کو بتایا کہ قریشی نے بغیر معاہدہ کیے بائیک میرے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایاز طیش میں آگیا۔ ”آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا میں اس حرامی کا پیٹ پھاڑ دیتا۔ احسان کر رہا ہے، ہم پر اپنا کمیشن پورا رکھتا ہے میں کل ہی اس کا دماغ درست کرتا ہوں۔“

”تم آرام سے اس کا دماغ درست کرتے رہنا۔ ابھی تو ہمیں دو مختلف جگہوں پر جانا ہے۔ تمہیں شہلا کے گھر کی طرف مین روڈ پر آنے والے راستے پر موجود رہنا ہے اور جیسے ہی وہ روانہ ہو تم مجھے اطلاع کرو گے اور پھر اس کا پیچھا کرو گے لیکن اس طرح کہ اسے احساس نہ ہو۔“

”میں سمجھ گیا۔“

”اپنا موبائل ہینڈ فری سے لگا لو تاکہ جب اس کا تعاقب کرو تو تمہیں اطلاع کرنے میں مشکل نہ ہو۔“

ہم دونوں نے روانہ ہونے سے پہلے یہ کام کرلیا۔ ایاز نے پوچھا۔ ”آپ کہاں ہوں گے؟“

”میں راول چوک سے ذرا آگے سڑک پر ہی کہیں ہوں گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن کسی سنسان جگہ مت رکیے گا آج کل پولیس چیکنگ کر رہی ہے بلاوجہ آجائے گی۔“

”میں کسی ریستوران یا ہوٹل میں رک جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی ایک بجا ہے ایسا کرو تم کھانا کھا لینا۔“

”کھا لوں گا کوئی چیز راستے سے لے لوں گا۔“ اس نے کہا اور روانہ ہو گیا۔ میں مری روڈ کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں ایک دکان سے پشت پر لٹکانے والا سیاہ رنگ کا بیگ لیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں راول چوک کراس کر کے آگے آیا۔ ایک جگہ سے بائیک کا ٹینک فل کرایا اور ایک جھگی ہوٹل کے سامنے رک گیا۔ یہاں مزدور پیشہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ آلو گوشت کے علاوہ صرف دال فرائی تھی۔ میں نے دال فرائی اور روٹی منگوالی۔ کھانے سے فارغ ہو کر دودھ پتی پی۔ تمام چیزوں کا معیار معمولی قسم کا تھا۔ گزشتہ چند دن سے جو چیزیں کھا رہا تھا اس کے مقابلے میں اسے حلق سے اُتارنا دشوار ثابت ہوا تھا۔ بہرحال پیٹ تو بھرنا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نہایت سست رفتاری سے چائے پیتا رہا۔ مجھے ایاز کی کال کا انتظار تھا۔ ڈھائی بجے کے قریب اس کی کال آئی۔ ”جناب وہ نکل گئی ہے سرخ چیری کار میں ہے اور رُخ مری روڈ کی طرف ہی ہے۔“

”تم تعاقب کر رہے ہو؟“

”جی اس وقت رش ہے اس لیے میں قریب سے پیچھا کر رہا ہوں۔“

میں نے اسے اپنا پتا بتایا۔ ”میں یہاں ہوں جب پانچ منٹ کی ڈرائیو رہ جائے تو مجھے دوبارہ کال کر کے بتانا۔“

”ٹھیک جناب۔“

میں ایاز سے گفتگو کے دوران ہی ہوٹل سے دور پارکنگ کی طرف آگیا تھا۔ اُٹھتے ہوئے ایک سو کا نوٹ میز پر رکھ دیا تھا اس لیے ہوٹل کے مالک نے میری اچانک روانگی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایاز سے بات کر کے میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور اسے سڑک کی طرف لے آیا اور وہیں رک گیا۔ انجن بند کر کے اسے اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور خود اس سے ٹک گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ایاز اور شہلا نصف گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ سردی کی وجہ سے سڑک پر رش بہت کم تھا۔ اس لیے ڈرائیو کرنے والے فری ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ کیونکہ خطرناک علاقہ ابھی اوپر تھا اس لیے سامنے سے گزرنے والی گاڑیاں زن زن کرتی گزر رہی تھیں۔ کوئی بیس منٹ بعد ایاز کی کال موصول ہوئی۔

”ہم تقریباً پانچ منٹ کی دوری پر ہیں۔“

”ٹھیک ہے اب تم مجھ سے مستقل رابطہ رکھو گے۔“ میں نے کہا اور موبائل کو ہینڈ فری پر منتقل کر دیا۔ بائیک اسٹارٹ کر کے میں سڑک پر آیا اور سست روی سے بائیک چلانے لگا۔ ”ایاز اس دوران میں تم نے دیکھنے کی کوشش کی کہ شہلا کے ساتھ گاڑی میں کوئی اور تو نہیں ہے؟“

”جی جناب رش میں میں اس کے بالکل پاس چلا گیا اور پچھلے حصے میں جھانک لیا تھا۔ کار میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔“

میں عقبی آئینے میں دیکھتا جا رہا تھا جیسے ہی مجھے سرخ کار کی جھلک نظر آئی میں نے بائیک کی رفتار بڑھا دی۔ لیکن سرخ شیوی کی رفتار خاصی تیز تھی اس سے فاصلہ برقرار رکھنے کے لیے مجھے رفتار مزید بڑھانی پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم بھارہ کہو سے گزرنے لگے یہاں شور بہت تھا اس لیے میں ایاز سے بات نہیں کر سکا۔ آبادی سے آگے نکل کر میں نے اس سے کہا۔ ”میرا ارادہ ٹول پلازا سے آگے نکل کر اسے کسی ایسی جگہ روکنے کا ہے جہاں دائیں بائیں کوئی سڑک نکل رہی ہو۔ ممکن ہے آگے سگنل نہ ہوں تو ہمارا رابطہ ٹوٹ جائے اس

صورت میں تم راستے پر نظر رکھو گے۔“

”آپ کا پروگرام کیا ہے؟“

”بس اس سے بریف کیس لینا ہے اس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر کرنا ہے اور واپس آنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب تم اپنے عقب میں بھی نظر رکھنا ممکن ہے کوئی ہمارے پیچھے ہو۔“

”میں دیکھتا آرہا ہوں..... بعض گاڑیاں نظر آئیں لیکن وہ آگے نکل گئیں یا کسی اور راستے پر مڑ گئیں۔ کوئی مستقل ہمارے پیچھے نہیں ہے۔“

”پھر بھی تم اس طرح ہوشیار رہو جیسے ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“

”ٹھیک جناب۔“ ایاز نے کہا اور اسی لمحے رابطہ ٹوٹ گیا۔ یہاں پر سگنل ختم ہو گئے تھے۔ ہم ذرا آگے آئے تو مری کا ٹول پلازہ آگیا۔ میں جیسے ہی آگے نکلا شہلا کی کار آگئی اور میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں کسی مداخلت کے بغیر شہلا کو روک سکوں۔ چند کلومیٹرز اوپر جانے کے بعد مجھے دائیں طرف ایک سڑک اوپر جاتی دکھائی یہ شاید کوئی نجی راستہ تھا یہاں پہاڑوں پر بے شمار چھوٹی چھوٹی بستیاں بن گئیں ہیں یہ سب دولت مندوں کی بستیاں ہیں جنہوں نے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں خرید کر ان پر اپنے لیے کوٹھیاں بنالی ہیں جہاں وہ اور ان کے اہلِ خانہ گرمیاں گزارنے آتے ہیں۔ مجھے یہ جگہ مناسب لگی۔ میں نے بائیک اس سڑک پر ذرا آگے جا کر روک دی اور ہیلمٹ اُتار کر واپس آیا۔ میں نے پستول نکال کر اسے پشت پر کر لیا تھا شہلا کی کار دو منٹ بعد نمودار ہوئی اور جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا اس کی رفتار کم ہونے لگی تھی۔ اس نے یقیناً مجھے پہنچان لیا تھا۔ کار مجھ سے کوئی دس گز کی دوری پر رک گئی۔ شہلا کار سے اُتر کر میری طرف بڑھی۔ لیکن اس کا ہاتھ خالی تھا۔ میں نے پوچھا۔

”بریف کیس کہاں ہے؟“

”تصاویر کہاں ہیں؟“ اس نے بھی سوال ہی کیا۔ میں نے پستول سامنے لا کر کہا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”اور میرے سوال کا جواب تمہارے پاس یقیناً یہ پستول ہے۔“

شہلا اسے مذاق مت سمجھو۔ میرے گھر پر ہاتھ ڈال کر خان اور تم نے اپنے حق میں بہت بُرا کیا ہے۔ میں بنا کسی لحاظ کے گولی مار دوں گا اگر اگلے ایک منٹ میں بریف کیس مجھے نہ ملا۔“

”بریف کیس گاڑی میں ہے۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”چلو اور نکالو لیکن کوئی چالاکی مت کرنا میں گولی چلانے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کروں گا۔“

وہ پلٹی اور اس نے کار کی فرنٹ سیٹ پر رکھا ہوا بریف کیس نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس پر سے نظریں ہٹائے بغیر بریف کیس لیا اور بولا۔ ”اب تم نیچے اُتر جاؤ۔“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”نیچے .... کیا مطلب؟“

”نیچے کا مطلب نیچے ہی ہوتا ہے اوپر نہیں .... اس ڈھلان سے نیچے اُترو اور کم سے کم سو گز نیچے چلی جاؤ۔“

”لیکن میری تصویریں....؟“

”پہلے میں تصدیق کروں گا کہ یہ بریف کیس اصلی ہے تب ہی میں تمہاری تصویریں حوالے کروں گا۔ اب نیچے اُتر جاؤ۔ میرے پاس وقت نہیں ہے کوئی آگیا تو اس کے ساتھ تم بھی مشکل میں پڑ جاؤ گی۔“

”شہباز تم دھوکا کر رہے ہو۔“ وہ ہانپسی نظر آنے لگی۔

”نہیں میں اپنے وعدے پر قائم ہوں کہ میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

شہلا نے میرے تیور سے بھانپ لیا تھا کہ میں اس وقت کسی رعایت کے موڈ میں نہیں ہوں۔ وہ مجبوراً ڈھلان سے نیچے جانے لگی یہاں ڈھلان بہت زیادہ ترچھی تھی اور اگر سہارے کے لیے بڑے تنوں والے درخت نہ ہوتے تو وہ اتنی آسانی سے نیچے نہیں جا سکتی تھی۔ ذرا سی غفلت اس کے قدم اُکھاڑ دیتی اور وہ کئی سو فٹ کی گہرائی میں جا کر رکتی۔ جب وہ سو گز سے زیادہ دور چلی گئی تو میں نے پہلی بار بریف کیس کا معائنہ کیا۔ بہ ظاہر یہ وہی بریف کیس لگ رہا تھا۔ سلور رنگ کی دھات سے بنا ہوا اور اس میں ویسے ہی نمبر سے کھلنے والے تالے تھے۔ اس کی خاص نشانی اس کا پش بٹن تھا جو سرخ رنگ کا تھا۔ یقیناً اس قسم کا بریف کیس مہیا کر لینا آسان نہیں تھا لیکن یہ ناممکن بھی نہیں تھا۔

وقت نہیں تھا میں نے اسے بیگ میں ڈال کر اسے پشت پر باندھ لیا اور تیزی سے بائیک کی طرف لپکا۔ اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے کار کے پاس سے گزرا تو اس کے عقبی پہیے پر فائر کر کے اسے ناکارہ بنا دیا اور خود نکلتا چلا گیا۔ فائر اور ٹائر پھٹنے کے دھماکے کی آواز کچھ دیر پہاڑوں میں گونجتی رہی تھی۔ جب میں موڑ مڑ رہا تھا تو بائیک کے عقبی آئینے میں شہلا سڑک پر آتی دکھائی دی اس نے حیرت انگیز پھرتی دکھائی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن بات اس کا اتنی

آسانی سے بریف کیس میرے حوالے کر دینا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جس طرح میں خالی ہاتھ تھا اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ بھی خالی ہاتھ ہوگی۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے بریف کیس نہیں دے گی جب تک کہ تصویروں کے سلسلے میں اسے اطمینان نہ ہو جائے۔ اس کا اتنی آسانی سے بریف کیس حوالے کرنا مجھے کھٹکنے لگا تھا۔

ایاز موڑ پر میرا منتظر تھا میں نے ہاتھ سے اسے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دور واپس جانے کے بعد ایک سڑک ہائی وے سے نیچے اُتر رہی تھی میں اس پر مڑ گیا اور اتنی دور جا کر رک گیا جہاں سے ہائی وے نظر نہیں آ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد ایاز بھی میرے پیچھے آ گیا تھا۔ اتنی دیر میں بیگ سے بریف کیس نکال لیا تھا۔ ایاز نے بائیک روکی تو میں نے اسے اشارے سے بولنے سے منع کیا اور پھر بریف کیس کو کان سے لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن اندر بالکل خاموشی تھی۔ اگر اندر کوئی ٹائم بم تھا بھی تو وہ ڈیجیٹل ٹائمر والا تھا اور اس میں کوئی آواز نہیں آتی ہے۔ میں نے بریف کیس لے جا کر سڑک کی ڈھلان والی طرف رکھ دیا۔ جہاں بائیک کھڑی تھیں اس سے محفوظ فاصلہ تھا۔ ایاز نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔

''مجھے شک ہے اس میں کوئی خطرناک چیز ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کوئی بم؟''

''بالکل ہو سکتا ہے۔ اس نے نہایت آسانی سے بریف کیس میرے حوالے کر دیا اور تصویروں کے حوالے سے بھی کوئی خاص اصرار نہیں کیا۔ وہ اتنی کم عقل عورت نہیں ہے کہ اس طرح بریف کیس اُٹھا کر لے آتی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ایاز نے سر ہلایا۔ ''کیا یہ ویسا ہی بریف کیس ہے؟''

''تقریباً۔'' میں نے کہا۔ ''اسے دیکھے ہوئے خاصا عرصہ ہو گیا ہے اس لیے صحیح سے یاد نہیں ہے۔ مگر مجھے وہی لگ رہا ہے۔''

''اس قسم کا بریف کیس تلاش کرنا کوئی مشکل نہیں ہے پنڈی میں ایک مارکیٹ ہے جہاں ہر قسم کا بریف کیس مل جاتا ہے اور اگر آپ چاہیں تو اپنی پسند کا آرڈر پر بھی بنوا سکتے ہیں۔''

''مجھے بھی یہی شک ہے یہ کام ناممکن نہیں ہے۔''

''ممکن ہے بریف کیس میں ٹائم بم نہ ہو کسی اور قسم کا بم ہو۔''

''نہیں وہ یا فتح خان جانتے ہیں کہ میں بریف کیس کھولنے کی کوشش نہیں کروں گا یا کم سے کم اس امکان کو ذہن میں رکھوں گا کہ بریف کیس میں بم ہو سکتا ہے اس لیے وہ ٹائم بم ہی استعمال کریں گے۔''

''ہو سکتا ہے....'' ایاز نے کہنے کی کوشش کی تھی کہ فضا ایک زور دار دھماکے سے گونج اُٹھی تھی۔ جہاں میں نے بریف کیس رکھا تھا وہاں سے پہلے شعلہ نکلا تھا اور گرد و غبار اُڑنے لگا تھا۔ دھماکے نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور اب پہاڑوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی میں نے سنبھلتے ہوئے ایاز سے کہا۔

''یہاں سے نکلو لیکن سڑک کی طرف مت جانا۔''

ہم آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ کچھ دور جا کر ایاز میرے برابر آ گیا۔ ''آپ کو اس علاقے میں راستوں کے بارے میں پتا ہے؟''

''نہیں میں اس طرف پہلے نہیں آیا۔'' میں نے چلا کر کہا دو بائکوں کے انجن کا مشترکہ شور زیادہ تھا۔

''تب میرے پیچھے آیئے میں اس علاقے سے واقف ہوں۔''

ایاز واقعی اس علاقے سے واقف تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ہائی وے پر واپس آ گئے تھے۔ ہم ٹول پلازہ سے کچھ دور تھے۔ ابھی تک ہمیں کوئی ایسا فرد نظر نہیں آیا تھا جو ہمارا پیچھا کر رہا ہو۔ اگر اس چکر کے پیچھے فتح خان تھا تو اس نے شہلا کو استعمال کیا تھا وہ جانتا تھا کہ اگر تعاقب کیا گیا تو میں کھٹک جاؤں گا اور شاید اس دھوکے میں نہ آؤں۔ کسی کے پیچھے نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ شہلا نے اپنے طور پر میرا کام تمام کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرا اس سے ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا لیکن شاید اسے خطرہ تھا کہ میں سویرا کے اغوا کا بدلہ لینے کے لیے اس کے خلاف کوئی کارروائی کروں کیونکہ وہ اس معاملے میں ملوث رہی تھی۔ چار بجے ہم واپس اسلام آباد کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ ایک جگہ بائیک روک کر میں نے وسیم سے رابطہ کیا کیونکہ اس وقت تک انہوں نے خواتین کو عبداللہ والی کوٹھی سے نکال لیا ہوگا۔

''وسیم کام ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی کام ہو گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا تو میں اس کے لہجے پر چونکا۔

''وسیم کیا بات ہے خیریت تو ہے؟''

''سویرا ابھی تک مقررہ جگہ نہیں پہنچی۔'' وسیم نے جواب دیا اور مجھے لگا جیسے میرا دل رک گیا ہو۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(یاسمین پاملا، فیصل آباد کا جواب)

محمد سعید قاسمی.........ڈلوال

زرم شہنی پہ نئے پھول کی صورت ہوں وہی
تو مجھے توڑ کے رکھ دے کسی بارش کی طرح

(انجم رفیق، گجرات کا جواب)

رانا محمد سجاد.........شاہ جمال

یہ خطِ بدگمانیاں دلوں کے بیچ آ گئیں
خلوص کا سلسلہ بھی درمیاں نہیں رہا

(سلطان فریدالدین، قطر کا جواب)

حکیم سید محمد رضا شاہ.........نورنگہ میانوالی

اگر کبھی ہو فرصت تو میرے آئینہ دل کو بھی دیکھ
اس میں تیری صورت زیبا کے سوا کچھ بھی نہیں

(شکیل الرحمٰن، کھاناں کا جواب)

احمد توصیف.........لیہ

یہ بات نہیں معلوم تجھے
وہ کن سوچوں میں ڈوبی ہے

نصرت جاوید.........حاصل پور

یہ کیسی دھوپ نفرت کی پڑی ہے
محبت بھاپ بن کر اُڑ گئی ہے

(راجا ثاقب نواز، ساہیوال کا جواب)

زاہد بخش.........پشاور

آنکھوں سے میرے اس لیے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی

نواز بٹ.........نوشہرہ

اپنے وحشت زدہ کمرے کی اِک الماری میں
تیری تصویر عقیدت سے سجا رکھی ہے

نصرت جاوید.........حویلی لکھاں

اِک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
اِک طرف جشنِ جاں منائے گئے

(عصمت آرا، حیدرآباد کا جواب)

مرزا ہادی بیگ.........حیدرآباد

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

(فرحانہ سعید قاسمی، ڈلوال کا جواب)

خالد یوسفی.........لیہ

اِک فوجِ ظفر موج کبھی ساتھ تھی اپنے
اب میں ہوں اور اِک گردشِ ایام ہے باقی

محمد خادم حسین.........اوکاڑہ

اپنی چھت بلاتی ہے ایک دن مسافر کو
ایک دن مسافر کو لوٹنا تو ہوتا ہے

ابوذر محسن.........لندن (یو، کے)

آواز میں تمہاری جادوئی کھنک ہے
ایسا لگے ہے کسی گھنگرو کی چھنک ہے

منظر علی خان.........لاہور

اب تو ہر شورِ طرب سن کر دہل جاتا ہے دل
جانے کس اندیشۂ فردا سے مل جاتا ہے دل

انجم رفیق.........گجرات

اس کی محفل نہ سہی ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں

(سعد احمد چاند، کراچی کا جواب)

سلطان فتح علی.........نگر (گلگت)

وہ اپنی کہتا رہا کہنے کچھ دیا نہ مجھے
سمجھ گیا تھا وہ مجھ کو جو اس سے کہنا تھا

محمد اختر.........رحیم یار خان

وحشتیں بسی ہیں اب ذہن و دل رگ و پے میں
ڈس رہی ہے روز و شب زیست بے حسی بن کر

فراست ترمذی.........ملتان

وہ جو مشکل تھا بہت آسان کیسے ہو گیا
کم سخن آنکھوں میں دل کی بات کیسے آ گئی

کلیم اطہر چنیوٹی.........العین، یو اے ای

وہ ساتھ تھا تو عجب دھوپ چھاؤں رہتی تھی
بس اب تو ایک ہی موسم ٹھہر گیا مجھ میں

خالد یوسفی.........لیہ

وہ شخص آخری سچ ہے مرے فسانے کا
اور اس کے بعد کا قصہ فقط کہانی ہے

(نصرت شاہین، حیدرآباد کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن.........گوجرہ

اُداس نہ ہوا کر اتنا کسی کی یاد میں
لوگ نصیب سے ملتے ہیں اُداسیوں سے نہیں

ناہید یاسمین.........شادی پور

اہلِ چمن نے جشنِ بہاراں کے نام پر
وہ داستاں سنائی کہ دامن بھگو دیے

واصف چنگاری.........جیکب آباد

اس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر
جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا

(مرزا افرحال بیگ، حیدرآباد کا جواب)

راجا ثاقب.........ساہیوال

حوادثِ روزگار دیکھیں ابھی دکھاتے ہیں اور کیا کیا
ابھی تو اتنا سمجھ میں آتا ہے بیکسوں کا خدا نہیں ہے

(خالد فاروق، منڈی بہاؤالدین کا جواب)

تنویر رفیق.........کراچی

دنیا کے اس ہجوم میں ہم کھو گئے اگر
تم بھی کسی سے پوچھ کر تنویر ڈھونڈنا

اقرا بانو نا گوری.........کراچی

داد دیجیے کہ ہم جی رہے ہیں وہاں
ہیں محافظ جہاں قاتلوں کی طرح

(ملک ظفر، چنیوٹ کا جواب)

عالم شیر زاہد.........چنیوٹ

کتنے مجبور ہیں تقدیر کے ہاتھوں فراز
نہ اسے پانے کی اوقات رکھتے ہیں نہ کھونے کا حوصلہ

مہتاب چنگیزی.........کوئٹہ

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

دعا زہرا.........فیصل آباد

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

محمد قیصر.........ملک وال

کبھی شکستوں کے دکھ اُٹھائے تو اس سے پوچھوں
وہ میری مانند ٹوٹ جائے تو اس سے پوچھوں

ناہید قمر.........کراچی

کب تلک اندھیروں میں یوں رہیں گے ہم آخر
آئے گا کوئی سورج گھر میں روشنی بن کر

حسین ارشاد.........ملتان

کچھ اس طرح سے جلایا ہے تپتے سورج نے
کہ اب تو چاند کے نیچے بھی پیاس لگتی ہے

(فرخندہ جبیں، جھنگ کا جواب)

محمد سجاد.........شہر شاہ جمال

یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھا گئی اس کو
وہ روٹھ کر بھی مجھے مسکرا کے ملتا ہے

سید خضر عباس بخاری.........شجاع آباد

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اِک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

(خالد یوسفی، لیہ کا جواب)

راجا ثاقب نواز ثاقب.........ساہیوال

طور پر گئے ہم آپ کو ڈھونڈنے مگر
کثرتِ احتیاط سے کام خراب ہوگیا

تحسین فاروقی.........احمد پور سیال

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

(شاہد خیال، لڈن کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

یہ الگ بات کہ تقدیر لپٹ کر روئی
ہم نے تو تمہیں دیکھ کے پھیلائے تھے بازو

(محمد سعید قاسمی، ڈلوال کا جواب)

نصرت جاوید.........حویلی لکھاں

نہ دل نے مانی کوئی بات لاکھ سمجھایا
کہ وہ زمانے میاں قیس و کوہکن کے گئے

ندا علی.........میاں چنوں

نہ پھول ہیں اب نہ رنگ و خوشبو نہ تتلیاں ہیں
ہماری آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں ہیں

فیروز حسن.........فیصل آباد

نہ جانے کتنی رتیں دُھوپ میں گزاری تھیں
وہ شخص سایۂ دیوار میں جو بیٹھا تھا

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 81
30 جون 2012ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن ... جوابات ... 30 جون 2012ء تک علمی آزمائش 81 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) 42

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

اگر آپ کو
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو
... شکایت فیکس کریں
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون 35895313 فیکس 35802551

علمی آزمائش۔ 81

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک صفحی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جون 2012ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1893ء میں بمقام بنارس پیدا ہوئے اور 9 ستمبر 1960ء کو بمقام گونڈہ انتقال فرمایا۔ اردو کے مقبول شعرا میں شمار ہوئے۔ شعلۂ طور اور آتش گل کے علاوہ بھی ان کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہوئے اور اشعار زبان زد عام کہلائے۔

علمی آزمائش 79 کا جواب

سید علی شاہ گیلانی کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جاتا ہے۔ بچپن سے اب تک وہ ایک ہی خواب دیکھتے رہے ہیں کہ انہیں آزادی نصیب ہو۔ مسلسل کشمیر کی جدوجہد آزادی میں معروف رہے۔ پہلے ایک گردہ خراب ہوا جسے انہوں نے نکلوا دیا، اب خبر آئی ہے کہ دوسرے گردے میں بھی کینسر کے جراثیم در آئے ہیں۔ 1989ء میں ان کا پاسپورٹ حکومتی اہلکاروں نے چھین لیا۔ 2005ء میں حج پر جانے کے لیے دیا گیا لیکن واپسی کے بعد ضبط ہو گیا۔ مگر ان کا جوش جہاد کم نہ ہوا۔

انعام یافتگان

1-عنایت قائم خانی، حیدر آباد -2 بے بی اسلام شیخ، راولپنڈی -3 الطاف بی بی، کراچی

4-نوید توتائی، مظفر گڑھ -5 کوکب سلمان، سیالکوٹ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: سید عزیز الدین، سید سعید الدین اشرف (سعود آباد) فضل خان، الطاف شیرازی، نصرت جاوید، فضل

...، محمد فہیم، نثار اختر، اشرف ملک، فہد قریشی، محمد اشہب سعید (صحافی کالونی) محسن اختر بلوچ، عارفہ سلطان، منور علی، نصرت ...لی، کہکشاں تسنیم، نواز علی شاہ، ملک سرفراز گوندل، ابرار احمد، کلیم اللہ فہمی، ناصر افروز، انصار حسین، وجیہ الحسن، رجب علی مرزا، ...مسیح، نور احمد، نگار صہبائی، کاوش اختر، علی احمد، تنویر حسین زیدی، بخت اور شاہ، نجم الدین حیدر، فہیم اللہ فہیم، جبار علی، خلش معظم۔ ...سے: الحاج کرم الٰہی اعوان، آغا خورشید، اختر شیخ، واجد موسوی، خضر اکرم، نثار عباس، عثمان فاروقی، منظر علی خان، تابش ...اری، نازش خان، ملک جاوید، ممتاز الحسن، مصطفیٰ ملک، راز فرمان علی، موسیٰ خان، جاوید حیدر، ناصر حسین، ابرار حیدر، پروین ...لقمان اشرف، زبیر اسلم، انعام الحق، اکرام صدیقی، فہیم مرزا، ارشاد علی، نثار اختر، گل زیبا، احمد بشیر بٹ، احمد علی مشرقی، نعمان ...، حدیقہ اشرف، خالد علی، ارباز خان، عقیل سندھو، برق ضیائی۔ ملتان سے: سید خضر عباس بخاری (شجاع آباد) جنید ارشد، احمد ملتانی، توفیق سلطان، محمد معین چشتی، بیگم احمد دین، مناف سید، ندا یونس، اشرف علی شیروانی، فضل الحق، اعزاز احسن، جمیل ...، زبیر شاہ، بہادر خان، مہوش زردلی خان ڈرائیور، کوکب جہاں، نگار سلطانہ، فہیم اللہ فاروقی، ابریز بشیر، خالد ڈار، نشاط جہاں، ...خان، زینب چوہان، قدوس بخش، اللہ دتا، فاضل خان اچکزئی۔ جہلم سے: سلطان بخش، ندیمہ سعدیہ امتیاز (سول لائن) ...راز حسین، نذر کلیم چغتائی، عثمان علی شاہ، شاور ترمذی، ناصر حسین سید، امتیاز خاکستر۔ چکوال سے: مسز فرحانہ سعید قاسمی، صدر الدین، کمال احسن کمال، اقبال حسن، نسرین ممتاز، فرحت حسین، ارباب خان، ملک شفاعت۔ کوئٹہ سے: نذر خان، ممتاز ...ن ملک، فصاحت اللہ خان، احباب خان، نعمان اصغر، کاشان اختر، حیات چنگیزی، نصرت چنگیزی، خاقان اعوان، راکا رشید۔ ...گودھا سے: خلیق حق، اکرم حیات، حیات خان، فہیم حیدر، سلیم اللہ خان، خضر حیات، مصطفیٰ اکمل لوانہ، فصیح الزماں۔ شجاع آباد ...سے: ارباز خان، زوار حسین زیدی، سید خضر عباس۔ ٹنڈو آدم سے: نعمان ثابت، شریف الرحمٰن، نصیر الحسن، سکھان شاہ۔ حیدر آباد ...سے: تہمینہ سلطان، نیاز الحسن، افتخار حسن خان، خاقان عباسی، نواز عثمان آبادی، عبدالقیوم حسن خان، انوار علی زبیری، کاشان ...شانہ، امتیاز حسن، زاہد خان، فتح شیر خان حسن زئی، آمنہ قائم خانی، فصاحت اللہ۔ ساہیوال سے: ممتاز فخر، راجا ثاقب نواز کیانی ...ایڈوکیٹ، ناصر کیانی، سلطان فرحت، فدا حسین، نوازش حسن، امجد سروش۔ حاصل پور سے: خالد بن ماجد، ذوہیب احسن، محمد عقیل، ...رحت بگھیو، اختر عباس، مہوش ملک، شیخ فخر الدین۔ ڈی جی خان سے: فرحت اللہ شیرازی، انیس حسین، اختر علی خان، نعمت خان، گل شیر میو۔ ننکانہ صاحب سے: فرانسس جیمز۔ ڈی آئی خان سے: نصیر الدین نصیر، محمد سہیل انجم، رانا وجدانی۔ بہاولپور سے: شمیم ...لو، نزہت ارمان، سلطان خان، ممتاز حسین، فتح حسن، نازش کریم، فہیم شیخ۔ کمالیہ سے: محمد الطاف فاروق، تقی محمد فلک گر، فرحت شاہ ...نواب شاہ سے: ارحم شاہ، مناف قریشی، مسکین شاہ۔ جہانیاں سے: خضر خان، امان اللہ فرحت، زبیر خان۔ مظفر گڑھ سے: نوید توتانی، رانا محمد سجاد (شاہ جمال) عزیز حسن، عزیز الدین۔ کوٹ ادو سے: اطہر حسین سید۔ شہر سلطان سے: نوید انصاری، سنجیدہ امر۔ حسن ابدال سے: کرم الٰہی، شاور حسین، سید محمد رضا۔ میرپور آزاد کشمیر سے: قدوس بٹ۔ چونالہ سے: ثنا احمد، فلک شاہ، کوکب شاہ۔ باغ، آزاد کشمیر سے: کاشف حسین، نصرت رند۔ بہاولنگر سے: نبیل احمد، محمد ذوالفقار عامر، محمد امین۔ میانوالی سے: نوشین احمر۔ ہری پور کملابٹ سے: خورشید احمد۔ پاک پتن سے: سدرہ شفیق۔ بھکر سے: غازی شاہ۔ گوجرہ سے: رانا حبیب الرحمٰن، عبدالرشید۔ جھنگ سے: امتیاز حسن، امجد علی انجم (احمد پور سیال) زدیا رفیق، عجب گل، ملک سرفراز، امنہ حسن، سلیم شیخ۔ سکھر سے: نعمان شیخ، فرحت اللہ۔ ٹنڈو آدم سے: ناصر بھگیو۔ کمالیہ سے: محمد شکیل شوکت۔ پشاور سے: جویریہ شیر نواز، اطہر نواز، نسیم ...فردوس، شمیم فاروق، ضیاالحق، نوید فہیم شاہ، جمال شاہ۔ اوکاڑہ سے: سید احسن محمود، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ اسلام آباد سے: ثمین جاوید، انور یوسف زئی۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ، نرجس زیدی، محمد رضا، مہ جبین فلک، اسلام الدین، نسیرا اجتہادی، فراست اللہ۔ اٹک سے: عرفینہ اقبال (شادی خان) ثنا جبران، زبیر اللہ خان۔ حافظ آباد سے: خالد جاوید۔

ممالک غیر سے: بشیر احمد، اومان۔ زاہد شیخ العین (یو اے ای) ثمن زیدی (دبئی) انعام خان، تسلیم فضل، مانچسٹر (یوکے) نثار احسن، ٹورنٹو (کینیڈا) صاحب جان، جرمنی۔

☆☆☆

کہانی ایک محبت کی

محترم معراج رسول صاحب
السّلام علیکم!
میں ایک انگریزی اخبار سے وابستہ ہوں۔ اردو میں کہانی لکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے انگریزی کاپی بھی ساتھ اٹیچڈ کردی ہے۔ اردو میں جہاں جہاں غلطی نظر آئے، اسے انگلش کاپی سے درست کرلیں۔ مگر میں نے نواز شاہ کا نام اور مقام بدل دیا ہے۔ اس عجیب وغریب محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے میں نے یہ کہانی لکھی ہے۔

اشعر علی سید
(کراچی)

اس کا مزاج ویسا ہی رہا تھا۔

نواز شاہ نام تھا اس کا۔ ایک بہت بڑا جاگیردار۔ جس کی زمینیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان زمینوں پر اس کے اینٹوں کے بھٹے بھی تھے جہاں سے لال لال اینٹیں بن کر آس پاس کے شہروں میں سپلائی ہوا کرتیں۔

نواز شاہ سے میرا تعلق کالج کے زمانے سے تھا۔

ہم ایک ساتھ ہی پڑھا کرتے۔ حالانکہ ہم دونوں کے سوشل اسٹیٹس میں بہت فرق تھا۔ اس کے باوجود ہم دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔

وہ اس زمانے میں بھی اپنے مزاج کے لحاظ سے جاگیردار ہی تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ اتنے پیسے ہوا کرتے کہ وہ پورے کالج کو عیش کراسکتا تھا۔

میں نے ایک دوبار اس کے باپ کو بھی کالج میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ کس شان سے آتا تھا۔ شاندار گاڑیاں اور محافظ اس کے ساتھ ہوتے۔

وہ اپنے چہرے اور باتوں ہی سے ایک غضب ناک اور سخت گیر آدمی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ایک بار نواز شاہ سے پوچھا۔ ''یار۔ یہ تمہارے فادر کے چہرے پر ہر وقت اتنا غصہ کیوں رہتا ہے؟''

''بے وقوف۔ یہ ان کی ضرورت ہے، مجبوری ہے ان کی۔'' نواز شاہ نے کہا۔ ''اگر وہ اپنا رعب قائم نہ رکھیں تو کام کیسے چلے؟''

''یہ... کام پیار اور مہربانی سے نہیں چلتا۔''

''اوئے۔ تم شہری لوگ ایسی باتیں کیا جانو۔ یہ جو مزدور کسان وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ بہت سست اور کاہل ہوتے ہیں۔ جب تک ان کے سروں پر ڈنڈا نہ ہو یہ کوئی کام نہیں کرتے۔''

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نواز شاہ تعلیم کیوں حاصل کررہا ہے؟ میں نے جب یہ بات پوچھی۔ تو ہنس کر کہنے لگا۔

''تم بھی بہت بے وقوف ہو۔ اشعر علی۔ ارے بھئی۔ کچھ ترنگ شرنگ میں زندگی گزارنی ہے۔ اس کے بعد تو زمینداری سنبھالنا ہی ہے۔''

''ہاں یار۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم لوگوں کے تو عیش ہیں۔ ایک ہمیں دیکھو۔ مزدور باپ۔ مزدور اولاد۔''

''او بھائی۔ اداس کیوں ہوتا ہے؟ آجانا ہماری طرف۔ تمہیں بھی زمینیں شمینیں دے دیں گے۔ کاشت کاری کیا کرنا۔''

''نہیں یار۔ اپنے بس کا روگ نہیں ہے۔ اپنے کو تو

...لت کرنی ہے۔''

ایک دن اس نے میرے پاس آکر کہا۔ ''اوئے ...مر۔ میں تو تباہ ہوگیا یار۔ برباد ہوگیا۔''

''کیوں بھائی۔ ایسی کون سی بات ہوگئی۔''

''یار۔ انارکلی میں کیا لڑکی دیکھنے کو ملی ہے کہ دل خوش ...کیا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں تو پہلی نظر میں ...ا عاشق ہوگیا ہوں۔''

''کون ہے وہ۔''

''یہ میں نہیں ...تایا۔'' اس نے کہا۔ ...انارکلی کی ایک درزی کی ...ان پر کھڑی ہوئی تھی۔''

''شاہ جی۔ اب وہ تمہیں کہاں سے ملے گی۔ پورے لاہور میں ڈھونڈتے پھرو گے اس کو۔''

''ملے گی۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''میں بھی اس وقت درزی کی دکان کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ درزی اسے بتارہا تھا کہ اس کے کپڑے تیار ہوگئے ہیں۔ وہ کل شام پانچ بجے آکر لے جائے۔ تو یارا۔ وہ کل پانچ بجے اسی دکان پر آئے گی۔ تم بھی چلنا میرے ساتھ۔''

''میں کیا کروں گا؟'' میں نے پوچھا۔

"ایک نظر دیکھ تو لینا۔ پھر دونوں مل کر کوئی راستہ نکالیں گے۔" اس نے کہا۔

اس کے پاس ایک گاڑی بھی ہوتی تھی۔ یہ گاڑی اس کے باپ نے اسے سال گرہ کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اگلے دن وہ اسی گاڑی میں مجھے انارکلی تک لے گیا۔

ہم نے نیلا گنبد کے پاس گاڑی کھڑی کی اور پیدل انارکلی کی طرف چل پڑے۔ شام کے وقت انارکلی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اتنا رش ہوتا ہے کہ چلنا محال ہو جاتا ہے۔

ہم کسی نہ کسی طرح اس درزی کے پاس پہنچ ہی گئے۔ ہم کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ "یار۔ اب وہ آنے والی ہوگی۔" نواز شاہ نے بتایا۔ "میرا تو دل ابھی سے دھڑک رہا ہے۔"

کچھ دیر کے بعد وہ لڑکی دکان میں آ ہی گئی اور واقعی وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ کیا ملاحت تھی اس کے چہرے پر کہ نظریں ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ اشعر علی۔" نواز شاہ نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ "کیسی ہے میری پسند؟"

"واقعی یار۔ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس میں ایک خاص قسم کا وقار بھی ہے جو آج کل کی لڑکیوں میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔"

"یار۔ تم نے تو میرا جی خوش کر دیا ہے۔ اور اب یہاں سے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔"

"کیوں۔ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تم اس کا پیچھا کرو گے۔" اس نے کہا۔ "دیکھو کہاں رہتی ہے؟"

"یہ کیا بات ہوئی۔ عاشق تم ہوئے ہو اور پیچھا میں کروں؟"

"یار۔ سمجھا کرو۔" وہ ہنس پڑا۔ "میں ایک بڑا زمیندار ہوں۔ مجھے پیچھا کرتے ہوئے اچھا نہیں لگے گا۔"

"واہ۔ اس وقت بھی تمہیں اپنی پوزیشن کا خیال ہے۔"

"بکواس نہیں کرو۔ دیکھو وہ جانے لگی ہے۔" نواز شاہ نے اشارہ کیا۔

وہ لڑکی شاپر میں کپڑے لے کر ایک طرف چل پڑی تھی۔ اس کا رُخ اردو بازار کی طرف تھا۔ میں نے ایک مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔

اردو بازار سے ہوتی وہ مال روڈ پر آ گئی۔ وہ اب تک پیدل ہی چل رہی تھی۔ اس کا رُخ کرشن نگر کی طرف تھا جو وہاں سے قریب ہی تھا۔ شاید اسی لیے وہ پیدل جا رہی تھی۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ کرشن نگر جا رہی تھی بالآخر وہ ایک مکان کے دروازے پر آ کر رک گئی۔

مجھے پتا چل گیا تھا۔ اس لیے میں واپس ہو گیا۔

نواز شاہ بہت بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ "کیا ہوا یار۔ کچھ پتا چلا؟"

"ہاں۔ میں نے اس کا گھر معلوم کر لیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "اب یہ بتاؤ۔ کیا کرنا ہے؟"

"اب اس کے بارے میں معلومات کرنی ہیں۔" اس نے کہا۔ "کون ہے۔ کیا نام ہے۔ کیا کرتی ہے۔ اس کے ماں باپ کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سمجھ لے یار کہ پوری جاسوسی کرنی ہوگی۔"

"اور یہ جاسوسی میں کروں گا؟"

"ہاں یار۔ تمہارے علاوہ میں اور کس پر بھروسا کر سکتا ہوں؟" اس نے کہا۔

"نواز شاہ۔ ایک بات بتاؤ۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ "آخر تم اس لڑکی سے کیا چاہتے ہو۔ صرف دوستی۔ یا شادی بھی کر لو گے؟"

"یار۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے اس سے دوستی تو ہو جائے۔" اس نے کہا۔ "بس یار تو میرا یہ کام کر دے۔"

میں نے اس کے کہنے پر اس لڑکی کی جاسوسی شروع کر دی۔ یہاں تک معلوم کر لیا کہ وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ اپنے تایا کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا تعلق لاہور سے نہیں تھا۔ وہ کہیں اور سے آئی تھی جبکہ اس کے ماں باپ کہیں اور رہتے تھے۔ وہ لاہور میں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی۔

اور اس کا نام صاحبہ تھا۔ اتنی معلومات آسانی سے نہیں ملی تھیں۔ ان کو حاصل کرنے کے لیے مجھے بہت محنت کرنی پڑی تھی۔ لیکن میرا مشن کامیاب جا رہا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔

نواز شاہ یہ سب سن سن کر خوشی سے بے حال ہوتا جا رہا تھا۔ "یار۔ تو نے تو کمال کر دیا اور اب اس سے ملاقات کا کوئی راستہ بھی نکالو۔"

"یہ بھی تو کہو کہ تمہارے Behalf پر اس سے محبت بھی میں ہی شروع کر دوں۔" میں نے جل کر کہا۔

"بھائی۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔ میں تو اس سے ملاقات کا طریقہ پوچھ رہا ہوں۔" نواز شاہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "ویسے یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس کے ماں باپ

کہاں رہتے ہیں؟"

"ہاں۔ یہ لوگ مدن پورہ کے رہنے والے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"مدن پورا۔" نواز شاہ اُچھل پڑا تھا۔ "جیو میرے لال۔ کیا زبردست نیوز دی ہے۔ کیا خبر سنائی ہے۔ مدن پورا ہمارا ہی علاقہ ہے۔" اس نے بتایا۔ "وہاں کی ساری زمینیں ہماری ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ ہم وہیں کے حاکم ہیں۔"

"چلو پھر تو تمہارا کام اور آسان ہو گیا۔"

"آسان۔ یار۔ آسان تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ تو سارا مسئلہ ختم ہو گیا۔ اب تم چلو میرے ساتھ۔ ہاں۔ اس کے باپ کا نام کیا ہے؟"

"فتح محمد۔" میں نے بتایا۔ "مدن پورا میں کوئی اسکول ہے۔ وہ اس کا ہیڈ ماسٹر ہے۔"

"وہ اسکول بھی ہمارا ہی ہے۔ ہم ہی نے بنوایا تھا۔" وہ نہال ہوا جا رہا تھا۔ "اب تم چلو میرے ساتھ۔ اب کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم خود چل کر میرا کرشمہ دیکھ لینا۔"

میں بھی اس کا "کرشمہ" دیکھنے اس کے ساتھ چل پڑا۔

کرشن نگر کی تنگ جگہوں میں گاڑی رو کی گئی اور ہم اس مکان تک پہنچ گئے۔ اس وقت نواز شاہ میں بلا کی خود اعتمادی دکھائی دے رہی تھی۔ وہی جاگیردارانہ خود اعتمادی۔ جب ایسے لوگ کسی کو بھی خاطر میں بھی نہیں لاتے۔

اس نے دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے جواب میں ایک تقریباً بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا تھا۔ میری انفارمیشن کے مطابق وہی صاحبہ کا تایا تھا۔

وہ ہمیں دروازے پر دیکھ کر کچھ نروس ہو گیا تھا۔ "کس سے ملنا ہے جی آپ لوگوں کو؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارا نام نیاز محمد ہے؟" نواز شاہ نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

"ہاں جی۔ میں نیاز محمد ہوں۔"

"ہمیں تمہاری بھتیجی صاحبہ سے ملنا ہے۔" نواز شاہ نے کہا۔ "فتح محمد کی لڑکی۔ وہ اس گھر میں رہتی ہے نا۔"

"ہاں جی۔ وہ اس گھر میں رہتی ہے لیکن آپ لوگ۔"

"میرا نام نواز شاہ ہے۔ تم میرے بابا کو تو جانتے ہو گے۔ دلدار شاہ۔ مدن پورا کے جاگیردار۔"

"آ...... آپ۔ دلدار شاہ صاحب کے بیٹے ہیں جی۔" اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

"ہاں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ اور یہ میرا دوست ہے۔ اشعر علی۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

بوڑھا تو پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ نواز شاہ واقعی وہاں کرشمہ ہی دکھا رہا تھا۔ ہمیں فوری طور پر اندر لے جا کر بٹھا دیا گیا تھا۔

بوڑھا نواز شاہ کے سامنے اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے وہ اس کا ازلی غلام ہو۔ نواز شاہ کے چہرے ایک فاتحانہ سی

ہماری اردو زبان جو فی زمانہ علوم و فنون کا خزانہ بھی جمع کر رہی ہے، کیا بلحاظ فصاحت کیا بلحاظ بلاغت ہندوستان کی جان ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ اس زبان نے قلعہ معلٰی اور دہلی شاہجہاں آباد کی چار دیواری سے قدم باہر نہیں نکالا تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے کہ کشمیر سے راس کماری اور کلکتہ سے کراچی تک اردو مادری زبان کا درجہ حاصل کرتی جا رہی ہے بلکہ پشاور، شیلانگ، کوئٹہ، افغانستان بھی اس کے الفاظ سے بوسیلۂ تجارت و سلطنت موجودہ خالی نہیں پایا جاتا۔ خدا رکھے اب تو ہندوستان کے باہر بھی قدم رکھنا شروع کر دیا ہے۔ عدن، مالدیپ، جزائر سیلون، لنکا، انڈمان، سنگاپور، ہانگ کانگ، شانگھی میں بھی اس کے شیدا پیدا ہو گئے ہیں۔ عرب میں حاجیوں نے بغداد شریف، کربلائے معلٰی، نجف اشرف، مشہد اور بیت المقدس میں زائروں نے، مصر، شام اور روم میں سیاحوں نے، انگلستان میں طلبائے ہندو پنشن یافتہ انگریزوں نے اس کا چرچا پھیلا دیا ہے۔ روس کی عملداری.... میں بھی اس کا رواج ہو چلا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہندوستانی زبان کا پروفیسر بھی وہاں بلایا گیا ہے۔ بلکہ سنا ہے کہ قسطنطنیہ میں بھی سلطان المعظم نے اس طرف گوشۂ چشم منعطف فرمایا ہے۔

اقتباس: سید احمد دہلوی، مولف فرہنگ آصفیہ

مرسلہ: شاہد سہیل، جھنگ صدر

مسکراہٹ تھی۔

”جاؤ بابا۔ اس لڑکی کو بھیج دو۔“ نواز شاہ نے کہا۔ ”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

بوڑھا جلدی سے اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے نواز کی طرف دیکھا۔ ”یار۔ یہ تو واقعی کمال ہے۔“

”اسے کہتے ہیں اقتدار اور طاقت۔“ نواز مسکرا کر بولا۔ ”اب دیکھ لینا۔ وہ لڑکی بھی ہاتھ باندھے ہوئے سامنے آئے گی۔“

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

وہ لڑکی بہت باغیانہ انداز سے نواز کے سامنے آئی تھی۔ وہ سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ ”جی فرمائیں۔“ اس نے پوچھا۔ ”کیسے آنا ہوا آپ دونوں کا۔ مجھ سے کیا کام ہے؟“

”تمہارے بارے میں پتا چلا تھا کہ تم لوگ مدن پورہ کے رہنے والے ہو۔“ نواز نے کہا۔ ”وہ میری ہی جاگیر ہے اور تمہارے فادر ہمارے ہی بنائے ہوئے اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔“

”تو پھر اس سے کیا فرق پڑا۔“ صاحبہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔ ”کیا مدن پورہ کا ہونا کوئی جرم ہے۔“

”تم کیسی باتیں کررہی ہو؟“ نواز شاہ تلملا کر رہ گیا تھا۔ ”ہم تو اس لیے آئے تھے کہ تم سے یہ معلوم کریں کہ لاہور میں تمہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔“

”بہت بہت شکریہ آپ کا۔“ صاحبہ نے کہا۔ ”ہمیں یہاں کوئی پرابلم نہیں ہے۔“

اب نواز شاہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ وہ یہاں اپنا کرشمہ دکھانے آیا تھا لیکن لڑکی اس سے مرعوب ہی نہیں ہوئی تھی۔

”کچھ اور کہنا ہے آپ کو۔“ صاحبہ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ نواز شاہ کھڑا ہوگیا تھا۔ ”اور کچھ نہیں کہنا۔“

وہ بوڑھا اتنی دیر میں چائے اور ناشتا وغیرہ لے کر آگیا تھا لیکن نواز شاہ نے اس پر دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ وہ باہر نکل آیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

”یار۔ یہ تو بہت بُری ہوئی۔“ اس نے باہر آکر کہا۔ ”اس لڑکی کے تو مزاج ہی آسمان پر ہیں۔“

اب میں نے ہنسنا شروع کردیا۔ اس کے تلملائے ہوئے چہرے کو دیکھ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ ”ہاں بھئی۔ اب کیا کہتے ہو۔ تمہارے عشق کے بھوت کا کیا حال ہے؟“

”یار۔ اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ میں اس سے پیچھے ہٹ گیا ہوں۔“ نواز شاہ نے کہا۔ ”بلکہ میری آگ اور بھڑک اٹھی ہے۔ میں اس کو حاصل کرکے رہوں گا۔“

”اب ایک جاگیردار کی انا بول رہی ہے نواز شاہ۔“

”ایسا ہی سمجھ لو۔ شہر آکر اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اگر مدن پورہ ہوتا تو میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔ خیر دیکھ لوں گا اس کو۔“

”میرا خیال ہے کہ تم اب اس کا پیچھا چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تمہارے ہاتھ نہیں آنے والی۔“

”اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ نواز شاہ غرانے لگا۔ ”اس نے مجھے پاگل کردیا ہے اور میں اتنی جلدی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

میں نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا تھا۔ ”یار۔ اب تم اس معاملے میں مت بولنا۔“ اس نے کہا۔ ”اب یہ معاملہ کچھ اور ہوگیا ہے۔“

پتا ہے وہ کچھ اور معاملہ کیا تھا۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ کچھ دنوں کے بعد نواز شاہ نے اس لڑکی کے بارے میں کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ اس کے دھیان سے نکل گئی تھی یا اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا۔ بہرحال اب اس کی دوسری مصروفیات اس کے سامنے آگئیں اور وہ ان میں مصروف ہوگیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ اپنے علاقے کی طرف چلا گیا۔ شاید گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئی تھیں کیونکہ اس کی واپسی دو مہینوں کے بعد ہی ہوئی تھی اور جب واپس آیا تو ایک نئی کہانی لے کر آیا تھا۔ ”یار! اس لڑکی نے تو انتہا کردی۔“

”کس لڑکی کی بات کررہے ہو؟“

”وہی کرشن نگر والی۔“ اس نے کہا۔ ”اب اس نے میری ایسی توہین کی ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“

”کمال ہے۔ تم اب تک اسے بھولے نہیں۔“

”یار۔ وہ بھولنے والی چیز تو نہیں ہے نا۔“ نواز شاہ مسکرا دیا۔ ”دیکھ لینا ہم دونوں ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے۔“

بات آئی گئی ہوگئی۔ پھر اس لڑکی کا ذکر ہی نہیں آیا۔ اس نے خود دو چار دنوں کے بعد یہ بتایا تھا کہ اس لڑکی نے دوبارہ کس طرح اس کی توہین کی تھی۔ ”یار۔ میں نے اس کے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ باقاعدہ رشتہ لیکن اس نے صاف انکار کردیا۔“

”تو اس میں ایسی کون سی بات ہوگئی؟ ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس سے چاہے شادی کرے۔“

”یہ تم شہر کے ماحول میں کہہ رہے ہونا کیونکہ تمہیں ...ی روایات نہیں معلوم۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے اس بستی ... ایک اور بندے کا رشتہ قبول کرلیا ہے کیونکہ دونوں ایک ...سرے سے محبت کرتے ہیں اور یہی بات میری توہین کی ہے۔“

اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ اب یہ دور غلاموں کا نہیں ...ا۔ اب ہر شخص ... اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہے۔

پھر کئی مہینے گزر گئے۔ ہم کالج کی تعلیم سے فارغ ہوکر ...پنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ نواز شاہ اپنی زمینوں ...ر حویلیوں کی طرف چلا گیا تھا اور میں کراچی آگیا۔ یہاں میں نے ایک اخبار جوائن کرلیا تھا کیونکہ میری منزل یہی تھی۔

پھر کئی برس گزر گئے۔ شاید چار یا پانچ برس۔ اس دوران نواز شاہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔ وہ یقیناً اپنی زمینوں پر حکمرانی کررہا ہوگا۔

☆☆☆

بہت عجیب مہم ہمارے سامنے تھی۔

ہمیں گاؤں میں تعلیمی سہولیات کے موضوع پر فیچر تیار کرنا تھا۔ میرے ساتھ ایک لڑکی نائلہ اور ایک ساتھی بشیر بھی تھے۔

ہم اپنی جیپ میں گاؤں گاؤں گھومتے پھر رہے تھے اور اس دوران یہ معلوم ہوتا جارہا تھا کہ گاؤں میں رہنے والوں کی زندگی کتنی تلخ ہے۔

تعلیم بنیادی ضرورت ہونے کے باوجود ان کے لیے تیسری یا چوتھی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا پہلا مسئلہ اپنی روزی کمانا تھا جس کے لیے وہ بے چارے رات دن محنت کرتے تھے۔

ہل چلانا۔ فصلیں بونا۔ ڈھور ڈنگر کی پرورش۔ اینٹیں بنانا۔ لکڑیاں چیرنا اور نہ جانے کیا کیا۔ تب جاکر انہیں روٹی کے دو ٹکڑے مل پاتے تھے۔

اس کے بعد ان کے لیے دوسرا مسئلہ اپنی عزتِ نفس بچانے کا تھا۔ نہ جانے کس وقت کس زمیندار یا کس پولیس آفیسر کی انا مجروح ہوجائے۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ بے چارے تو کسی سے فریاد بھی نہیں کرسکتے تھے۔

ان سب کے بعد تعلیم کا نمبر آتا تھا۔

اس کی حالت اور بھی خراب تھی۔ ٹوٹے ہوئے اسکول۔ نہ پڑھانے والے نہ پڑھنے والے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں اور دھوپ میں بیٹھے ہوئے بچے۔

ہم سب یہی سوچتے رہتے کہ خدا جانے ہمارے ملک میں تعلیم کو کب اہمیت دی جائے گی؟ ہم بہت دکھی دل سے فیچر تیار کررہے تھے۔

عجیب وحشت سی ہونے لگی تھی۔

نائلہ خاص طور پر بہت پریشان تھی۔ ”اشعر علی۔ یہ بتاؤ۔ آخر یہ سب کب تک چلتا رہے گا؟“

”جب تک ہم تعلیم کو اپنے پیٹ سے زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔“

”اور یہ ہونے سے رہا۔“ بشیر نے کہا۔ وہ بھی بہت حساس قسم کا نوجوان تھا۔

ایک بار ہم ایک ایسی بستی میں پہنچ گئے جہاں اسکول نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پتا چلا کہ ایک اسکول ہوا کرتا تھا لیکن ایک بار اس میں آگ لگ گئی اور پورا اسکول خاک کا ڈھیر ہوگیا۔

اس کے بعد اس اسکول کو بنانے کی نوبت نہیں آئی تھی اور اس بستی سے تعلیم کا سلسلہ ہی ختم ہوگیا تھا۔

”کیا اس اسکول سے وابستہ کوئی آدمی مل جائے گا؟“ نائلہ نے پوچھا۔

یہ آئیڈیا بھی اچھا تھا۔ ہم اس آدمی سے انٹرویو لے سکتے تھے۔ ”ہاں جی۔ کیوں نہیں۔ اس اسکول کو چلانے والے بابا سے آپ کی ملاقات ہوسکتی ہے۔ آپ جو کچھ معلوم کرسکتے ہیں۔ اس سے پوچھ لیں۔“

”اور یہ بابا کہاں ملیں گے؟“

”آئیں۔ ان کا گھر دکھا دیتا ہوں۔“

بابا کا گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ایک منزلہ چھوٹا سا گھر۔ ہم نے دروازے پر دستک دی۔ تو ایک بزرگ باہر آگئے۔ وہ اپنے دروازے پر اجنبیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

”ہم آپ سے کچھ باتیں کرنے آئے ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”ہمارا تعلق ایک اخبار سے ہے۔ ہم صحافی لوگ ہیں۔“

”آؤ جی آؤ بسم اللہ۔“ بابا نے دروازہ کھول دیا۔

انہوں نے ہمیں اپنی بیٹھک میں بٹھا دیا تھا اور گفتگو شروع ہونے سے پہلے ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ ہمارے لیے چائے لینے چلے گئے تھے۔

اس چھوٹے سے کمرے میں کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ جن سے یہ ظاہر ہورہا تھا کہ اس گھر میں علم موجود ہے۔ بابا کچھ دیر میں بڑے سلیقے سے ٹرے میں چائے لے کر آگئے۔ ”پتا نہیں جی۔ کیسی چائے بنی ہوگی۔“ بابا نے کہا۔ ”خود سے بنانی پڑتی ہے نا۔ اسی لیے اندازہ نہیں ہوتا۔“

”کیا آپ کے یہاں کوئی اور نہیں ہے؟“ بشیر نے پوچھا۔

"نہیں جی۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "کوئی اور نہیں ہے۔ صرف میں ہوں۔ بتایئے۔ میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہم نے... سنا ہے کہ یہاں ایک اسکول ہوا کرتا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں صاحب ہوتا تھا لیکن اب وہ ایک پُرانی داستان بن گیا ہے۔"

"آگ کیسے لگی تھی۔"

"کچھ نہیں معلوم۔ بس رات گئے آگ لگی اور جب تک گاؤں والے بجھانے کی کوشش کرتے سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس بستی سے تعلیم بھی ختم ہو گئی۔"

"افسوس ہوا سن کر۔" میں نے کہا۔

"آپ نے گاؤں کے زمیندار سے بات نہیں کی۔" نائلہ نے پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟"

"یہی کہ وہ اسکول دوبارہ تعمیر کروادے۔ اس کے لیے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔"

"ہاں۔ اس کے لیے تو کوئی بات نہیں ہوتی۔ لیکن وہ مجھ سے ناراض تھا جی۔ اسی لیے اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔"

"کیوں؟ وہ آپ سے ناراض کیوں تھا؟" بشیر نے پوچھا۔

"بس بھائی۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ان لوگوں کو پورا حق حاصل ہے جس سے چاہیں ناراض ہو جائیں اور جس سے چاہیں راضی ہو جائیں۔ ویسے میں نے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی لیے ناراض ہو گیا۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا چمک گیا۔ مجھے کچھ یاد آنے لگا تھا۔ "آپ یہ بتائیں۔ آپ کی ایک بیٹی بھی ہے صاحبہ۔"

"ہاں۔" وہ تڑپ اُٹھا۔ "آپ کو کیسے معلوم۔ آپ کیسے جانتے ہیں۔ کہاں ہے میری بیٹی۔ خدا کے لیے بتاؤ مجھے؟"

"کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی بیٹی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ان دونوں کو غائب ہوئے چار سال ہو گئے۔" اس نے بتایا۔ "میں نے اس کی شادی کر دی تھی وہ اسی بستی کا نوجوان تھا اور شادی کے کچھ دنوں کے بعد دونوں میاں بیوی غائب ہو گئے۔ خدا جانے کہاں چلے گئے؟ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا.... ان دونوں کو لیکن کوئی پتا نہیں چلا۔ آپ میری صاحبہ کو کیسے جانتے ہیں۔ کہاں ملی ہے آپ کو؟"

"بابا اب سے چھ سال پہلے وہ مجھے لاہور میں ملی تھی۔" میں نے بتایا۔ "وہ شاید وہاں کسی کالج میں پڑھتی تھی میں نے ایک بار اس سے انٹرویو لیا تھا (میں نے مصلحتاً کہا تھا۔ میں نواز شاہ کا حوالہ نہیں دینا چاہتا تھا) اس نے اپنے بارے میں مجھے بتایا تھا اور اب یہ سن رہا ہوں کہ وہ کہیں غائب ہو گئی ہے۔"

"ہاں بیٹا۔ وہ غائب ہو گئی ہے۔" بابا نے بتایا۔ "اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ ہے۔"

"خدایا۔ یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔"

"بس جو میرے خدا کی مرضی اب میں کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے اس بابا سے اجازت چاہی اور اس کے مکان سے باہر آ گیا۔ مجھے اب نواز شاہ سے ملنا تھا کیونکہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اس کا ہی گاؤں ہے۔ اسی کی بستی ہے۔ وہ حاکم ہے یہاں کا۔

"اب ہمیں اس بستی کے حاکم یعنی زمیندار سے ملنا ہے۔" میں نے اعلان کیا۔

"کیوں اس سے مل کر کیا کرنا ہے؟"

"اس لیے کہ وہ میرا دوست ہے۔" میں نے بتایا۔ "ہم دونوں کالج میں ایک ساتھ ہی ہوتے تھے۔"

"واہ پھر تو ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔"

نواز شاہ کی حویلی تک پہنچنا کوئی اتنا مشکل نہیں تھا۔ پورے گاؤں میں سب سے شاندار حویلی جس کے در و دیوار سے رعب اور دبدبہ جھلک رہا تھا۔ اونچے سے گیٹ کے سامنے دو دو مسلح محافظ کھڑے ہوئے تھے۔

"جی آپ لوگوں کو کس سے ملنا ہے؟" ایک محافظ نے پوچھا۔ "ہمارے حلیے اور اسٹائل سے اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم لوگ شہر سے آئے ہیں۔"

"شاہ صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے بتایا۔

"کون سے شاہ۔ دیدار شاہ صاحب یعنی بڑے شاہ صاحب یا چھوٹے شاہ صاحب۔"

اس وقت پتا چلا کہ نواز شاہ کا باپ ابھی زندہ تھا۔

"چھوٹے شاہ۔ نواز شاہ سے۔" میں نے بتایا۔ "ان سے کہنا کہ شہر سے کچھ لوگ ان سے ملنے آئے ہیں۔"

ہمیں کچھ دیر میں اندر بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ ہم سب حویلی کی سجاوٹ اور شان و شوکت دیکھ دیکھ کر حیران ہوئے جا رہے تھے۔

"خدا کی پناہ اس طبقے کے لوگ کتنے شاندار طریقے سے رہتے ہیں۔" نائلہ نے کہا۔

"اسی لیے تو ان کے سروں میں غرور بھرا رہتا ہے۔" [بشیر] نے تبصرہ کیا پھر میری طرف دیکھا۔ "بھائی یہ بتا دو یہ نواز شاہ تمہیں پہچانے گا بھی یا نہیں۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "انسان کو بدلتے دیر کیا لگتی ہے۔"

کچھ دیر بعد ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ شاہ صاحب تشریف لا رہے ہیں پھر نواز شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ ذرا بھی نہیں بدلا تھا البتہ بدن تھوڑا سا فربہ ہو گیا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "ارے۔ ارے تو اشعر، یار تو ادھر کہاں؟"

پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اس کی گرم جوشی اسی طرح برقرار تھی۔ "یار۔ تو عجیب آدمی ہے تو نے اپنی اطلاع بھی نہیں دی۔ میں خود تجھے لینے آ جاتا۔"

"میں نے سمجھا تھا کہ تم اب مکمل جاگیردار اور حاکم ہو گئے ہو پتا نہیں لفٹ بھی دو گے یا نہیں۔"

"بکواس نہیں کرو۔" اس نے پھر نائلہ اور شبیر کی طرف دیکھا۔ "آپ لوگ معاف کریں جی ہم بہت پُرانے دوست ہیں۔ ہمارے درمیان ایسی ہی بے تکلفی ہے۔"

"جی ہاں اشعر نے راستے میں بتا دیا تھا۔"

پھر میں نے نائلہ اور بشیر کا تعارف کروایا۔ اپنے بارے میں بتایا کہ ہم کس مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کی بھی شادی ہو چکی ہے، اپنے ہی جیسے ایک گھرانے کی لڑکی کے ساتھ۔ ایک بیٹا بھی تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی بلا لیا تھا۔

وہ بھی کنگ ایڈورڈز کالج کی پڑھی ہوئی ایک لڑکی تھی۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھانے کا دور چلا۔ چائے چلی پھر بڑے شاہ بھی آ گئے یعنی دیدار شاہ، وہی رعب داب، ویسا ہی کرخت چہرہ لیکن ہم سے بہت خوش اخلاقی سے ملے تھے کیونکہ میں لاہور میں دو تین بار ان سے مل چکا تھا۔

اب تم لوگ چار پانچ دنوں تک ہمارے ساتھ رہو گے۔" دیدار شاہ نے حکم دیا۔

"انکل۔" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن نواز شاہ نے مجھے اشارہ کر دیا کہ میں کسی بات میں اختلاف نہ کروں۔

اب اختلاف کی کیا گنجائش ہو سکتی تھی۔ نائلہ کو زنان خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ میں اور نواز شاہ گزرے دنوں کی باتیں کرنے لگے تھے۔

اس وقت شبیر سونے کے لیے جا چکا تھا۔ جبکہ میں اور نواز شاہ لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ "نواز۔" میں نے اصل موضوع چھیڑ دیا۔ "میں نے فتح محمد سے بھی ملاقات کی ہے۔"

"کون فتح محمد؟"

"وہی تمہاری بستی کے اکلوتے ہیڈ ماسٹر اور اس لڑکی صاحبہ کا باپ۔" میں نے بتایا۔

"اوہ تو تم اس سے ملتے ہوئے آ رہے ہو۔" اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"پھر تو تمہیں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہو گا۔"

"ہاں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے اور بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مثال کے طور پر اس بے چارے کے اسکول میں آگ کیسے لگی اور مثال کے طور پر صاحبہ اور اس کا شوہر کہاں غائب ہو گئے؟ کیا حادثہ ہوا ہے ان دونوں کے ساتھ؟"

"یار اتم آ گئے ہو تو اب میرے دل کا بوجھ اُتر جائے گا۔" اس نے کہا۔ "بہت دنوں سے یہ سوچ رہا تھا کہ تم کو بلا کر سب کچھ بتا دوں۔ کیونکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے اگر میں نے نہیں بتایا تو شاید میرا سینہ پھٹ جائے گا۔"

"ہاں نواز شاہ بتاؤ مجھے کیا ہے یہ سب۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بابا نے اپنے مقام سے بہت نیچے آ کر صاحبہ کے لیے میرا رشتہ بھیجا تھا لیکن ان لوگوں نے صاف انکار کر دیا تھا کیونکہ صاحبہ اس بستی کے کسی اور نوجوان سے محبت کرتی تھی۔"

"ہاں یار یہ تم مجھے بتا چکے ہو۔" میں نے کہا۔ "اس سے آگے کی کیا کہانی ہے؟"

"آگے کی کہانی یہ ہے کہ یہ انکار بابا کو بہت بُرا لگا۔ بہت بُرا زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا ہو گا کہ کسی نے ان کی بات ری فیوز کی ہو گی۔ اس وقت تو انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا لیکن......" وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

"ہاں بتاؤ لیکن کیا؟"

"لیکن انہوں نے صاحبہ کے باپ سے اپنا بدلہ اس طرح لیا کہ اسکول میں آگ لگوا دی حالانکہ وہ اسکول انہوں نے ہی بنوایا تھا۔ وہ چاہتے تو اسے اسکول سے الگ کر سکتے تھے لیکن انہیں اتنا غصہ آیا ہوا تھا کہ اسکول ہی کو کھنڈر بنا دیا۔"

"نواز شاہ میرا بھی خیال کچھ ایسا ہی تھا۔" میں نے

کہا۔ ”جس وقت میں نے یہ بات سنی اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ اس اسکول کی تباہی میں تمہارا یا تمہارے بابا کا ہاتھ ہے۔ چلو اب ان دونوں کے بارے میں بتاؤ۔ وہ دونوں کہاں گئے ؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ اس نے اپنی گردن جھکالی تھی۔

”نہیں نواز شاہ۔ تمہیں بتانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”شروع سے آخر تک اس کہانی میں ساتھ رہا ہوں اسی لیے اس بدنصیب لڑکی کا انجام بھی معلوم ہونا چاہیے۔“

”وہ دونوں مر گئے۔“ نواز شاہ نے بتایا۔

میں سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو مجھ سے بولا ہی نہیں گیا پھر میں نے غصے سے کہا۔ ”نواز شاہ تم ایک ظالم اور بے رحم انسان ہو۔ آخر تم نے ماردیا ان دونوں کو شرم نہیں آئی تمہیں۔“

”یارا۔ میری بات تو سنو !“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہ حکم بابا نے دیا تھا۔“

”تو کیا تم ان دونوں کو بچا نہیں سکتے تھے۔“

”یار' بابا کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔“ اس نے کہا۔ ”زندگی میں پہلی بار وہ میرے لیے کسی کے سامنے شرمندہ ہوئے تھے پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے ان دونوں کی موت کا اس وقت پتا چلا جب یہ کہانی ہو چکی تھی۔“

”افسوس ہے مجھے تم پر نواز شاہ بہت افسوس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے بزدل اور بے رحم نکلو گے۔ میں تمہاری دوستی پر شرمندہ ہو رہا ہوں۔“

اس نے اپنی گردن جھکالی تھی۔ ہمارے درمیان شاید کچھ کہنے سننے کے لیے رہ ہی کب گیا تھا۔ کتنے ظالم لوگ تھے جو ذرا سی بات پر کسی کو اس طرح ہلاک کروا دیا کرتے تھے۔

میں نے اس قسم کے جاگیرداروں اور زمینداروں وغیرہ کی صرف داستانیں سنی تھیں لیکن اب ایسا ایک کردار میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس شخص سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ ”نواز شاہ ہم لوگ کل صبح یہاں سے جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیوں یار ؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”اس لیے کہ تمہارا اب کوئی بھروسا نہیں رہا، نہ جانے کون سی بات بُری لگ جائے اور تم مجھے بھی ٹھکانے لگوا دو۔“

”بکواس نہیں کرو۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”بابا تمہیں نہیں جانے دیں گے۔ تم نے ضد کی تو یہ بھی ان کی توہین ہوگی۔“

”ویسے ایک بات بتاؤ۔ ان دونوں کی موت کس طرح ہوئی اور گاؤں والوں کو کیوں نہیں معلوم ؟ خود اس کا باپ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا ؟“

”ان دونوں کا کام بہت خاموشی سے رات کی تار[یکی] میں ہوا تھا۔“ نواز شاہ نے بتایا۔ ”باہر کے کسی آدمی [کی] خدمات لی گئی تھیں اور اس کا کام تھا کہ وہ دونوں کو مار[نے] کے بعد ہمارے خاندانی قبرستان کی کسی پُرانی قبر میں [دفن] کر دے۔ قبرستان کے گیٹ کی چابی اس کے حوالے کر دی تھی۔ اس نے بڑی خوبی سے اپنا کام کیا۔ ان دونوں کو [...] دفن کیا اور بابا سے ایک لاکھ روپے لے کر راتوں رات گا[ؤں] سے نکل گیا۔“

”اوہ کتنا بڑا ظلم ہوا ہے اسی لیے کسی کو نہیں معلوم ہوا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا گزری ؟“

”ہاں کسی کو نہیں معلوم کہ اس رات اور کیا ہوا تھا“ اس نے بتایا۔ ”یہ راز سوائے ایک عورت کے اور کوئی نہیں جانتا۔“

”عورت۔ کون ہے وہ عورت ؟“

”عالیہ نام ہے اس کا۔“ نواز شاہ نے بتایا۔ ”[وہ] کراچی میں رہتی ہے۔ تم اگر اس سے مل لو۔ تو وہ تمہیں سار[ی] کہانی سنا دے گی۔“

”لیکن یہ عالیہ ہے کون ؟“

”اسی حویلی کی ایک ملازمہ۔“ نواز شاہ نے بتا[یا۔]

”بس یار۔ اب اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا اب جاؤ جا کر سو جاؤ۔ ویسے بھی بہت رات ہو گئی ہے۔“

میں رات بھر کروٹیں ہی لیتا رہا تھا۔ ان دونوں کے حسرتناک انجام پر بے پناہ دکھ ہو رہا تھا۔ ویسے ان زمینداروں اور حاکموں کے لحاظ سے اس بے چاری ملیحہ کے کئی گناہ تھے۔

پہلا گناہ تو یہی تھا کہ وہ ان کے علاقے میں پیدا ہوئی تھی۔ نمبر دو اس کا تعلق ایک انتہائی غریب گھرانے سے تھا۔ یہ کہ وہ بدقسمتی سے خوبصورت بھی تھی۔ پھر یہ کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے ہی مزاج اور حیثیت کے ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ اس نے چھوٹے زمیندار کو لفٹ نہیں دی تھی۔ اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ توہین کی تھی اس کی۔

تو یہ ایسے معمولی گناہ تو نہیں تھے کہ جن پر اسے معاف کر دیا جاتا۔ اتنی جرأت کی سزا تو ملنی چاہیے تھی اور وہ سزا ل[ے] گئی تھی۔

لعنت ہو ایسے معاشرے پر، ایسی دولت اور طاقت پر۔

صبح اٹھ کر میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ نواز [شاہ سے] جانے کی اجازت مانگ لی۔ میں اس حویلی میں اب [نہیں رہ] سکتا تھا۔ نائلہ اور بشیر بھی بہت حیران ہو رہے تھے [کہ میں] نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا ؟

پھر میں نے نواز شاہ سے کہا۔ ”کیا تم مجھے اس عورت [کا پتا د]ے سکتے ہو، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں ہاں' کیوں نہیں' میں تو خود یہی چاہتا ہوں کہ تم [اس سے] مل لو تا کہ تمہارا ذہن میری طرف سے صاف ہو [جائے]۔“ اس نے پتا لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں نواز شاہ۔ میں یہ صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ [میرا د]ل تمہاری طرف سے کبھی صاف نہیں ہوگا اور شاید تم سے پھر نہ ملوں۔“

”لیکن میرا دل یہ کہہ رہا ہے کہ تم مجھ سے ملتے رہو [گے]۔“ اس نے کہا۔

ایسی بے حس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ [مجھ]ے اس کے باپ سے بھی ملنے کی ضرورت نہیں تھی اور [ہم وہا]ں سے روانہ ہو گئے۔ نواز شاہ اس وقت بہت اداس ہو رہا [تھا۔] ”یار۔ مجھے معاف کر دینا جو کچھ ہوا ہے اس میں میرا کوئی [قصور] نہیں تھا۔“

”نواز شاہ تمہیں معافی مانگنی ہے تو خدا سے مانگو۔ اس [بے] چاری کے باپ کے پاس جاؤ۔ وہ بوڑھا ابھی تک اس [کے] انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوا ہے۔“

نواز شاہ نے پھر کچھ نہیں کہا اور ہم وہاں سے رخصت [ہو] گئے۔ ہاں چلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ”یار' جب اس عورت عالیہ سے مل کر میرا حوالہ دو گے تو وہ تم کو سب [کچھ] بتانے کے لیے تیار ہو گی۔ ورنہ وہ تم سے بات بھی نہیں [کر]ے گی۔“

ہم بوجھل دل سے ..... واپس آ گئے۔

میں نے نائلہ اور بشیر کو نواز شاہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا ورنہ وہ بھی اس سے نفرت کرنے لگتے اور خوامخواہ [ا]یک ایشو کھڑا ہو جاتا۔

دو دن آرام کرنے کے بعد تیسری شام میں اس گھر تک گیا جس کا پتا نواز شاہ نے دیا تھا اور جہاں عالیہ رہتی تھی۔

گلبرگ کا یہ مکان دو منزلہ اور خوبصورت بنا ہوا تھا۔ [درو]ازے پر لگی ہوئی گھنٹی کے جواب میں ایک عورت نے [درو]ازہ کھولا۔ بہت معقول لباس میں۔ پینتالیس اور پچاس [کے] درمیان کی عمر۔ باوقار سی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری [طرف] دیکھ رہی تھی۔

”میں اشعر علی ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کروایا۔ ”مجھے نواز شاہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

”ہاں، ان کا فون بھی آ گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”آئیں اندر آ جائیں۔“

ڈرائنگ روم بھی بہت سلیقے کا تھا۔ اگر یہ ملازمہ تھی تو اس کے حالات بہتر معلوم ہوتے تھے۔

”جی بتائیں کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“

”میں صاحبہ اور اس کے شوہر کے موت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ان دونوں کی موت کس طرح ہوئی تھی ؟“

”میں یہ نہیں بتا سکتی۔“

”کیوں، کیوں نہیں بتا سکتیں ؟“

”اس لیے کہ وہ دونوں ماشاءاللہ زندہ ہیں۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”کیا.....!“ میں اُچھل پڑا تھا۔ ”دونوں زندہ ہیں۔“

”ہاں دونوں زندہ ہیں اور یہ مکان بھی انہی کا ہے۔“ وہ انکشاف پر انکشاف کیے جا رہی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ میں خود ان کی قبریں دیکھ کر آ رہا ہوں۔“

”اب آپ کو ساری باتیں ان ہی دونوں سے معلوم ہوں گی۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔“ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت تھی۔

میں کیا سن رہا تھا۔ دونوں زندہ تھے پھر وہ سب کیا تھا؟ وہ پوری کہانی۔ ان کا غائب ہونا، ان کی قبریں اس کے باپ کا واویلا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے اور یہ وہی صاحبہ تھی، اس میں کوئی شک ہی نہیں تھا۔ اس کے وہی خدوخال، وہی دلکشی، وہی تیور، وہی انداز اور اس کے ساتھ ایک معقول صورت مہذب انسان تھا جو یقیناً اس کا شوہر ہوگا۔

میں آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھتا رہا تھا۔

”اشعر علی صاحب۔ آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں ؟“ صاحبہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا پھر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ ”یہ میرے شوہر ہیں کمال شاہ۔“

کمال نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔

”صاحبہ۔ آخر یہ سب کیا ہے ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ سب بے پناہ محبت کی داستان ہے' اشعر صاحب۔“ اس کے شوہر کمال نے کہا۔ ”ایسی محبت جس کی مثال اس دور میں نہیں مل سکتی۔“

”اور مجھے اس محبت پر فخر ہے۔“ صاحبہ بھی بولی۔ ”میں

خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسی بے غرض اور بے لوث محبت اور توجہ حاصل ہے۔''

''کیسی محبت کی بات کر رہی ہیں۔ کس کی محبت ؟''

''نواز شاہ کی۔'' اس نے ایک اور انکشاف کیا۔

''نواز شاہ کی محبت۔ میرے خدا میں یہ سب کیا سن رہا ہوں۔''

''جی جناب۔ یہ بہت عجیب کہانی ہے۔'' صاحبہ نے بتایا۔ ''اس شخص نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک شریف النفس انسان ہے۔ اس میں ایسا خلوص، ایسی محبت اور ایسا پیار ہے کہ اس زمانے میں اس کی مثال ہی نہیں مل سکتی۔ اس نے مجھ سے سچا پیار کیا اور اس پیار کی لاج رکھ لی۔ اس نے ثابت کر دیا کہ اس دور میں بھی انسانیت زندہ ہے۔''

''خدا کے لیے مجھے صاف صاف بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔'' صاحبہ نے بتایا۔ ''میرے انکار پر نواز شاہ کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ جب کہ اس کے باپ نے اپنے سینے میں انتقام کی آگ جلا لی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے بابا کے اسکول میں آگ لگوا دی۔''

''اوہ۔ تو یہ حرکت دیدار شاہ کی تھی۔''

''جی جناب۔'' اب صاحبہ کے شوہر نے کہا۔ ''جب یہ بات نواز شاہ کو معلوم ہوئی تو وہ معافی مانگنے صاحبہ کے گھر آیا' اس نے کہا کہ خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا باپ غصے میں اس حد تک آگے چلا جائے گا۔''

اور اس وقت اس نے یہ بھی بتایا کہ دیدار شاہ مجھے اور کمال کا خون کروانا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے باپ کے سامنے مجبور ہے۔ اس کی مخالفت نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور کروں گا کہ میں خفیہ طور پر بچانے کی کوشش کروں۔''

''اور جناب۔ اس خدا کے بندے نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا۔'' کمال نے بتایا۔ ''ہماری شادی کو ایک سال ہو گیا تھا جب اس نے آ کر بتایا کہ اس نے غنڈے کو توڑ لیا ہے۔ وہ یہی ظاہر کرے گا کہ اس نے ہم دونوں کو ٹھکانے لگا کر ایک پُرانی قبر میں دفن کر دیا ہے۔''

''اور یہی ہوا۔'' اب صاحبہ بتا رہی تھی۔ ''نواز شاہ نے انتہائی سختی کے ساتھ منع کیا تھا کہ ہم اس سازش کی ہوا اپنے بابا کو بھی نہیں لگنے دیں۔ ان کو بھی اندھیرے میں رکھا جائے' ورنہ قیامت آ جائے گی۔''

''اس اللہ کے بندے نے ہمارے لیے یہ مکان خریدا اور ہم راتوں رات وہاں سے فرار ہو کر یہاں آ گئے۔'' [illegible] نے کہا۔ ''پورا گاؤں یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم دونوں پُراسرار [illegible] غائب ہو گئے۔ دیدار شاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم دونوں کو مار [illegible] کروا دیا گیا ہے جب کہ اصل کہانی صرف نواز شاہ کو معلوم [illegible]

''شہر میں کمال کے لیے کاروبار کا بندوبست بھی [illegible] نے کیا ہے۔'' صاحبہ نے بتایا۔ ''وہ تو ایسا آدمی ہے [illegible] کہ ہم ساری زندگی بھی اس کے احسان کا بدلہ نہیں چکا [illegible]

''وہ شاید انسان ہی نہیں ہے صاحبہ۔'' میں دیر [illegible] سے بولا۔ اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے [illegible] ''شاید وہ کوئی فرشتہ ہے۔''

''یا فرشتے سے بھی بلند کسی مخلوق کا تصور ہو سکتا [illegible] نواز شاہ ایسا ہے جناب۔'' کمال شاہ نے کہا۔

''اور ہمیں اس وقت تک پوشیدہ رہنا ہے جب [illegible] اس کا باپ زندہ ہے۔'' صاحبہ نے بتایا۔ ''ہم بہت [illegible] ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں بابا سے کہیں مل [illegible] کیونکہ نواز شاہ نے بہت سختی سے منع کر رکھا ہے۔''

''کیا نواز شاہ کبھی یہاں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کبھی نہیں۔'' صاحبہ نے جواب دیا۔

''بلکہ ہماری خواہش ہے کہ وہ کبھی یہاں آئیں [illegible] کی راہوں میں آنکھیں بچھانے کے لیے بے تاب ہیں [illegible] کمال شاہ نے کہا۔

میں نہ جانے کیا کیا سوچ کر وہاں آیا تھا۔ نواز شاہ [illegible] خلاف میرے دل میں کیا کیا بھرا ہوا تھا اور اب میں داستان لے کر واپس جا رہا ہوں۔

میں نے نواز شاہ سے کہا تھا کہ میں اب کبھی اس [illegible] پاس نہیں آؤں گا لیکن اس نے بڑے یقین اور اعتماد کے سا[illegible] کہا تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ میں اس کے پاس نہ آؤں۔

اور میں ایک ہفتے بعد ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ [illegible] اس سے لپٹ کر دیر تک روتا رہا تھا۔ ''میری جان، میر[illegible] دوست تم نے انسان ہونے کا ثبوت دے دیا ہے۔''

''چھوڑ یار۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''کیا خاک ثبوت [illegible] ہے۔ وہ تو ابھی بھی مجھے یاد آتی ہے۔''

''نواز شاہ تم اس سے ملنے کیوں نہیں جاتے؟''

''نہیں یار۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''میں اس کے سا[illegible] نہیں جا سکتا۔ انسان ہوں نا۔ نہ جانے کس وقت پُرانی [illegible] زندہ ہو جائے اس لیے وہ جہاں ہیں انہیں خوش رہنے دو۔''

میں ایک بار پھر نواز شاہ سے لپٹ پڑا تھا۔

یہ ان کی شادی کی تیسری سالگرہ تھی۔

رمیز چونکہ ایک معروف اور مقبول کاروباری شخصیت [illegible] لیے اس سالگرہ میں اس کے گھر اور خاندان والوں [illegible] دوستوں کی ایک بڑی تعداد بھی شریک ہوئی تھی۔

رمیز اور نائمہ نے اپنے خوبصورت گھر کے خوبصورت [illegible] میں شاندار پارٹی ارینج کی تھی۔

دونوں میاں بیوی بہت خوبصورت تھے اور سفید لباس [illegible] میں کسی خوبصورت جوڑے کی طرح تیرتے پھر رہے [illegible] نہ جانے رشک کی کتنی نگاہوں نے ان دونوں کو اپنے [illegible] میں لے رکھا ہو گا۔

لان کے پودوں، درختوں پر برقی بلبوں کی بیلیں لپیٹ دی گئی تھیں۔ پورے گھر میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس رات چاند بھی روشن تھا لیکن اس کی روشنی وہاں پھیکی ہو رہی تھی۔

اچانک ایک ایک کر کے سارے بلب بجھا دیے گئے صرف چاندنی رہ گئی۔ خوبصورت چاندنی اور ہلکی ہلکی موسیقی شروع ہو گئی۔ رمیز نے نائمہ کا ہاتھ تھاما اور دونوں کسی کی پروا کیے بغیر رقص کرنے لگے۔ پیار کا رقص۔

ہم سب دم بخود رہ گئے تھے۔

محبت کا ایسا انوکھا مظاہرہ کم ہی دیکھنے میں آیا کرتا ہو گا۔

جب یہ رقص ختم ہوا تو ہم بہت دیر تک تالیاں بجاتے رہے اور یہ بات صرف ایک ہفتہ پہلے کی تھی۔

تجربہ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

میں سرگزشت کا ایک ادنیٰ قاری ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میری زندگی کا یہ سبق دیگر قارئین تک پہنچ جائے۔ امید ہے اسے جگہ ضرور دیں گی۔

فیصل اختر

(کراچی)

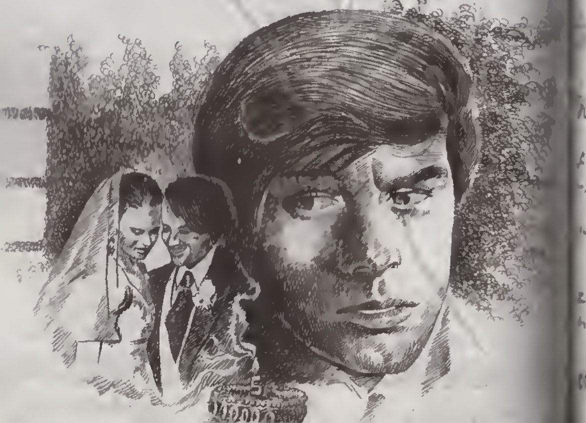

اور ٹھیک دس مہینوں کے بعد۔

رمیز میرے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا، خاموش۔ اس نے آکر ایک ایسی خبر سنادی تھی کہ میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔ میں اس وقت دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ رمیز مجھ سے ملنے چلا آیا تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ میرا عزیز دوست تھا۔ اس کے آنے کی خوشی ہوئی تھی لیکن اس طرح صبح صبح آنا کچھ حیرت کی بات تھی۔ ''فیصل تم آج دفتر نہیں جارہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''او کے۔'' میں مسکرادیا۔ ''جو حکم میں ابھی دفتر فون کر کے بتادیتا ہوں کہ میں نہیں آرہا۔''

''ہاں بتا دو۔'' اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

''یقیناً کوئی خاص بات تھی ورنہ وہ اس موڈ میں کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے اپنے دفتر فون کر کے بتا دیا کہ میں نہیں آسکوں گا اور خود کپڑے تبدیل کرنے اور چائے بنانے چلا گیا۔

میں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اپنے خوبصورت اور بڑے اپارٹمنٹ میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ ملازمہ ہفتے میں صرف دو دنوں کے لیے آتی تھی۔

چائے بنا کر لایا تو رمیز اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ میری آہٹ سن کر وہ چونک گیا تھا۔ میں نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ دی۔ ''ہاں میری جان اب بتاؤ خیریت تو ہے؟''

''نہیں۔ خیریت نہیں ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میں اور نائمہ ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں۔''

''کیا......!'' میں جیسے اُچھل پڑا تھا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو۔''

''سچ کہہ رہا ہوں۔ ہم دونوں نے ہمیشہ کے لیے علیٰحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم دونوں کے دماغ تو نہیں خراب ہو گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے ابھی بھی تم دونوں کی شادی کی تیسری سالگرہ یاد ہے جب تم نے ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ صرف دس ہی مہینے تو گزرے ہیں اور اب علیٰحدگی کی خبر سنانے چلے آئے ہو۔''

''ہاں بھئی زندگی کبھی کبھی ایسے تماشے بھی دکھا دیتی ہے۔''

''لیکن کیوں۔ اس پاگل پن کی کیا وجہ ہے؟''

''اس لیے کہ اب جھوٹ کے سہارے زندگی نہیں گزر

سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''یہ جھوٹ نائمہ کی طرف سے نہیں بلکہ میری جانب سے ہے۔ کیونکہ میں شاید اس کو اتنی محبت نہیں دے سکوں گا جتنی محبت کی وہ حقدار ہے۔ لہٰذا جھوٹ بول کر رہنے سے کیا فائدہ؟''

''تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔''

''فیصل۔ میں کسی اور سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' رمیز نے بتایا۔

یہ میرے لیے ایک اور انکشاف تھا۔ رمیز کسی اور کو چاہتا ہو یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ اس نے تو نائمہ کو اپنی جان پر کھیل کر حاصل کیا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنے کیریئر کی بھی پروا نہیں کی تھی اور اب وہ ایک اور محبت کی خبر سنا رہا تھا۔

''پلیز تم مجھے آرام اور تفصیل سے بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ مجھے پتا چلے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''فیصل میرے اور نائمہ کے درمیان اختلاف جس قسم کا ہے میں تمہیں اس کے بارے میں بتا نہیں سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اب ہم شاید ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکیں۔ ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہو چکے ہیں۔ اسی لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''میں تو ہر وقت تم دونوں کے لیے کوشش کرنے کو تیار ہوں۔''

''نہیں، ہم دونوں کے لیے نہیں صرف نائمہ کے لیے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا مطلب؟''

''وہ اس وقت ٹوٹی ہوئی ہے، یہ اور بات ہے کہ اس نے ظاہر نہیں کیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس فیصلے نے اسے کمزور کر دیا ہے۔ تم ہمارے مشترکہ دوست ہو۔ کالج کے زمانے سے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ لہٰذا اس کا ساتھ دو۔''

''میں اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''بہت آسان ہے۔ تم اس کے قریب ہو جاؤ۔ ایک اچھا اور ہمدرد دوست بن کر اس کے ساتھ رہو۔ اسے سہارا دو۔ تفریح کراؤ تاکہ وہ اس دکھ کو برداشت کر سکے۔''

''خدا کے بندے۔ جب تمہیں اس کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر اس سے الگ کیوں ہو رہے ہو؟''

''یہ ایک دوسرا معاملہ ہے۔'' اس نے کہا ''میں نہیں چاہتا کہ اس علیٰحدگی کے بعد وہ بکھر کر رہ جائے۔''

عجیب بات تھی لیکن رمیز کی اس بات نے مجھے کچھ یاد دلا دیا تھا۔ یوں سمجھیں کہ میرے زخم ہرے ہو

تھے۔ میں نے بھی کسی زمانے میں نائمہ سے محبت کی تھی لیکن اس کا اظہار نہیں ہو پایا تھا۔ دل ہی دل میں اس کی پرستش کرتا رہا تھا۔ رمیز نے پیش قدمی کی اور وہ نائمہ کو لے اُڑا۔ اس نے محبت کا اظہار بھی کیا اور شادی کی پیش کش بھی۔

ان دونوں کی شادی ہو گئی اور میں اپنی تمناؤں اور اپنے خوابوں کے ساتھ تنہا رہ گیا۔

اور اب وہ مجھ سے یہ کہے جا رہا تھا کہ میں اس کے قریب ہو جاؤں۔ اس کا دل بہلاؤں۔ اس کا ساتھ دوں۔ نہ جانے ان دونوں کے درمیان ایسی کون سی بات ہو گئی تھی ؟

رمیز مجھے گھر پر بلا کر چلا گیا تھا۔ اس نے تاکید کی تھی کہ میں شام کو اس کے پاس پہنچ جاؤں۔

میں شام کو اس کے گھر گیا تو رمیز نہیں تھا صرف نائمہ تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ ''آؤ فیصل رمیز تو اس وقت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا ضروری ہے کہ میں رمیز ہی سے ملنے آؤں۔ میں تمہارا بھی تو دوست ہوں۔''

''کیوں نہیں۔ بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔''

میں آرام سے بیٹھ گیا۔

اس گھر میں کسی قسم کا کوئی تکلف نہیں تھا، اپنا ہی جیسا تھا۔ نائمہ کچھ دیر بعد چائے لے آئی تھی۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بجھی بجھی سی ہے۔

''نائمہ۔'' میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ''میں یہ کس قسم کی حماقت سن رہا ہوں۔''

''اوہ۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''رمیز نے تمہیں بتا دیا ہے۔''

''ظاہر ہے کہ وہ سب سے پہلے میرے پاس آیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''لیکن مجھے اس کی بکواس پر یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''یہ بکواس نہیں سچائی ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''ہم دونوں نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ تم یہ سوال کرو گے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے تو میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گی۔ یہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔''

''آخر معاملہ کیا ہے ؟'' میں زچ ہو چکا تھا۔ ''نہ تو رمیز بتا رہا ہے اور نہ تم بتا رہی ہو۔''

''میں نے کہا نا کہ میں نہیں بتا سکتی۔'' نائمہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ اس کی آنکھوں میں آ[نسو] آتے وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

میں اس کی حالت دیکھ کر کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس خوبصورت چہرے کی اداسی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں [کچھ] دیر اس کا انتظار کر کے واپس آ گیا تھا۔

دوسرے دن رمیز کا فون آیا، وہ میرا شکریہ ادا کر[رہا] تھا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم اس سے ملنے چلے گئے [تھے] آج بھی چلے جانا پلیز۔''

میں نے رمیز کو ایک بار اور سمجھانے کی کوشش کی [تھی] اس نے میری بات یہ کہہ کر ختم کر دی۔ ''فیصل جو فیصلہ ہ[و چکا] وہ ہو چکا اب اس کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ پلیز اس موضو[ع پر] اب کچھ مت کہنا۔''

''شام کے وقت میں پھر رمیز کے گھر چلا گیا۔ نائمہ گ[ھر] ہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''فیصل اب اس گھر میں شاید رمیز [سے] تمہاری ملاقات نہ ہو اس نے کہیں اور رہنا شروع کر دیا ہے۔''

''ظاہر ہے میں اس پاگل پن کے بارے میں اور [کیا] کہہ سکتا ہوں۔''

''میں تم سے ایک بات کہوں میری بات مانو گے [؟] مجھ سے اب اس موضوع پر بات مت کرو۔'' اس نے کہا۔

''اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔''

''تو پھر کس موضوع پر بات کروں؟''

''زمانے کی باتیں، اپنی باتیں۔ تم نے کیا سوچا [ہے] زندگی کس طرح گزارنا چاہتے ہو۔ ابھی تک شادی کیوں نہ[یں] کی وغیرہ وغیرہ۔''

اور ہم باتیں کرتے رہے زمانے بھر کی ان باتوں [کے] درمیان ہم نے رمیز اور نائمہ کی شادی شدہ زندگی کے بار[ے] میں کوئی بات نہیں کی تھی پھر نائمہ ہی کی تجویز پر ہم آؤٹنگ کے لیے نکل گئے تھے۔ اس وقت میرے دل کی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ نائمہ کے ساتھ وقت گزارنے کا خواب تو اس زمانے کا تھا لیکن اس خواب کی تکمیل کس انداز سے ہو رہی تھی۔

نائمہ کے ساتھ گھومتے اور باتیں کرتے ہوئے میرے دل کے چور نے آواز دی۔ ''فیصل تم یہ اچھا نہیں کر رہے، نائمہ تمہارے دوست کی بیوی ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ ریزرو رہنا چاہیے۔''

پھر اندر ہی سے جواب آیا میں جو کچھ کر رہا ہوں اس میں میری مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے یہ میں اپنے دوست کی مرضی سے کر رہا ہوں وہ جانتا ہے سب کچھ۔

نائمہ نے ایک بار چلتے چلتے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

ہم اس وقت ایک ہوٹل کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اس ہوٹل میں کھانے کا مشورہ اسی نے دیا تھا اور جب جانے لگے تو اس نے کہا۔ ''نہیں فیصل ہم اس طرح جائیں گے۔''

''تو پھر۔''

''تم میرا ہاتھ تھام لو۔'' اس نے کہا۔

''نائمہ۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہم اس طرح ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے [چلیں] گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں اس کی کیفیت کے [بارے] میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میری کیفیت بہت بُری ہو [رہی تھ]ی۔ دل کا یہ حال تھا جیسے سینہ سے باہر آ جائے گا ایسا شاید پہلے کبھی نہیں ہوا ہو گا۔''

ہم اسی طرح ہوٹل میں داخل ہوئے۔

اور ایک عجیب بات ہوئی، رمیز اسی ہوٹل میں موجود [تھا] ہم دونوں کو اس طرح آتا۔۔ دیکھ کر وہ چونک اُٹھا تھا۔ [میں] نے گھبرا کر نائمہ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا لیکن نائمہ نے فوراً ہی [ہا]تھ دوبارہ تھام لیا تھا۔

مجھے شرم سی آ رہی تھی لیکن نائمہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ [رمیز] ہوٹل سے باہر چلا گیا تھا۔

''نائمہ یہ اچھا نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔

''کیوں اس میں کون سی بُرائی ہو گئی ؟'' نائمہ نے کہا۔ [ج]ب وہ خود مجھ سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتا تو اس سے [ڈر]نے یا شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''اس کا بھی کہنا اپنی جگہ درست تھا لیکن مجھے رمیز سے [ہمدردی] محسوس ہو رہی تھی لیکن اب شاید نائمہ اس سے اکھڑ چکی [تھی] اسی لیے اس نے رمیز کی پروا نہیں کی تھی۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ بہاروں اور خوابوں کے [د]ن۔ میں اور نائمہ بہت تیزی سے ایک دوسرے کے [قری]ب آتے جا رہے تھے۔ ویسے ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ [اس کا] انجام کیا ہو گا ؟

رمیز نے ابھی تک نائمہ کو مکمل طور پر نہیں چھوڑا تھا اس [کو] چھوڑ دینے کے بعد ہی میں اور نائمہ ایک ہو جانے کے [بار]ے میں کچھ سوچ سکتے تھے اس سے پہلے تو ظاہر ہے یہ [بُر]ی بات تھی۔

ایک بار اور ایسا ہوا۔

ہم دونوں ساحل پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے تھے [ر]میز نے دیکھ لیا۔ اس بار بھی نائمہ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی تھی۔ وہ بدستور مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔

اور اب میں بھی کسی حد تک اسے اور خود کو حق بجانب سمجھنے لگا تھا۔ ظاہر ہے جب ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا تو پھر ڈرنے اور شرمانے کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن یہ سلسلہ کب تک چل سکتا تھا۔ اسی لیے ایک دن میں نے نائمہ سے کہا۔ ''نائمہ بہتر یہی ہے کہ تم اب رمیز سے صاف صاف بات کر لو۔''

''کیا بات کروں؟''

''یہی کہ وہ اب تمہیں چھوڑ دے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ نہ تو تم معلق ہو کر زندگی گزار سکتی ہو اور نہ میرے بس کا روگ ہے، ہم دونوں کو کسی ایک نتیجے پر پہنچ جانا چاہیے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' نائمہ نے میری تائید کی۔ ''میں اس سے بات کر لیتی ہوں۔''

اس گفتگو کے دوسرے دن نائمہ نے فون کر کے بتایا۔ ''فیصل رمیز سے میری بات ہو گئی ہے، وہ کل آخری فیصلہ کرنے آ رہا ہے۔ تم بھی آ جانا۔''

''نائمہ۔ میرا آنا شاید مناسب نہیں ہو گا۔''

''کیوں نہیں ہو گا ؟'' اس نے کہا۔ ''تم رہو گے تو مجھے تمہاری وجہ سے حوصلہ ملتا رہے گا۔''

''اوکے میں پہنچ جاؤں گا۔''

وہ رات میرے لیے بہت بے چینی کی تھی۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا کل آنے والا کل میرے اور نائمہ کے لیے کتنا عجیب ہونے والا تھا۔

اگر کوئی اور ہوتا تو مجھے اتنی پروا بھی نہیں ہوتی لیکن یہ معاملہ رمیز کا تھا جو میرا دوست تھا لیکن اس میں میرا بھی کیا قصور رمیز نے تو خود ہی نائمہ کو چھوڑ دیا تھا اب وہ اپنے منہ سے کیا کہہ سکتا تھا۔

دوسری شام میں نائمہ کے پاس پہنچ گیا۔

اس شام نائمہ نے میک اپ اور لباس میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا اور بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی اور اس کی آنکھوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے۔

''رمیز بس آنے ہی والا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور اس کے آتے ہی ایک نئی زندگی شروع ہو جائے گی۔''

رمیز ٹھیک ساڑھے پانچ بجے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت بوکے تھا۔ اس نے آتے ہی وہ پھول نائمہ کو دے دیا تھا اور نائمہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

میرے لیے یہ منظر بالکل ہی غیر متوقع اور حیرت انگیز

تھا۔

"فیصل تمہارا بہت بہت شکریہ۔" رمیز نے کہا۔ "تم نے میری محبت مجھے واپس دلا دی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ نائمہ بھی تمہاری شکرگزار ہے۔ کیوں نائمہ۔"

"ہاں۔" نائمہ نے اپنی گردن ہلا دی۔ "اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایک دوسرے سے بہت دور جا چکے ہوتے۔"

"میں نہیں سمجھا کہ یہ سب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ڈراما۔" رمیز نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کی ہے۔"

"تو پھر ایسے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟" میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

"ضرورت اس لیے تھی کہ ہمارے درمیان بے زار کن لمحے آنے لگے تھے۔" اس نے بتایا۔ "اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ ہماری محبت میں کمی ہوئی تھی، نہیں وہ اسی طرح تھی صرف یکسانیت سے اُکتاہٹ سی ہونے لگی تھی پھر میں نے ایک مشہور سماجی مفکر کا ایک قول پڑھا۔ اس نے کہا ہے کہ اگر محبت کا احساس شدید کرنا چاہتے ہو تو ایک رقیب پیدا کرلو۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "تو تم نے اس طرح ایک رقیب پیدا کرلیا۔"

"ہاں یار۔" وہ ہنس پڑا۔ "مجھے افسوس ہے کہ اس کے لیے تم سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں تھا۔ اور تم یقین کرو کہ تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میں واقعی رقابت کی آگ میں جلنے لگا تھا اور نائمہ کی محبت میرے دل میں شدید ہوتی جارہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے ناٹک ہے۔ اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے نائمہ کو تم مجھ سے چھین کر لے جا رہے ہو بس یہ ہوا کہ میں نے اور نائمہ نے فون کر کے یہ طے کرلیا کہ اب بہت ہو گئی اس کہانی کو اب ختم ہو جانا چاہیے اور ہمیں احساس ہوا کہ ہماری محبت پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ اسی لیے اب ہم دونوں تمہارے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑے ہیں۔"

"بہت بہت مبارک ہو یار۔" میں نے کہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت میرے دل کی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ "مبارک ہو کہ تم دونوں نے بہت زبردست اداکاری کا مظاہرہ کیا اور اس بات کی بھی مبارک کہ تمہارے درمیان پیار کا رشتہ کہیں زیادہ مضبوط ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بتا دوں کہ آئندہ اس قسم کا تجربہ مت کرنا ہو سکتا ہے کہ جس انداز سے آج میں نائمہ کو واپس کر رہا ہوں کوئی اور نہ کرے تم دونوں کا تو یہ کھیل ہوگا لیکن کسی اور کے لیے شاید کھیل نہ ہو۔"

"ہاں یار یہ شاید ہماری حماقت تھی۔" رمیز نے کہا۔ "بہرحال آج ہم دونوں کو ایک نئی زندگی شروع کرنی ہے ایک انتہائی پیار بھری زندگی۔"

یہی نائمہ نے بھی کہا تھا کہ آج سے اس کی ایک نئی زندگی شروع ہو جائے گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور خود میں بھی اس وقت ان کا ساتھ دے رہا تھا لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس وقت میرے وجود میں کیسی توڑ پھوڑ اور ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کس طرح میرا دل رو رہا تھا۔ میرے سارے خواب ذرا سی دیر میں بکھر کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ یہ کوئی اچھا مذاق نہیں کیا تھا۔

"فیصل۔" اس بار نائمہ نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں سمجھ رہی ہوں کہ اس وقت تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہوگی مجھے احساس ہے کہ تم مجھ سے واقعی محبت کرنے لگے تھے لیکن ایک بات بتاؤ کیا ہم اب بھی ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے۔ ایک اچھے دوست کی طرح ایک مہربان ہمدرد کی طرح۔" اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "بتاؤ کیا ہمارے درمیان ایسی محبت نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں؟" میں نے اپنے آنسو اپنے سینے ہی میں چھپا لیے تھے۔ "کیوں نہیں ہو سکتی؟ میں تو تم سے ہر قسم کی محبت کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ رمیز بھی ہنس دیا تھا۔ میں بھی مسکرا رہا تھا اور اس کمرے میں محبت اپنی پوری توانائی کے ساتھ در آئی تھی اور احساس دلا رہی تھی کہ محبت کے ہزار پہلو ہوا کرتے ہیں۔

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں۔ میں یہ کہانی ان دونوں کی شادی کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر لکھ رہا ہوں۔ آج بھی سب کچھ اسی تیسری سالگرہ کی طرح ہے۔ روشنیاں گل کر دی گئی ہیں۔ چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور دونوں ہلکی ہلکی موسیقی میں ایک دوسرے کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔

اور خود میں بھی اب تنہا نہیں ہوں میرے ساتھ میری بیوی افروز ہے۔ بہت خوبصورت اور خیال رکھنے والی بالکل نائمہ کی طرح اس کی صورت نائمہ ہی جیسی ہے کیونکہ وہ نائمہ کی چھوٹی بہن ہے۔ یہ شادی نائمہ ہی نے کرائی ہے اور ہمارے درمیان پیار کے رشتے اور گہرے ہو گئے ہیں۔

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

السّلام علیکم!

آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی اور چھاپی ہوں گی، آج میں آپ کو اپنا ہی ایک واقعہ سنا رہا ہوں جو یقینا دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ چور پر مور کی صحیح تشریح ہے یہ کہانی۔

بدرالدین
(فیصل آباد)

آخری شرط

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہوگا۔

مجھے بات بے بات شرط لگانے کی عادت تھی اور اپنی ہوشیاری سے میں اکثر شرط جیت بھی لیتا تھا۔ مثال کے طور پر کئی واقعات ہیں۔ ایک بار میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔

سامنے والی میز پر ایک خونخوار شکل کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ایک دوست نے کہا۔ "یار بدرو یہ آدمی کتنا خطرناک دکھائی دیتا ہے۔"

یاد رہے کہ میرا پورا نام بدرالدین ہے لیکن یار لوگ پیار سے بدرو کہتے ہیں اور زیادہ پیار ہو تو بدروح بھی کہنے لگتے ہیں۔

"ہاں ہے تو خطرناک۔" میں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تو اس کو تھپڑ مار سکتا ہے؟" دوست نے پوچھا۔

"مجھے اپنی زندگی عزیز ہے بھائی۔" میں نے کہا۔ "میں خوامخواہ کیوں تھپڑ ماروں، ہاں اگر شرط لگاؤ تو پھر سوچا جاسکتا ہے۔"

"چل دو سو روپے کی شرط۔"

"اس خطرناک آدمی کے لیے دو سو روپے بہت کم ہیں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"اچھا تو پھر تین سو روپے۔"

"ہاں اب سوچا جاسکتا ہے۔" میں نے ہنکاری لی۔ "بس بھائی تو میری مرہم پٹی کا سامان تیار رکھ میں اسے مار کر آتا ہوں۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس آدمی کے پاس پہنچ گیا۔ "جناب عالی! مجھے آپ سے ایک درخواست کرنی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔ میری پوری بات سن لیں گے۔"

"کیا بات ہے؟" وہ غرایا۔

"پہلے وعدہ کریں کہ آپ میری پوری بات سنیں گے۔"

"اچھا بولو تو سہی۔"

"میں آپ کو ایک تھپڑ مارنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا......!" غصے سے اس کے گال لرزنے لگے۔ "کیا بکواس کر رہا ہے۔"

"جناب۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ آپ میری پوری بات سنیں گے۔" میں نے کہا۔

"اچھا چل بتا کیا بات ہے؟"

"میں آپ کو ڈیڑھ سو روپے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "خود سوچ لیں ابھی اسی وقت آپ کو ڈیڑھ سو روپے مل جائیں گے اور آپ کون سا روز روز اس ہوٹل میں آتے ہیں کہ لوگ آپ کو یاد رکھیں گے، ایک ہلکے سے تھپڑ کے بدلے ڈیڑھ سو روپے کوئی اتنا مہنگا سودا نہیں ہے، اگر کوئی مجھے صرف پچاس روپے بھی دے تو میں تھپڑ کھالوں۔"

اتنا کہہ کر میں بھاگنے کی پوزیشن میں آگیا یعنی وہ ذرا سا بھی غرائے تو میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ لوں لیکن اس کو بھی شاید پیسوں کی ضرورت تھی' اس لیے اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چل ٹھیک ہے میں تیار ہوں' لیکن تجھے پیسے بڑھانے ہوں گے۔"

"چلیں دو سو اس سے زیادہ میں نہیں دے سکوں گا۔"

"تو نکال دو سو۔"

میں نے اپنی جیب سے دو سو نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔ اس نے اپنا گال آگے کر دیا۔ چونکہ پچاس روپے پہلے سے چلے گئے تھے اسی لیے میں نے خاصا زوردار تھپڑ رسید کیا تھا۔

تو یہ تھی میری شرط جیتنے کی تکنیک۔

اور اسی تکنیک کے بھروسے پر میں کلن بھائی سے ٹکرا گیا تھا۔ کلن بھائی ایک زبردست آدمی تھے پینتالیس اور پچاس کے درمیان، بہت زبردست صحت تھی ان کی۔ کسی زمانے میں شکاری بھی رہ چکے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ گپ ہانکنے کے ماہر تھے۔ ہمارے محلے میں ایک بڑا سا چبوترہ تھا، بالکل روایتی چبوتروں کی طرح جن پر درختوں کے سائے ہوتے ہیں۔

وہ چبوترہ کلن بھائی کا اڈا تھا۔ وہ شام کے وقت اپنے دوستوں کو لے کر بیٹھ جاتے اور گپ شپ چلتی رہتی تھی۔ کلن بھائی کی شخصیت کی ایک اور خاص بات ان کی مونچھیں تھیں۔

واقعی بہت ہی شاندار مونچھیں تھیں کلن بھائی کی۔ نہ جانے ان پر کتنی محنت کی ہوگی، وہ خود کہا کرتے تھے کہ روزانہ ایک پاؤ مکھن ان مونچھوں کو پلایا جاتا ہے۔

کھاتے پیتے آدمی تھے اسی لیے ایک پاؤ مکھن مونچھوں کو پلا سکتے تھے اور خود بھی پی سکتے تھے۔ اس اڈے پر ان ہی کے دم سے چائے کا دور چلتا رہتا تھا۔

سامنے ہی ایک ہوٹل تھا کبھی تو کلن بھائی کسی بندے کو بھیج دیتے کہ جا اتنی چائے کا آرڈر دے کر آجا یا کبھی وہیں سے آواز لگا دیتے۔ "استاد جلدی سے بارہ چائے بھیج دے۔" اور استاد فوری طور پر چائے تیار کرنے لگتا۔

ایک دن کلن بھائی نے فرمایا۔ وہ اس وقت اپنے مچھلی کے شکار کا واقعہ سنا رہے تھے۔ "بھائیو ہوا یہ کہ میں نے اندازہ لگا لیا کہ کوئی بہت ہی وزنی مچھلی کانٹے میں پھنس چکی ہے کیونکہ اس میں اتنا زور تھا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچے لیے جا رہی تھی۔ بہرحال میں نے بھی جان لڑا دی اور کھینچنا شروع کر دیا۔ دس منٹ کے بعد وہ چار من کی مچھلی اوپر آئی تھی۔"

"چار من کی۔" سننے والوں نے اپنی سانسیں روک لی تھیں۔

"ہاں بھائی۔" انہوں نے بڑی بے نیازی سے چاروں طرف دیکھا۔ "وہ تو میں نے تم لوگوں کے تکلف میں وزن کم بتایا ہے ورنہ اس کا وزن اور بھی زیادہ تھا۔"

سب واہ واہ کرنے لگے۔ اس وقت نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں بول پڑا۔ "کلن بھائی ایک بار میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔"

"اچھا وہ کیا؟" اب وہ سب میری طرف متوجہ ہوگئے

"میں نے جب کانٹا باہر نکالا تو ایک جلتی ہوئی لالٹین نکل آئی۔" میں نے کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو پانی سے جلتی ہوئی لالٹین کیسے نکل سکتی ہے؟"

"کلن بھائی آپ مچھلی کا وزن کم کر دیں' میں لالٹین بجھا دیتا ہوں۔"

اس پر جو قہقہے پڑے ہیں تو کلن بھائی کی مونچھیں بھی پھڑانے لگی تھیں۔ اس واقعے کے کئی دنوں بعد تک کلن بھائی مجھ سے ناراض ناراض رہے تھے بعد میں سیٹ ہوتے چلے گئے۔

ایک دن میرے ایک دوست نے کہا۔ "یار تو بڑا یار بنتا ہے، تو کلن بھائی کی مونچھیں صاف کروا دے۔"

"مونچھیں۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "ابے کیوں میری جان کا دشمن ہوا ہے، کلن بھائی جتنا شریف ہے اتنا ہی خطرناک بھی ہے۔ ہاتھ چلانے میں اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ دو منٹ میں آنتیں باہر نکال دے گا۔"

"ابے جا...... پھر تیری استادی کہاں گئی؟"

"استادی کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں شیر کے منہ میں ہاتھ دے دوں۔" میں نے کہا۔

"یہی تو دیکھنا ہے۔ تو بڑا شرط لگاتا پھرتا ہے، چل بیس ہزار کی شرط ٹھہری۔ اگر تو نے ان کی مونچھیں صاف کروا دیں تو بیس ہزار تیرے ہوگئے۔"

"بیس ہزار تو بہت بڑی رقم ہے اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"لیکن یاد رکھ اس کی بھی ایک کنڈیشن ہے۔"

"اب اس کی کیا کنڈیشن ہے؟"

"ان کی مونچھیں ان کے ہوش میں صاف ہوں گی۔ جاگتے ہوئے صاف ہوں گی ایسا نہیں ہوگا کہ تو نے انہیں بے ہوشی کی دوا دے دی اور وہ جب بے ہوش ہوگئے تو استرا لے کر ان کی مونچھیں صاف کر دیں یہ نہیں ہوگا۔"

"یار یہ تو بہت کڑی شرط ہے۔"

"یہی تو ہے۔ اب تجھے حلوہ تو نہیں مل سکتا نا۔"

معاملہ بیس ہزار کا تھا۔ میرے سیریس ہونے کی وجہ یہ تھی آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں نے کوئی شرط جیتی ہو اور رقم نہ ملی ہو۔ اس معاملے میں یہ لوگ بہت کھرے تھے۔

"کیا سوچ رہا ہے بدرو؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی گردن ہلائی۔ "میں تیار ہوں۔"

"واہ میرے شیر اب دیکھتا ہوں تیری کاریگری۔"

اس شام جب کلن بھائی کی بیٹھک جمی تو میں وہاں موجود تھا۔ میری نگاہیں ان کی شاندار مونچھوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

"کلن بھائی۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "میں نے پورے شہر میں آپ جیسی خوبصورت مونچھیں نہیں دیکھیں۔"

"یہ تو ہے۔" کلن بھائی اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے۔ "بڑی محنت ہوئی ہے اس پر۔"

"اور خرچ بھی تو بہت ہوا ہوگا۔"

"بہت۔ اب تک کم از کم پچیس ہزار صرف ان مونچھوں پر خرچ کر چکا ہوں۔"

"کلن بھائی۔ آپ یہ مونچھیں میرے ہاتھ بیچ دیں۔" میں نے کہا۔

"کیا... !" کلن بھائی حیران رہ گئے تھے۔ "کیا بکواس کر رہے ہو۔ مونچھیں بیچ دوں؟"

"جی ہاں کلن بھائی۔ یہ مونچھیں مجھے دے دیں۔ میں اس کے بدلے آپ کو تیس ہزار روپے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور پورا محلہ اس بات کا گواہ ہے کہ میں پیسوں کے معاملے میں ہیرا پھیری نہیں کرتا۔ جو کہہ دیا کر دیتا ہوں۔"

"یہ بات تو ہے۔" محلے والوں نے بھی میری تائید کی۔ "اس معاملے میں تو یہ کھرا آدمی ہے۔"

"ابے تو مونچھیں کیسے بیچ دوں اور میری مونچھیں لے کر کیا کرے گا؟ میرے چہرے سے نکلنے کے بعد یہ تیرے کس کام آئیں گی؟"

"یہ میرا دردِ سر ہے کلن بھائی۔" میں نے کہا۔ "تم تو سودا طے کر لو اور ہاں ایک بات اور کوئی ضروری نہیں ہے کہ میں یہ مونچھیں لے ہی لوں۔ سودا ہونے کے بعد بھی یہ تمہارے ہی چہرے پر رہیں گی۔"

"تو پھر کس بات کے پیسے دو گے؟"

"اس بات کے کہ جب میں چاہوں گا یا مجھے ضرورت ہوگی تم بغیر کسی پس و پیش کے اپنی یہ مونچھیں میرے حوالے کر دو گے۔"

"بھائیو اس کا شاید دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

"اب یہ سب رہنے دو کلن بھائی۔" میں نے کہا۔ "تم تو معاملے کی بات کرو۔ ایڈوانس کے پانچ ہزار میں ابھی دینے کو تیار ہوں۔"

کلن بھائی سوچ میں پڑ گئے تھے ظاہر ہے کہ ایسا پہلی بار ہوا ہوگا کہ کوئی ان کی مونچھوں کا سودا کر رہا ہوگا۔ محلے والے بھی اس انوکھے سودے میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ ان سبھوں کی یہ خواہش تھی کہ میرے اور کلن بھائی کے درمیان یہ سودا ہو جائے۔

"چلو ٹھیک ہے۔" کلن بھائی نے محلے والوں کے اُکسانے پر ہاں کر دی۔ "میں اپنی مونچھیں تمہارے ہاتھ بیچ رہا ہوں۔"

"تو پھر کاغذ پر لکھوا لو اور گواہوں کے دستخط بھی ہو جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔"

اُسی وقت ایک ایگری منٹ تیار کر لیا گیا جس کے مطابق پارٹی نمبر ایک یعنی کلن بھائی کی مونچھیں پارٹی نمبر دو یعنی بدرالدین نے دس ہزار روپوں کے عوض خرید لی تھیں اور ایڈوانس کے طور پر پانچ ہزار روپے دے دیے تھے اور شرط کے مطابق جب بھی پارٹی نمبر دو یعنی بدرالدین کو مونچھوں کی ضرورت ہو سکتی تھی وہ پارٹی نمبر ایک سے مونچھیں لے سکتا تھا چاہے وہ مونچھیں آدھی ہوں یا پوری ہوں۔ پارٹی نمبر ایک یعنی کلن بھائی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔

دوسری شق یہ تھی کہ اگر پارٹی نمبر ایک یعنی کلن بھائی نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مونچھیں دینے سے انکار کر دیا تو پھر پارٹی نمبر دو یعنی بدرالدین کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ وہ کلن بھائی سے پچاس ہزار روپے وصول کر لے۔"

معاہدے پر گواہوں کے دستخط بھی ہو گئے اور میں نے ایڈوانس کے طور پر پانچ ہزار روپے کلن بھائی کو دے دیے۔ کلن بھائی اس وقت تک اُلجھنوں میں تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

ویسے میں نے دیکھا کہ ایک دو بار عادت کے مطابق مونچھوں پر تاؤ دینے کے لیے ان کا ہاتھ ہونٹوں تک گیا تھا پھر جلدی سے واپس آ گیا شاید انہیں یہ احساس ہو رہا ہوگا کہ اب یہ مونچھیں کسی اور کی ہو چکی ہیں۔

میرے دوستوں کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ حیران رہ گئے تھے۔ "ابے یہ کیسی شرط لگالی۔"

"یہی تو اصل کاریگری ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تم لوگ تماشا دیکھتے رہنا۔"

"یہ تو نقصان کا سودا ہے۔ کلن بھائی کی مونچھیں لے کر کیا کرے گا۔ وہ بھی تیس ہزار روپے میں۔"

"تم لوگ دیکھ لینا میں نے تیس کی جگہ ساٹھ وصول نہیں کیے تو میرا بھی نام نہیں۔"

اب میں اس انتظار میں تھا کہ ایسا کوئی موقع مل جائے کہ میں کلن بھائی سے اپنے پیسے مع منافع کے وصول کر سکوں اور ایک دن قدرت نے یہ موقع فراہم کر ہی دیا۔

کلن بھائی تنہا زندگی گزارا کرتے تھے یعنی ان کی بیوی وغیرہ نہیں تھی۔ بہت پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اس کے بعد سے اب تک صرف مونچھوں پر گزارا تھا۔

کلن بھائی ایک ہوٹل میں ایک عورت کے ساتھ دکھائی دیے تھے۔

اس زمانے میں بہت سے ہوٹلز میں کیبن بنے ہوتے تھے۔ میں چائے پینے کے ارادے سے ہوٹل میں داخل ہوا تو اتفاق سے کیبن کا پردہ اپنی جگہ سے ہل گیا تھا اور مجھے کلن بھائی اس عورت کے ساتھ دکھائی دے گئے۔

وہ ایک جوان اور قبول صورت عورت تھی۔ کلن بھائی دل و جان سے اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکے تھے۔ میں ان کے برابر والے کیبن میں جا کر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کی شخصیت اتنی شاندار ہوگی۔" وہ عورت کہہ رہی تھی۔

"کیا خاص بات لگی میری شخصیت میں۔"

"آپ کی مونچھیں۔" اس عورت نے کہا۔

"تسنیم میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ تم اتنی اچھی ہوگی"، کلن بھائی کی آواز آئی "ورنہ عام طور پر قلمی دوستی کے نام پر ایک دوسرے کو دھوکے ہی دیے جاتے ہیں۔"

پھر مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کے درمیان قلمی دوستی کا سلسلہ تھا اس زمانے میں اس قسم کی دوستیاں بہت عام تھیں اور شاید یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔

لیکن کلن بھائی کی قسمت کہ میں نے پہلی ہی ملاقات میں انہیں دیکھ لیا تھا۔

میں ان کی باتیں سنتا رہا۔ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کلن بھائی بہت خوش ہیں کیونکہ انہیں کسی کی محبت حاصل ہو گئی تھی۔ بہر حال مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ ان دونوں نے اگلی ملاقات کہاں رکھی ہے۔

اب یہ ایسا موقع تھا جس سے مجھے فائدہ اُٹھانا تھا۔

میں نے ایک شام کلن بھائی سے کہا۔ "کلن بھائی میں آپ کو ایک مشورہ دوں۔"

"ضرور۔"

اس وقت بیٹھک حسب معمول آباد تھی۔ کلن بھائی بہت ترنگ میں تھے اور سب کو دو دو بار چائے پلوا چکے تھے۔

"میرا مشورہ یہ ہے کلن بھائی کہ اب آپ کی طرف محلے والوں کی دعوت ہو جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ شادی کر لیں۔ خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے، کیا نہیں ہے آپ کے پاس پھر یہ اکیلی زندگی آپ کو اچھی نہیں لگتی۔ کیوں بھائیو۔" میں نے دوسروں کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں بدرو ٹھیک کہہ رہے ہیں، کلن بھائی آپ بھی کر لیں محلے میں رونق ہو جائے گی۔"

"خود سوچیں کلن بھائی کوئی مرنے والے کے ساتھ تو نہیں مر جاتا نا۔ آپ کی بیوی کے انتقال کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ تو آپ کی شرافت ہے کہ آپ ابھی تک ان کی یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں لیکن کب تک؟"

کلن بھائی کی مونچھیں تھرتھرانے لگی تھیں۔ وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ انہیں میرا مشورہ یقیناً بہت پسند آیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" کلن بھائی نے کہا۔ "لیکن میرے لیے رشتہ کہاں سے آئے گا؟"

"ارے کلن بھائی۔ آپ خود بھی اپنے لیے کوئی تلاش کر سکتے ہیں۔ بس کسی شریف گھرانے کی شریف خاتون کی طرف اشارہ کر دیں۔ ہم خود آپ کا رشتہ لے کر پہنچ جائیں گے کیونکہ آپ تو اکیلے آدمی ہیں آپ کی طرف سے بات کون کرے گا؟"

"ہاں یہ تو ہے۔" کلن بھائی جلدی سے بولے۔ "یہ تم لوگوں کو ہی کرنا پڑے گا۔ میرا تم لوگوں کے علاوہ اور کون ہے؟"

میں نے جال پھینک دیا تھا میں جانتا تھا کہ کلن بھائی اس عورت کی بات کریں گے جو ان کی مونچھوں پر عاشق ہو گئی تھی۔ کئی دنوں کے بعد کلن بھائی نے مجھے بتایا۔ "میاں میں نے لڑکی تلاش کر لی ہے بہت شریف خاندان کی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے حیرت ظاہر کی جبکہ میں جانتا تھا کہ یہ لڑکی وہی ہو سکتی ہے جس کو میں کلن بھائی کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ "مبارک ہو کلن بھائی اب آپ یہ بتا دیں کہ آپ کا رشتہ کب لے جانا ہے؟"

"پہلے اس کے گھر والوں سے تو بات کر لوں۔ وہ لوگ راضی تو ہوں۔"

پورے محلے میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ کلن بھائی شادی کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور انہوں نے ایک رشتہ بھی دیکھ لیا ہے اور محلے والے بہت جلد شادی کی تاریخ طے کرنے جا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب محلے والے ایک ہی خاندان جیسے ہوا کرتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں پوری طرح شریک۔ آج کی سی صورتِ حال نہیں تھی کہ برابر والے کو برابر کی خبر نہ ہو۔

بہر حال وہ وقت بھی آ گیا جب ہم چار پانچ آدمی کلن بھائی کا رشتہ لے کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ ایک چھوٹا سا گھر لیکن گھر والوں سے مل کر احساس ہوا کہ وہ واقعی مہذب اور شریف لوگ تھے۔

اس دن پتا چلا کہ اس لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ شادی کے دو سال بعد ہی شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد اس نے بہت دکھ بھرے دن گزارے تھے۔ کسی اسکول میں ٹیچر تھی۔

کلن بھائی سے قلمی دوستی ہوئی تھی۔ کلن بھائی اس کو پسند آ گئے تھے جبکہ اس کے گھر والوں نے بھی کلن بھائی کو پسند کر لیا تھا۔

بہر حال شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔

پورا محلہ اس شادی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ کلن بھائی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور جس وقت کلن بھائی سج دھج کر تیار ہوئے اس وقت میں اپنے منصوبے کے مطابق ان کے پاس پہنچ گیا۔ "بس کلن بھائی اب معاہدے پر عمل ہو جانا چاہیے۔"

"کیسا معاہدہ!" کلن بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی مونچھوں والا۔" میں نے کہا۔

"میاں یہ کون سا موقع ہے۔" کلن بھائی نے کہا۔ "دیکھتے نہیں میری برات کی روانگی ہے۔"

"یہ میں نہیں جانتا معاہدے میں صاف صاف لکھا ہے کہ میں جب چاہوں اور جس طرح چاہوں آپ کی مونچھیں لے سکتا ہوں۔ میں نے ایڈوانس کے طور پر آپ کو پانچ ہزار بھی دے رکھے تھے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی شرافت نہیں ہے کہ تم اس وقت میری مونچھیں مانگنے لگو۔"

محلے والے بہت دلچسپی سے یہ بحث سن رہے تھے۔ ان سبھوں کو اس معاہدے کا علم تھا۔ میں نے اپنی جیب سے وہ معاہدہ نکال کر لوگوں کو دکھایا۔ "بھائیو یہ ہے وہ معاہدہ جس پر آپ لوگوں کے سامنے کلن بھائی نے دستخط کیے ہیں۔ میں انہیں بتایا پچیس ہزار ابھی دینے کو تیار ہوں لیکن مجھے ان کی مونچھیں چاہئیں۔"

محلے والوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" میں نے کہا۔

''کلن بھائی سے مونچھیں صول کرنے کا یہی موقع ہے۔''
''اچھا بھائی تو ایسا کر مجھ سے دس ہزار لے لے اور میری جان چھوڑ۔''
''نہیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اسی وقت آپ کی مونچھیں چاہئیں۔''
ایک عجیب صورتِ حال ہو گئی تھی۔ کلن بھائی کی مونچھیں غصے سے پھڑ کنے لگی تھیں۔ میں نے ان کو بہت بُرے موقع پر گھیر لیا تھا۔
''دیکھو تم جو کچھ کر رہے ہو یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔''
''یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔
''پانچ ہزار کی رقم میں نے یونہی نہیں دی تھی۔''
''چلو ٹھیک ہے۔'' کلن بھائی نے اپنی گردن جھکا لی۔ کلن نے کبھی اپنے وعدے سے انحراف نہیں کیا ہے۔ آج بھی میں اسی وعدے کے لیے اپنی مونچھوں کی قربانی دے رہا ہوں۔ بلاؤ کسی حجام کو۔''
محلے کے ایک حجام کو بلایا گیا۔ اس وقت لوگ مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھائی آج اس بے چارے کی شادی ہے جانے دو یہ موقع پھر آ جائے گا۔ وہ کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے۔''
''دیکھیں آپ لوگ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ معاملہ میرا اور کلن بھائی کا ہے۔ معاہدہ کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔''
حجام جب استرا لے کر کلن بھائی کی طرف بڑھا تو میں نے اسے روک دیا۔ ''اب کیا ہے؟'' کلن بھائی جھلا کر بولے۔
''پوری نہیں صرف آدھی مونچھ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیا!'' سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔
''جی ہاں۔'' میں نے معاہدہ پھر سامنے لہرا دیا۔ ''یہ دیکھیں اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ میں جب چاہوں اور جس طرح چاہوں کلن بھائی سے مونچھیں وصول کر سکتا ہوں، لہٰذا اس وقت مجھے آدھی مونچھوں کی ضرورت ہے۔ اسی لیے آدھی مونچھیں لوں گا۔''
''ارے بھائی۔ اس طرح تو یہ بے چارے کارٹون بن کر رہ جائیں گے۔''
''اور آج شادی کا دن ہے۔ دولہا بن کر جا رہے ہیں ایسا ظلم تو نہ کرو۔''
''نہیں جناب۔ یہ کوئی ظلم نہیں۔ یہ تو ایک معاہدہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ایک کھیل ہے اور کھیل میں انسان کو پوری طرح ایماندار ہونا چاہیے۔ کیوں کلن بھائی۔''
''ٹھیک ہے۔'' کلن بھائی نے اپنی گردن اکڑا لی ''تمہاری یہی ضد ہے تو یہی سہی۔ لاؤ بقایا پچیس ہزار میں ابھی اپنی آدھی مونچھیں کٹوا رہا ہوں۔''
اب میری آزمائش شروع ہو گئی تھی۔ پچیس ہزار روپے جا رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ کلن بھائی عین وقت پر انکار کر دیں گے۔ ایسا کون دلہا ہو گا جو جوکر بن کر شادی کے لیے جائے گا۔ اسی اطمینان کے ساتھ میں نے پچیس ہزار روپے کلن بھائی کے حوالے کر دیے۔
محلے والوں کی دلچسپی دگنی ہو گئی تھی۔ ایسا تماشا پہلے کہاں دیکھنے کو ملا ہو گا۔
اور کلن بھائی نے واقعی اپنی آدھی مونچھیں کٹوا لی تھیں ان کی شاندار مونچھیں آدھی ہو گئی تھیں اور وہ بہت مضحکہ خیز دکھائی دے رہے تھے۔
''تمہاری تسلی ہو گئی۔'' کلن بھائی نے پوچھا۔
''جی کلن بھائی آپ معاہدے کے پکے انسان ہیں۔'' میں نے کہا۔
کلن بھائی نے ایک آدمی کو اشارہ کیا جس کو میں نہیں جانتا تھا وہ محلے کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کلن بھائی اسے لے کر اپنے گھر میں چلے گئے۔ پندرہ منٹ کے بعد ان کی واپسی ہوئی تھی اور ہم سب حیرت سے اچھل پڑے تھے کلن بھائی کی مونچھیں ان کے چہرے پر موجود تھیں۔ بالکل وہی شاندار مونچھیں۔ جو ان کی شخصیت کا حصہ تھیں۔
''یہ۔ یہ مونچھیں۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
''کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ کلن بھائی مسکرا دیے۔ ''میاں تم نے جس وقت یہ تماشا شروع کیا تھا میں سمجھ گیا تھا کہ تم نے بھی وہ مشہور کہانی پڑھی ہوئی ہے جس میں ایسا ہی واقعہ تھا لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ کسی زمانے میں میرا تعلق تھیٹر سے رہ چکا ہے اور یہ رشید چاچا ہیں میک اپ کے ماہر۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تم عین وقت پر ایسی حرکت کرو گے اسی لیے میں نے ان کو بلا لیا تھا اور انہوں نے میرے چہرے پر آدھی مونچھ نقلی لگا دی ہے اب اس معاہدے میں یہ تو کہیں نہیں تھا کہ میں نقلی مونچھ نہیں لگا سکتا کیوں ہے؟''
محلے والے تالیاں بجانے لگے۔ میرا یہ حال تھا کہ میرے تیس ہزار روپے چلے گئے تھے، اس دور میں یہ ایک بہت ہی بڑی رقم تھی۔ بس وہ دن ہے اور آج کا دن میں نے آج تک کسی سے شرط نہیں لگائی۔

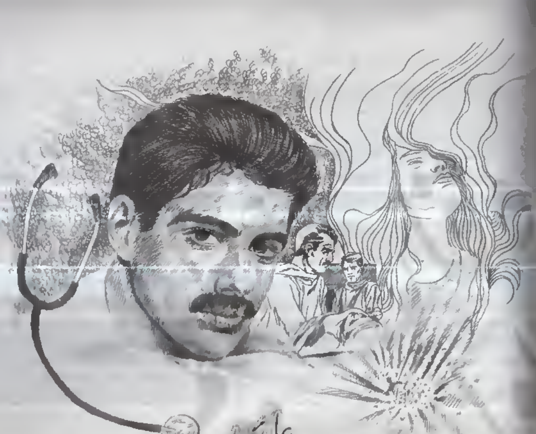

دعائے بد

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!
میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں اور ہمارا پیشہ سب سے مقدس پیشہ ہے۔ اس پیشے میں رہ کر میں نے ایک دل کو دکھایا تھا جس کا اعتراف میں آج کر رہا ہوں۔ امید ہے اسے شائع ضرور کریں گے۔
ڈاکٹر فرحان
(پشاور)

جب مجھے ایم بی بی ایس کی ڈگری ملی تھی تو ہر ڈاکٹر کی طرح میں نے بھی حلف اُٹھایا تھا کہ میں انسانیت کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دوں گا۔ انسانیت کی خدمت کو اپنا شعار بناؤں گا، وغیرہ وغیرہ۔
اس وقت دل میں جذبہ بھی یہی تھا لیکن ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد جب میں نے اپنی وہ ایم بی بی ایس کی ڈگری ہاتھ میں لے کر سال بھر تک بڑے بڑے سرکاری اسپتالوں کے دھکے کھائے تو مجھے اپنی ڈگری بھی بے وقعت لگنے لگی اور خدمت انسانیت کا جذبہ بھی نہ جانے کب دم توڑ گیا۔
میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھ سے چھوٹی تین بہنیں تھیں۔ وہ سب زیرِ تعلیم تھیں اور پورے گھر کو مجھ سے

بہت امیدیں وابستہ تھیں۔

ملازمت کے لیے یا تو کئی لاکھ روپے کی ضرورت پڑتی تھی یا پھر کسی "تگڑی" سی سفارش کی۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں، جب ایک ایل ڈی سی (لوئر ڈویژن کلرک) کی اسامی کے لیے وزیروں اور سیکریٹریز کی سفارشیں آتی ہوں تو ڈاکٹر کی جاب کے لیے کیسی سفارش کی ضرورت ہوگی۔

میرے ایک دوست دانیال نے امریکا کی ایک میڈیکل یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ پھر وہیں کے ایک اسپتال میں اسے جاب بھی مل گئی۔ وہ ان دنوں چھٹی پر پاکستان آیا ہوا تھا۔

دانیال پرائمری سے لے کر اے لیولز تک میرے ساتھ ہی پڑھا تھا۔ ہم دونوں میں بہت اچھی دوستی تھی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ گھریلو تعلقات تھے۔ وہ ایک معروف بزنس مین کا بیٹا تھا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں ابھی تک بے روزگار ہوں تو وہ حیران ہو کر بولا "فرحان! تو اتنا گیا گزرا اسٹوڈنٹ تو نہیں تھا۔ پھر ابھی تک بے روزگار کیوں ہے؟"

"میرے پاس نہ کوئی سفارش ہے نہ اندرون سندھ کے کسی پس ماندہ علاقے کا ڈومیسائل۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ارے یار، لعنت بھیج ملازمت پر، تُو اپنا کلینک کیوں شروع نہیں کرتا؟"

"اپنا بزنس!" میں نے مزید تلخ لہجے میں کہا "اپنا بزنس شروع کرنے کا سرمایہ ہوتا تو میں اس سے آدھے سے بھی کم خرچ کر کے سرکاری اسپتال کی جاب حاصل کر لیتا۔" میں نے کہا۔

"تُو نے کب کہا تھا، تجھے سفارش چاہیے۔" دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بس تو پھر سمجھ لے، تیرا کام بن گیا۔"

"او بھائی!" میں نے تلخی سے کہا "ہواؤں میں باتیں مت کر۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ چٹکی بجاتے میں یہ کام کرانے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔"

"کئی لوگ میں اور مجھ میں فرق ہے فرحان۔" دانیال مُسکرا کر بولا "تو اپنے ڈاکومنٹس مجھے دے۔ تین دن کے اندر اندر اپائنٹمنٹ لیٹر تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ بھی شہر کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال کا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "یار فرحان! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی، یہ تمام گریجویٹ سرکاری ملازمت کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟"

"تو نے امریکا سے تعلیم ضرور حاصل کی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تیری پوری زندگی پاکستان میں گزری ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا تو نہیں جانتا کہ کسی بھی ڈاکٹر کی قدر و قیمت اس وقت بنتی ہے جب وہ کسی بڑے سرکاری اسپتال کا ملازم ہو، چاہے وہ مریضوں کو مکسچر کے نام پر پانی میں رنگ گھول کر دیتا ہو اور گلوکوز کے انجکشن لگاتا ہو۔ پھر ان اسپتالوں میں نہ صرف سیکھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ اسی بنیاد پر انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ پرائیویٹ اسپتال والوں کو کون پوچھتا ہے۔"

"او بھائی، تو نے تو باقاعدہ تقریر شروع کر دی۔" دانیال نے کہا "پرسوں اپائنٹمنٹ لیٹر تیرے ہاتھ میں ہوگا۔" پھر وہ ہنس کر بولا "افشاں! مجھے ذرا اچھی سی کافی پلاؤ۔ تمہارے بھائی نے تو میرا دماغ خراب کر دیا۔"

افشاں مجھ سے چھوٹی اور انتہائی شوخ تھی، وہ مسکرا کر بولی "دانیال بھائی، کسی چیز کے خراب ہونے کے لیے پہلے اس کا ہونا ضروری ہے۔"

"یعنی...... اب...... تم بھی ...... خیر کافی تو میں پیوں گا۔" دانیال نے ہنس کر کہا۔

پھر وہ رات کا کھانا کھائے بغیر نہیں ٹلا۔ اسے امی کے ہاتھ کے شامی کباب بہت پسند تھے۔ اس نے نہ صرف کباب کھائے بلکہ اپنے ساتھ بھی لے گیا۔

میں ایک دفعہ پھر ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ مجھے دانیال پر اعتبار تو تھا لیکن وہ بے چارہ بھی کیا کر سکتا تھا؟ زیادہ سے زیادہ اپنے ڈیڈی سے سفارش کرا سکتا تھا یا پھر دوسری صورت یہ تھی کہ وہ رشوت میں مانگی جانے والی رقم مجھے اُدھار دے دے۔ یہ بات مجھے گوارہ نہیں تھی۔

تین دن بعد دانیال ہمارے گھر آیا تو بہت سنجیدہ تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ اسے بھی ناکامی ہوئی ہے۔ اسے شاید اس بات کی شرمندگی تھی کہ اس نے امی اور میری بہنوں کے سامنے بیٹھ کر بڑے بڑے دعوے کیے تھے۔

"یار فرحان!" دانیال نے آہستہ سے کہا "یار، میں نے کوشش تو بہت کی لیکن......"

"ارے یار!" میں مسکرا کر بولا "تُو تو میرلیس ہی ہو گیا۔"

"اچھا چل، آج ہم آؤٹنگ پر چلتے ہیں، کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔"

"نہیں یار!" میں نے کہا "اس وقت میرا بالکل بھی موڈ

نہیں ہے۔"

"اوہو، اب ہمارے ساتھ بھی موڈ؟" دانیال ہنس کر "سیدھی طرح چل ورنہ میں زبردستی لے جاؤں گا اور اس سے تُو اچھی طرح واقف ہے۔"

"یار، یہ اچھی زبردستی ہے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

میں لباس تبدیل کر کے آیا تو دانیال نے پھر ایک مرتبہ کہا "یار فرحان، میں نے کہا نا کہ میں نے بہت کوشش کی لیکن بُری کوشش سے کیا ہوتا ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ہو ہی گیا ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"کیا کسی مضافاتی ڈسپنسری میں جاب ملی ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال تو یہی ہے۔" دانیال نے کہا اور اپنی جیب سے خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکال کر مجھے دے دیا۔

میں نے بے دلی سے لفافہ کھول کر اس میں رکھا ہوا خط نکال لیا۔ پھر جیسے جیسے میں خط پڑھتا گیا، میرا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ خط پڑھ کر میں نے دانیال کو مارنے کے لیے تکیہ اُٹھا لیا لیکن وہ پہلے ہی میری پہنچ سے دور امی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

میں اس کی طرف مارنے کو بڑھا تو امی نے کہا "یہ کیا بے ہودگی ہے فرحان! اس نے تو کوشش کی تھی، اس سے زیادہ اور وہ کیا کر سکتا ہے؟ تجھے اعتراض ہے تو مت کر یہ ملازمت۔"

امی کی ہر بات پر دانیال سر ہلاتا رہا۔

"ارے امی، اس خبیث نے فضول میں مجھے اتنی دیر تک پریشان کیا۔ کراچی کے ایک بڑے سرکاری اسپتال میں میرا اپائنٹمنٹ ہو گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امی نے تو اسی وقت مصلیٰ سنبھال لیا۔ وہ شکرانے کے نفل پڑھنا چاہتی تھیں۔

"او بھائی، یہ سب ہوا کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"تیرا حافظہ اب واقعی کمزور ہو گیا ہے لیکن پریشان مت ہو، یہ عمر کا تقاضا ہے۔" فرحان مسکرایا "ابے گھامڑ! کیا تو بھول گیا کہ میرے بڑے ماموں منسٹری آف ہیلتھ میں چیف سیکریٹری ہیں۔"

"ہاں یار، مجھے ضیا ماموں کا تو خیال ہی نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

"مافوق الفطرت" سے مراد ایسی قوت ہے جو فطرت (Nature) سے ماورا ہو، طبعی قوانین سے بالاتر ہو یا وہ چیزیں جو انسان کی عقل و ادراک سے بالاتر ہوں مافوق الفطرت کہلاتی ہیں، انگریزی میں انہیں سپر نیچرل (Supernatural) کہتے ہیں۔

لغت میں شیطان کے معنی ہیں سرکش، شریر۔ قرآن حکیم میں شیطان کے لیے "ابلیس" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ شیطان شطن سے بنا ہے، جس کے معنی دور ہونے کے ہیں اس لیے اسے شیطان کہتے ہیں یہ لفظ شیطان شط سے بنا ہے جس کے معنی جلنے کے ہیں چونکہ وہ آگ سے بنا ہے اور آگ میں ہی داخل ہوگا اس لیے اسے شیطان کہا گیا۔ آگ چونکہ اس کا مادۂ تخلیق ہے اس لیے اس میں قوتِ غضبیہ اور تخریب مذموم زیادہ ہے۔ یہی اوصاف حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے روکنے والے تھے۔ سرکش، جس میں انسان اور حیوان بھی شامل ہیں کو شیطان کہتے ہیں۔ شریر جن کو شیطان کہتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں ہے (اور ایسے ہی ہم نے شریر "جنوں" اور "انسانوں" کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "حسد شیطان ہے اور غصہ شیطان ہے۔"

انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

"بس میں کل ان کے آفس گیا اور ان سے کہا کہ ماموں جان، اس درخواست پر سائن کر دیں۔"

"یہ کیا ہے بھئی؟" ماموں جان نے پوچھا۔

"یہ فرحان کی ملازمت کی درخواست ہے۔" میں نے کہا "آپ کے ہوتے ہوئے وہ گزشتہ ایک سال سے بے روزگار ہے۔"

ماموں جان نے اسی وقت اپنے پی اے سے اپائنٹمنٹ لیٹر ٹائپ کرنے کو کہا پھر جب تک میں نے چائے پی اپائنٹمنٹ لیٹر کا پرنٹ آ گیا۔" پھر وہ افشاں سے بولا "اب مجھے اچھی سی کافی پلا دو۔"

"ارے، میں تو آپ کو کھانا کھلاؤں گی دانیال بھائی!" افشاں نے ہنس کر کہا۔

"کھانے میں تو ابھی دیر ہوگی۔" دانیال ہنس کر بو "وہ تو خیر میں کھاؤں گا ہی، ابھی صرف کافی۔" پھر وہ مجھ مخاطب ہوا "اور تُو جا کر مٹھائی ہی لے آ۔"

یوں سال بھر تک ٹھوکریں کھانے کے بعد مجھے شہر

اس بڑے سرکاری اسپتال میں ملازمت مل گئی۔

وہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ ہمارے وہ بڑے بڑے پروفیسرز جو ہمیں رات دن انسانیت کا درس دیتے تھے، خود وہ باتیں بھول گئے تھے۔ وہ لوگ او پی ڈی میں بیٹھتے تو تھے لیکن او پی ڈی کے زیادہ تر مریض ان کے ذاتی اسپتالوں اور کلینک پر منتقل ہو جاتے تھے۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، اگر میں اس کی تفصیل بتا دوں تو آپ کا اعتماد اسپتال اور ڈاکٹروں دونوں سے ہمیشہ کے لیے اُٹھ جائے گا۔

چند ہی مہینوں بعد میں بھی سب کچھ بھول گیا۔ وہاں ہر شخص کا مقصد صرف اور صرف پیسا کمانا تھا۔ لوگ اس کا جواز یہ دیتے تھے کہ ہمارے والدین نے پانچ سال تک ہم پر جو رقم خرچ کی ہے، اسے بھی تو واپس لینا ہے۔ میں بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔

او پی ڈی کے موقعے پر تو ہر ڈاکٹر گویا فرعون ہوتا تھا۔ ہم میں سے بہت کم ایسے تھے جن کو واقعی اپنے پیشہ ورانہ فرائض کا احساس تھا۔ ڈاکٹر تو رہے ایک طرف، وہاں تو وارڈ بوائز، نرسیں اور دوسرا اسٹاف بھی مریضوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔

اس دن میں حسبِ معمول او پی ڈی میں مصروف تھا۔ میرے کمرے کے باہر مریضوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ میں جلدی جلدی سب کو بھگتا رہا تھا۔ مریضوں کو تو ہر حال میں دیکھنا ہی پڑتا تھا۔

اچانک ایک بوڑھا مریض میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ نہیں ہو گی لیکن غربت، نامساعد حالات اور بیماری نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

''کیا تکلیف ہے بابا جی؟'' میں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں جو کچھ کھاتا ہوں، ہضم نہیں ہوتا۔ پیٹ میں بھی ہر وقت تکلیف رہتی ہے اور اب تو بخار بھی رہنے لگا ہے۔''

میں نے اس کا بلڈ پریشر چیک کیا، اسٹیتھسکوپ سے اس کا سینہ دیکھا، آنکھوں کی پتلیوں کا جائزہ لیا۔ اسے معدے کا السر تھا اور ذرا سی توجہ سے ٹھیک ہو سکتا تھا۔ مجھے بھلا توجہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اگر توجہ دیتا بھی تو اسے دینے کے لیے دوائیں کہاں سے لاتا؟ اسپتال کی ساری دوائیں تو میڈیکل اسٹور پر بھیج دی جاتی تھیں۔

''ڈاکٹر صاحب!'' اس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا ''ایک ہفتے سے میں علاج کرا رہا ہوں لیکن کوئی فائدہ ہی نہیں ہوتا۔ میں اکیلا کمانے والا ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ڈاکٹر صاحب! اگر میں نے اب اور دو چار دن کام نہ کیا تو میرے گھر میں فاقے شروع ہو جائیں گے۔''

''میں دوا لکھ کر دے رہا ہوں۔'' میں نے کہا ''یہ دوا باہر سے لے لینا۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' پھر میں نے اسے السر کی ایک مہنگی دوا لکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے اسپتال کا رنگین پانی اور کیلشیم کی بے ضرر گولیاں بھی لکھ دیں۔

وہ مجھے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

میں جانتا تھا کہ اسپتال کی دوا سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ باہر کی دوا سے البتہ اسے افاقہ ہو سکتا تھا۔ باہر کے جتنے نسخے ہوتے تھے، ان میں میرا کمیشن بھی ہوتا تھا۔

وہ مریض دو دن بعد پھر آیا۔ اس کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس نے میڈیکل اسٹور کی مہنگی دوائیں نہیں خریدی ہیں۔ اگر مزید دو تین ہفتے اس حال میں گزرے تو وہ بچ نہیں سکے گا۔

پھر وہی ہوا، دو ہفتے بعد وہ مریض مجھے نظر نہیں آیا۔ بے چارہ کب تک اسپتال کے رنگین پانی اور کیلشیم کی بے فیض گولیوں پر زندہ رہتا؟

یہ واقعہ تو میں نے اس لیے تحریر کر دیا کہ آپ کو میری بے حسی کا اندازہ ہو جائے۔ ان دنوں تو انسانی جان کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

ہاں، ایمرجنسی میں واقعی کام کرنا پڑتا تھا۔ وہاں ڈاکٹروں کو شدید محنت کرنا پڑتی تھی۔ ہر وقت ڈیوٹی پر موجود اور مستعد رہنا ہوتا تھا اس لیے ہر ڈاکٹر ایمرجنسی کی ڈیوٹی سے گھبراتا تھا۔

میرے کچھ ساتھی ڈاکٹرز نائٹ ڈیوٹی کے موقعے پر کسی ایک خالی کمرے میں بیٹھ کر خوب ہلا گلا کرتے تھے۔ ٹی وی پر فلمیں دیکھتے تھے، ڈیک پر گانے سنتے تھے یا پھر فلیش کھیل کر وقت گزارتے تھے۔ اسپتال کی نرسیں بھی ہم سے پیچھے نہیں تھیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ خوب انجوائے کرتی تھیں۔

گنتی کے چند ڈاکٹرز اور نرسیں، جن میں ایمانداری اور فرض شناسی کا ہیضہ لاحق تھا۔ وہ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوتے تھے بلکہ وارڈوں میں رہتے تھے۔ اس دن اس طرح کی ایک ''نائٹ'' تھی۔ ہم لوگ بہت ترنگ میں تھے اور نرسوں کی لائی ہوئی مختلف ڈشوں پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ایک گوشے میں بیٹھے فلیش کھیل رہے تھے، کچھ ڈاکٹرز میگزین پڑھ رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو خوبصورت

ں کو پڑھ رہے تھے۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان داخل ہوا۔

''جی فرمائیے؟'' ڈاکٹر ذیشان نے کچھ ناگواری سے کہا ''کیا پرابلم ہے؟''

''میرا بھائی یہاں ایڈمٹ ہے۔ وہ شدید بیمار ہے اور آپ لوگ مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے یہاں پکنک منا رہے ہیں؟'' نوجوان نے سخت لہجے میں کہا۔

''تمہارا بھائی بیمار ہے تو ہم کیا کریں؟'' ڈاکٹر جاوید نے ناگواری سے کہا ''اس کا علاج ہو رہا ہے لیکن تم یہاں کیسے آ گئے؟''

''مجھے یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے؟'' وہ بھنا کر بولا ''میں ملک کے ایک بڑے اخبار کا کرائم رپورٹر ہوں اور کل یہ خبر ملک کے تمام اخبارات میں ہو گی کہ اسپتال کے ڈاکٹرز اور نرسیں ڈیوٹی کے اوقات میں پکنک مناتے ہیں۔ ان کی اس مجرمانہ غفلت کا خمیازہ بے چارے مریض بھگتتے ہیں۔''

''او بھائی!'' ڈاکٹر فیضان نے نخوت سے کہا ''تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرو، ہمیں پھانسی پر چڑھوا دو لیکن فوری طور پر یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ......''

فیضان ہیلتھ منسٹر کا بھانجا تھا اور اسے بہت زعم تھا کہ اسپتال کا ایم ایس بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ تو معمولی سا رپورٹر تھا۔

رپورٹر خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے کہا ''اب یہاں سے ساری چیزیں سمیٹو، اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹاؤ ورنہ اس مرتبہ وہ کیمرے کے ساتھ آئے گا۔ فیضان کو اندازہ نہیں ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا آج کل کیسا شترِ بے مہار ہے۔''

فیضان تو اس رپورٹر کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا لیکن دوسرے ڈاکٹروں اور نرسوں نے عجلت میں اس کمرے کی صفائی کر دی اور ہم لوگ اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے۔

وہ رپورٹر خود تو نہیں آیا لیکن دوسرے دن کے ہر اخبار میں وہی خبر چھپی تھی کہ اسپتال کے ڈاکٹرز ڈیوٹی کے اوقات میں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ وہ مجرمانہ غفلت کا شکار ہو رہے ہیں۔ دو تین اخبارات نے تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ڈاکٹروں اور نرسوں کے تعلقات پر بھی کیچڑ اُچھالی تھی کہ ڈاکٹروں نے اسپتال کے اس کمرے کو عیاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔

انگریز ہندوستان کے ہال و ہ، لوچ کر اس کی اندرونی سیاست کو مفلوج کر دینے کے لیے تمام آئینی اور غیر آئینی ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ مسلم لیگ جس نے 1906ء میں جنم لیا تھا نوابوں، جاگیرداروں اور حاشیہ برداروں کی مفلوج سی جماعت بنتی جا رہی تھی۔ خلافت کا الگ دم گھٹ گیا تھا۔ 1934ء میں مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی صدارت قبول کر کے اس جماعت کو بے موت مرنے سے بچا لیا۔ آپ نے کئی مسائل پر مجھ سے مشورے لیے، کئی باتوں میں ہمارا اختلاف ہوا اور اس طرح ہم نے مسلمانوں کے لیے ایک پلیٹ فارم تیار کر لیا۔

الیکشن کا وقت آیا تو محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کیے۔ رفیع احمد قدوائی نے اپنے دو امیدوار مسلم لیگ کے مقابلے میں اور ایک نواب چھتاری کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ راہ پر نہ آیا۔ خلافت کے ہیرو مولانا شوکت علی زندہ تھے، آپ نے صوبے بھر میں سپاہیوں کی طرح کام کیا۔ میں نے بیس ہزار روپے کے بینک پرونوٹ کا بندوبست کر لیا اور شبانہ روز بھاگ دوڑ سے چھتیس میں سے انتیس سیٹوں پر قبضہ کر لیا۔

یو پی کے گورنر سر ہیگ نے نواب چھتاری کی زبانی مجھے پیشکش کی کہ میں یو پی کی عبوری حکومت کی کیبنٹ میں شامل ہو جاؤں لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی پارٹی کے مفاد کے پیشِ نظر یہ پیش کش قبول کرنے کو تیار نہیں۔

مجھے جمعیت علمائے ہند کے ایک اجلاس میں بلایا گیا لیکن وہ لوگ میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے انہیں صاف بتا دیا کہ ہم ابھی ہندوستان کی آزادی سے زیادہ مسلمانوں کے الگ حق رائے دہندگی اور الگ انتخاب کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جنگِ آزادی بعد میں لڑی جائے گی۔ یہ جمعیت بیکار سی جماعت تھی جو چند ہی روز بعد مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے کانگریس سے جا ملی۔

اقتباس: چوہدری خلیق الزماں، بقلم خود
مرسلہ: نعمان فیض پوری، جہلم

اس سے پہلے کہ ایم ایس صاحب یا کوئی اور سینئر ڈاکٹر ہم لوگوں سے باز پرس کرتا، ہم نے ڈاکٹر شاہد کے کہنے پر ہڑتال کا اعلان کردیا۔ ڈاکٹر شاہد زمانۂ طالب علمی میں اسٹوڈنٹ لیڈر رہ چکا تھا اور اس قسم کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھا۔

پھر اس نے تمام چینلز اور اخبارات کے نمائندوں کو بلا کر پریس کانفرنس کی اور کہا کہ اس رپورٹر نے ذاتی عناد کی وجہ سے یہ خبر لگائی ہے۔ اخبار اس رپورٹر کو ملازمت سے نکالے اور جن جن اخبارات میں خبر شائع ہوئی ہے، وہ ڈاکٹروں اور نرسوں سے معافی مانگیں۔ انہوں نے ہمارے مقدس پیشے کی توہین کی ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ہم ڈیوٹی پر نہیں جائیں گے۔“

یوں اسپتال کے تمام ڈاکٹرز اسٹرائیک پر چلے گئے۔ ہم اسپتال جاتے ضرور تھے لیکن ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ پہلے ایک آدھ دن تو او پی ڈی مریضوں سے کھچا کھچ بھری رہی لیکن پھر ڈاکٹر شاہد نے چپراسیوں کو حکم دے دیا کہ کل سے او پی ڈی کے دروازے بھی بند رکھو۔ کوئی مریض اندر داخل ہونے نہ پائے۔ او پی ڈی میں مریضوں کی کراہوں سے اس کا موڈ خراب ہوتا تھا۔

البتہ ایمرجنسی میں اسٹرائیک نہیں تھی جہاں بہ دستور کام مہیا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹرز ان دنوں بہت مصروف تھے۔

ایمرجنسی کے ایک ڈاکٹر آفتاب نے مجھ سے شکوہ کیا کہ آپ لوگ تو سارا وقت چائے اور خوش گپیوں میں گزار دیتے ہیں۔ مریضوں کا سارا پریشر ایمرجنسی پر پڑ گیا ہے۔ آپ اسٹرائیک ضرور کریں لیکن اگر آپ میں سے کچھ ڈاکٹر رضاکارانہ طور پر ایمرجنسی میں چند گھنٹے بھی کام کرلیں تو ہمارے لیے بھی آسانی ہوگی اور اس سے اسپتال کی انتظامیہ اور میڈیا پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔“

”ڈاکٹر آفتاب!“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”ہماری اس اسٹرائیک کو ڈاکٹر شاہد لیڈ کررہے ہیں۔ آپ پلیز ان سے بات کریں۔ ہمیں ایمرجنسی وارڈ میں چند گھنٹے ڈیوٹی دینے پر کوئی اعتراض نہیں۔“

ڈاکٹر آفتاب چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر شاہد صاف انکار کردے گا، یہی ہوا۔ ڈاکٹر شاہد نے صاف انکار کردیا اور ڈاکٹر آفتاب اپنا سا منہ لے کر واپس آگئے۔

اسپتال کا پورا انتظام درہم برہم تھا۔ ہمارے ساتھ ساتھ نرسوں نے بھی اسٹرائیک کردی تھی کیونکہ ان کی ”نیک نامی“ پر بھی حرف آرہا تھا۔ ہم لوگ سارا دن خوش گپیاں کرتے، گانے گاتے، فلیش کھیلتے اور کچھ منچلے نرسوں سے فلرٹ بھی کرلیتے۔ گویا راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

ایک دفعہ ہم حسبِ معمول ہلے گلے میں مصروف تھے کہ چپراسی نے آ کر بتایا ”ایم ایس صاحب اور ہیلتھ سیکریٹری صاحب اسی طرف آرہے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ چینلز کے نمائندے بھی ہیں۔“

شاہد نے مجھے، فیضان کو اور ڈاکٹر جاوید کو ساتھ لیا اور ان سے مذاکرات کرنے روانہ ہوگیا۔

ایم ایس صاحب نے بہت نرم لہجے میں کہا ”دیکھیے، آپ لوگوں کا غصہ بجا ہے لیکن آپ جس مقدس پیشے سے وابستہ ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ لوگ تحمل سے کام لیں۔ آپ کے چکر میں مریض بے چارے پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ اخبارات میں ہماری پوری کمیونٹی کی بدنامی ہورہی ہے۔ نیوز چینلز ...... ہمارے بارے میں عجیب عجیب خبریں نمک مرچ لگا کر نشر کررہے ہیں۔ وہ لوگ روزانہ دو چار مریضوں اور ان کے لواحقین کے انٹرویوز دیتے ہیں' جو ڈاکٹروں کی سنگ دلی کا شکار بنے ہیں۔ عوام کا غم و غصہ بڑھتا جارہا ہے۔“

”سر، تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ ہم ان کے الزامات کو تسلیم کرلیں؟“ شاہد نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”جب تک میڈیا والے ہم سے معافی نہیں مانگیں گے، اس وقت تک ہم اسٹرائیک ختم نہیں کریں گے۔“ شاہد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”دیکھیے ڈاکٹر صاحب!“ سیکریٹری ہیلتھ نے پہلی دفعہ زبان کھولی ”اس سے قبل شاید میڈیا سے آپ کا واسطہ نہیں پڑا ہے۔ ان کی طاقت سے بڑی بڑی حکومتیں خوف زدہ رہتی ہیں۔“

”سر، اسٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے کئی دفعہ میڈیا والوں سے میرا واسطہ پڑ چکا ہے۔“ شاہد نے کہا۔

”حکومتیں ان سے خوف زدہ ہوتی ہوں گی، ہم بلیک میل ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ایک بات اور بتادوں۔“ شاہد نے بے خوفی سے ہیلتھ سیکریٹری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”پرسوں کراچی کے دوسرے بڑے سرکاری اسپتالوں کے ڈاکٹرز بھی اسٹرائیک پر چلے جائیں گے۔“

”بات کو اتنا مت بڑھائیں ڈاکٹر صاحب!“ ایم ایس نے کہا ”ہم کوشش کررہے ہیں کہ آپ کے مطالبات تسلیم

کرلیے جائیں۔“

”تو پھر جب آپ کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نکلے تو ہمیں بھی آگاہ کردیجیے گا۔ ہم اسی وقت ڈیوٹی پر حاضر ہوجائیں گے۔“

ایم ایس اور ہیلتھ سیکریٹری مایوس ہوکر چلے گئے۔

میڈیا نے ایک طوفان اُٹھا رکھا تھا۔ ایک دفعہ تو میں نے بھی سوچا کہ انتظامیہ سے مذاکرات کرکے اسٹرائیک ختم کردینا چاہیے لیکن شاہد اس پر راضی نہ ہوا۔

یہ اسٹرائیک کے پانچویں دن کی بات ہے، میں ڈاکٹر ذیشان اور ڈاکٹر جاوید کے ساتھ اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ بھاپ اُڑاتی کافی کی پیالیاں ہمارے سامنے تھیں اور ہم صورتِ حال پر گفتگو کررہے تھے۔

اچانک باہر سے میرے چپراسی کے تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی کو اندر آنے سے روک رہا تھا۔ پھر دھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی عمر بہ مشکل پچیس چھبیس سال رہی ہوگی، جسم پر بہت سستا سا ملگجا لباس تھا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی گود میں دو ڈھائی سال کا ایک بچہ بھی تھا۔

اس نے رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھا، پھر بولی ”ڈاکٹر صاحب، میرے بچے کو دیکھ لیں، صبح سے اس کی حالت بہت خراب ہے۔“

”بی بی! آپ کو معلوم نہیں کہ ہم لوگ اس وقت اسٹرائیک پر ہیں۔“ میں نے تحمل سے کہا ”ہم اس وقت کسی پیشنٹ کو نہیں دیکھ سکتے۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ عورت نے خوشامدانہ انداز میں کہا ”ڈاکٹروں کی ہڑتال کسی انسانی جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہوسکتی۔“

”زیادہ لیکچر مت دو بی بی!“ میں نے درشت لہجے میں کہا ”ہماری عزتیں داؤ پر لگی ہیں اور تم مجھے انسانیت کا سبق پڑھا رہی ہو۔“

اچانک بچے کا سانس اکھڑ گیا۔ وہ جھٹکے لینے لگا۔ بچے کی حالت دیکھ کر عورت چیختی ہوئی آواز میں بولی ”ڈاکٹر صاحب! آپ کو اللہ کا واسطہ، میرے گڈو کو دیکھ لیں، دیکھیں...... اسے کیا ہورہا ہے؟“

ڈاکٹر ذیشان نے کہا ”یار فرحان! بچے کو ایک نظر دیکھ لو۔ شاہد کو کون سا معلوم ہوگا یا تم نہ دیکھنا چاہو تو مجھے دیکھنے دو۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے۔ اس دو ٹکے کے رپورٹر نے ہماری عزت اُچھالی ہے اور تم ابھی سے میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔ تم دیکھنا چاہو تو شوق سے دیکھو، میں ابھی ڈاکٹر شاہد کو کال کرتا ہوں۔“

ڈاکٹر ذیشان خاموش ہوگیا۔

عورت نے پھر دل ہلا دینے والے انداز میں روتے ہوئے کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ کو اپنے پیاروں کا واسطہ، آپ کو اللہ کا واسطہ۔ میرے گڈو کو دیکھ لیں۔ یہ مجھے بہت منتوں اور مرادوں کے بعد ملا ہے۔“ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اس نے اچانک میرے پیر پکڑ لیے ”میرے گڈو کو بچالیں ڈاکٹر صاحب!...... میرے گڈو کو بچالیں۔“

میں نے جھٹکا دے کر اپنے پیر چھڑائے اور چیخ کر چپراسی سے کہا ”کریم، یہ عورت اندر کیسے آئی، اسے باہر نکالو۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ کریم نے افسردگی سے کہا ”اس کا بچہ واقعی بہت سیریس ہے۔ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔“

”بکو مت!“ میں چیخ کر بولا ”اس عورت کو دھکے دے کر باہر نکالو ورنہ ابھی کھڑے کھڑے میں تمہیں نوکری سے نکلوا دوں گا۔“

”چل زبیدہ......!“ عورت سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے میلے کچیلے جواں عمر مرد نے کہا ”ان ڈاکٹروں کے سینے میں دل نہیں پتھر ہیں۔ اس وقت یہ اختیارات کے نشے میں چور ہیں۔ یہ تیری کوئی بات نہیں سنیں گے۔“

”ڈاکٹر صاحب! اللہ کے واسطے آپ ......“

عورت نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی اور چیخ کر بولا ”کریم، میں نے تم سے کیا کہا تھا؟“

کریم نے اس عورت کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر کی طرف گھسیٹا۔ کریم کی آنکھوں میں بھی نمی تھی اور صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ عورت کو اپنی مرضی کے خلاف باہر نکال رہا ہے۔

زبیدہ کے ساتھ آیا ہوا مرد آگے بڑھا اور اس سے بولا ”تجھے گڑگڑانا ہے، رحم کی بھیک مانگنا ہے تو اس قادرِ مطلق سے مانگ۔ یہ بھک منگے تجھے کیا دے سکتے ہیں؟“

”گیٹ لاسٹ!“ میں نے چیخ کر کہا۔

”یو شٹ اپ ڈرٹی سوائن!“ مرد نے اسی لہجے میں چیخ کر کہا۔ ”کون کہتا ہے کہ تم ڈاکٹر ہو، یو آر مرڈرر!“ اس نے کہا اور زبیدہ کو سہارا دے کر باہر لے گیا۔

مرد کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے، ان کے جانے کے بعد کریم نے دروازہ اندر سے بند

کردیا۔

ایک ہی منٹ بعد پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں بُری طرح بھنّا گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ وہی ڈھیٹ عورت ہوگی۔

کریم نے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں؟ میں تلملا کر آگے بڑھا اور دروازے کا لاک کھول دیا اور چیخ کر بولا ''تم لوگ آخر کس مٹی......'' میرا جملہ حلق ہی میں رہ گیا کیونکہ آنے والا ڈاکٹر شاہد تھا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں شور کررہے ہو ڈاکٹر؟''

''ارے ڈاکٹر صاحب، ان پیشنٹس نے تو زندگی اجیرن کردی ہے۔''

''چھوڑو اس بات کو، اب تم جلدی سے مٹھائی منگوالو۔''

''مٹھائی کس لیے ڈاکٹر؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''ارے بھئی، ہمارے مطالبات پورے ہوگئے ہیں۔ اخبار کی انتظامیہ نے اس بدزبان رپورٹر کو ملازمت سے نکال دیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں خوش ہوکر بولا ''اب کم از کم کسی اخبار کا کوئی رپورٹر ایسی حرکت نہیں کرے گا۔''

''میرے خیال مین اب ہمیں او پی ڈی شروع کردینا چاہیے۔'' ڈاکٹر شاہد نے کہا۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ''ابھی صرف ساڑھے نو بجے ہیں۔ ہم او پی ڈی کے مریضوں کو دیکھ سکتے ہیں۔''

اچانک باہر سے چیخ پکار اور بین کرنے کی آوازیں آئیں۔ ان آوازوں میں اس عورت زبیدہ کی جگر خراش چیخیں نمایاں تھیں۔ میں جھنجلا کر کرسی سے اُٹھا ''کیا مصیبت ہے؟'' میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے ہی برآمدے میں مجھے زبیدہ دکھائی دی۔ وہ برآمدے کے پختہ فرش پر اپنا سر پھوڑ رہی تھی اور بہت دردناک انداز میں بین کررہی تھی۔ اس کی گود میں وہی بیمار بچہ تھا۔ وہ اب بالکل بے حس و حرکت تھا۔

زبیدہ نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہورہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ان میں سے آنسوؤں کے بجائے خون چھلک پڑے گا۔

وہ ہذیانی انداز میں بولی ''میرا بچہ مرگیا ڈاکٹر!...... مرگیا میرا بچہ...... تو اس کا قاتل ہے...... تُو نے میرے بچے کو قتل کیا ہے...... دنیا کی کوئی عدالت تجھے سزا نہ دے لیکن تو بھول گیا کہ ایک سب سے بڑی عدالت اور بھی ہے۔ وہاں صرف اور صرف انصاف ہوتا ہے...... میں نے اپنا معاملہ اسی عدالت کے سپرد کردیا ہے...... جیسے تو نے میری خوشی چھینی ہے، اللہ اسی طرح تجھے بھی خوشیاں دے گا اور چھین لے گا...... تو کبھی سکون سے نہ رہ سکے گا میرے بچے کے قاتل...... تو خوشیوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر نڈھال ہوجائے گا...... دولت کے انبار بھی تجھے ایک ذرا سی خوشی نہ دے سکیں گے...... تو قاتل ہے، تو میرے بچے کا قاتل ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

ڈاکٹر شاہد نے پوچھا ''ڈاکٹر فرحان! یہ کیا معاملہ ہے؟''

''ارے یہ جاہل لوگ ایک تو مریض کو اس وقت اسپتال لے کر آتے ہیں جب وہ بالکل لبِ دم ہوتا ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا ''اور اگر بدقسمتی سے مریض ایکسپائر ہوجائے تو اس کا سارا الزام ڈاکٹر پر دھر دیتے ہیں۔''

''ارے تُو مرے گا تو کوئی حلق میں پانی ڈالنے والا بھی نہیں ملے گا۔'' زبیدہ جنونی انداز میں چیخی ''کیڑے پڑیں گے تیری قبر میں۔ تُو میرے بچے کا قاتل ہے، تو ڈاکٹر نہیں درندہ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے بچے کو فرش پر رکھا اور جنونی انداز میں میری طرف بڑھی۔

اس سے پہلے ہی اس کے شوہر نے اسے پکڑ لیا اور بولا ''گھر چل زبیدہ! ابھی ہمیں گڈو کو وداع بھی تو کرنا ہے۔ بہت کام ہے۔ ان پتھروں سے سر مت پھوڑ۔''

وہ بچے کی لاش کو اُٹھا کر زبیدہ کو باہر کی طرف کھینچنے لگا۔ زبیدہ مسلسل چیخ رہی تھی ''تُو خوشیوں کو ترسے گا ڈاکٹر...... تُو خوشیوں کو ترسے گا...... تُو قرار کو ترسے گا...... تُو......''

آہستہ آہستہ اس کی آواز معدوم ہوگئی۔

نہ جانے اس کی آواز میں کیا بات تھی کہ میں اپنی جگہ پر ساکت ہوکر رہ گیا۔ اس کی جگر خراش چیخیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں ''میرا گڈو...... میرا لال...... تُو خوشیوں کو ترسے گا ڈاکٹر...... تُو خوشیوں کو ترسے گا۔''

''کب تک یہاں کھڑے رہو گے ڈاکٹر فرحان!'' ڈاکٹر جاوید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں بُری طرح چونک اُٹھا۔

''اسٹرائیک ختم ہوچکی ہے۔ چلو، او پی ڈی میں چلو۔''

میں بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وقت سبک رفتاری سے گزرتا رہا۔ میں نے اب شہر کے ایک پس ماندہ علاقے میں اپنا کلینک بھی شروع کردیا تھا۔

وہاں فیس اگرچہ کم تھی لیکن مریضوں کی تعداد بے تحاشا تھی۔ ایسے علاقوں میں چونکہ طبّی سہولتوں کا فقدان ہوتا ہے، اس لیے ڈاکٹرز کے علاوہ جعلی ڈاکٹر جنہیں ہماری اصطلاح میں ''کوئیک'' کہا جاتا ہے، وہ بھی خوب کماتے ہیں۔ کوئی کیس بگڑ جاتا ہے تو وہاں کے اَن پڑھ اور معصوم لوگ ڈاکٹر کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے اسے مشیت ایزدی سمجھ لیتے ہیں۔

میں نے اس آبادی سے اتنا کمایا تھا کہ دو ہی سال میں شہر کے ایک پوش علاقے میں کلینک کھول لیا۔ اللہ مجھ پر مہربان تھا اور مجھ پر ہن برس رہا تھا۔ جدید ماڈل کی قیمتی گاڑی، امپورٹیڈ اور مہنگا سیل فون، بیش قیمت لباس...... میری تو پوری شخصیت ہی تبدیل ہوکر رہ گئی تھی۔

افشاں تعلیم سے فارغ ہوچکی تھی۔ امی اس کے لیے رشتے کی تلاش میں تھیں۔

بالآخر انہیں ایک لڑکا پسند آ ہی گیا۔ خاندان بھی اچھا تھا اور لڑکا بھی بہت سلجھا ہوا اور پڑھا لکھا تھا۔ وہ کیمیکل انجینئر تھا اور ایک ملٹی نیشنل فرم میں بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔

رسمی سی چھان بین کے بعد امی نے وہ رشتہ قبول کرلیا اور افشاں کی شادی ہوگئی۔

ناصر واقعی بہت اچھا لڑکا تھا۔ افشاں اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھی۔

شادی کے دو ہی مہینے بعد ناصر کی تقرری امریکا کی ایک کمپنی میں ہوگئی۔ وہ افشاں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

وہاں سے افشاں تقریباً روزانہ ہی امی کو ٹیلی فون کرتی تھی۔ وہاں وہ بہت خوش تھی۔

پھر ناصر نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ مبارک ہو، فرحان بھائی! آپ ماموں بن گئے ہیں۔''

میں خوشی سے پاگل ہوگیا۔ میری نظروں میں وہ چھوٹی سی افشاں گھوم گئی جو فراک پہنے، دو چٹیاں باندھے سارے گھر میں ایک پاؤں سے اُچھلتی پھرتی تھی اور میں اس کی چوٹیاں پکڑ کر اس بُری طرح کھینچتا تھا کہ وہ رونے لگتی تھی۔ آج وہی افشاں ایک بچی کی ماں بن گئی تھی۔

امی نے اپنی نواسی کا نام ثمرہ رکھا۔ افشاں نے بتایا تھا کہ میں دو مہینے بعد پاکستان آؤں گی۔

اس دن اتوار تھا۔ میں نے رات کو ایک پیچیدہ آپریشن کیا تھا اس لیے رات گئے آیا تھا اور ابھی رات ہی کی تھکن اُتار رہا تھا۔

اچانک ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجی تو میں جھنجلا گیا۔ ان اسپتال والوں کو بھی بالکل احساس نہیں ہے کہ ابھی ڈسٹرب نہ کریں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور ریسیور اُٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہیلو!''

''بھیا!'' دوسری طرف سے افشاں کی وحشت زدہ آواز سنائی دی۔

میری نیند اچانک اُڑ گئی اور میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بولا ''کیا بات ہے افشاں! تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''میں تباہ ہوگئی بھیا!...... برباد ہوگئی...... میں...... کیا کروں؟'' وہ بُری طرح روتے ہوئے بولی۔

''افشاں! مجھے بتاؤ، کیا بات ہے؟ ثمرہ تو ٹھیک ہے...... ناصر کہاں ہے؟'' میں نے ایک ہی سانس میں اس سے دو سوال کردیے۔

''ناصر مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے بھیا!'' افشاں ہانپتی ہوئی بولی ''وہ آج اپنے ایک گودام کے وزٹ پر گئے تھے۔ وہاں ... کیمیکل کا ایک [illegible] ارم پھٹ گیا اور [illegible] اور '' وہ پھر بُری طرح رونے لگی ''اس [illegible] اجنبی ملک میں...... مجھے تو کوئی دلاسا [illegible] دینے والا بھی نہیں ہے بھیا! ...... میں کیا کروں...... میں کیا کروں بھیا!''

''ہمت سے کام لو افشاں! اگر تم نے حوصلہ ہار دیا تو ثمرہ کا کیا بنے گا؟ تم گھبراؤ مت، میں پہلی دستیاب پرواز سے وہاں پہنچتا ہوں۔''

''اس کی...... ضرورت نہیں ہے بھیا!'' افشاں سسکتے ہوئے بولی ''ناصر کی کمپنی والوں...... نے ہماری واپسی کا انتظام کردیا ہے...... میں آج رات دو بجے کی فلائٹ سے ثمرہ...... اور نا...... صر کو...... لے کر آرہی ہوں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر رونے لگی۔

''رومت گڑیا!'' اس کی آہ و زاری سن کر میرے آنسو بھی بہنے لگے ''ہمت کر...... اور تجھ پہ ثمرہ کی بھی ذمّے داری ہے۔ تو...... مجھ سے اتنی دور ہے گڑیا کہ...... میں تیرے سر پر ہاتھ بھی نہیں رکھ سکتا...... تو پاکستان آجا...... پھر......''

''میں آرہی ہوں بھیا!'' افشاں نے کہا ''اب میں یہاں کس کے سہارے رہوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

امی شاید میری بلند آواز سن کر کمرے میں آگئی تھیں۔ میرے آنسو دیکھ کر وہ تڑپ کر بولیں ''کس کا فون تھا فرحان؟''

میں امی سے یہ بات چھپا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں میرے ہنستے بستے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

مجھے ایسا لگا جیسے ان آوازوں میں ایک آواز سب سے

نمایاں ہو" تجھ سے بھی تیری خوشیاں یوں ہی چھن جائیں گی ڈاکٹر! تو میرے گڈو کا قاتل ہے...... قاتل ہے۔"

میں نے سر جھٹک کر اس عورت کے خیال سے پیچھا چھڑایا پھر امی اور دوسرے لوگوں کی دل جوئی میں مصروف ہوگیا۔

یوں میری شوخ دھلنڈری بہن' بیوگی کا داغ ماتھے پر سجائے میرے گھر لوٹ آئی۔

وقت پھر اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ میں نے ثمرہ کی معصوم شرارتوں اور باتوں میں خود کو بہلالیا۔ افشاں بھی اس کی وجہ سے زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی اس لیے اس نے ایک انگلش میڈیم اسکول میں جاب کرلی۔ میں نے بھی اس لیے اعتراض نہ کیا کہ باہر رہ کر اس کا دل بہل جائے گا۔

زندگی پھر اسی ڈگر پر چلنے لگی۔ میں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتا رہا۔

میری دوسری بہن نورین نے ابھی انٹر ہی کیا تھا کہ اس کے لیے قومی ائرلائن کے ایک پائلٹ کا رشتہ آگیا۔ شکیل میرا دیکھا بھالا تھا۔ ابو کے ایک دوست رزاق انکل کا بیٹا تھا۔ خاصا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ رزاق انکل کا انتقال ہوچکا تھا۔ شکیل، ایک چھوٹی بہن اور والدہ کے علاوہ اس گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔

میں چاہتا تھا کہ فی الحال منگنی ہوجائے اور نورین بی اے کرلے لیکن شکیل کی والدہ کو بہت جلدی تھی۔ یوں اس کی شادی ایک مہینے کے اندر اندر ہوگئی۔

میں نے اس کی شادی میں دل کھول کر اپنے ارمان نکالے۔ پھر وہ رخصت ہوکر اپنے سسرال چلی گئی۔

نورین کے جانے کے بعد گھر ایک دم خالی خالی سا لگنے لگا۔ افشاں نے تو گویا ہنسنا بولنا چھوڑ ہی دیا تھا۔ نورین ہی چہکتی رہتی تھی یا پھر اس کی اور نوشین کی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سے نوشین بھی بالکل چپ چپ سی ہوگئی تھی۔

ایک دن میں تھکا ہارا اسپتال سے آیا تو معلوم ہوا گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ نوکر نے بتایا کہ بڑی بیگم صاحبہ کی کوئی رشتے دار ہیں۔

میں نے انہیں زیادہ اہمیت نہ دی۔ ہمارے نزدیک کے چند ہی تو رشتے دار تھے۔

میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نہادھو کر، فریش ہوکر اپنے کمرے سے نکلا تو افشاں ہنستی ہوئی میرے پاس آئی۔ اسے یوں مہینوں بعد ہنستا دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔

اس نے کہا" بھیا! گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں اور آپ آکر سیدھے کمرے میں گھس گئے۔ وہ لوگ کیا کہیں گے کہ ان کا بیٹا کتنا بداخلاق ہے۔"

"ارے تو مہمان ہیں کون؟" میں نے پوچھا" اور مہمانوں کے چکر میں آج تم نے شام کی چائے بھی گول کردی۔"

"امی کی سکھر والی کزن ہیں۔" افشاں ہنس کر بولی "آیئے، وہ آپ ہی کا انتظار کررہی ہیں۔ چائے بھی وہیں ملے گی آپ کو۔" افشاں نے کہا اور واپسی کے لیے مڑگئی۔

امی کی سکھر والی کزن سے بھلا مجھے کیا لینا دینا۔ میں جھنجلایا ہوا سا ڈرائنگ روم میں پہنچا تو امی کے ساتھ ایک حسین چہرے کو دیکھ کر چونک اُٹھا۔ وہ لڑکی تھی یا حسن کی مورت! اب تک بے شمار لڑکیاں میری نظروں سے گزری تھیں لیکن اتنا مکمل حسن تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر پڑیں تو ہٹنا بھول گئیں۔

"آؤ بیٹا فرحان!" امی کی آواز پر میری محویت ٹوٹی "یہ تمہاری عابدہ خالہ ہیں۔" انہوں نے ادھیڑ عمر...... خاتون کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بہت نفیس خاتون تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں ادب سے سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹے!" انہوں نے کہا۔

"اور یہ عابدہ خالہ کی بیٹی صائمہ ہیں۔" افشاں نے اس نازنین کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے بہت ادا سے ہاتھ ماتھے پر لے جاکر مجھے آداب کیا۔

"جیتی رہو۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔" میں نے کسی بڑی بوڑھی کی طرح اسے دعا دی۔

میرے اس انداز سے کمرے میں قہقہے گونج اُٹھے اور صائمہ کچھ جھینپی جھینپی سی نظر آنے لگی۔

"بیٹا فرحان!" عابدہ خالہ نے کہا" میں نے تمہیں اب سے سولہ سترہ سال پہلے دیکھا تھا۔ جب تمہارے خالو زندہ تھے تو میں کراچی آئی تھی۔ تمہیں تو شاید یاد بھی نہ ہوگا۔ اس وقت صائمہ میری گود میں تھی۔ ایک دن تم نے زبردستی اسے چاول کھلادیے تھے۔"

"زبردستی کیوں خالہ!" میں نے ہنس کر پوچھا" کیا صائمہ چاول نہیں کھاتی ہیں؟"

"ارے بیٹا! یہ اس وقت صرف چھ مہینے کی تھی۔" خالہ نے ہنس کر کہا۔

"اچھا، یہ کبھی چھ مہینے کی بھی تھیں؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"شاید کراچی میں لوگ پیدا ہوتے ہی جوان ہوجاتے ہیں۔" صائمہ نے کہا۔ اس کی طرح اس کی آواز بھی دلکش تھی۔

انہی خوش گپیوں کے دوران .... چائے پی گئی۔ مجھے رات کو کلینک جانا تھا لیکن میں نے اپنے اسسٹنٹ ڈاکٹرز سے کہہ دیا کہ میں آج کلینک نہ آسکوں گا۔"

رات کو امی اور افشاں میرے کمرے میں آئیں تو میں انہیں دیکھ کر چونک اُٹھا۔

"آیئے امی!" میں نے بیڈ پر ان کے لیے جگہ بنائی۔ افشاں پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔

"فرحان! تمہیں صائمہ کیسی لگی؟"

میں ان کا سوال سن کر چونک اُٹھا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا کہ امی مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟

"صائمہ!" میں نے منہ بنا کر کہا" بس آدمی کا بچہ ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اچھی نہیں ہے؟" افشاں نے کہا پھر وہ امی سے بولی" امی، آپ عابدہ خالہ سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بدصورت بیٹی کی شادی سکھر میں ہی کہیں کردیں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھنے لگی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا" ارے، میں نے یہ کب کہا ہے کہ وہ بدصورت ہے۔ بھئی، آدمی کا بچہ تو میں بھی ہوں، تم بھی ہو۔ اس کا مطلب یہ کب ہوا کہ آدمی کے بچے بدصورت ہوتے ہیں؟"

"تو تمہیں یہ رشتہ پسند ہے؟" امی نے پوچھا۔

"ارے امی! آپ کو پسند ہے تو میں کیسے انکار کرسکتا ہوں لیکن پہلے میں نوشین کی شادی کروں گا۔" میں نے سنجیدہ ہوکر کہا۔

"ابھی نوشین کی عمر شادی کی ہے؟" امی نے آنکھیں نکالیں" وہ ابھی میٹرک میں پڑھ رہی ہے۔ کیا تم بڑھاپے میں شادی کرو گے؟ پھر عابدہ اتنی دیر نہیں رکے گی۔ اس کی سسرال سے بھی دو تین رشتے آئے ہوئے ہیں، اسے مجبوراً صائمہ کی شادی انہی جاہلوں میں کرنا پڑے گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی امی!" میں نے سر جھکا کر کہا۔

پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق دو مہینے کے اندر اندر صائمہ میری دلہن بن کر میرے آنگن میں اُتر آئی۔

وہ اتنی خوبصورت تھی کہ کبھی کبھی تو مجھے یہ خوف ہوتا تھا کہ کہیں یہ میرے چھونے سے میلی نہ ہوجائے۔

امی نے اس شادی کے موقعے پر دل کھول کر اپنے ارمان نکالے، ولیمے کی تقریب شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی۔

اب میں نے اپنی مصروفیت کچھ کم کرلی تھی۔ میں تو صائمہ کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔

پھر وقت دبے پاؤں یوں گزرا کہ مجھے احساس ہی نہ ہوسکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال گزر گئے۔ بس میرے دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ صائمہ کی گود ابھی تک خالی تھی۔

میں نے اپنا اور صائمہ کا میڈیکل چیک اپ بھی کرالیا تھا۔ دونوں کی رپورٹس نارمل تھیں۔ بس قدرت ہی کی طرف سے دیر تھی۔ امی پہلے تو اشاروں کنایوں میں مجھے اس محرومی کا احساس دلاتی رہیں، پھر انہوں نے کھلے عام کہنا شروع کردیا کہ مجھے ایک پوتا چاہیے۔ کیا میں اپنی یہ خواہش قبر میں ساتھ لے جاؤں گی؟ انہوں نے دبے لفظوں میں مجھے دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا۔ میں نے ان کے اس مشورے کو مسترد کردیا کہ جب ہم دونوں کی میڈیکل رپورٹس نارمل ہیں تو دوسری شادی کا کیا جواز ہے؟

اسی خواہش میں تین سال گزر گئے۔

نورین بھی ابھی تک ماں نہیں بنی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نوشین اب بجھی بجھی سی رہتی ہے۔ اس کا چہرہ بھی پہلے کی طرح تروتازہ اور نکھرا ہوا نہیں تھا۔ بہ ظاہر اسے کوئی پریشانی بھی نہیں تھی۔ محبت کرنے والا شوہر تھا۔ شفیق ساس تھی۔ گھر میں ہر طرح کا آرام تھا۔

ایک دن افشاں کے بہت زیادہ اصرار پر وہ رونے لگی اور اس نے بتایا کہ اس کی ساس نے اس کا جینا حرام کردیا ہے۔ شکیل تو کئی کئی دن بلکہ ہفتوں کے لیے فلائٹ پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے ساس اور نند صفیہ اس کی زندگی اجیرن کردیتی ہیں۔ ہم دونوں کی میڈیکل رپورٹس بالکل ٹھیک ہیں' لیکن ساس صاحبہ مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہیں۔ وہ شکیل کی دوسری شادی کرانا چاہتی ہیں۔

افشاں نے اسے سمجھایا کہ فکر مت کرو، اللہ کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔

میں اس دن کلینک میں تھا اور بہت زیادہ مصروف تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجی۔ ثمرہ کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی تو وہ بہت زیادہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی" ماموں

جان! آپ فوراً گھر پہنچیں۔''
''خیریت تو ہے بیٹا!'' میں گھبرا گیا۔
''بس آپ فوراً گھر پہنچیں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سارے اپائنٹمنٹ منسوخ کیے اور آندھی طوفان کی طرح ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر پہنچا۔

امی سکتے کی حالت میں بیٹھی تھیں۔ افشاں اور نوشین بُری طرح رو رہی تھیں اور ثمرہ کی تو ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

افشاں نے روتے ہوئے بتایا کہ نورین نے مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگالی۔ وہ اس وقت سول اسپتال میں ہے اور اس کی حالت بہت خراب ہے۔

میں نے ثمرہ اور نوشین کو امی کے پاس چھوڑا اور افشاں کو ساتھ لے کر اسپتال کی طرف دوڑا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ نورین نے مٹی کے تیل کی بوتل اپنے جسم کے بالائی حصے پر انڈیلی تھی، پھر اس نے خود کو آگ لگالی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ بُری طرح جھلس گیا تھا، صرف ٹانگیں محفوظ تھیں۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا اور اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

وہ اس وقت اپنی قوتِ ارادی کی بدولت ہوش میں تھی۔

اسپتال کے ڈاکٹرز نے پولیس کو بھی طلب کرلیا تھا۔ نورین نے بیان دیا کہ میں نے ساس اور نند کے طعنوں سے تنگ آکر خودسوزی کی ہے۔ اس کا ذمّے دار کوئی اور نہیں ہے، میں خود ہوں۔

ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں جانتا تھا کہ نورین جاں بر نہ ہو سکے گی۔ اس بُری طرح جھلسے ہوئے مریض کبھی نہیں بچتے تھے۔ اگر وہ بچ بھی جاتی تو اس کی بقیہ زندگی مزید اذیت میں گزرتی۔

شام تک شکیل بھی آگیا۔ وہ نورین کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے نورین کو شکیل ہی کا انتظار ہو۔ رات تک اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔

مجھے زور کا چکر آیا اور میں کھڑے قدموں فرش پر گر پڑا۔ میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اردگرد کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔

اچانک ایک جانی پہچانی آواز آئی۔
''ڈاکٹر! تو میرے گڈو کا قاتل ہے، خوشیاں یوں ہی تجھ سے دور دور بھاگتی رہیں گی۔''

''اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں نے بہت سزا بھگت لی ہے، اب تو مجھے معاف کردو۔'' میں چیخ کر بولا۔

جواب میں مجھے زبیدہ کی ہذیانی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

اس وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور کوئی نرم لہجے میں بولا ''آرام سے لیٹے رہیں ڈاکٹر صاحب!''

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ سول اسپتال ہی کا ایک کمرا تھا۔ فرش پر گرنے سے میرے سر اور بازو پر چوٹ آئی تھی۔

نورین کی موت کے بعد تو مجھے خوشیوں سے خوف آنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں زبیدہ کو تلاش کرکے اپنے طور پر معافی مانگ لوں لیکن میں اسے تلاش کہاں کرتا؟

میرا چپراسی کریم اس دن اسے اندر لایا تھا، شاید وہی اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو؟

میں نے کریم کو بلایا اور پوچھا ''کریم! تمہیں وہ عورت یاد ہے جو ہڑتال کے دنوں میں یہاں آئی تھی؟''

''اچھی طرح یاد ہے ڈاکٹر صاحب!'' کریم نے کہا ''اس کا بچہ مرگیا تھا۔''

''ہاں ہاں!'' میں نے جلدی سے کہا ''تم جانتے ہو کہ وہ کہاں رہتی ہے؟''

''میں جانتا ہوں صاحب!'' کریم نے افسردگی سے کہا۔

''تو پھر مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''وہ میرے ہی محلّے میں رہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب!'' کریم نے افسردگی سے کہا ''لیکن آپ نے بہت دیر کردی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''اف میرے خدا!'' میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''بیٹے کی موت کے بعد وہ پاگل ہوگئی تھی ڈاکٹر صاحب!'' کریم بولے جا رہا تھا ''وہ پھٹے حال، بُرے احوال گلیوں میں ماری ماری پھرتی تھی، بچے اسے پتھر مارتے تھے لیکن اس نے کبھی کسی بچّے کو کچھ نہیں کہا، پھر ایک دن دیوانگی میں سڑک پار کرتے ہوئے وہ ایک ٹرک کی لپیٹ میں آگئی۔''

''اور اس کا شوہر......؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ تو اس کے مرنے کے فوراً بعد وہ محلّہ چھوڑ گیا تھا۔''

کریم کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک ساکت

بیٹھا رہا۔ زبیدہ سے معافی مانگنے کی آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔

نورین کی موت اور افشاں کی بیوگی سے گھر پر عجیب سی یاسیت چھا گئی تھی۔ امی ٹوٹ کر رہ گئی تھیں اور مجھے اب ان کی طرف سے بھی فکر رہنے لگی تھی۔

صائمہ اولاد کے لیے اب دوا علاج چھوڑ کر پیروں فقیروں اور مزاروں کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ وہ مجھے عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار پر لے گئی، ٹھٹھہ کے مزاروں پر حاضری دی، شاہ عقیق کے مزار پر جا کر منت مانی، سیہون شریف گئی، داتا دربار گئی، بری امام گئی۔ غرض وہ ہر اس مزار پر گئی جہاں اسے امید کی ہلکی سی کرن بھی نظر آئی۔

ہماری شادی کو پانچ سال ہوگئے تھے لیکن صائمہ کی گود ابھی تک خالی تھی۔ امی کافی ضعیف ہوگئی تھیں۔ اب تو انہوں نے بھی پوتے کی تمنا چھوڑ دی تھی۔ بس وہ ہر دم اداس رہتیں اور خلا میں تکتی رہتیں۔ ثمرہ اب ماشاء اللہ دس سال کی ہوگئی تھی۔ وہی امی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر دولت سمیٹنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ میں نے کلفٹن میں ایک کلینک اور کھول لیا تھا۔

میرے کلاس فیلو میری قسمت پر رشک کرتے تھے کہ محض ایم بی بی ایس کرکے میں لاکھوں روپے ماہانہ کما رہا تھا۔ میرے پاس تو کوئی اعلیٰ ڈگری بھی نہیں تھی ورنہ ڈگریوں کی قطار کے بغیر کوئی بھی ڈاکٹر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

صائمہ نہ صرف مزاروں پر حاضری دے رہی تھی بلکہ وہ اپنے علاج پر بھی لاکھوں روپے خرچ کر رہی تھی۔

شادی کا ساتواں سال تھا کہ امریکا سے ایک ماہر ڈاکٹر پاکستان آیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کے علاج سے شرطیہ طور پر اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ صائمہ کی ضد پر میں اس ڈاکٹر سے بھی ملا۔

ڈاکٹر ہونے کے ناتے اس نے میرا بہت خیال کیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ دونوں کی رپورٹس نارمل ہیں۔ میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھوں گا۔ میرے علاج سے بس اتنا فائدہ ہوگا کہ ہارمونز متحرک ہو جائیں گے۔ اولاد ہوتا یا نہ ہونا دستِ قدرت میں ہے۔ میں تو کوشش ہی کر سکتا ہوں۔

اس نے جو دوائیں دیں وہ بھی ان دواؤں سے مختلف تھیں جو صائمہ اب تک استعمال کرتی رہی تھی۔ اس نے مجھے کیپسولز کا ایک کورس کرایا۔

آخر اللہ نے ہماری سن ہی لی۔ صائمہ کی طبیعت خراب ہوگئی تو میں نے پہلے تو خود ہی اس کا چیک اپ کیا، پھر مزید تصدیق کے لیے شہر کے ایک معروف گائنا کولوجسٹ کے پاس لے گیا۔ الٹرا ساؤنڈ کے بعد اس نے بھی تصدیق کردی کہ صائمہ ماں بننے والی ہے۔

وہ دن میری زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ امی بھی اس خبر سے گویا دوبارہ جی اٹھی تھیں اور انہوں نے اپنی عمر کے دس سال گویا جھٹک دیے تھے۔

افشاں اور امی نے صائمہ کو بالکل بیڈ پر بٹھا دیا۔ ان دونوں نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا لیا تھا۔ آخر آٹھ سال کے طویل انتظار کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے خوشی کا یہ دن دکھایا تھا۔

پھر صائمہ نے چاند سے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ امی نے اس کا نام ارسلان رکھا۔ صائمہ پیار میں اسے مون کہتی تھی کہ وہ تھا بھی چاند کا ٹکڑا۔

میرے گھر میں خوشیاں ایک مرتبہ پھر لوٹ آئیں۔ افشاں اور نوشین تو مون کی دیوانی تھی، ثمرہ بھی اسکول سے آنے کے بعد سارا وقت مون ہی کو لیے رہتی تھی۔ وہ بھی اب چودہ سال کی ہو رہی تھی۔

وقت سبک رفتاری سے گزرتا رہا۔ مون ایک سال کا ہونے والا تھا۔ صائمہ اس کی پہلی سالگرہ بہت دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھی۔ اس کی سالگرہ میں ابھی پندرہ دن باقی تھے۔ صائمہ کی شاپنگ ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ افشاں، نوشین اور ثمرہ بھی بہت خوش تھیں۔

ثمرہ کئی دن سے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ مجھے کچھ ضروری چیزیں خریدنا ہیں۔ بس یہ آخری شاپنگ ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔''

مجھے ٹائم نہیں مل پا رہا تھا۔ اصل میں صائمہ میرے ہی لیے کچھ شاپنگ کرنا چاہتی تھی۔

میں نے اس سے کہا کہ تم امی، افشاں اور نوشین کو لے جاؤ۔ امی نے شاپنگ بھی نہیں کی ہے، انہیں بھی شاپنگ کرا دینا اور ثمرہ کو بھی میری طرف سے ایک نیا سوٹ دلوا دینا۔

میں حسبِ معمول اسپتال آگیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کسی ڈاکٹر نے ایک نرس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی اس لیے تمام نرسیں اسٹرائیک پر چلی گئیں۔ انہوں نے میڈیا کو بھی یہ بیان دیا تھا کہ جب تک ہماری عزت و آبرو کی حفاظت کی کوئی ضمانت حکومتی سطح پر نہیں دی جاتی، ہم اسٹرائیک پر رہیں گے۔

جواب میں ڈاکٹرز نے بھی اسٹرائیک کردی۔ یہ ہم پر

سراسر الزام ہے۔ وہ نرس ڈاکٹر سے ذاتی عناد کی بنا پر ایسا کہہ رہی ہے۔

اسپتال میں اسٹرائیک تھی اس لیے میں نے سوچا کہ میں صائمہ اور دوسرے گھر والوں کے ساتھ شاپنگ ہی کرلوں۔

میں نے گھر ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ شاپنگ کے لیے نکل چکے ہیں۔

ایک دفعہ پھر وہی منظر تھا۔ او پی ڈی کے باہر بے شمار مریض جمع تھے لیکن کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔

میں نے کریم سے ایک مرتبہ پھر او پی ڈی کا مین گیٹ بند کرا دیا تھا۔

اس وقت ایمرجنسی سے کال آئی کہ یہاں بم دھماکے کے کئی مریض بہت تشویش ناک حالت میں لائے گئے ہیں۔ یہاں ڈاکٹرز کی تعداد کم ہے اس لیے آپ پلیز ایمرجنسی میں آجائیں۔

اسٹرائیک کے دوران میں عموماً ہوتا یہ ہے کہ ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر حسبِ معمول کام کرتے رہتے ہیں۔

میں ایمرجنسی کی طرف جانے کے لیے نکلا تو اس وقت ملک کی ایک اہم شخصیت کو زخمی حالت میں لایا گیا۔ ان کی فوری نگہداشت بہت ضروری تھی۔ میں نے انہیں آپریشن تھیٹر میں منتقل کرا دیا۔

دو گھنٹے بعد جب میں آپریشن سے فارغ ہو کر نکلا تو ڈاکٹر فیضان میرے پاس آئے اور افسردہ لہجے میں بولے۔ "ڈاکٹر فرحان! آپ میرے ساتھ آیئے۔"

"کیا کوئی اور مریض آگیا ہے؟" میں نے پوچھا "میں اس وقت بہت تھک گیا ہوں، آپ ڈاکٹر شاہد کو......"

میرے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے۔ ایمرجنسی کے برآمدے میں قطار سے چھ لاشیں رکھی تھیں۔ یہ لوگ خودکش بم دھماکے میں جاں بہ حق ہوئے تھے۔ ان کے چہرے چادروں میں چھپے ہوئے تھے۔

"ہمیں افسوس ہے ڈاکٹر فرحان!" ڈاکٹر شوکت نے کہا۔ وہ ایمرجنسی وارڈ کے انچارج تھے "ہم نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن ہم آپ کی مسز کو نہ بچا سکے۔"

"میری مسز......!" میں نے حیرت سے کہا "کہاں ہے صائمہ! وہ تو شاپنگ کے لیے گئی تھی۔"

"جی ہاں، وہیں تو بم دھماکا ہوا ہے۔ اس حادثے میں آپ کا ڈرائیور بھی ایکسپائر ہوگیا ہے۔ آپ کی مسز کے پرس سے یہ شناختی کارڈ نکلا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں علم ہوا کہ میڈم صائمہ فرحان، آپ کی مسز ہیں۔"

اسپتال کے در و دیوار بُری طرح گھومنے لگے۔ ڈاکٹر شوکت اگر آگے بڑھ کر مجھے سہارا نہ دیتے تو شاید میں چکرا کر گر جاتا۔

میں نے ہمت مجتمع کی اور کانپتے ہاتھوں سے ایک لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ میں چیخ پڑا۔ وہ ثمرہ کی لاش تھی۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت اور شوخی تھی۔ دوسری لاش صائمہ کی تھی۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔ افشاں، امی اور نوشین کی لاشیں اس قابل نہیں تھیں کہ انہیں دیکھا جاتا۔ ان کے چہرے مسخ ہوگئے تھے لیکن قابلِ شناخت تھے۔

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سب سے چھوٹی لاش پر سے چادر ہٹائی۔ میرے مون کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے باوجود کہ اس کے جسم کا دایاں حصہ دھماکے میں اُڑ گیا تھا۔

مجھے بہت زور کا چکر آیا اور میں دھڑام سے فرش پر گر گیا۔

ڈاکٹروں اور نرسوں کی ملی جلی آوازوں میں ایک آواز پھر نمایاں تھی۔ وہ زبیدہ کی آواز تھی "دیکھا ڈاکٹر...... جب اپنی اولاد مرے تو دل پر کیا گزرتی ہے اور تو، تو اب سب کچھ کھو بیٹھا ہے...... تجھے بہت غرور ہے نا اپنی ڈاکٹری کا...... تو پھر انہیں زندہ کرلے...... زندہ کرلے انہیں۔"

میں نے نظریں گھما کر دیکھا، ایک پھٹے حال، اُجڑی ہوئی عورت میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔

"اس عورت کو ہٹاؤ۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"یہاں تو کوئی عورت نہیں ہے ڈاکٹر فرحان!" ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

ڈاکٹر یہ سمجھے کہ اس حادثے کی وجہ سے میں اعصابی تناؤ کا شکار ہوگیا ہوں۔

زبیدہ کے قہقہے اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہوگیا ہوں۔ اس پاگل پن کے باعث میری ملازمت ختم ہوگئی، میری پریکٹس ختم ہوگئی اور میں مجبور بن کر اپنے گھر کے ایک کمرے میں پڑا ہوا ہوں۔ اب تو میں اللہ سے گڑگڑا کر یہی دعا کرتا ہوں کہ اے مالک دو جہاں، میں نے اپنے کیے کی بہت سزا بھگت لی، اپنا پورا خاندان گنوا دیا۔ اب تو مجھے معاف کردے۔ اب تو مجھے زبیدہ کی بددعا سے نجات دے دے۔"

آئینہ

محترم مدیر اعلیٰ
سلام مسنون!

میں جب بھی لکھتا ہوں، حقیقت لکھتا ہوں۔ یہ واقعہ جو چشم کشا ہے، اس کا ہر لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ میرے ایک واقف کار کا واقعہ ہے۔ وہ ایک بڑا نام ہے اس لیے میں نے اس کا نام حذف کردیا ہے۔ امید ہے قارئین کے لیے یہ واقعہ ایک سبق ہوگا۔

منظر امام
(کراچی)

میں ایک سائے کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ سائے سے مراد ہے آنکھیں۔ گہری نیلی اور دلوں میں اُتر جانے والی خوبصورت آنکھیں!

یہ آنکھیں مجھے ایک آڈیو شاپ پر ملی تھیں۔ میں وہاں اپنے پروفیشنل کام کے سلسلے میں انگریزی کی چند کمپوزیشن لینے گیا تھا۔ بیک گراؤنڈ میوزک کے لیے۔

اس دکان میں وہ لڑکی بھی موجود تھی۔ نیلے رنگ کے برقع میں صرف اس کی خوبصورت آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں، اس کے علاوہ اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ سامنے نہیں تھا۔

لیکن چہرے کا جتنا حصہ بھی کھلا ہوا تھا اس نے یہ بتا دیا تھا کہ لڑکی کتنی خوبصورت ہے۔ وہ بھی اپنی پسند کے کیسٹ لے رہی تھی، آج کی جدید پسند۔

اور جب میں نے دکاندار کو اپنی پسند بتائی تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں بے پناہ حیرت بھی تھی اور تمسخر بھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک اچھی عمر کا آدمی ہوں۔ میرے سارے بال سفید ہو چکے ہیں اسی لیے اسے حیرت ہو رہی ہوگی کہ یہ بڑے میاں کس قسم کی ماڈرن پسند رکھتے ہیں۔

اس نے جب مجھے دیکھا تو ذرا سی دیر کے لیے میں ان خوبصورت آنکھوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ پورے بدن میں ایک سناٹا سا محسوس ہونے لگا۔

وہ آنکھیں اپنے آپ میں سمو لینے کی قدرت رکھتی تھیں۔

وہ لڑکی اپنی پسند کے کیسٹ لے کر چلی گئی لیکن میں اس دکان میں کھڑا رہ گیا تھا۔ مجھے اس وقت اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس ہونے لگا تھا۔ کاش میں اپنے وقت سے پچیس

سال پیچھے ہوتا، کاش!

میں ایک فلم ڈائریکٹر ہوں۔

میں نے ابتدا فلموں سے کی تھی پھر فلموں کا بُرا حال دیکھ کر چھوٹی اسکرین یعنی ٹی وی کی طرف آ گیا تھا اور ڈرامے وغیرہ بنایا کرتا۔

اس شاپ میں جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایک ڈرامے کے بیک گراؤنڈ میوزک کے لیے نئے آئیڈیاز لیے جائیں۔ میں جس لائن سے وابستہ تھا اس میں لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ایک سے ایک خوبصورت طرح دار لیکن اب تک کسی نے اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا ہوگا جتنا اثر یہ لڑکی دے گئی تھی، صرف اپنی آنکھوں کے ذریعے۔

وہ لڑکی محلّے ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ شاپ ایسی تھی جس میں عام طور پر اہلِ محلّہ ہی آیا کرتے تھے۔ میں خود بھی اسی محلّے میں رہتا تھا۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ میں اسے دوبارہ تلاش کرلوں گا۔ اس کے بارے میں دکاندار سے بھی معلوم کرنا مناسب نہیں تھا۔

گھر کے پاس ایک مارکیٹ بھی ہے۔ میں کئی دنوں تک ان آنکھوں کو مارکیٹ میں اور اس دکان میں تلاش کرتا رہا لیکن وہ دوبارہ دکھائی نہیں دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہیں پر کوئی سوئی اٹک گئی ہو۔

پھر ایک شام وہ دکھائی دے گئی۔ علاقے ہی کے ایک خوبصورت فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوسری لڑکی بھی تھی۔ میں اُن کے سامنے والی میز پر بیٹھا تھا اس لیے جب اس لڑکی نے میری طرف اپنی آنکھیں اُٹھائیں تو میں نے فوراً پہچان لیا۔

یہ وہی تھی وہی آنکھیں، وہی انداز، آنکھوں میں وہی شرارت۔ وہ اپنی ساتھی لڑکی سے کچھ کہنے لگی تھی اس پر اس کی ساتھی نے بھی میری طرف دیکھا تھا۔ شاید اس لڑکی نے یہ بتایا ہوگا کہ بڑے میاں کو اس عمر میں بھی انگلش گانوں کا شوق ہے یا اسی قسم کی کوئی اور بات۔

ساتھی لڑکی ہنسنے لگی تھی اور میں...... میں تو ایک بار پھر ان آنکھوں کے سحر میں کھو گیا تھا۔ ایسی بولتی اور جادو جگاتی ہوئی آنکھیں بہت کم ہی ہوتی ہوں گی۔

جب وہ چلنے لگیں تو غیر ارادی طور پر میں بھی ان کے پیچھے چل پڑا بہت مناسب فاصلہ دے کر میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس تعاقب کا احساس ہو جائے۔

انہیں احساس بھی نہیں ہوا اور میں نے ان کا مکان دیکھ لیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ وہ ایک خوبصورت مکان تھا۔ ایک منزلہ لیکن بہت نفیس۔ چھوٹا سا لان جس میں بہت خوبصورت پودے لگے ہوئے تھے۔

اتنی خوبصورت آنکھوں والی لڑکی کا گھر ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں ایک بڑی عمر کا آدمی ہوں اسی لیے مجھے ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ میری بیوی ہے دو بچے ہیں اس کے باوجود میں اس لڑکی کی قوت کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

دل چاہتا تھا کہ اس سے باتیں کروں۔ اس سے ملوں اور اس کی آنکھوں کے دریا میں ڈوب جاؤں، اسی لیے میں نے اس کے گھر کے آس پاس چکر لگانے شروع کر دیے اس توقع پر کہ شاید وہ کبھی دکھائی دے جائے۔

ایک دن پھر وہ دکھائی دے گئی۔

اس دن وہ اکیلی تھی اور ایک دکان سے باہر آ رہی تھی۔ میں جان بوجھ کر اس کے سامنے آ گیا کہ وہ مجھے دیکھ سکے اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ اس نے یقیناً مجھے شناخت کر لیا تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے یہ احساس ہو کہ میں اس میں ...... دلچسپی لینے لگا ہوں۔ کچھ آگے جا کر ایک بک اسٹال تھا۔ میں میگزین وغیرہ دیکھنے کے بہانے وہاں کھڑا ہو گیا۔

نہ جانے کس توقع پر اور یہ توقع اس طرح پوری ہوئی کہ وہ بھی اسی اسٹال پر آ گئی تھی اور اس نے ایک فیشن میگزین طلب کیا تھا۔

میں نے ایک میگزین اُٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی جبکہ میرا دھیان اسی کی طرف تھا۔ میگزین کی قیمت ادا کرنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ ”ماشاءاللہ ہر قسم کا شوق ہے آپ کو۔“

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ بہت ہی شوخ قسم کا جملہ تھا جس سے اس کے مزاج کی شرارت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میں نے بھی ایک میگزین کی قیمت ادا کی اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ لیکن وہ مارکیٹ کی بھیڑ میں کہیں گم ہو چکی تھی۔

اس سے ایک اور ملاقات بھی اسی انداز سے ہوئی تھی۔ میں ایک دکان سے اپنی پسند کا پرفیوم لے رہا تھا اور مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ لڑکی بھی اسی دکان میں میرے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ جب میں پرفیوم لے کر باہر نکلنے لگا تو پھر اس پر نظر پڑی اور اس بار بھی اس نے ایک جملہ چست کر

”یہ عمر تو عطر گلاب خریدنے کی ہوتی ہے“ ماڈرن...“

میں مسکرا دیا۔ اس بار میں خاموش نہیں رہا تھا۔ ”محترمہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن سے ملنے کے بعد گزرتی ہوئی عمر کا احساس نہیں ہوتا وہ پھر سے جوان کر دیتے ہیں۔“

”تو کس نے جوان کیا ہے آپ کو؟“

”ہے ایک لڑکی۔ جس کی اب تک صرف آنکھیں دیکھی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”بہت خوب۔“ وہ مسکرا دی۔ اس کے مسکرانے کا اظہار اس کی آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ ”خدا آپ کے حال پر رحم کرے۔“

”آنکھیں رحم کر جائیں تو خدا بھی رحم کر دے گا۔“

وہ چند لمحوں تک دیکھتے رہنے کے بعد آگے بڑھ گئی۔ خود بھی اس طرح مارکیٹ میں کھڑے ہو کر اس سے باتیں کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

اب بے قراری میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اب اس سے باتیں بھی ہو گئی تھیں۔ شوخ لہجہ۔ خوبصورت آواز۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا۔ وہ اس قابل تھی۔

ایک بار پھر ملاقات ہو گئی۔ میں یہ کہوں گا کہ یہ ملاقات اتفاقاً ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں میری کوششوں کا دخل تھا۔ یعنی اس کے گھر کی نگرانی کے دوران میں اور جب وہ گھر سے نکل کر مارکیٹ کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی تو میں اس کے سامنے آ گیا تھا۔

”خدا کی پناہ۔ کچھ لوگ ہمیشہ مارکیٹ ہی میں دکھائی دیتے ہیں۔“ میں اس کے قریب سے ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

”خدا کی پناہ۔ کچھ لوگ اس عمر میں بھی ایسی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔“ یہ اس کا جملہ تھا۔

اس دن بھی ان دو جملوں کے تبادلوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوا لیکن ایک دن میں نے دل کڑا کر کے اس سے دو چار باتیں کر ہی لیں۔ وہ راستے میں مل گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا انگلش گانے پسند کرنا اور البم وغیرہ لینا میرے پروفیشن کی مجبوری ہے۔“

”اوہو۔ ایسا کون سا پروفیشن ہے کہ آپ ماضی کی طرف لوٹ گئے ہیں۔“

میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ”میوزک میں اپنے ڈرامے کے بیک گراؤنڈ کے لیے پسند کر رہا تھا۔“

لفظ مشاعرہ مروج و مستعمل ہوا تو اس کے دوش بدوش اسی وزن کے اور کئی الفاظ بنا لیے گئے اور معنوی اعتبار سے مشاعرے کے مترادفات قرار پائے۔ ان لفظوں میں مراختہ، مسالمہ، مناظمہ اور مغازلہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مراختہ کی اصل عربی نہیں ہے یہ ریختہ یعنی اردو سے بروزن مشاعرہ گھڑ لیا گیا ہے۔ ریختہ کا لفظ اصلاً فارسی مصدر ”ریختن“ کا اسم مفعول ہے اور اس کے لغوی معنی گرا پڑا اور کم مایہ و کم رتبہ ہیں۔ اردو کو چونکہ شروع شروع میں فارسی کے مقابلے میں کم تر درجے کی عامیانہ زبان خیال کیا جاتا تھا اس لیے ”ریختہ“ کہا جانے لگا۔ فارسی میں ”ریختن“ کے دوسرے لغوی ومجازی معنی کی رعایت سے ریختہ کے معنی پختہ اور مضبوط و مستحکم بھی ہیں۔ اردو چونکہ متعدد زبانوں کے آمیزے سے وجود میں آئی ہے اور اس کی تعمیر کے لیے کئی اجزا کو ملا کر مسالا تیار کیا گیا ہے اس لیے اردو کو ریختہ کہا جانے لگا۔ وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو، اس میں شبہ نہیں کہ ”ریختہ“ اردو ہی کا دوسرا نام ہے اور اردو میں لفظ ”مراختہ“ اسی سے مشتق ہے۔ حتیٰ کہ ”ریختہ“ سے اردو میں ایک نئی اور بہت عجیب و غریب صنف سخن ”ریختی“ کے نام سے وجود میں آ گئی۔

”مراختہ“ کا لفظ غالباً اردو مشاعرے کو فارسی مشاعرے سے ممیز کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ شعرائے قدیم کے تذکروں ہی میں یہ لفظ نظر آتا ہے۔ میر تقی میر نے میاں کمترین کے بیان میں لکھا ہے کہ ”گاہے گاہے در مجلس مراختہ کہ ایں لفظ بروزن مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود“ (نکات الشعراء، مرتبہ مولوی عبدالحق اورنگ آباد 1935ء، صفحہ 147) لیکن بہ قول مولوی عبدالحق ”یہ اصطلاح صرف چند روز ہی رہی۔ خود ریختہ کا لفظ بھی کبھی کبھی غالب کے ابتدائی دور تک استعمال ہوا پھر جب یہ زبان عام ہو گئی تو خود بخود متروک ہو گیا۔“ (الطبات عبدالحق، دہلی 1938ء، صفحہ 79) مسالمہ اپنی ساخت اور اصل میں عربی ہے، باہم سلام علیک کے معنی رکھتا ہے اور قدما میں اسی طور پر مستعمل رہ چکا ہے لیکن مرثیے کی مقبولیت کا دور آیا تو اس کے لوازم کے حوالے سے اس لفظ نے ایک الگ صنف سخن کی صورت اختیار کر لی۔ اس طرح جب صرف سلام پڑھنے یا سنانے کی غرض سے شعرا اکٹھا ہوئے تو اس مجلس کو مسالمہ کہا جانے لگا۔

اقتباس: مشاعرہ از فرمان فتح پوری

مرسلہ: تسنیم کوثر، حاصل پور

"چلیں مان لیا کہ یہ آپ کے پروفیشن کی مجبوری تھی لیکن آپ کو صفائی پیش کرنے کی مجبوری کیوں ہوگئی ہے؟"

اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا میرے پاس۔ اب اسے کیا بتاتا کہ اس کی آنکھوں نے مجبور کردیا ہے۔

"ڈائریکٹر صاحب۔ میں بتاتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "یہ آپ کی رومان پسند طبیعت کی مجبوری ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے اعتراف کرلیا تھا۔

"تو فرمائیں کیا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم ڈسٹرب ہوتی رہی ہو۔ لیکن اب میں تمہیں دکھائی نہیں دوں گا۔"

"ارے ارے۔ آپ تو اتنی سی بات کا بُرا مان گئے۔" اس کی ہنسی بھی اس کی آواز میں شامل ہوگئی تھی۔ "چھوڑیں یہ سب۔ آپ اگر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو ملتے رہا کریں۔ وہ بھی اس لیے اتنی رعایت دے رہی ہوں کہ آپ ایک کریٹو آدمی ہیں۔ آپ نے بہت اچھے ڈرامے پروڈیوس کیے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ بہت اچھے دوست ثابت ہوسکتے ہیں۔"

"اس اعتماد کا بہت بہت شکریہ۔" اب میں بھی مسکرادیا۔

میں نے ہی اسے دعوت دی تھی اور ہم ایک ریستوران میں آکر بیٹھ گئے۔ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ میرے ساتھ اگر کوئی بے پردہ لڑکی ہوتی تو شاید ایسا محسوس نہیں ہوتا۔

میں نے یہ عام طور پر دیکھا ہے کہ لڑکی اگر بے پردہ ہو تو اس کی طرف بس ایک دو بار نگاہیں اُٹھتی ہیں اور اگر برقعے والی لڑکی ہو تو پھر نگاہیں اس طرح اس میں ترازو ہوجاتی ہیں۔ جیسے اس کے وجود میں اُتر رہی ہوں۔

وہی کیفیت یہاں بھی تھی اور اس لڑکی کو اس کا احساس بھی تھا۔ "ڈائریکٹر صاحب۔ دیکھا آپ نے۔ لوگ کس طرح ہم دونوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ وہی دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ سے حسد محسوس کررہے ہیں کہ دیکھو۔ یہ بڑے میاں کس کو گھیر کرلے آئے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

خدا کی پناہ۔ کتنی شوخی تھی اس کے مزاج میں۔ کیسے کیسے جملے بولا کرتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں میں اس کی باتوں کا بُرا نہیں مان رہا تھا بلکہ اندر سے خوشی سی محسوس ہورہی تھی۔ "چلو۔ اب تم کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"نام تو میرا تبسم ہے۔" اس نے بتایا۔ "بی اے کی طالبہ ہوں۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔ والد صاحب سرکاری آفیسر ہیں، وغیرہ وغیرہ۔"

"مزید کوئی بات۔"

"پتا نہیں آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں لیکن میری زندگی میں فی الحال مزید کچھ بھی نہیں ہے اور آپ۔"

"ظاہر ہے کہ میری شادی ہوچکی ہے۔ دو بچے ہیں۔"

"اور عشق؟" اس نے بڑی بے باکی سے دریافت کیا۔

"ہاں۔ بہت پہلے ایک عشق کیا تھا۔" میں نے بتایا۔ "تمہاری جیسی آنکھوں والی ایک لڑکی تھی۔"

"اس لیے جب آپ نے مجھے دیکھا تو آپ خود پر قابو نہیں رکھ سکے ہوں گے۔ آپ کو اس کی یاد آگئی ہوگی۔ کیوں...... یہی بات ہے نا۔" اس کی آنکھوں میں شرارت جیسے رقص کررہی تھی۔

"اب تمہارے سامنے تو میں کچھ بول نہیں سکتا۔" میرے ہونٹوں پر ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔ "ہاں شاید یہی بات ہے۔ ورنہ مجھ جیسے آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی لڑکی کے لیے خوار ہوتا پھرے۔"

کچھ دیر تک ہم وہیں بیٹھے رہے۔ بہت مزے کی باتیں کیا کرتی تھی۔ پھر ہم ہوٹل سے باہر آگئے۔ اس نے مجھ سے موبائل نمبر لے لیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "ڈائریکٹر صاحب۔ آپ خود مجھ سے ملنے کی کوشش مت کیجیے گا اور نہ ہی میری گلی کے چکر لگائیے گا کیونکہ میری گلی کے بچے ہر وقت ہاتھوں میں پتھر اٹھائے رکھتے ہیں اور میں ایسی بھی نہیں ہوں کہ دوڑ کر سامنے آجاؤں اور چلا چلا کر گانے لگوں کہ کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔"

"اب میں کیا کہوں۔ تمہاری یہی باتیں مجھے پریشان کردیتی ہیں۔"

"کیا میں آپ کے گھر آسکتی ہوں۔" اس نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"بس یوں ہی۔ دیکھنا چاہتی ہوں کہ ایک رائٹر اور ڈائریکٹر کی طرزِ رہائش کیسی ہے۔" اس نے کہا۔ "اس بہانے میں آپ کی بیوی سے بھی مل لوں گی۔ آپ سے تو جان پہچان ہوچکی ہے۔ آپ کی بیوی سے بھی ہوجائے۔"

"لیکن تم اس سے کہو گی کیا؟"

"بہت آسان ہے۔ میں یہ کہوں گی کہ میں آپ کی فین ہوں۔ آپ جیسے لوگوں کے لیے تو یہ ایک اچھا بہانہ ہوتا ہے۔"

"تم واقعی بہت ذہین ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم فون کرکے آنا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں آپ کی غیر موجودگی میں آؤں گی۔"

"او کے۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنا پتا سمجھا دیا۔

ایک شام میری بیوی نے مجھ سے کہا۔ "آج ایک لڑکی آئی تھی۔"

میں سمجھ گیا کہ وہی ہوگی۔ بہرحال میں نے اپنے انداز سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ "کیوں آئی تھی۔" میں نے سرسری انداز میں دریافت کیا۔

"اسے آپ کے ڈرامے بہت پسند آتے ہیں۔" بیوی نے بتایا۔ "تبسم نام ہے اس کا۔ میں تو بس اس کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ خدا کسی کو ایسا نہ کرے۔"

"کیوں! کیا ہوگیا۔"

"اس کا پورا چہرہ بدنما ہے۔" بیوی نے کہا۔ "صرف آنکھیں سلامت ہیں۔ آنکھوں کے نیچے تو۔ بس کچھ مت پوچھیں۔ یہ بڑے بڑے دانے۔ دانے ہی دانے۔"

میں سٹ پٹا کر رہ گیا۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے وہ ہر وقت ایسی نقاب باندھے رہتی ہے جس میں صرف آنکھیں ہی دکھائی دیں۔ مجھے یہ سن کر ایک زبردست ذہنی جھٹکا سا لگا۔

میرے سارے خوبصورت تصورات دھواں بن کر اُڑ گئے۔ اس کی آنکھوں نے کیسے دھوکے میں رکھا تھا مجھے۔ مجھے اس کا حال سن کر بہت افسوس بھی ہوا۔

بیوی اُٹھ کر چلی گئی اور میں اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔

میرے خدا۔ یہ کیسی عجیب بات تھی۔ اتنی خوبصورت آنکھیں رکھنے والی اور اتنی ذہانت اور زندگی سے بھرپور باتیں کرنے والی لڑکی ایسی ثابت ہوئی تھی۔

اور خود میں کیا کررہا تھا؟ میں اپنے آپ کو ٹٹول رہا تھا۔ میں جو اس کی طرف بہت تیزی سے کھنچ رہا تھا۔ جس کے مکان کے اردگرد چکر لگا تا رہا تھا۔ اب سب کچھ معلوم ہونے کے بعد میرا کیا رویّہ ہونا چاہیے تھا۔

کیا کرتا میں۔ بہرحال کچھ دنوں کے بعد اس سے پھر ملاقات ہوگئی۔ اس کا وہی انداز تھا۔ یعنی مکمل نقاب۔ صرف آنکھیں کھلی ہوئی۔ زندگی سے بھرپور جاگتی اور شرارت کرتی ہوئی آنکھیں۔

وہ اچانک ہی میرے سامنے آگئی۔ "کیا حال ہیں ڈائریکٹر صاحب۔ کئی دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہورہی

مشاہیر عالم کی نظر میں اسلام، حضور پرنورؐ کی شخصیت

جان ڈیون پورٹ:

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلوص وصداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے جو آپؐ کے گھر کے دوست اور قریبی رشتے دار تھے۔

ڈی جی ہوگرتھ:

آپؐ کے روزمرہ اعمال وافعال نے ایک ایسے قانون کی شکل اختیار کرلی ہے جس پر کروڑوں انسان پورے شعور کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ کسی انسان کی بھی، جسے نوع انسانی کے کسی گروہ نے انسان کامل ٹھہرایا ہو، جزوی سے جزوی امر میں اس طرح پیروی نہیں کی گئی جیسے آپ کی۔ بانی مسیحیت کے کردار نے بھی اپنے پیروؤں کی عام زندگی پر ایسا اثر نہیں ڈالا۔ علاوہ ازیں کسی بانی مذہب کو تن تنہا ایسی عظمت نہیں ملی جیسی پیغمبرِ اسلام کو۔

اے ایم ایل اسٹارڈ:

تاریخ انسانی میں غالباً کوئی واقعہ ایسا حیرت انگیز نہیں جیسے اسلام کا ظہور۔ ایسی سرزمین اور ایسی قوم سے اُبھر کر جن کی قبل ازیں کوئی وقعت نہ تھی، اسلام ایک صدی کے اندر اندر نصف کرۂ ارض پر پھیل گیا۔ اس نے بڑی بڑی سلطنتوں کا تختہ اُلٹ دیا، صدیوں سے قائم شدہ مذاہب کا خاتمہ کردیا، اقوام وامم کے ذہن کو ایک نئے قالب میں ڈھال دیا اور ایک بالکل نئی دنیا یعنی دنیائے اسلام پیدا کردی۔

اسٹینلے لین پول:

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اپنے دشمنوں پر سب سے بڑی فتح مندی کا دن آپ کی اپنی ذات پر سب سے بڑی فتح کا دن بھی تھا۔ قریش نے سالہا سال تک آپ کو تکالیف پہنچائیں اور اپنے ظلم ونفرت کا نشانہ بنایا لیکن آپؐ نے عفو ودرگزر سے کام لیا اور اہلِ مکہ کو غیر مشروط طور پر معاف کردیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے آبائی شہر میں اس طرح داخل ہوئے کہ فتوحات کی ساری تاریخ میں آپؐ کے فاتحانہ داخلے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

انتخاب: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

ہے۔"

"ہاں۔ پچھلے دنوں کچھ مصروف رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے گھر بھی گئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "آپ کی بیوی سے ملاقات ہوئی تھی۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔"

"ہاں۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔"

"اور یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں کیسی ہوں۔" اس نے کہا۔ "شاید اس لیے میری طرف سے آپ کا سارا جوش ٹھنڈا ہو چکا ہے۔"

"نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ڈائریکٹر صاحب۔ میں بھی چہرے پڑھنا جانتی ہوں۔ خیر چھوڑیں۔ چلیں۔ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

ہم ایک ہوٹل میں آ گئے۔ یہاں کیبن کا بھی انتظام تھا۔ وہ مجھے ایک کیبن میں لے آئی۔

"جی اب بتائیں۔" اس نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں؟"

"ڈائریکٹر صاحب۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ حسن پرست ہوتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو کنٹرول میں رکھے۔ اسے اپنے آپ پر جبر کرنا پڑتا ہے کیونکہ حسن پرست اور رومانویت کا وقت نکل چکا ہوتا ہے۔ وہ اب عمر کا کافی حصہ طے کر چکا ہوتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

"نہیں۔ تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔"

"اسے اپنے آپ کو مارنا ہوتا ہے۔ اپنی ساکھ کے لیے۔ اپنی عمر کے لیے۔ اپنے گھر کے لیے۔ اپنی بیوی بچوں کے لیے۔ یہ عمر عشق کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ اپنا تجزیہ کرنے کی ہوتی ہے۔"

"تم شاید مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"نہیں۔ احساس دلانا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "جس وقت ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ اسی وقت میں نے محسوس کر لیا تھا کہ آپ میری آنکھوں کے سحر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ کو میں پسند آ گئی ہوں۔ یہ جھوٹ تو نہیں ہے۔"

"نہیں۔ تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔"

اس کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور احساس ہو گیا کہ آپ نوجوانوں جیسی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ یعنی میرا انتظار کرنا۔ گلی کے چکر کاٹنا اور یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی۔ کم از کم آپ کو بالکل زیب نہیں دیتا تھا۔ میں سوچتی رہی کہ آپ کو کس طرح روکا جائے کیونکہ آپ تو مجھے خوبصورت سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ پھر میں نے مناسب سمجھا کہ میں آپ کے گھر جا کر آپ کی بیوی کے سامنے خود کو ظاہر کر دوں اور میں نے خود کو ظاہر کر دیا۔ نتیجہ یہ دیکھ رہی ہوں کہ آپ کے سر کا بھوت اُتر چکا۔ آپ مجھ سے کترانے لگے ہیں۔"

"نہیں۔" میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "میں ابھی بھی تم سے دوستی کرنے کو تیار ہوں۔"

"لیکن یہ دوستی صرف مہربان اور ہمدرد دوست کی ہوگی۔ ایسا دوست جو دوست بھی ہو اور بزرگ بن کر ساتھ دے سکے۔ بتائیں۔ کیا آپ ایسی دوستی کے لیے تیار ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ "کیونکہ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"چاہے میں جیسی بھی ہوں۔"

"ہاں۔ چاہے تم جیسی بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری ذہانت، تمہاری باتوں اور تمہاری شرارتی آنکھوں سے دلچسپی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

"بدل تو نہیں جائیں گے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تو پھر آپ بھی مجھے دیکھ لیں۔" اس نے اپنا نقاب اُتار دیا۔

خدا کی پناہ۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اپنی خوبصورت آنکھوں کی طرح وہ مجسم خوبصورت تھی۔ صاف شفاف چہرہ۔ کہاں کے دانے۔ کہاں کے داغ دھبے۔ کچھ بھی نہیں تھا۔

"تو پھر۔ میری بیوی نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے اس بے چاری کے پاس اپنی ایک دوست کو بھیجا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اس بے چاری کا چہرہ ایسا ہی ہے جیسا آپ نے سنا ہوگا۔ اب بتائیں۔ اب کیا کہتے ہیں۔"

"کیا کہوں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "ایک بار پھر تمہاری ذہانت اور شرارت کا قائل ہو گیا ہوں۔"

"تو پھر ہم دوست تو ہو گئے نا۔"

"ہاں۔"

"کیسے دوست؟"

"جیسے دوست کی تمہیں خواہش ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

✖

جھانسا

مکرم ومحترم معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

میں پیشے کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہوں اور یہ میری اپنی روداد ہے۔ میرے ساتھ ایک عورت نے کتنا عجیب مذاق کیا ہے، اسی کی روداد سنا رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ میری طرح کوئی اور بے وقوف نہ بنے، کسی اور کی شہرت داؤ پر نہ لگے، کوئی اور معصوم اپنی معصومیت کا شکار نہ بن جائے۔

ڈاکٹر ذیشان سولنکی

(جیکب آباد)

رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مریضوں کا رش کم ہو گیا تھا۔ دس بجے تک میں آخر کے دو "وزٹس" نمٹا کر گھر روانہ ہو جاتا تھا۔ چونکہ آج کوئی وزٹ نہیں تھا اس لیے آج گھر نصف گھنٹا پہلے پہنچنے کی امید تھی۔ ویسے بھی جلدی گھر جا کر کیا کرنا تھا، سونا ہی تھا۔ میں والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں، سب سے بڑی کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری چچازاد سے منسوب تھی۔ میری بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔

میں نے بھی حال ہی میں ایم بی بی ایس کیا تھا، ہاؤس جاب کرنے کے فوراً بعد جیکب آباد میں ہی کلینک کھول لیا تھا کیونکہ یہی میرا آبائی شہر تھا۔ اللہ کا شکر تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں میری پریکٹس خاصی جم گئی۔ ساتھ ہی میں گورنمنٹ جاب کے لیے بھی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھا۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی...... پہلے اپنا تھوڑا تعارف تو کرا دوں ورنہ آپ کو میری یہ سچی مگر حیرت انگیز کتھا پڑھنے کا وہ مزہ نہیں آئے گا۔

بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ آج مجھے کلینک سے واپسی پر کوئی وزٹ نہیں کرنا تھا مگر جب میں آخری مریض کو فارغ کرنے کے بعد اسے اپنے ڈسپنسر کے حوالے کر کے جانے کی تیاری کرنے لگا تو دو افراد کلینک میں داخل ہوئے، میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی مریض نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اُن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ مجھے لینے آئے تھے، ان کا کوئی مریض تھا جس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے اپنے کمپاؤنڈر سے میڈیکل ایمرجنسی بیگ تیار کرنے کو کہا، ان میں سے ایک نے میرا باکس سنبھالا، دوسرے نے تانگا پکڑا اور ہم چل پڑے۔ دونوں آدمی میرے لیے اجنبی تھے۔ یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ میرے کلینک میں تقریباً روزانہ ہی دوسرے علاقے سے مریض آتے تھے۔ اجنبی سے مراد آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ لوگ جو میرے مستقل مریض نہ تھے۔ جیکب آباد شہر تھا ہی کتنا بڑا، سب ایک دوسرے کے دیکھے بھالے تھے۔ میرا کلینک سکھر، شکار پور جانے والی مین شاہراہ پر واقع تھا۔ یہ علاقہ جعفر آباد کہلاتا تھا۔ مغرب میں شہر تھا، مشرق میں لمبی سڑک...... ہمارا تانگا مشرق ہی کی سمت چل رہا تھا۔

ریلوے پھاٹک پار کرنے کے بعد کوئی پندرہ بیس منٹ بعد تانگے والے کو دائیں جانب کے قدرے نشیبی کچے راستے پر اُترنے کو کہا گیا۔ آگے چھوٹے چھوٹے گھروں کے خاکے نظر آرہے تھے، کہیں کہیں ٹمٹماتی روشنی نظر آرہی تھی۔ یہ مضافاتی علاقے کا کوئی گوٹھ تھا، مجھے نہ جانے کیوں بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ ہمارے علاقے میں یہ بدامنی بھی تو تھی، لوٹ مار، اغوا برائے تاوان۔

بہرطور کسی کچی آبادی کے چھوٹے سے گوٹھ میں ہم داخل ہوئے، پھر ایک گارے مٹی کی دیواروں والے گھر کے سامنے تانگا رک گیا۔ ہم نیچے اُترے، ایک نے لکڑی کا اکلوتے پٹ والا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا، اندر... بلب کی روشنی میں مجھے چار افراد نظر آئے۔ وسط میں ایک چارپائی پر کوئی رلی اوڑھے بیٹھا تھا۔ میں اندر داخل ہوا، ایک نے مریض پر سے رلی ہٹائی۔ میں مریض کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ ایک جوان اور خوبصورت عورت تھی۔ اس نے سر پر کپڑے کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی، یہ جوان عورت اور وہ بھی کسی ایسے گھر میں جدھر صرف دو جوان مرد رہتے تھے، میرے لیے یہ بات باعث حیرت تھی۔ یہی نہیں بعد میں تین مزید جوان اور ہٹے کٹے مرد بھی وہاں پہلے سے موجود تھے، گویا ان پانچ مردوں کے بیچ یہ جوان عورت تنہا تھی، کیوں؟..... خیر، میں اپنا کام نمٹانے لگا۔

عورت کو تیز بخار تھا اور شدید کمزوری بھی لاحق تھی۔ میں نے تفصیلی طبی معائنے کے بعد ایک شخص سے کہا۔

"اس عورت کی حالت زیادہ خراب ہے...... اسے میرے کلینک پر پہنچانا ہوگا۔ وہاں اسے ڈرپ لگے گی اور اس کے اندر کچھ مزید انجکشن شامل کرنا پڑیں گے۔"

وہ پانچوں افراد ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انہوں نے ایک کونے میں جا کر آپس میں کھسر پھسر کی۔ اس کے بعد ایک شخص مریضہ کو میرے کلینک تک لے چلنے پر راضی ہوگیا۔ مریضہ کو تانگے میں سوار کرایا گیا۔ ایک شخص اسے سنبھالے ہوئے بیٹھ گیا اور تانگا واپس چل پڑا۔ کلینک میں کوئی مریض نہ تھا، عورت کو کوچ پر لٹا کر ڈرپ لگا دی گئی اور اس کے اندر چند ضروری انجکشن ڈال دیے گئے۔ ڈرپ ڈیڑھ گھنٹے بعد ختم ہونا تھی، کلینک سے دیر ہونا معمول کی بات تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ میرے گھر والے پریشان نہیں ہو رہے ہوں گے۔ البتہ میرا ایک کمپاؤنڈر چھٹی لے کر جا چکا تھا۔ دوسرا موجود تھا۔ میں اپنی کرسی پر نیم دراز ہوگیا اور اس شخص کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مجھے خاصا مضطرب نظر آرہا تھا اور بار بار میرے قریب کھڑے کمپاؤنڈر کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے مگر کمپاؤنڈر کی موجودگی میں کترا رہا ہے۔ میں نے کمپاؤنڈر کو بہانے سے چائے لانے کے لیے بھیج دیا۔ مریضہ ہنوز نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

"ڈاکٹر سائیں! آپ کی فیس کتنی ہوئی؟" اس آدمی نے مجھ سے پوچھا۔

"وزٹ کے پانچ سو روپے اور ڈرپ وغیرہ کے ہزار، کل ملا کے پندرہ سو۔" میں نے اپنی فیس ٹوٹل کر کے بتا دی۔

اس نے جھٹ ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال لیے۔ میں نے پانچ سو واپس کیے۔

"سائیں! میں ابھی ذرا تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" باقی کے پیسے لے کر وہ بولا اور اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

اتنے میں کمپاؤنڈر چائے لے آیا۔ ہم نے اس آدمی کا انتظار کیا مگر وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگیا تھا۔ چائے ہم نے ہی پی۔ حتیٰ کہ ڈرپ بھی ختم ہوگئی اور مریضہ کو بھی ہوش آگیا تھا۔ بالکل بھلی چنگی ہوگئی۔ اس کی عمر پچیس برس کے لگ بھگ تھی۔ گہرائی لیے ہوئے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، دراز گیسو اور سرخ و سپید رنگت۔ اس نے علاقائی طرز کا لباس پہن رکھا تھا جو خاصا بوسیدہ ہو رہا تھا۔ میرے اندر عجیب عجیب خیالات اُبھر رہے تھے، کچھ کچھ اندازہ بھی ہو رہا تھا۔

بالآخر میں نے اس سے پوچھا "اب کیسی ہے تُو؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور ہولے سے بولی "ٹھیک ہوں۔"

"یہ مرد کون تھا تیرے ساتھ؟ ابھی تک واپس نہیں

آیا؟" میں نے اس سے کہا۔

"وہ نہیں آئے گا...... اور نہ ہی میں اس کو جانتی ہوں۔" عجیب سے لہجے میں بولی۔

"ایں......!" میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا "یہ کیا کہہ رہی ہے تو چھوکری! وہ نہیں آئے گا...... مگر کیوں؟ اور وہ تیرا کچھ نہیں لگتا......؟"

"ہاں ڈاکٹر صاحب! وہ نہیں آئے گا۔"

"آخر وہ لوگ تھے کون؟ اور تو پھر ان کے پاس وہاں کیا کر رہی تھی؟" میں نے اُلجھن سے کہا۔

اس کے حسین چہرے کی معصومیت پر جیسے غموں کی بارش برس پڑی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی، میں سٹپٹا گیا۔

"روتی کیوں ہے چھوکری! کچھ بتا تو سہی، تو کون ہے اور وہ کون تھے؟"

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے آنسو پونچھے پھر اپنی سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے بتانے لگی۔

"میں..... حالات کی ستائی ہوئی لڑکی ہوں، میرا نام کیراں ہے۔ میں شکار پور کی رہنے والی ہوں۔ میرا بوڑھا باپ چند روپوں کے عوض ایک بڈھے سے میری شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں بہت روئی چلائی مگر اس پر جوں تک نہ رینگی بلکہ اُلٹا مجھے یہ دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے "کاری" قرار دے کر مار ڈالے گا۔ میں خوف زدہ ہوگئی۔ پھر مجھے مجبوراً اس بڈھے کھوسٹ سے بیاہ دیا گیا۔ مجھے اس کے وجود سے ہی کراہیت آتی تھی۔ میں اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔ یوں تو میں نے بھی اپنے دل میں یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ اسے اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دوں گی مگر مجھے بعد میں سخت حیرت ہوئی کہ اس نے بھی کبھی میرے ساتھ زبردستی کرنے یا میرے قریب آنے اور مجھے چھونے کی کوشش نہ کی۔ میں نے سوچا، شاید اس عمر میں وہ ناکارہ ہوگیا ہوگا...... کچھ عرصہ گزرا، اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔

"تو اگر کسی جوان چھوکرے سے شادی کرنا چاہتی ہے تو میں کروا دیتا ہوں۔"

مجھے اس کی بات پر خوشگوار سی حیرت آمیز خوشی ہوئی بالآخر میری اس کے ساتھ مسلسل نفرت آمیز سلوک نے اسے مایوس کر ہی ڈالا تھا۔

"تو مجھے چھوڑ دے، یہی کافی ہے۔" میں نے بڑی رکھائی سے کہا تھا۔

"نہیں، میں نے تیرے پیو (باپ) کو پورے پچاس ہزار دیے ہیں، میں بھی آخر تیرے ٹکے کھرے کروں گا۔" وہ

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں، ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

خبیثانہ لہجے میں بولا۔

میں نے سوچا چلو کچھ بھی ہو، اس بڈھے سے تو جان چھوٹے۔ جوان آدمی کے ساتھ پھر بھی گزارہ ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر، یوں ایک تیس پینتیس سالہ شخص سے بیاہ دی گئی۔ وہ رنڈوا تھا، اس کی بیوی چار بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ مجھے معقول لگا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جوان شخص اس پہلے والے بڈھے سے بھی گیا گزرا تھا کیونکہ وہ نشہ کرتا تھا، چرس سے لے کر ہیروئن تک۔ چرس تو وہ دن میں کئی کئی بار پیتا تھا۔ اس کے بچوں کو رحم کھا کر اس کا کوئی بے اولاد رشتے دار اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس بدبخت نے ان کے بھی ٹکے کھرے کیے تھے۔ پھر اس مردود نے نشے کے پیسے پورے کرنے کے لیے مجھے بدکاری پر مائل کرنا چاہا اور ایک روز رات کو وہ کسی ''گاہک'' کو بھی لے آیا۔ میں کسی طرح اپنی عزت بچا کر وہاں سے بھاگی۔ مجھے سخت بخار نے آلیا۔ میں جیکب آباد آنے والی ایک لاری میں سوار ہوگئی اور راستے میں ان بھیڑیوں کے چنگل میں پھنس گئی۔ وہ مجھے اپنی اوطاق میں لے آئے مگر میری نازک حالت کے پیشِ نظر پریشان ہوگئے۔ میں نے انہیں ڈرانے کے لیے کہا کہ میں جس ہیروئنچی کی بیوی ہوں، اس کم بخت کو ایڈز کی بیماری تھی اور اب مجھے بھی ہوگئی ہے۔ ایڈز کی بیماری کی شہرت تو یہاں ہر خاص و عام میں پھیلی ہوئی ہے، تب انہوں نے مجھے ہاتھ تک لگانا گوارا نہ کیا اور مجھ سے خوف زدہ ہوگئے اور مجھے علاج کروانے کے بہانے یہاں چھوڑ گئے۔''

☆☆☆

اپنی عبرت ناک کہانی بیان کرنے کے بعد وہ خاموش ہوگئی۔ میں خود اس کی درد بھری بپتا سن کر متحیر سا رہ گیا اور پھر کسی خیال سے پریشان ہو کر بولا۔

''اب تو کہاں جائے گی؟ تیرا تو کوئی گھر گھاٹ بھی نہ رہا؟''

''ہاں ڈاکٹر سائیں! میرا تو اللہ سائیں کے سوا اب اس دنیا میں کوئی نہ رہا۔ میرا ابو (باپ) بھی کب کا مر چکا ہے۔'' وہ پھر روہانسی ہونے لگی۔

میں پریشان ہوگیا مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ لڑکی میرے دل کو بھا گئی تھی۔ اب جانے اس میں میری ہمدردی کا دخل تھا یا اس کے معصوم حسن کا مگر میں اس کی مدد کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا تھا کیونکہ وہ شادی شدہ ہونے کے بعد بھی کنواری تھی۔

انسان کی سوچ کی کایا پلٹتے کب دیر لگتی ہے۔ میر سنجیدہ سوچ کے گھوڑے پھر دور تک دوڑتے چلے گئے۔ بڑی بہن دوسرے شہر بیاہی تھی، دوسری کی شادی ہوئے تھی۔ وہ سکھر بیاہی جاتی تھی۔ میرے ماں باپ بہت ضعیف تھے۔ باپ کو بھی دل کا مرض لاحق تھا۔ میں نے سوچا چلو بٹھائے ایک حسین اور شریف دوشیزہ کا رشتہ مل رہا ہے، چنانچہ میں نے بلا تامل اس کا عندیہ لیا۔

''خیراں! تو میرے ساتھ رہے گی؟''

اس نے ایک دم چونک کر میری طرف اپنی موٹی موٹی کالی آنکھوں سے دیکھا پھر اداس سے لہجے میں بولی۔

''نہیں سائیں! میرا مقدر تو خراب ہے ہی...... کیوں خراب ہو۔ تو مجھے کسی طرح لاڑکانہ کے دارالامان تک پہنچا دے، تیری وڈی مہربانی ہوگی۔''

''نہیں...... میں تیرے سے شادی کروں گا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا ''اگر تو مجھے پسند نہیں کرتی تو اور بات ہے۔''

''نہیں، نہیں...... سائیں! میں تو ساری عمر تیرے پاؤں بھی دھو کر پیوں تو بھی تیرا احسان نہیں بھولوں گی۔'' وہ بولی۔

قصہ مختصر میں نے اس سے شادی کر لی۔ خیراں سے شادی کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے خیراں سے بہت محبت ہوگئی تھی۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میں اسے پا کر بہت خوش تھا اور وہ بھی۔ میں اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا اور اکثر شاپنگ کے لیے اسے سکھر لے جایا کرتا تھا۔ بائی روڈ جیکب آباد سے سکھر کا فاصلہ بہ مشکل ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔

خیراں کو کپڑوں سے زیادہ جیولری کا شوق تھا۔ میں نے بھی اس کی کوئی خواہش نہیں ٹالی۔ چونکہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اس لیے شادی پر بھی میں نے ہی اسے سونے کے دو سیٹ ڈالے تھے۔ اس کے بعد بھی ہم اکثر زیورات خریدتے رہے، کبھی سونے کا نیکلس تو کبھی جڑاؤ کڑے اور کبھی بریسلیٹ، اسے جیولری کا بہت شوق تھا، میرے محتاط اندازے کے مطابق صرف جیولری کی مد میں، میں نے لگ بھگ دو ڈھائی لاکھ کی خریداری کی تھی۔

تھوڑا وقت گزرا...... اتوار کے روز میں صبح کلینک نہیں کھولتا تھا۔ صرف شام میں جاتا۔ دوپہر میں تین افراد مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ مجھے وہ تینوں کچھ شناسا سے معلوم ہو رہے تھے۔ مگر اس وقت باوجود ذہن پر زور دینے کے میں انہیں نہیں پہچان سکا۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے ضروری بات کرنے کو کہا۔

میں نے ازراہِ اخلاق و مہمان نوازی گھر کا ساتھ والا

...ق (بیٹھک) کھول کر انہیں بٹھایا۔

''سائیں! میرا نام امیر خان ہے...... یہ دو میرے چچا ...ہائی ہیں۔ رحیم خان اور خدا بخش!''

نسبتاً ایک لمبے تڑنگے شخص نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ...ف کرواتے ہوئے کہا۔ ''سائیں معاف کرنا! بات ہی ایسی ہے کہ...... آپ کو ناگوار گزرے گی لیکن...... مجبوری ہے۔''

''آپ بات کریں، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے گہری متانت سے کہا۔

وہ بولا ''سائیں! آپ کی بیوی کا نام خیراں ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے مختصراً کہا۔ میرے اس جواب پر اس نے اپنے سامنے بیٹھے رحیم خان نامی شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک بڑا سا کاغذ نکال کر امیر خان کو تھمایا۔ امیر خان نے کاغذ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے ان کے بشروں کی طرف دیکھا پھر کاغذ پر مندرج عبارت پڑھنے لگا۔ پھر جیسے جیسے...... میں اسے پڑھتا گیا، میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی اور میری کنپٹیاں ذہنی انتشار کے باعث سلگ اُٹھیں۔

''یہ...... یہ کیا بکواس ہے؟'' میں نے امیر خان کی طرف گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

''یہ بکواس نہیں ہے سائیں! حقیقت ہے یہ۔'' وہ میری طرف بہ غور گھورتے ہوئے بولا۔

''میں اسے ہرگز نہیں مانتا، خیراں میری بیوی ہے۔'' میں نے اپنے اندرونی غبار پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ کاغذ درحقیقت خیراں کا نکاح نامہ تھا جس کی رو سے وہاں موجود رحیم خان اس کا شوہر تھا۔

''آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں...... ایسا نہ ہو، میں مہمان نوازی بھلا کر جھگڑا کرنے پر تُل جاؤں۔'' یہ کہہ کر میں غصے سے کھڑے ہوتے ہوئے مزید بولا ''یہ نکاح نامہ جعلی ہے۔''

''سائیں! یہ نکاح نامہ جعلی ہے یا اصلی، ہماری خواہش ہے کہ آپ اسے اس وقت اپنی بیوی کو دکھائیں، ہمیں یقین ہے کہ وہ اسے جھٹلانے کی ہمت نہیں کرے گی۔'' امیر خان نے معتدل لہجے میں کہا۔ مجھے اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔

''دیکھو ڈاکٹر سائیں! آپ بھی عزت والے ہو، ہم بھی...... لڑکی نے ہم دونوں کے ساتھ دھوکا کیا ہے، ہم معاملہ سلجھانے آئے ہیں...... پہلے آپ اپنی بیوی سے ذرا جا کر پوچھ تو لو پھر یہ نکاح نامہ بھی دکھاؤ، اس میں اس کے انگوٹھے کا

میں ایک روز دربار کر رہا تھا کہ امیر اعظم خاں کی لڑکی کا ایک خط مجھے ملا۔ یہ کابل میں تھی اور میرے ساتھ منسوب تھی۔ اس نے قاصد کو ہدایت کی تھی کہ خود میرے ہاتھ میں خط دے۔ خط بند کر کے لے آئے جیسا کہ میں نے پیشتر ذکر کیا ہے۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا کبھی شوق نہ تھا اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ خط پا کر مجھے کس قدر ندامت ہوئی۔ میں نے اپنے آپ کو سخت ملامت کی کہ مجھے فخر ہے کہ میں ایسا اچھا شخص ہوں لیکن درحقیقت مردانگی سے بعید ہے کہ جاہل رہوں۔ اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بہت رویا اور اپنے خدا کی درگاہ میں نہایت عاجزی اور انکسار سے دعا مانگی اور ارواح اولیا اللہ سے سفارش کی درخواست کی۔ آخر روتے روتے صبح کے قریب میری آنکھ لگ گئی اور میں نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ میانہ قامت لیکن بالکل راست، آنکھیں بادام اور ابرو نہایت باریک۔ ریش دراز چہرہ بیضوی اور انگلیاں پتلی اور لانبی تھیں، بھورے رنگ کا عمامہ زیب سر تھا۔ ایک دھاری دار کپڑا کمر سے بندھا تھا اور ایک لمبا عصا ہاتھ میں تھا جس کے سرے پر لوہے کی شام تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بزرگ میرے سرہانے کھڑے ہو کر آہستہ سے فرماتے ہیں ''عبدالرحمٰن اُٹھ اور لکھ'' میں چونک پڑا اور کسی کو نہ پا کر پھر سو گیا۔ وہی بزرگ پھر تشریف لائے اور فرمایا ''اگر اس مرتبہ تو سویا تو اس عصا سے تیرا سینہ چھلنی کر دوں گا۔'' یہ سن کر میں خوف کے مارے اُٹھ بیٹھا اور پھر نہ سویا۔ خادم کو بلا کر کاغذ قلم منگوایا اور مکتب میں جو حروف لکھا کرتا تھا، انہیں سوچنے لگا۔ خدا کی قدرت کہ تمام حروف کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ میرے حافظے نے مدد کی اور جو کچھ میں نے پڑھا تھا، یاد آنے لگا۔ ایک ایک لفظ کر کے کاغذ پر لکھا۔ اس طرح طلوع آفتاب تک میں نے ساٹھ سطریں لکھ لیں۔ بعض حروف اچھی طرح نہ ملا سکا تھا اور بعض درست بھی نہ تھے لیکن جب میں نے ان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب پڑھ سکتا ہوں اور غلطیاں بھی معلوم کر لیں جو کہ بہت تھیں۔

امیر عبدالرحمٰن خان کی سرگزشت

مرسلہ: نواز خاں، راولپنڈی

نشان ہے۔"

میں اس کی بات کو سر بہ سر ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر اس کی بات پر مجبور ہونا پڑا۔ چونکہ یہ معاملہ ہی اتنا نازک تھا۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں نے وہ نکاح نامہ اس سے لے لیا اور اپنے کمرے میں آیا۔ وہ خیراں کو دکھایا اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ یہ نکاح نامہ دیکھ کر پریشان سی ہوگئی۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ سن ہوکر رہ گئی، میرا دل ڈوب گیا۔ خیراں نے نمناک آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر یکدم میرے پاؤں پکڑ لیے۔

"سائیں! میرا اس میں کوئی قصور نہیں ...... یہ میرا وہی نامراد شوہر ہے، جس نے میری زندگی تباہ کردی اور اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے مجھے بدکاری کی طرف مجبور کرتا تھا۔"

میں پریشان ہوگیا۔ بات بہ ظاہر درست ثابت ہوئی تھی مگر اس میں خیراں کا بھی بہرحال کوئی قصور نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس کا تو ذکر پہلے ہی کرچکی تھی۔ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ یوں اچانک ایک دن بھیانک عفریت کی طرح آن کھڑا ہوگا۔ اگر میں عدالت سے رجوع کرتا تو بدنامی میری ہی ہوتی۔ جبکہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے معاشرے میں عزت تھی، میں نے خیراں کو سنبھالا اور پوچھا۔

"خیراں، اب تم ہی بتاؤ، کیا کرنا چاہیے ہمیں؟"

"سائیں! یہ کمین آپ کو شریف اور عزت دار آدمی سمجھ کر بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے منہ پر دو چار روپے دے مارو اور یہ نکاح نامہ رکھ لو۔ بعد میں پھاڑ دینا۔ وہ مجھے طلاق دے دے گا۔" مجھے اس کی بات معقول لگی اور میں اوطاق میں آیا تو تب تک میرا سارا طیش اور غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا اور اس کی جگہ اب معاملہ فہمی نے لے لی تھی۔

میں ایک گہری سانس لے کر امیر خان سے بولا۔

"امیر خان! اب خیراں میری بیوی ہے...... اپنے پہلے شوہر رحیم خان سے طلاق لینا چاہتی ہے......" میری بات سن کر ان تینوں کو جیسے یکدم سانپ سونگھ گیا۔ میں اندر سے بہت پریشان تھا اور یہی دعا مانگ رہا تھا کہ معاملہ دے دلا کر رفع دفع ہوجائے، ایک عورت کے دو دعوے دار تھے، بڑی اُلجھن آمیز اور پریشان کن صورت حال تھی۔

"ٹھیک ہے سائیں! ہم بھی یہی چاہتے ہیں اب...... کہ یہ نازک معاملہ اِدھر ہی اوطاق میں طے پا جائے۔" خاصی دیر کی پُرسوچ خاموشی کے بعد امیر خان بولا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔

"آپ چار لاکھ روپے نقد دے دیں۔ ہم یہ نکاح نامہ اور طلاق نامہ آپ کے حوالے کردیں گے۔"

"چار لاکھ!" میں اتنی بڑی رقم کا سن کر پریشان ہوا، لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ میرے پاس چار لاکھ روپے نہیں تھے بلکہ اس مسئلے کے حل کے عوض اتنی بڑی رقم نے مجھے حیرت زدہ کردیا تھا۔ امیر خان بولا۔

"سائیں! اپنی جوان، خوبصورت بیوی کو چھوڑنا مذاق تو نہیں۔"

"شٹ اَپ......!" میں نے غصے سے کہا "تم کل یہ رقم میرے کلینک پر آ کر لے جانا اور طلاق نامہ بھی ساتھ لے آنا۔"

مجھے اس کی یاوہ گوئی زہر لگی تھی اس لیے میں نے بھی معاملہ اِدھر ہی ختم کرنا چاہا۔ خیراں سے اب میں جی جان سے محبت کرنے لگا تھا۔ چار لاکھ اس کے سامنے معمولی رقم تھی۔

میں نے اگلے روز چار لاکھ کی رقم چیک کٹوا کر بینک سے نکلوائی اور ان تینوں کے حوالے کردی اور انہوں نے نکاح نامہ مع طلاق نامہ میرے حوالے کردیا۔

میری ہنستی بستی زندگی میں جو خزاں آنے والی تھی، وہ اب بادِ بہار میں بدل گئی۔ انہی دنوں چھوٹی بہن کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس کا جہیز تیار تھا۔

اگلی صبح ماں اور بہنوں نے سینہ کوبی کرتے ہوئے مجھے جگایا۔ گھر میں چوری ہوگئی تھی۔ راتوں رات چوروں نے گھر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ جہیز، نقد رقم اور زیورات سب چور سمیٹ کر لے گئے تھے اور...... خیراں بھی غائب تھی۔ میں دُہری پریشانی کا شکار ہوگیا جبکہ مجھے اپنی بیوی خیراں کا پُراسرار غیاب زیادہ بے چین اور پریشان کیے ہوئے تھا۔

اچانک میری نگاہ بیڈ سائڈ پر کانچ کے گلاس کے نیچے دبے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ میں اسے اُٹھا کر پڑھنے لگا۔

"ڈاکٹر سائیں! آپ جیسے سیدھے سادے اور شریف لوگوں کی وجہ سے ہی تو ہماری دال روٹی چل رہی ہے۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش بیکار ہوگی۔ وہ نکاح نامہ اور طلاق نامہ دونوں ہی جعلی تھے بلکہ میں اور میری محبت بھی جعلی تھی۔ بلاوجہ آپ کی بدنامی ہوگی۔ معاملے کو خاموشی سے دبالیں...... خیراں!"

کاغذ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا...... اور میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔

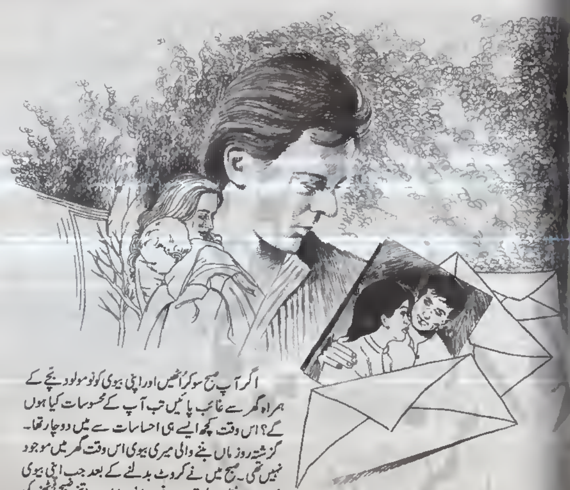

جنس

اگر آپ صبح سو کر اُٹھیں اور اپنی بیوی کو نومولود بچے کے ہمراہ گھر سے غائب پائیں تب آپ کے محسوسات کیا ہوں گے؟ اس وقت کچھ ایسے ہی احساسات سے میں دوچار تھا۔ گزشتہ روز ماں بننے والی میری بیوی اس وقت گھر میں موجود نہیں تھی۔ صبح میں نے کروٹ بدلنے کے بعد جب اپنی بیوی کے بستر پر نظر ڈالی تو اسے غیر حاضر پایا۔ وہ اتنی صبح اُٹھنے کی عادی نہیں تھی۔ میں نے سوچا شاید کچن میں دودھ گرم کررہی ہوگی لیکن بیڈ کے ساتھ موجود لکڑی کے پالنے پر نظر ڈالی تو نومولود بچے کو بھی اپنی جگہ موجود نہیں پایا۔ تب میں ہڑبڑا کر بستر سے نیچے اُتر آیا اور ماں بچے کو فلیٹ میں تلاش کرنے لگا۔ وہ دونوں فلیٹ میں موجود نہیں تھے۔ میرے ماتھے پر فکرانگیز لکیروں کا جال پھیلنے لگا۔ وہ ہوچکا تھا جس کا گزشتہ چھ مہینوں سے خطرہ تھا۔ میں نے جیب سے سستے برانڈ کا سگریٹ باہر نکالا اور لائٹر کے ذریعے اسے سلگانے کے بعد آرام کرسی پر

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
یہ روداد میرے بڑے قریبی دوست کی ہے۔ اسی کے الفاظ میں پوری کہانی لکھی ہے۔ باپ اور ماں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اس سے آپ کو بخوبی پتا چل جائے گا.

عمران قریشی
(کوئٹہ)

بیٹھ کر کش لگانے لگا۔ میرے ساتھ پڑی میز کی دراز میں ایسے تین خط موجود تھے جنہوں نے مجھے چھ ماہ سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے خط باہر نکالے، ان میں سے ایک خط کے ساتھ ایسی تصویر موجود تھی جس میں ایک مرد اور جوان عورت کرسی پر بیٹھے چائے پینے میں مصروف تھے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ عورت میری بیوی طاہرہ تھی۔ لیکن مرد کو میں نہیں جانتا تھا۔ یہ تصویر مع خط مجھے چھ ماہ قبل موصول ہوئی تھی۔ خط کی تحریر تقریباً پانچ سطروں پر مشتمل تھی اور خلاصہ کچھ یوں تھا۔

"میرے دوست!

تمہیں حیرانی محسوس ہو رہی ہوگی کہ خط کے ساتھ موجود تصویر میں تمہاری بیوی کے ساتھ میں کیوں موجود ہوں تو یقین جانو...... اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی باتوں کے متعلق آگاہی رکھتا ہوں جن کے متعلق تمہارے اور میرے علاوہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔ مثلاً تمہاری بیوی کے سینے پر موجود سرخ تل..... ایک پوشیدہ نشان ہے اور تم ایک جہاندیدہ انسان ہو اور یقیناً یہ جان سکتے ہو کہ میری ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟ پھر بھی بتائے دیتا ہوں کہ تمہاری بیوی ایک چالباز اور آوارہ عورت ہے۔ میرے علاوہ اس کے تین چار اور مردوں کے ساتھ بھی ناجائز تعلقات ہیں۔ تمہیں سب کچھ بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ فوراً سے پیشتر اسے طلاق دے دو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔

تمہارا خیر خواہ۔"

باقی ماندہ دونوں خطوں کی تحریر موجودہ تحریر سے مختلف نہیں تھی۔ کم وبیش یکساں مضمون تھا۔ میں نے ان دنوں خطوں کی جانب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کوئی بھی ڈاکٹر کسی بھی عورت کے پوشیدہ رازوں سے واقف ہو سکتا تھا۔ رہی تصویر کی بات تو کسی بھی خصوصی موقع پر کھینچی جا سکتی تھی۔ لیکن ایک بات جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا وہ یہ تھی کہ شادی کے تقریباً دو ماہ بعد تک طاہرہ کا رویّہ میرے ساتھ مخلصانہ رہا تھا لیکن خط ملنے کے بعد رویّے میں تبدیلی پیدا ہوتی چلی گئی۔ وہ بات بات پر میرے ساتھ لڑنے جھگڑنے لگی۔ گھریلو ذمے داریوں کی جانب سے اس نے غفلت برتنی شروع کر دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہر روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر میں نے فلیٹ کے نیچے موجود ہوٹل کے مالک کو کچھ رقم ایڈوانس دے کر اسے دوپہر اور رات کا کھانا فلیٹ میں بھجوانے کی ہدایت کر دی تھی۔ اس وقت میری بیوی حاملہ تھی۔ ایسے موقع پر اکثر خواتین چڑچڑی ہو جایا کرتی ہیں۔ میں نے ایسا سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کیا لیکن اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ میں ایک سفری سیلز مین تھا۔ ہماری شادی میرے پیشے کی مرہون منت تھی۔ کاروبار کی نیت سے شہر سے کچھ دور ایک پہاڑی قصبے میں جانا ہوا تھا۔ وہیں طاہرہ سے ملاقات ہوئی اور میں طاہرہ کی آنکھوں پر مر مٹا تھا پھر لوٹ کر آفس کے کچھ ساتھیوں کی منت سماجت کی اور انہیں طاہرہ کے گھر بھجوایا۔ میری طرح اس کے آگے پیچھے بھی دادی کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ دادی نے فوراً ہاں کر کے اپنے سر کا بوجھ میرے سر پر منتقل کر دیا۔ شادی کے بعد ایک اور بات جو مجھے کھٹکتی رہی وہ یہ تھی کہ اس کی دادی شادی کے بعد کبھی بھی اس سے ملنے شہر نہیں آئی تھی۔ میں اگر طاہرہ کو دادی کے پاس جانے کی تجویز پر متفق کرنے کی کوشش کرتا۔ تب وہ بُرا سا منہ بنا کر انکار کر دیتی تھی۔

میں نے ہاتھوں میں موجود ختم ہوتی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور خط اور تصویر کو جیب میں ڈال کر فلیٹ سے باہر نکل کر مین دروازے کی جانب چل دیا۔ وہاں گیٹ کی چوکیداری پر متعین گارڈ موجود تھا۔ میں نے اس سے اپنی بیوی کے متعلق پوچھا۔ تب اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا کہ رات کے تین بجے وہ بچے کے ہمراہ فلیٹ سے باہر نکلی تھی۔ پھر فلیٹ کے سامنے موجود ٹیکسی میں بیٹھ کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

کیا ٹیکسی کے اندر ڈرائیور کے علاوہ کوئی اور شخص بھی موجود تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"یقیناً پچھلی سیٹ پر کوئی شخص موجود تھا لیکن میں اس کی شکل نہیں دیکھ پایا تھا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ فلیٹ میں جا کر ناشتا کیا۔ پھر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بس اسٹینڈ کی جانب چل دیا۔ طاہرہ کی دادی کا قصبہ کچھ فاصلے پر واقع تھا، قصبے کا نام دیال پور تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ نوکر نے فوراً مجھے طاہرہ کی دادی کے سامنے پہنچا دیا۔ انہوں نے حیرانی کے ساتھ میری جانب دیکھا پھر بولیں۔

"نصیب دشمناں...... آج خلافِ معمول تمہارا یہاں آنا کیسے ہوا؟ طاہرہ تو خیریت سے ہے نا......؟" میں نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے یہاں آنے کی وجہ طاہرہ ہی ہے۔ وہ گھر میں موجود نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق شاید اسے آپ کے پاس ہونا چاہیے کیونکہ اس کے علاوہ اور اس کا کہیں بھی

جانا نہیں ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو بچے!" دادی نے بات درمیان کاٹ کر کہا۔ "بھلا اس کا یہاں کیا کام...... تم اچھی طرح جانتے ہو۔ شادی کے بعد سے وہ کتنی دفعہ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہے اور اگر تمہارے کہنے کے مطابق آئی بھی ہوتی تب تو وہ اسے چٹیا سے پکڑ کر تمہارے گھر چھوڑ آتی۔"

میں نے جیب سے طاہرہ اور خط لکھنے والے آدمی کی تصویر باہر نکالی پھر دادی کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

"طاہرہ کے ساتھ موجود اس مرد کا طاہرہ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" دادی کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات نمایاں ہوئے۔ پھر وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"یہ موا کون ہے...... اور ہماری بیٹی کے ساتھ تصویر میں کیا کر رہا ہے؟"

"یہی... تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے ہں بھرے لہجے میں کہا "کہ یہ موا کون ہے؟ اور طاہرہ کے ساتھ بھلا کیوں دکھائی دے رہا ہے؟"

"تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟" دادی نے پوچھا۔

"یہ طاہرہ کے سامان میں موجود تھی۔" میں نے جھوٹ بولا "تلاشی لینے پر دستیاب ہوئی۔"

"بہرحال میں اسے نہیں جانتی، شاید طاہرہ کے کالج کا کوئی دوست ہو۔ لیکن طاہرہ کو ایسی تصویر اپنے سامان میں نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔"

"طاہرہ اس شخص کے ہمراہ فرار ہو چکی ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں دادی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "اور مجھے اس بات سے کسی بھی قسم کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ میری بلا سے وہ جس کے ساتھ مرضی بھاگ جائے۔ مجھے اگر دلچسپی ہے تو صرف اپنے نومولود بچے سے ہے، وہ مجھے واپس چاہیے۔"

"طاہرہ بچے کے ہمراہ بھاگی ہے...!" دادی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں...... ایک دن پہلے پیدا ہوا بچہ میرے فلیٹ میں موجود نہیں ہے۔ یقیناً وہ اپنی ماں کے ہمراہ ہوگا۔"

"بہرکیف، اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" دادی نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے پوچھا "مجھے معلوم نہیں ہے کہ طاہرہ اس وقت کہاں ہے؟"

"تصویر میں موجود اس شخص کا نام اور پتا مجھے چاہیے۔ طاہرہ یقیناً اس کے گھر میں موجود ہوگی۔"

"میں اسے نہیں جانتی۔" دادی نے حتمی لہجے میں انکار کر دیا۔ "اگر جانتی ہوتی تب ضرور بتا دیتی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب میں اس شخص کے متعلق قصبے والوں سے معلومات کروں گا۔ یقیناً آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اپنی جگہ بیٹھے رہو۔" دادی فیصلہ کن لہجے میں بولیں "قصبے والوں سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"طاہرہ تمہیں اس کے متعلق شادی سے پہلے بتا دینا چاہتی تھی لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ شاید یہ میری غلطی تھی لیکن میں بھی کیا کرتی...... اگر ایسا نہ کرتی تب تم طاہرہ کے ساتھ شادی نہ کرتے اور تمہارے علاوہ قصبے میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا جو طاہرہ کے ساتھ شادی کی ہامی بھرتا۔ اس آدمی کا نام حامد علی خان ہے اور یہ طاہرہ کا پہلا شوہر ہے۔"

مجھے اپنے سر پر پہاڑ گرنے کا دھماکا محسوس ہوا۔ دادی بولتی جا رہی تھیں۔

"دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے لیکن حامد میاں غصے کے بہت تیز تھے۔ اس لیے غصے کی حالت میں طاہرہ کو طلاق دے بیٹھے...... بعد میں پچھتاوے کے ہاتھوں مجبور ہو کر طاہرہ سے معافیاں مانگتے رہے لیکن لاحاصل... ایک بار طلاق کے بعد حلالہ کے بغیر وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ پھر طاہرہ، حامد میاں سے بدظن بھی ہو چکی تھی اور ایسا چاہتی بھی نہیں تھی اس لیے چپ ہو کر بیٹھی رہی۔

"حامد میاں کی رہائش کہاں ہے؟" میں نے بات درمیان میں کاٹ کر جوشیلے لہجے میں پوچھا۔

شمارہ مئی 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں
ہماری پیش کش ... آپ کا انتخاب
☆ اول: انتقام...... طلعت (لاہور)
☆ دوم: ڈھول بھرا سناٹا...... انور علی (کراچی)
☆ سوم: ٹوٹے رشتے...... کوثر زید حسن (کراچی)
پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

''طاہرہ کی شادی کے بعد حامد میاں قصبہ چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن شادی کے بعد جو آخری خط مجھے موصول ہوا، اس پر لاہور کی مہر تھی۔ شاید وہ لاہور میں رہائش اختیار کیے ہو۔ بس وہ آخری خط تھا جو ہمیں موصول ہوا۔ اس کے بعد ہمارے اس کے ساتھ تعلقات منقطع ہوگئے۔''

''اس کا ذریعۂ معاش کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میونسپل کارپوریشن میں کلرک تھا۔ شاید نوکری چھوڑ کر لاہور چلا گیا ہو، مجھے معلوم نہیں۔''

''ٹھیک ہے...... میں معلوم کرلوں گا۔'' میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو اپنا کارڈ دیے دیتا ہوں، اس پر میرا موبائل نمبر درج ہے۔ اگر طاہرہ یا حامد علی خان کے متعلق کچھ معلوم ہو تو موبائل پر مجھے اطلاع کر دیجیے گا۔'' انہوں نے کارڈ تھام لیا اور میں تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

میرے دماغ میں آگے کا کچھ لائحہ عمل ترتیب پاچکا تھا۔ طاہرہ یقیناً اپنے پہلے شوہر حامد علی خان کے پاس تھی۔ حامد علی خان میونسپل کارپوریشن میں کلرکی کرتا تھا۔ نوکری یقیناً پکی تھی اور وہ گورنمنٹ کی نوکری کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ طاہرہ کی دادی کو اس کا آخری خط، لاہور سے موصول ہوا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ اس وقت لاہور میں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے اپنا ٹرانسفر وہاں کروالیا ہوگا۔ اور اب وہ میونسپل کارپوریشن کے لاہور دفتر میں کام کررہا ہوگا۔ مجھے اس کی تلاش میں مزید سرگرداں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مجھے بہ آسانی وہاں دستیاب ہوسکتا تھا۔ میں نے اسٹیشن سے لاہور کی بس پکڑی اور روانہ ہوگیا۔

مجھے شہر تک پہنچنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگ گیا۔ بس نے مجھے میونسپل کارپوریشن کی عمارت کے بالکل سامنے اُتار دیا۔ میں اپنا مختصر بیگ سنبھالے عمارت کی جانب چل دیا۔ چپراسی نے مجھے روک کر دفتر میں آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب میں نے اس سے حامد علی خان کے متعلق پوچھا۔

اس نے انکار میں سرہلاتے ہوئے جواب دیا ''وہ تو ایک مہینے کی چھٹی پر شہر سے باہر جاچکے ہیں۔''

میں نے اس کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار میں سرہلاتے ہوئے بتایا ''میں نہیں جانتا، آپ ہیڈ کلرک سے معلوم کرلیں۔ ان کا کمرا سامنے گیلری میں تیسرے نمبر پر ہے۔''

میں نے اثبات میں سرہلایا اور گیلری میں موجود تیسرے کمرے کی جانب چل دیا۔ کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور سامنے ایک لمبی میز کے دو اطراف تین افراد بیٹھے بات چیت میں مصروف تھے۔ میں نے سلام دعا کے بعد ہیڈ کلرک سے حامد کے متعلق دریافت کیا۔ ان تینوں میں ایک شخص نے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں ہیڈ کلرک ہوں، کہیے آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

میز کے سامنے رکھی کرسی کو اپنی جانب گھسیٹ کر میں اس پر بیٹھ گیا۔ پھر جیب سے طاہرہ اور حامد علی خان کی تصویر نکال کر میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے تصویر میں موجود اس سے متعلق کچھ معلومات درکار ہیں۔ کیا ان سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

دادی کی نسبت ہیڈ کلرک نے اپنے چہرے پر موجود گھبراہٹ کے تاثرات کو چھپانے میں کمال چابکدستی کا ثبوت دیا پھر انکار میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ ''حامد علی خان شہر سے باہر جاچکے ہیں۔ ایک مہینے سے پہلے ان کی واپسی متوقع نہیں ہے۔ اگر آپ کو کچھ ضروری کام درپیش ہو تو مجھے بتادیجیے، میں ان تک پیغام پہنچادوں گا۔''

''کام کی بات میں ان سے خود ہی کروں گا۔'' میں نے جیب سے اپنا کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرا کارڈ ان کے حوالے کردیجیے گا اور اگر ہوسکے تو موبائل پر مجھ سے بات چیت کرادیجیے گا۔ اب میں چلتا ہوں۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور کارڈ اس کے ہاتھوں میں تھما کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

میونسپل کارپوریشن کے دفتر کے سامنے ایک چھوٹا سا صاف ستھرا ہوٹل موجود تھا۔ دوپہر کے ڈیڑھ بجنے والے تھے۔ میں نے ہوٹل میں داخل ہوکر کھانے کا آرڈر دے دیا اور خود ہیڈ کلرک کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ یقیناً حامد علی خان کا قریبی رشتے دار تھا یا پھر ہوسکتا تھا کہ اس کا بڑا بھائی ہو۔ جو بھی تھا، اس کے چہرے کی کیفیت دیکھنے کے بعد میں یہ خود اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ بھی اس تمام کھیل میں برابر کا شریک تھا اور یقیناً وہ اس بات سے بھی واقفیت رکھتا تھا کہ اس وقت حامد علی خان کہاں چھپا ہوا ہے؟ میں تھوڑی دیر میں طاہرہ تک پہنچنے والا تھا۔ یہ سوچ کر میرے ہاتھوں کی مٹھیاں غصے سے بھنچ گئیں۔ ویٹر نے کھانا لاکر میرے سامنے رکھ دیا اور میں اسے زہر مار کرنے لگا۔ کھانے کی میز سے میونسپل کارپوریشن کے دفتر کا گیٹ صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں نے میز کا انتخاب اسی وجہ سے کیا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے چائے منگوائی پھر سگریٹ سلگا کر چائے پینے لگا۔ میرا دماغ مختلف سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ ہوسکتا تھا کہ میں بلاوجہ اس پر شک کررہا ہوں۔ میرے فلیٹ سے نکلنے کے بعد وہ کہیں آ گئی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو جس کی وجہ سے اسے مجھے بتائے بغیر فلیٹ کو چھوڑنا پڑا ہو۔ میں نے جیب میں سے موبائل باہر نکالا اور ہمسائی کا نمبر ملانے لگا لیکن اچانک ہی ہیڈ کلرک میونسپل کارپوریشن کے گیٹ سے باہر نمودار ہوا۔ میں نے موبائل کو بند کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ وہ عمارت کے قریب واقع بس اسٹینڈ کی جانب جارہا تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ویٹر کے ہاتھوں میں بل کی رقم تھمائی اور ہوٹل سے باہر نکل کر معقول فاصلہ رکھتے ہوئے ہیڈ کلرک کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ شہر کے مضافات میں جانے والی بس کا منتظر تھا۔ بس اسٹاپ پر لوگوں کی کافی بھیڑ جمع تھی۔ اس لیے اسے میرے متعلق معلوم ہوجانے کا خدشہ معدوم تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک گھنے درخت کا انتخاب کیا اور پیچھے کھڑے ہوکر ہیڈ کلرک کی جانب دیکھنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد بس آتی دکھائی دی۔ ہیڈ کلرک نے ہاتھوں میں موجود فائلوں والا بیگ سنبھالا اور بس کی جانب چل دیا۔ اس کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی بس پر چڑھنے لگے۔ ان لوگوں کے پیچھے میں بھی موجود تھا۔ بس مسافروں سے کھچاکھچ بھری ہوئی تھی۔ بیٹھنے کی جگہ مفقود تھی۔ اس لیے بس کے ڈنڈے کو تھام کر میں ایک جانب کھڑا ہوگیا۔ وہ مجھ سے تقریباً دس بارہ قدم آگے کھڑا تھا اور ہمارے درمیان تقریباً پانچ چھ مرد حائل تھے۔ ہیڈ کلرک شکل سے بہ ظاہر مطمئن دکھائی دیتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میری طرح اس کا دماغ بھی اس وقت مختلف سوچوں کے گرداب بگولے کی طرح اُٹھ رہے ہوں گے۔ وہ بس میں کھڑے تقریباً ڈیڑھ سگریٹ پی چکا تھا۔ بس اب مضافات میں داخل ہوچکی تھی۔ میں دروازے کے پاس سے ہٹ کر ایک کونے میں کئی مسافروں کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ بس رکی تو ہیڈ کلرک نیچے اُتر کر تیز قدموں کے ساتھ قریبی کالونی کی جانب چل دیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ تب بالکل اچانک ہی ایک موٹر سائیکل سوار بڑی سڑک سے نمودار ہوکر تیزی کے ساتھ میرے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ موٹر سائیکل پر ایک مرد اور عورت بیٹھے تھے۔ عورت کی گود میں نومولود بچہ موجود تھا۔ موٹر سائیکل سوار نے ہیڈ کلرک کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک ہی بریک لگائے اور گرم جوشی کے ساتھ ہیڈ کلرک کے ساتھ بات چیت کرنے لگا۔ پیچھے بیٹھی عورت نے بچے کو ایک ہاتھ سے سنبھالا اور اپنے جسم پر موجود چادر کو درست کرنے لگی۔ ایک لمحے

اس زمانے میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آوازِ بازگشت بن گئی۔

''منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے'' جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں اور عظیم بھائی نے بھی میری ناسمجھی سے فائدہ اُٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے، بڑی ہوشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور ضدی تھی ان کی شہ پاکر اور بھی قابو سے باہر ہوگئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انہیں حرارت ہوجاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ پیر اینٹھتے۔ ان کی بیوی بیٹھی ان کی چھاتی سینکا کرتیں اور وہ مجھے پڑھایا کرتے، انہوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے ہوگئے اور چند صفحوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

''ہم نہیں پڑھتے آپ سے۔ آپ اتنا تو کھانستے ہیں۔'' میں نے جل کر کہا۔

''بے وقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔'' انہوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتا نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہوگئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے، چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلالیا، چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ غلطی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کردیا۔ حجاب اسماعیل، مجنوں گورکھ پوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے، اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن تصور کرکے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کردیے۔

اقتباس: عصمت چغتائی
مرسلہ: راحیلہ امجد، گجرات

کے لیے مجھے اس کے چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ وہ یقیناً طاہرہ تھی۔ میں نے موٹر سائیکل پر بیٹھے مرد کی جانب دیکھا۔ وہ تصویر میں موجود حامد علی خان تھا۔ ہیڈ کلرک یقیناً اسے میری آمد کے متعلق بتا رہا تھا۔ حامد علی خان کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں نمودار ہوتی دکھائی دیتی تھیں۔ پھر اس نے موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیا اور مکمل رفتار کے ساتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے ہڑبڑا کر اردگرد نگاہ دوڑائی۔ لیکن وہاں کوئی ٹیکسی یا پھر رکشا وغیرہ موجود نہیں تھا۔ ہیڈ کلرک تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا قریبی گلی کی جانب مڑ گیا۔ گلی میں لوگ کم تھے۔ میں نے اندھادھند دور جاتی ہوئی موٹر سائیکل کی جانب بھاگنا شروع کر دیا۔

میں بھاگتا ہوا گلی کے سامنے پہنچا۔ گلی سنسان دکھائی دی۔ اب یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ وہ دونوں اس گلی کے کس مکان میں موجود تھے یا پھر گلی میں داخل ہونے کے بعد دوسری جانب سے نکل کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ گلی کے نکڑ کے پاس آیا، چھوٹی سی کریانے کی دکان کی کھڑکی موجود تھی۔ کریانے کی دکان کوارٹر نما مکان میں بنی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دکان کی کھڑکی میں جھانکا۔ وہاں پندرہ سولہ سالہ ایک لڑکا کرسی پر بیٹھا۔ ہیڈ فون کانوں سے لگائے میوزک سننے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہیڈ فون کانوں سے اُتارا اور استفہامیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے جیب میں سے پیسے نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے اپنے برانڈ کے سگریٹ کی فرمائش کی۔ پھر لہجے میں پریشانی کا عنصر شامل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

مجھے اپنے بچپن کے دوست کا پتا درکار ہے۔ اس کا نام حامد علی خان ہے اور وہ میونسپل کارپوریشن میں کلرک ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے موٹر سائیکل پر گزرا ہے لیکن میرے آواز دینے کے باوجود توجہ نہیں دے پایا۔

لڑکے نے سگریٹ کا ڈبا میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بقایا پیسے میرے حوالے کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم رکھ لو، مجھے صرف ایڈریس بتا دو۔" اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکالا پھر دکان کی لائن میں پانچویں گھر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اس کا گھر ہے۔ وہ ابھی اپنی بیوی کے ہمراہ یہاں سے گزرا ہے اور یقیناً گھر میں ہی ہوگا۔ میں نے لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور تیز قدموں کے ساتھ حامد علی خان کے گھر کی جانب چل دیا۔ کھڑکی کے دروازے کے آگے ٹاٹ کا پردہ موجود تھا۔ دروازے کے پاس گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ میں نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے کسی بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے......؟" میں نے جواب میں اپنا نام بتایا اور حامد علی خان کے متعلق دریافت کیا۔

عورت بولی "وہ موٹر سائیکل اپنے دوست کو واپس دینے گیا ہوا ہے۔ تم کچھ دیر بعد آ جانا۔" اچانک بوڑھی عورت کے پیچھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ باہر کون ہے؟ میں اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ طاہرہ کی آواز تھی۔ غصے کی شدت سے مجھے اپنے جسم کا دوران خون بڑھتا ہوا محسوس ہوا اور میں نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ بوڑھی عورت ہڑبڑا کر ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ طاہرہ سامنے برآمدے میں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے اور نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ بوڑھی عورت پریشان لہجے میں بولی۔

"میں نے بتایا نا...... حامد گھر میں موجود نہیں ہے۔ تم تھوڑی دیر بعد آ جانا۔" بوڑھی عورت کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے طاہرہ سے پوچھا۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟ میں اسے لینے آیا ہوں۔"

"تم اندر آ جاؤ...... ہم بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔" طاہرہ نے اپنے لہجے میں موجود کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ بوڑھی عورت حیران و پریشان نگاہوں سے کبھی میری جانب اور کبھی طاہرہ کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔

"میں بات چیت کرنے نہیں آیا ہوں، صرف اپنے بچے کو واپس اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے۔" طاہرہ اس دفعہ ہذیانی انداز میں چلّاتے ہوئے بولی "تم اسے واپس نہیں لے جا سکتے۔ اور میرے شوہر کے آنے سے پہلے گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرنا ورنہ میں پولیس کو فون کرنے میں دیر نہیں کروں گی۔"

میں نے حیرانی کے ساتھ طاہرہ کی جانب دیکھا۔ اس کا یہ روپ میں پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی شیرنی جو اپنے دودھ پیتے بچوں کی حفاظت کے لیے آخری حدوں کو پار کر لینے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے بوڑھی عورت اور طاہرہ کی جانب دیکھا پھر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم مجھے ان حالات کے متعلق بتاؤ۔ جن کی بدولت تم اپنا فلیٹ چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہو۔ بچہ کس کے پاس رہے گا، اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔"

''فلیٹ چھوڑنے کی وجہ میں نہیں بتا سکتی۔ رہی بچے کی بات......تو وہ میرے پاس رہے گا۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' میں نے اس دفعہ غصیلے لہجے میں کہا اور صحن میں داخل ہو کر سامنے موجود برآمدے میں نظر آتے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی' لیکن میں نے اسے بے دردی کے ساتھ دھکا دے کر ایک جانب ہٹایا اور کمرے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ بیڈ روم تھا۔ پلنگ کے ساتھ لوہے سے بنا ہوا پالنا رکھا ہوا تھا اور اس میں میرا نومولود بچہ سفید کپڑے میں لپٹا سویا ہوا تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر بچے کو اُٹھایا اور سینے کے ساتھ لگا کر کمرے سے باہر کی جانب چل دیا۔ وہ دروازے میں پریشان نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے لیکن شدتِ جوش کی بدولت وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

''میں اسے لے کر جا رہا ہوں۔'' میں نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''تمہاری بے وفائی کے لیے یہ سزا کافی ہوگی۔ اگر تم مجھے وجہ بتانے کے لیے آمادہ ہو، تب میں اس سزا میں ترمیم کرنے کے متعلق سوچ سکتا ہوں۔''

اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے بچے کو چھیننے کی کوشش کی لیکن میں نے دوبارہ دھکا دے کر اسے دور ہٹا دیا اور تیزی کے ساتھ کمرے کا پردہ ہٹا کر باہر نکل آیا۔

بوڑھی عورت صحن میں موجود تھی۔ اس نے مجھے روکنے کی ذرہ برابر بھی کوشش نہیں کی۔ میں نے بھاگتے ہوئے صحن کو عبور کیا اور دروازے پر لگے پردے کو ہٹا کر باہر نکلنے کی کوشش کی' لیکن اچانک ہی مجھے اپنے پیچھے طاہرہ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہی تھی۔

''میں وجہ بتانے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے پردے کو چھوڑ دیا پھر طاہرہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم وجہ بتاؤ...... میں وجہ سننے کے بعد فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ مجھے اگلا قدم کیسے اُٹھانا چاہیے۔''

''کیا تم برداشت کر پاؤ گے؟ وجہ کا تعلق تمہارے بچے سے ہے۔ ایک ماں ہونے کے ناتے میں ابھی تک اپنے دل میں اُٹھتی درد کی ٹیس پر قابو نہیں کر پائی ہوں اور ہر لمحے تڑپتی رہتی ہوں۔ نہ جانے باپ ہونے کی بدولت تمہارا ردِعمل کیا ہوگا؟ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی لیکن تمہاری ضد کے آگے مجبور ہو کر بتائے دیتی ہوں۔ تمہاری گود میں موجود بچہ نہ مردوں میں ہے اور نہ ہی صنفِ نازک میں ہے۔ اسے تہذیب کے الفاظ میں خواجہ سرا کہا جاتا ہے۔''

مجھے اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ میں نے حیران نگاہوں کے ساتھ بچے کے چہرے کی جانب دیکھا لیکن وہاں ایسی کوئی بھی نشانی دکھائی نہیں دیتی تھی جس کی بدولت اس پر لگائے گئے گھناؤنے الزام کی نفی ہو پاتی۔ اس کی شکل عام بچوں کی مانند تھی۔ طاہرہ بولے جا رہی تھی۔

''ایک ماں ہونے کے ناتے میں اسے کسی بھی صورت میں کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم تھا کہ جب تمہیں اس کی صنف کے متعلق معلوم ہوگا، تب تم اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرو گے۔ اس لیے کہ تم نے لڑکی کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کیے تھے۔ جب تم لڑکی کے باپ کہلانا پسند نہیں کرتے تو پھر ایسے بچے کو کیسے قبول کر لیتے اس لیے میں نے گھر سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ دادی کے پاس جانے سے متعلق میں اس لیے منحرف رہی کہ وہاں بھی میرے بچے کو تحفظ ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میری پوشیدگی کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں کسی ایسے مقام کا انتخاب کرتی جہاں تمہارا پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ تب میں نے حامد کے پاس واپس چلے آنے کا فیصلہ کیا۔ حامد ہماری شادی کے بعد مجھے کئی دفعہ خط لکھ چکے تھے اور اپنے کیے کی معافی مانگتے رہتے تھے۔ میں نے اس شرط پر ان کے پاس آنے کی ہامی بھری کہ وہ میرے بچے کے متعلق زیادہ استفسار نہیں کریں گے اور میں جیسے چاہوں گی، بچے کی پرورش کروں گی۔ علاوہ ازیں آپ سے طلاق کے متعلق بھی میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ حامد نے ہامی بھر لی اور یوں میں یہاں چلی آئی۔''

میرے قدموں میں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں موجود بچہ کسمسایا۔ پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ طاہرہ نے آگے بڑھ کر بچے کو میری گود سے واپس لیا پھر کپڑا اُٹھا کر بولی ''لو...... دیکھ لو۔''

میں نے ٹھنڈی سانس بھری پھر پوچھا ''کیا حامد اس کی صنف کے متعلق معلومات رکھتا ہے؟''

''بالکل...... وہ سب جانتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اس کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں۔'' طاہرہ بولی اور میں مایوسی کے ساتھ دروازے کی جانب چل دیا۔ اتنی بڑی آزمائش کے لیے میں اپنے آپ کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔ بچہ ابھی کم عمر تھا، جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا، اس کی کمزوریاں نمایاں ہوتی جاتیں اور انہیں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا ناممکن ہوتا جاتا۔ میں لوگوں کی نگاہوں میں تماشا نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنی بیوی کی قربانی دے کر اپنے شہر کی جانب چل دیا۔ ☐

جب اس نے گاڑی سے پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو اس کے تمام خیالات کی نفی ہو گئی، اس نے سوچا تھا کہ گزرنے والے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے علاقے نے بھی ترقی کر لی ہوگی لیکن تیس سال گزرنے کے باوجود بھی وہاں ویرانی ہی تھی۔ سب کچھ تقریباً ویسا ہی تھا۔ وہ چھوٹے سے اسٹیشن کے سائبان سے گزر کر سڑک پر آ گیا اور بڑے شوق سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

جب وہ گیا تھا تو اس وقت بھی چھوٹا سا اسٹیشن تھا اور آس پاس ویرانی تھی۔ اب اسے اسٹیشن کے ساتھ سائبان کا اضافہ نظر آیا اور ساتھ سیدھ میں بنی ہوئی سڑک۔

گاؤں سے اسٹیشن کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ چند ایک نئے مکانات بنے ہوئے تھے جنہیں کچی آبادی میں شمار کیا جا سکتا تھا لیکن دوسرے شہروں اور دیہاتوں کی طرح جدید طرز پر نہ کوئی فیکٹری بنی تھی اور نہ ہی جدید قسم کی عمارتوں نے جگہ گھیری تھی۔

وہ کچی پکی سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا رہا اور گاؤں پہنچ گیا۔ اسی گاؤں میں وہ پلا بڑھا تھا۔ اس کی ایک ایک گلی سے وہ مانوس تھا۔ تھوڑا بہت فرق آیا ورنہ سب کچھ ویسا ہی تھا، اسے یوں لگا جیسے وہ صبح ہی وہاں سے گیا ہے اور شام کو لوٹ آیا ہے۔

منزل

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میرے دکھ درد آپ کے سامنے ہیں۔ یہ میری زندگی کی لفظی تصویر ہے۔ میں نے اپنے درد کو لفظوں کا پیرہن دیا ہے۔ اپنی ایک بہت بڑی غلطی کا اعتراف کر رہا ہوں جو میرے ضمیر پر بوجھ بن گئی ہے۔ امید ہے آپ کو میری یہ کاوش پسند آئے گی۔

عبد الرحیم
(رحیم یار خان)

گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ملنگ بابا کا تکیہ اور بوڑھے برگد کا درخت جو اَب اور بوڑھا ہوگیا تھا، ملنگ بابا جو کمر سیدھی کر کے چلا کرتا تھا، اب ضعیف ہونے کی وجہ سے جھک کر چلنے لگا تھا جیسے کوئی اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔

وہ وہیں برگد کے درخت کے نیچے ٹھہر گیا۔ سب کچھ یاد ہونے کے باوجود وہ ببول کے دو درختوں والا گھر اور اس کی یادیں بھول چکا تھا۔

گاؤں کے کونے کا وہ آخری مکان تھا جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر لیکن اب اس مکان کی پچھلی طرف صاف زمین کی بجائے باغ نظر آرہا تھا۔

باغ تو اس کے بچپن کے وقت بھی تھا اور تھوڑی دور پر سے نہر کے ساتھ اور نہر کہ جس میں وہ اور ساتھیوں کے ساتھ نہایا کرتا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے آہستہ آہستہ قدم بڑھانے شروع کر دیے جیسے اسے کچھ یاد آرہا ہو۔ کوئی بھولی بسری کہانی یا پھر کوئی یادوں کا حادثہ۔ پھر ایک دم ہی سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ گلی کا موڑ، مکان کا نقشہ اور اندرونی پلاٹ۔

اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں، ایک مدت گزر گئی۔ نسلیں جوان ہوکر نسلوں کو بڑھا چکی تھیں جو اس وقت پیدا ہوئے تھے، ان کے سروں میں سفید بال آنا شروع ہوگئے تھے۔

پھر اچانک یادوں کے دریچوں میں ایک بجلی سی چمکی اور اسے ایسا لگا جیسے ایک دن ہی گزرا ہو۔ جیسے کل کی ہی بات ہو، ان ہی گلیوں میں زینب کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ گھوما کرتا تھا۔ دوسروں کے ساتھ مل کر شرارتیں کیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا تمیں سال گزر گئے لیکن ایسے لگا جیسے آنکھ جھپکی ہو۔ دن میں کتنی ہی دفعہ زینب کے ساتھ مل کر برگد کی ٹہنیوں پر چڑھ کر جھولا جھولا کرتا تھا۔

زینب جو اس کی ہم عمر تھی اور معصوم بھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر کہتا، ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے زینب! تو زینب مسکرا دیا کرتی۔ پھر اسے یاد آیا کہ کتنی ہی دفعہ نہر کے کنارے اس نے زینب سے پیاری پیاری باتیں کی تھیں، پھر جب جوانی کا شعور آیا تو اس نے برگد کے پاس کھڑے ہوکر زینب سے کہا تھا، میں تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

قد ہی بڑھ گئے تھے لیکن سوچیں بچگانہ تھیں، پھر اسے یاد آیا کہ برگد کے نیچے ہی آخری دفعہ زینب کو آخری بار کہا تھا، آخری بار دیکھا تھا۔ وہ چلی گئی اور وہ خود ایسے ہی بے دھیانی میں برگد کے پتے کو انگلیوں میں مروڑتا رہا۔

اس وقت سطحی سوچیں تھیں، بچپنا تھا۔ اس سے آگے سوچنے کی صلاحیتیں ہی نہ تھیں۔ اس کے باوجود آج تک زینب یاد تھی۔ اس کی معصوم مسکراہٹ یاد تھی۔ اس کا آنکھیں مٹکا مٹکا کر اسے دیکھنا یاد تھا۔

زینب، وہ تصور کے پردے پر اس کی تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب اس عمر میں اس کی نشیلی آنکھیں کیا غضب ڈھاتی ہوں گی۔ کتنوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہوں گی، رخساروں کے چاہ غب غب اب کس انداز سے دیکھنے والے کے دل پر بجلیاں گراتے ہوں گے۔ پھر اچانک وہ تصور کی دنیا سے نکل آیا۔ اس نے سوچا کہ اس کی سوچیں بھی شاید اپنے حواس کھو بیٹھی ہیں ورنہ زینب تو اس کی ہم عمر تھی اور اب ادھیڑ عمر میں زینب کے بال بھی شاید سفید ہو چکے ہوں گے۔ اس کا حسن سفید بالوں میں بھلا کیا غضب ڈھاتا ہوگا۔

اس نے پہلے پہل زینب کو کپاس کے کھیت میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ زمیندار کی کپاس چننے گیا تھا کہ ماں کے حصے میں زیادہ کپاس آئے اور وہ کاندار زیادہ پیسے دے۔

سردی کا موسم اپنی جوانی کی طرف قدم قدم بڑھ رہا تھا۔ سورج چوتھائی سفر طے کرنے کو تھا لیکن سردی کا احساس کم نہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنی ماں کے ساتھ کھیت میں پہنچا تھا تو گھنگھریالے بالوں والی زینب اسے بہت اچھی لگی تھی۔ بچہ تھا وہ بھی لیکن محبت تو ہر رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کپاس نہ چنے بس زینب کو دیکھتا ہی رہے۔

گاؤں میں وہ اپنی نانی کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس کی نانی کا گھر گاؤں سے باہر کی جانب تھا اور وہ اپنی نانی کو بھی ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ شام کو وہ دکان سے مٹی کا تیل لینے چلا تو ساتھ والے گھر میں اسے زینب پھر دکھائی دی تب اسے پتا چلا کہ زینب گاؤں کے امام مسجد کی بیٹی ہے اور جب نانی نے اسے مسجد میں پڑھنے کے لیے امام صاحب کے حوالے کیا تو زینب بھی اسے مسجد میں پڑھتی نظر آئی۔ مولوی صاحب نے اسے بہت پیار کیا اور سبق سے فارغ ہوکر اسے اپنے اور زینب کے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ مولوی صاحب کی بیوی ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ اس نے بھی اس کے سر پر پیار کیا، اور پھر وہ زینب کے ساتھ ساتھ پھرتا رہا۔ کبھی باغ میں، کبھی نہر کے کنارے اور کبھی اسکول کے گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے۔

گاؤں میں اور بھی بہت سارے لوگ تھے لیکن اس وقت اسے کوئی یاد نہ تھا کیونکہ اس کی سوچوں کا محور صرف زینب تھی۔

ساری دنیا اس کے لیے زینب میں سمائی ہوئی تھی۔

ہنستے کھیلتے دن گزر رہے تھے۔ بہت خوش تھا وہ، زینب سے اور کسی کا خیال ہی نہ رہتا تھا اور پھر ماہ و سال گزر گئے اور وہ دونوں جوانی میں داخل ہوگئے۔

کیا نکھار تھا زینب کی جوانی میں اور کیا خمار تھا اس کی آنکھوں میں، کیا لوچ تھا اس کی چال میں اور کیا نزاکت تھی اس کی اداؤں میں۔

وہ زینب سے محبت کرنے لگا تھا۔ بچپن کی دوستی نے یہ رنگ اپنایا تھا۔ اسے زینب کے بغیر اپنا آپ اَدھورا نظر آنے لگا تھا۔

پھر ایک دن شرماتے ہوئے زینب نے بھی اس سے محبت کا اقرار کرلیا کہ وہ بھی اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور نہیں کرسکتی۔

گاؤں ہی کیا معاشرتی طور پر ہر علاقے کی کچھ روایتیں ہوتی ہیں۔ ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنیں گے۔ شادی کریں گے۔ جس کے لیے اس نے اپنی نانی ماں سے رجوع بھی کرلیا لیکن نانی اماں نے ان کے خوابوں کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنی اور مولوی صاحب کی حیثیت سمجھانے بیٹھ گئی۔

جوانی کے منہ زور ریلے کے آگے اگر بندھ باندھنے کی کوشش کی جائے تو وہ اور منہ زور ہو جاتا ہے اور پھر وہ نام نہاد عزت و ناموس کی ریت کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ چولہے پر چڑھی ہوئی پتیلی میں لاکھ چمچہ ہلایا جائے لیکن اُبال پھر بھی آجاتا ہے۔ اسی طرح محبت بھی جب انتہائی راستے پر چلتی ہے تو عورت کی جوانی بھی چولہے پر چڑھی پتیلی کی طرح ہوتی ہے۔ چولہے میں آگ جلتی ہے، تپش پہلے پتیلی کو لگتی ہے، پھر پتیلی میں جو چیز ہوتی ہے وہ گرم ہونے لگتی ہے اور جب گرمی ایک حد تک بڑھتی ہے تو پتیلی میں اُبال آجاتا ہے۔ جب اُبال آتا ہے تو پتیلی میں پکنے والی چیز اُبل اُبل کر پتیلی کے کناروں سے باہر گرتی ہے اور پتیلی کے اطراف کو جلاتی ہوئی نیچے چولہے میں جا گرتی ہے۔ اس کے بعد چولہے کی آگ ایک آواز کے ساتھ بجھ جاتی ہے۔ جب آگ بجھ جاتی ہے تو پتیلی میں پکنے والی چیز کا جوش ماند پڑ جاتا ہے اور پتیلی کے اندر سکون ہو جاتا ہے۔

نانی ماں نے کہا تھا کہ وہ بچہ ہے ابھی۔ جب تک وہ بڑا آدمی نہ بن جائے اس کی شادی نہیں ہوسکتی۔ زینب تو تھی ہی مذہب پرست گھرانے کی بیٹی۔ لیکن جوانی کے فیصلے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یہ حسن کی مرضی ہے کہ خیرات میں کسے اپنا آپ سونپ دے۔

زینب نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا اور وہ دونوں ہر راستے سے گزر گئے۔ وہ دو دن تک نانی ماں سے بولا نہیں، بڑھاپا کیا کرسکتا تھا۔ تیسرے دن نانی ماں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر سمجھایا "دیکھو عبدالرحیم! ابھی نوکری تلاش کرو۔ دنیا کو دکھانے کے لیے کچھ پونجی جمع کرو۔"

"نانی ماں! مجھے دنیا سے کیا لینا، زینب میرے ساتھ ہے۔"

"کیا.....!" نانی ماں نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا ہو کہ اس نے عبدالرحیم کے منہ سے کیا سن لیا ہے۔ "زینت تمہارے ساتھ ہے؟"

"ہاں۔" عبدالرحیم نے غراتے ہوئے کہا۔ اسے اس وقت بڑھاپے کی نصیحت بُری لگ رہی تھی۔

"لیکن بیٹا.....!"

"میں کچھ نہیں جانتا ماں!" اس نے نانی ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "زینب کا بھی دل ٹوٹ جائے گا۔"

"کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ بالکل ہی۔

Monthly Digest
مکتبہ اہلا و سہلا
Sole Distributor
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

بےہودہ ہو تم ...... اپنی حیثیت تو دیکھو۔"

"کیا ہوا ہے میری حیثیت کو؟ کیا میں نے گاؤں کے اسکول میں نہیں پڑھا۔ کیا میں کبڈی نہیں کھیلتا؟ کیا میں زمیندار کی نوکری نہیں کرتا؟" وہ بولتا رہا اور نانی ماں سنتی رہی۔ وہ خاموش رہی، بولتی بھی کیا؟ اسے تو اپنی جوانی کا وقت یاد آرہا تھا اور وہ عبدالرحیم کی باتیں سنتے ہوئے دونوں وقتوں کا موازنہ کر رہی تھی۔

وقت نے، بزرگوں نے، معاشرے نے، حالات نے جب عبدالرحیم اور زینب کا ساتھ نہ دیا تو انہوں نے بھی زبانی کوئی وعدہ نہ کیا، جو کرنا تھا ایسی زبان میں کر گئے جو صرف جوانی ہی سمجھتی ہے، جوانی ہی بولتی ہے۔ کوئی بس نہ چلا عبدالرحیم کا۔ اسے اپنے والدین کے پاس آنا ہی پڑا اور پابندی لگادی گئی کہ وہ نانی ماں سے ملنے نہیں جائے گا۔

پُرانا وقت تھا جب تعلیم عام نہ تھی اور پھر زینب نے تو صرف اسلامی تعلیم حاصل کی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ خط ایک دوسرے کو لکھ نہ سکتے تھے، بس انجانے میں عہد تھا، جیسے زینب کہہ رہی ہو کہ زندگی کے کسی موڑ پر میرا پیار بھلا نہ پاؤ گے۔

عبدالرحیم کا دل ہٹانے کی خاطر اس سے کہہ دیا گیا کہ جب وہ بائیس سال کا ہوگا تو کوشش کی جائے گی کہ زینب سے اس کی شادی کردی جائے۔ باقی مولوی صاحب کی مرضی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ عبدالرحیم سے کرنے پر راضی ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ اس طرح وقتی طور پر عبدالرحیم بہل گیا لیکن زینب سے بچھڑنے کا تصور جب بھی ذہن کے پردے پر اُجاگر ہوتا تو وہ بے چین ہو جاتا۔ کس بُری طرح بلبلا کر روئی تھی وہ...... اس کا اپنا حال بھی بُرا تھا لیکن پھر بھی اس نے زینب کو دلاسا دیا تھا۔

"زینب! وقت گزر جائے گا۔"

"اکیلے میں کیسے......؟" زینب نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"میں ہر دن، ہر لمحہ، ہر گھڑی تمہیں یاد رکھوں گا۔"

"ہماری شادی کیسے ہوگی عبدالرحیم!"

"کیوں...... لیکن زینب خاموش رہی، کیا کہتی وہ اس سے کہ وہ اپنے والدین کو اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ آتے وقت زینب نے اسے ایک ریشمی رومال دیا تھا اور پھر جب بھی زینب کی یاد شدت سے آتی، وہ رومال کو آنکھوں سے لگا کر تسکین حاصل کر لیتا۔

یہ ایک زمانہ پہلے کی بات تھی۔ جب عبدالرحیم کو آس تھی کہ ایک دو سال کی بات ہے، پھر زندگی بھر کا ساتھ ہے لیکن وہ سب کچھ خواب تھا۔ انسان خواب دیکھنے پر قادر ہے لیکن تعبیر حاصل کرنے پر قادر نہیں۔

وقت جب آہستہ آہستہ گزرتا ہے تو ساتھ ساتھ اپنے لگائے ہوئے زخموں کو بھی مندمل کرتا جاتا ہے۔ جس طرح کسی دیوار پر لگی ہوئی تصویر ہر گزرنے والے دن کے ساتھ گرد کی تہ میں چھپتی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح دیوانگی میں کمی آتی گئی اور پھر دو سال میں اسے زینب کا کبھی خیال نہ آیا۔

اس کی زندگی میں نئے دوستوں نے شمولیت کرلی، پھر کچھ والدین نے ہمت دلائی اور کچھ اس نے اپنے شوق میں تعلیم حاصل کرلی، کورس کے لیے اسے بڑی عمر کا سہارا لینا پڑا۔ اب وہ ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ پھر بھی زینب جو ایک بھولا بسرا خواب بن چکی تھی، کبھی کبھی اس کی تنہائیوں کی یادوں میں چلی آتی۔ اس نے کام سیکھ کر اپنی ورکشاپ بنالی اور مکمل شہری انسان بننے کے ساتھ ساتھ مصروف ہوتا چلا گیا اور پھر زینب ایک خوشگوار خواب بن گئی۔

وقت نے ایک اور کروٹ لی تو اسے زینب کی شکل بھی بھول گئی، ذہن پر نقش شدہ تصویر کے نقوش مدھم پڑ گئے۔ بچپن کے فیصلے اسے عجیب سے نظر آنے لگے، پھر اس کی شادی ہوگئی۔

حمیداں سے شادی اس کی زندگی کا مفہوم تو نہ تھی لیکن زندگی سے منہ موڑتے ہوئے ماں اور باپ کی خواہش کا پاس تھا، اس سے آگے اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

حمیداں بڑی اچھی بیوی ثابت ہوئی، جس کی چاہت و خدمت نے اس کے ذہن اور یادوں کے سارے زخم مندمل کر کے صاف کر دیے کہ سوائے نشان کے باقی کچھ نہ بچا۔ وہ بہت سگھڑ، سمجھ دار، تابعدار اور شوہر پرست قسم کی عورت تھی۔ گو کہ وہ حسین تو نہ تھی لیکن اس نے اپنے حسنِ سلوک سے عبدالرحیم جیسے انسان کو قابو میں کرلیا تھا۔ عبدالرحیم کے ذہن سے زینب کے نقوش مٹا ڈالے تھے۔ اس لیے عبدالرحیم حمیداں سے نہایت خوش اور مطمئن تھا۔

جس طرح زیادہ کھانے سے پیٹ میں گڑبڑ ہو جاتی ہے یا وقت بے وقت کھانے سے ہاضمے میں خرابی ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح قبل از وقت ملاپ سے زینب کے پیٹ نے بھی نمایاں حیثیت اختیار کرلی تھی گو کہ وہ ایک شریف آدمی کی بیٹی ہونے کے ناتے بالکل ڈھیلا لباس پہنتی تھی، جس سے اس کی حرکت چھپی رہتی تھی لیکن کب تک؟ دنیا کی نظریں بالکل ایکس رے مشین ہوتی ہیں۔

ایک دن ایک عورت نے زینب کی چال دیکھ کر اس کی ماں سے ذکر کر دیا۔ اس کے بعد زینب کی ایسی شامت آئی کہ اسے سچ بتاتے ہی بن پڑی۔ یہ ایک علیحدہ بات کہ اسے اس حرکت کا کیا نذرانہ ادا کرنا پڑا، اسے زینب یا خدا جانتا ہے۔

ایک زمانہ بیت گیا۔ کتنے ہی ماہ و سال بیت گئے۔ کتنی حکومتیں بدل گئیں، عبدالرحیم نے پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا ہوتی بڑی حسین ہے لیکن جب آنکھ حقائق کو دیکھتی ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے، وہ بھی خوابوں کی دنیا سے نکل آیا۔

وہ شہر تو نہ تھا، نہ ہی قصبہ تھا۔ بس تھوڑی سی ترقی ضرور کی تھی جیسے آٹے میں نمک ڈال دیا جائے ورنہ گاؤں کا گاؤں وہی تھا۔ جب وہ گیا تھا تو چڑھتے سورج کی جوانی تھی لیکن اب زندگی اور دُھوپ کے سائے کافی لمبے ہو چکے تھے۔

اس نے قدم آگے بڑھائے تو دو ایک جگہ بینچ پڑے ہوئے دیکھے اور چولہے میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ گاؤں کا ہوٹل ہے، اس نے ایک جگہ بریف کیس سائڈ میں رکھا اور خود ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ گنجے اور موٹے ہوٹل والے نے اسے حیران کن نظروں سے دیکھا اور اپنے تہ بند سے ہاتھ صاف کرتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

"کیا چائے ملے گی؟"

"ہاں جی، باؤ جی! کیوں نہیں؟" اور چائے بنا کر اس کے ہاتھ میں جو پیالی آئی تھی اس میں چائے کی جگہ شیرے، ہلکے دودھ اور کپاس کی پتیوں میں اُبلی ہوئی کوئی چیز تھی۔

"یہاں پر بہت عرصہ پہلے ایک مولوی صاحب رہا کرتے تھے......"

"کون سے مولوی صاحب؟" دکاندار نے پوچھا۔

"نام تو ان کا تھا شاید ارشاد حسین......"

"ارشاد حسین......" دکان دار نے آہستہ سے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر ایکدم سر اُٹھا کر ایک طرف منہ کر کے بولا "چاچا خیرو!" دکان دار کے گلے کا والیوم کچھ اتنا اونچا تھا کہ بے خیالی میں عبدالرحیم کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھلک گئی۔ اس نے گھبرا کر دکاندار کی طرف دیکھا لیکن دکاندار اس کی طرف متوجہ نہ تھا اور اس کے ہاتھوں میں پیالی چھلکتے کسی نے نہ دیکھی تھی۔

"کیا کہے موٹے!" اُدھر سے آواز آئی، جس طرف منہ کر کے دکاندار نے آواز لگائی تھی۔

"یہ بابو جی آئے ہیں......"

"کون سے بابو جی؟"

"پتا نہیں، مولوی صاحب کا پوچھے ہیں۔"

"اچھا ٹھہرو، میں وہیں آتا ہوں۔" چاچا خیرو کی طرف سے جواب ملا تو موٹا اپنی گدی پر جا بیٹھا۔ اتنے میں عبدالرحیم نے چائے ختم کرلی۔

"بابو جی! اُدھر ہی رکھ دو پیالی۔" موٹا بولا۔ عبدالرحیم نے بینچ پر پیالی رکھی ہی تھی کہ آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کیے ایک بوڑھے کو اپنی طرف گھورتے ہوئے پایا۔

"سلام چاچا!" عبدالرحیم نے نہایت اخلاق سے ہاتھ اُٹھا کر اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، وعلیکم السلام! پر بابو جی! میں نے پہچانا نہیں۔"

"جی میں اجنبی ہوں۔" عبدالرحیم لفظ اجنبی کہتے ہوئے ذرا جھجک سا گیا۔

"کس سے ملنا ہے؟" چاچا خیرو نے اس سے دریافت کیا۔

"جی...... وہ اُدھر...... ایک عرصہ پہلے مولوی صاحب رہتے تھے، جن کا نام شاید ارشاد حسین تھا۔"

"ارے تھا نہیں...... ہے۔ وہ بے چارہ ابھی مرا تو نہیں ہے، پر......تو کیا لگے ہے اس کا؟"

"جی......بس صرف واقفیت ہے۔"

"اچھا......اچھا...... وہ اُدھر کونے والا مکان ہے، وہ......" چاچا خیرو نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ جس میں ببول کا درخت کھڑا ہے، بس وہی مکان ہے۔"

عبدالرحیم نے چائے کے پیسے ادا کیے اور شکریہ ادا کر کے بریف کیس اُٹھا کر اپنی منزل کی جانب چل دیا۔

اس نے ابھی دروازہ کھٹکھٹانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کے پاس سے ایک عورت چھوٹے سے بچے کو اُٹھائے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ عبدالرحیم جلدی سے بولا۔

"زینب!" اس عورت نے گھور کر عبدالرحیم کی جانب دیکھا اور منہ سے کچھ بولے بغیر دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

عبدالرحیم شش و پنج میں پڑ گیا۔ کبھی ہاتھ اُٹھاتا کہ دروازے پر دستک دے، پھر رک کر ہاتھ گرا لیتا۔ اس کی سوچیں منتشر ہوگئی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ زینب پر ماہ و سال نے اثر کیوں نہیں چھوڑا، وہ ویسی کی ویسی ہے اور پھر اس نے مجھے پہچانا بھی نہیں۔ پھر اس نے سوچا کہ ایک زمانہ زندگی کا گزار دیا ہے اور زمانہ گزرنے کے نشانات اس کے چہرے اور بالوں پر عیاں تھے۔

"میں بدل گیا، زینب نہیں بدلی۔" وہ خود کلامی کے

انداز میں بولا۔

ابھی اس کی سوچیں کسی منزل نہ پہنچ پائی تھیں کہ دروازہ پھر کھلا اور ایک دفعہ پھر اسے زینب کا چہرہ نظر آیا ’’اندر آجاؤ۔‘‘ زینب نے عبدالرحیم سے کہا تو وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ برآمدے میں پہنچ کر زینب نے اسے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری طرف چل دی۔

عبدالرحیم نے غور سے زینب کی جانب دیکھا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے وہیں کھڑا زینب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ زینب تو ایک کمرے میں گھس گئی، اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی لیکن وہ بے خیالی میں اسی طرف دیکھتا رہا۔

انسان کی سوچیں ذہن کی پیداوار ہیں لیکن جذبات دل کی لہروں پر ہچکولے کھاتے ہوئے وارد ہوتے ہیں۔ اصل میں یہی مٹھی بھر گوشت کا لوتھڑا اپنی جگہ ایک سمندر ہے۔ جس میں جذبات کی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی جب کوئی لہر سرکشی پر آمادہ ہوتی ہے تو نہ وقت کو دیکھتی ہے نہ عمر کو۔ چاہے وہ نوعمر ہو، جوان ہو یا بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہو۔ یہ لہر انسان کو بے دست وپا کردیتی ہے۔ اس وقت اس کے اختیار میں کچھ نہیں رہتا۔ وہ شعوری طور پر دل میں اُٹھنے والے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے تو لاشعوری طور پر اس کی زد میں آجاتا ہے اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب شعور اور لاشعور میں جنگ ہوتی ہے تو بعض اوقات تحت الشعور جیت جاتا ہے۔

سوچوں کا ایسا چوراہا تھا جہاں پر عبدالرحیم رک چکا تھا اور فیصلہ نہ کرپا رہا تھا۔ وہ کہاں تک پہنچتا کہ کسی کے کھانسنے کی آواز نے اسے خیالات کی دنیا سے نکال باہر کیا، اتنے میں اسے دروازے میں ایک بوڑھی عورت کا چہرہ نظر آیا جس کی طرف زینب اشارہ کرگئی تھی۔

’’آپ...... آپ برآمدے میں کھڑے ہوگئے ہیں۔‘‘

’’کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔‘‘

’’کیا......؟‘‘

’’بس ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔‘‘

’’آیئے، اندر آجایئے۔‘‘ اتنا کہہ کر وہ چہرہ اندر کمرے میں غائب ہوگیا اور عبدالرحیم اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

’’میں سمجھتی ہوں یہ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر آپ جیسے شان وشوکت والے انسان کے شایانِ شان تو نہیں، پھر بھی جو کچھ ہے، حاضر ہے۔‘‘

’’شکریہ!‘‘ عبدالرحیم نے ایک سال خوردہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’آپ دروازے پر کس لیے کھڑے تھے؟‘‘

’’میں یہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔‘‘

’’کس سے؟‘‘

’’زینب سے......‘‘

’’اوہ......‘‘ عورت کے منہ سے اتنا نکلا اور ایک لمے کے لیے اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔

’’کیا ہوا......؟‘‘ عبدالرحیم نے بے چینی سے پوچھا۔

’’مدت ہوئی اس کا انتقال ہوگیا......‘‘

’’کب......؟‘‘ عبدالرحیم کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

’’یہی کوئی تیس بتیس سال پہلے کی بات ہے۔‘‘

’’لیکن میں نے اسے دیکھا ہے۔‘‘

’’آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے عبدالرحیم!‘‘

’’آپ...... آپ مجھے جانتی ہیں؟‘‘

’’بہت اچھی طرح......‘‘ عورت نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

’’افسوس......‘‘

’’اب افسوس کرنے کا کیا فائدہ۔ تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ نا، یہ بے چینی اب فضول ہے۔‘‘

’’آپ...... میرا مطلب ہے کہ آپ......‘‘

’’میں اس کی بڑی بہن ہوں۔‘‘ عبدالرحیم بہت آہستگی سے بیٹھ گیا اور جیب سے چھید شدہ بہت ہی پرانے ریشمی رومال کو نکال کر اپنی پیشانی سے نہ آنے والا پسینا صاف کرنے لگا۔ عورت بڑے غور سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رومال کو دیکھنے لگی۔

’’آپ جیسے...... خوش پوش انسان کے ہاتھ میں یہ دقیانوسی اور سستا سا رومال اچھا نہیں لگتا۔‘‘ عورت نے بھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے عبدالرحیم سے کہا۔

’’یہ...... یہ دراصل......‘‘ اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔

’’کیا کہہ رہے تھے تم؟‘‘ عورت نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

’’میں کہہ رہا تھا کہ یہ رومال میرے...... پاس...... زینب کی نشانی ہے۔‘‘

’’اوہ...... اتنی محبت تھی تم کو اس سے کہ اس کے مرنے کے اتنے سال بعد بھی اس چیز کو سنبھالے ہوئے ہو؟‘‘ عبدالرحیم چپ رہا، وہ جواب بھی کیا دیتا۔

’’تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا عبدالرحیم!‘‘ تھوڑی دیر بعد عورت بولی۔

’’آپ کے پاس زینب کی کوئی تصویر ہوگی؟‘‘

عبدالرحیم نے عورت سے اس طرح پوچھا جیسے اس کی بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔

’’ہاں...... ہے۔‘‘ عورت نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

’’آپ نے بتایا نہیں کہ میں نے ابھی زینب کو دیکھا ہے، اس کے پاس چھوٹا سا بچہ بھی تھا......‘‘

’’میں نے کہا تھا کہ تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔‘‘ عورت نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا ’’لیکن تم نے پھر وہی سوال کر ڈالا تو سنو......‘‘ اتنے میں وہ عبدالرحیم کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس نے عبدالرحیم کی کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور جھک کر سرگوشی کے انداز میں عبدالرحیم کے کان کے قریب منہ کر کے بولی وہ...... وہ زینب کی روح ہے جو برسوں سے یہاں بھٹکتی پھر رہی ہے اور بچہ...... تم اسے کیا دے کر گئے تھے؟‘‘

’’وہ...... وہ ہماری غلطی تھی۔‘‘ عبدالرحیم نے نروس ہوتے ہوئے کہا۔

’’خیر...... چھوڑو اس ذکر کو۔‘‘ عورت نے سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ’’یہ بتاؤ تمہارے بیوی بچے تو خیریت سے ہیں ناں؟‘‘

’’میری بیوی کا انتقال ہوچکا ہے اور میرا کوئی بچہ بھی زندہ پیدا نہیں ہوا۔‘‘ عبدالرحیم نے ایک بار پھر چہرے پر رومال کو پھیرتے ہوئے کہا۔

عورت اس کے پاس سے ہٹ کر ایک بکس کے پاس گئی اور اس میں سے کچھ تلاش کرنے لگی اور پھر جو واپس مڑی تو اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی جس میں زینب بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ فوٹو برسوں پرانا ہونے کی وجہ سے مدھم پڑ چکا تھا۔

عبدالرحیم تصویر دیکھتے ہی پُرجوش انداز میں بولا ’’یہی ہے...... خدا کی قسم یہی ہے۔ یہی تو مجھے بلا کر اندر لائی ہے۔ اُف خدایا......‘‘ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو پکڑ لیا ’’کیا یہ واقعی روح ہے؟‘‘ عبدالرحیم نے سر اُٹھا کر بے یقینی کے سے انداز میں عورت سے پوچھا۔

’’ہاں۔‘‘ عورت نے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ’’میرے خیال میں روح کے بجائے اسے بدروح کہا جائے تو اچھا ہوگا۔‘‘

’’نہیں، نہیں...... آپ ایسا نہ کہیں۔‘‘

’’کیوں؟ بہت اذیت ہوئی ہے تمہیں...... اچھا عبدالرحیم! یہ تو بتاؤ کہ بچھڑتے سمے زینب نے تمہیں تو نشانی کے طور پر رومال دیا تھا اور جسے تم نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔‘‘

’’بالکل۔‘‘ عبدالرحیم نے رومال اس عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا لیکن عورت اس طرف کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے بولی ’’اور تم نے اسے جو نشانی دی تھی، وہ تصویر میں اس کی گود میں ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ آدھی صدی گزرنے کے قریب ہے، تمہیں آج سے پہلے خیال کیوں نہیں آیا؟‘‘ عورت ایک دم جوش میں آگئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

’’میری شادی ہوگئی تھی۔‘‘ عبدالرحیم نے مری سی آواز میں کہا۔

’’شادی ہوجانا اور بات ہے، پیار کرنا اور بات۔ دونوں چیزیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ تم نے تو دوبارہ پوچھا بھی نہیں کہ بے چاری زینب پر کیا گزری۔‘‘ عورت نے تیکھے انداز میں عبدالرحیم سے کہا۔

عبدالرحیم نے سر جھکا لیا۔ وہ بولتا بھی تو کیا؟ قصور اس کا اپنا تھا۔ اسے واپس آنا چاہیے تھا لیکن وہ تو حمیداں کے دام میں ایسا اُلجھا کہ تیس سال تک نکل نہ سکا۔ تاوقتیکہ وہ اس دنیا سے رخصت نہ ہوگئی۔

’’مجھے بہت افسوس ہے عبدالرحیم! تم نے آنے میں بہت ہی زیادہ دیر کردی۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ عبدالرحیم نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا ’’مجھ سے واقعی دیر ہوگئی۔ اب اس غلطی کی سزا بھی میں ہی زندگی بھر بھگتوں گا۔ اچھا مجھے اجازت دیجیے۔‘‘ اس نے اُٹھتے ہوئے کہا اور اپنا بریف کیس ہاتھ میں پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔

عورت بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور پوچھا ’’جا رہے ہو؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عورت اسے دروازے تک چھوڑنے گئی اور جب عبدالرحیم اس پر الوداعی نظر ڈال کر دروازے سے باہر نکل گیا تو وہ عورت دروازہ بند کر کے بڑھاپے میں بھی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اچانک اس کی نظر دائیں ہاتھ کی طرف الماری میں لگے ہوئے آئینے پر پڑی تو وہ ٹھٹک گئی، غور سے دیکھا اور پھر قدم بہ قدم آئینے کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ اپنے سراپے کا جائزہ لینے میں اس طرح مصروف ہوگئی کہ وقتی طور پر ساری کائنات سے کٹ کر رہ گئی۔ زمانے کے ساتھ گزرنے والے طوفانوں نے اس کے ڈھانچے کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اپنے سفید سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنے لگی کہ کچھ تو ہے آخر فرق اس میں اور زینب میں۔ پھر ایک طویل سالوں کا فاصلہ جس طرح اس نے طے کیا، اس سفر نے اس کی روح وجسم پر تھکن طاری کردی تھی، پھر تھکن

نے رنگ دکھایا کہ وہ ہستی جو کبھی رگ وجاں سے بھی قریب تھی، دل کی ہر دھڑکن جس کا نام لیتی تھی، وہ ہستی بھی اسے پہچان نہ پائی۔ وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے نڈھال سی ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ اب اسے آرام کرنا چاہیے، ابدی آرام۔ زندگی کی دوڑ میں اب وہ حصہ نہ لے سکے گی، ایک انتظار تھا سو وہ بھی ختم ہوگیا۔

وہ پتا نہیں کب تک محویت کے عالم میں کھڑی رہتی کہ ساتھ والے کمرے سے کھانسنے کی آواز آئی اور پھنسی پھنسی سی آواز اس کے کانوں میں پڑی "زینب!" اس کے ساتھ ہی وہ خیالوں کی دنیا سے نکل آئی اور زور سے بولی "آئی ابا!" اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے کمرے میں پہنچ گئی۔ اپنے باپ کو سنبھالا، دوائی کھلائی۔ ابھی وہ لحاف ٹھیک کر رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی "امی!" اس نے گھوم کر دیکھا تو اس کی بیٹی اپنے بچے کو گود میں لیے آنکھوں میں شکایت سجائے کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"آپ نے امی! آج پھر نانا میاں کو "ابو" کہا؟"

"نہیں بیٹی! میں نے ابا کہا......"

"کیوں؟"

"تو کیا ہوگیا؟"

"آپ نے وعدہ کیا تھا مجھ سے......"

"اوہ...... بھول ہوگئی۔"

"آپ تو ایک عمر سے بھولتی چلی آرہی ہیں۔"

"کیا چاہتی ہو؟"

"اب تو میں بھی بچوں والی ہوگئی ہوں۔"

"مجھے بھی معلوم ہے۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ بچپن سے اب تک آپ ٹالتی چلی آرہی ہیں......"

"مجھے پریشان نہ کرو۔"

"نہیں، آپ کو بتانا ہی پڑے گا۔"

"کیا......؟"

"میرے ابو کہاں ہیں؟ وہ ہم سے کیوں نہیں ملتے؟"

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اگر وہ پلنگ کا سہارا نہ لیتی تو شاید گر ہی پڑتی۔ اس وقت ماں کی ممتا بھی جاگی اور اپنا پیار بھی۔ اس کے اندر ایک طوفان برپا ہوگیا، اس کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن سامنے بیٹی تھی، وہ پوچھتی تو کیا جواب دیتی۔

جذبات بے قابو تھے، آنسوؤں کا ریلا منہ زور ہوکر بند توڑنے کو تھا۔ اس نے بیٹی کی طرف سے منہ موڑ لیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی "تمہارا ابو بیٹی! اس وقت زندگی کے کسی راستے پر سر جھکائے مایوسی کو گلے لگا کر، بغیر منزل کا تعین کیے چلا جا رہا ہوگا۔"

اتنا کہتے ہوئے وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں آگئی۔ شاید اپنی حالت بیٹی سے چھپانا چاہتی تھی اور پھر وہ بیٹی کو کیسے بتاتی کہ ابھی جس اجنبی نے تمہیں "زینب!" کہہ کر پکارا تھا اور پھر تو ہی اسے اندر بلا کر لائی تھی، وہی تیرا ابو تھا۔ کمرے میں وہ چارپائی کی پٹی سے پیشانی ٹیک کر بیٹھ گئی جیسے کہ اس وقت آنسوؤں کے ذریعے زندگی کو بھی بہا دینا چاہتی ہو۔

مگر زندگی اتنی آسان کہاں ہوتی ہے کہ اسے آنسوؤں میں بہا دے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو لوگ اس کی باتوں پر یقین کر لیتے۔ اسے عبدالرحیم کے جانے کے بعد ڈیڑھ سال تک پنڈی میں اپنی پھوپی کے ہاں گزارنے کی سزا نہ ملتی، جب وہ واپس گاؤں آئی تھی اور ماں نے سب کو بتایا تھا کہ زینب کی شادی ہوئی اور شوہر سڑک حادثے میں مر گیا تو کتنے لوگوں نے یقین کیا تھا، آنکھیں طعنے دیتی تھیں۔ آنسو بھی کسی کا منہ بند نہیں کر پائے تھے۔

اس وقت بھی وہ آنسوؤں سے ان نشانِ قدم کو دھو رہی تھی جو اس کی زندگی پر ثبت تھے۔ وہ ان کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتی تھی کہ ایک آواز سنائی دی۔

"زینب!...... میں سزا پانے کے لیے لوٹ آیا...... میرے بال ہی سفید نہیں ہوئے ہیں، بینائی بھی کمزور ہوگئی ہے۔ تبھی تو تمہیں پہچان نہیں پایا...... سڑک پر پہنچ کر ذہن نے تمہاری باتوں کا تجزیہ کیا تو آئینے سے گرد صاف ہوئی...... میں لوٹ آیا ہوں زینب!"

"بینائی ہی نہیں عقل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے...... اب آ ہی گئے تو اپنے ساتھ اپنی نشانی بھی لیتے جاؤ...... اس کا شوہر اسے چھوڑ گیا ہے، صرف اور صرف تمہاری وجہ سے کہ اسے بھی میری کہانی پر یقین نہیں آیا تھا اور طعنے دے دے کر اس کی زندگی جہنم بنائے ہوئے تھا۔"

"ٹھیک ہے...... میری غلطی میرے ساتھ جائے گی مگر تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔ اپنے ابا کو بھی تیار کر لو۔ میں تانگہ لانے جا رہا ہوں۔"

کچھ دیر بعد ایک تانگہ جس پر چار کہانیاں لدی پھندی پکی سڑک کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ایک کہانی مولوی صاحب کی، دوسری زینب، تیسری بیٹی اور چوتھی عبدالرحیم کی۔ ان کہانیوں کو ایک نیا اور خوشگوار اختتام ملنے والا تھا۔

آس کے جگنو

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
انسان کا ضمیر غلطیوں سے گندھا ہے۔ ایک غلطی میرے ابا کے دوست نے کی پھر اس دوست نے جس نے میری پرورش کی، مجھے پروان چڑھایا۔ ایک غلطی میں نے کی ان دونوں غلطیوں کو آپ کے سامنے تحریری طور پر لایا ہوں۔ تاکہ لوگ سبق حاصل کر سکیں۔

فراز علی
(نیو یارک)

زندگی بھی انسان کے ساتھ عجیب تماشے کرتی ہے۔ کبھی خوشیوں کی اتنی بہتات ہوتی ہے کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور کبھی دکھوں کی ایسی آندھی آتی ہے کہ انسان بگولے کی طرح گردش کرنے لگتا ہے۔ زندگی میں یہ تماشے کسی کے ساتھ کم ہوتے ہیں اور کسی کے ساتھ زیادہ لیکن نشیب و فراز تو ہر انسان کی زندگی میں آتے ہیں۔

میری زندگی بھی ان ہی تلخیوں اور شیرینی سے عبارت ہے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا تھا، مجھ سے چھوٹی دو بہنیں تھیں، گجرات کے ایک چھوٹے سے قصبے میں اباجی کی تھوڑی سی زمینیں تھیں۔ ہم بہت زیادہ غریب نہ تھے تو بہت امیر بھی نہیں تھے۔ اچھی گزر بسر ہو جاتی تھی۔

اباجی چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہر باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے کیونکہ ہمارے گاؤں میں بہت سے لڑکے ایسے تھے جن کے والدین نے انہیں محض پرائمری تک تعلیم دلا کر ہی کام پر لگا دیا تھا۔ ان میں سے کئی لڑکے تو ایسے تھے جن کی زمینیں ہم سے زیادہ تھیں

لیکن اس صدی میں بھی وہ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ پڑھ لکھ کر بھی ہمارے بیٹے کون سے گورنر بن جائیں گے، اس لیے ان کی تعلیم میں وقت اور پیسا کیوں ضائع کیا جائے؟

ابا جی ان کے مقابلے میں روشن خیال تھے۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ پڑھانا چاہتے تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے "بیٹا جی! اگر تم تعلیم کے لیے ولایت بھی جانا چاہو گے تو میں تمہیں بھیج دوں گا۔ میں تمہاری تعلیم کی خاطر اپنی زمین بیچ دوں گا۔"

مجھے بھی بچپن ہی سے تعلیم کا شوق تھا، پھر ابا جی کے الفاظ میرے شوق پر مہمیز تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں انتہائی محنت سے پڑھ رہا تھا۔

اس کا صلہ مجھے یوں ملا کہ میٹرک میں پورے ضلع میں میری دوسری پوزیشن تھی، پہلی پوزیشن گجرات کے کسی اعلیٰ اسکول کی لڑکی نے لی تھی۔

ہمارے گھرانے کے لیے تو میٹرک ہی اعزاز تھا۔ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے میٹرک پاس کیا تھا۔ گاؤں کا بھی پہلا لڑکا تھا جس نے میٹرک کے امتحان میں دوسری پوزیشن لی تھی اور جس کی تصویر اخباروں میں چھپی تھی، ٹی وی چینلز پر دکھائی گئی تھی۔

پورا گاؤں مبارک باد دینے کے لیے ہمارے گھر امڈ آیا تھا۔ مجھ سے زیادہ خوش ابا جی تھے۔ وہ یوں فخر سے گردن اکڑائے ہوئے تھے جیسے یہ کارنامہ انہوں نے ہی انجام دیا ہو۔ اگر دیکھا جائے تو حقیقت بھی یہی تھی۔ یہ ان ہی کی خواہش تو تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔ انہوں نے کبھی مجھے کسی محرومی کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔

ہمارا اسکول تو وہاں سے پانچ، ساڑھے پانچ میل دور قصبے میں تھا لیکن اب کالج میں پڑھنے کے لیے مجھے گجرات جانا تھا۔ گجرات کا فاصلہ وہاں سے پچاس کلو میٹر تو ہوگا۔ ابا جی کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں اتنا لمبا سفر طے کر کے گجرات کیسے جاؤں گا؟

میرے تعلیمی اخراجات کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ مجھے سرکار کی طرف سے وظیفہ ملا تھا۔ مسئلہ تھا میرے قیام کا، ابا جی نہیں چاہتے تھے کہ میں ہاسٹل میں رہوں۔ نہ جانے انہیں کن لوگوں نے بہکا دیا تھا کہ ہاسٹل میں رہ کر لڑکے آوارہ ہو جاتے ہیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بس اب میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ میں روزانہ اتنا طویل سفر طے نہیں کر سکتا تھا اور ابا جی مجھے ہاسٹل بھیجنے کے قائل نہیں تھے۔

انہی دنوں چاچا جمال خان ہمارے گھر آئے۔ وہ ابا جی کے بچپن کے دوست تھے۔ جمال چاچا جب بھی گاؤں آتے تھے تو اپنے بھائیوں کے ساتھ رہنے کی بجائے ہمارے ہی گھر ٹھہرتے تھے۔

وہ بہت خوش اخلاق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ لاہور میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ دو ٹیکسٹائل ملیں تھیں، اور گلبرگ میں گارمنٹ کے دو بڑے اسٹور تھے اور نہ جانے ان کا کیا کچھ کاروبار تھا۔

وہ ہمیشہ چمکتی دمکتی گاڑی میں گاؤں آتے تھے۔ ان کی چمکتی ہوئی گاڑی دھول مٹی میں اٹ جاتی تھی۔ ابا جی فوراً گاؤں کے کسی آدمی کو بلا کر جمال چاچا کی گاڑی کو دھلوا دیا کرتے تھے۔

میں بھی دو چار بار ابا جی کے ساتھ جمال چاچا کے گھر جا چکا تھا۔

لاہور میں گلبرگ کے علاقے میں ان کا محل جیسا گھر تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اتنے بڑے گھر میں وہ صرف چند ملازموں کے ساتھ کیوں رہتے ہیں؟ اپنے بھائیوں یا ان کے بچوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟ اکثر یہ سوال میرے ذہن میں سر اٹھاتا تھا لیکن میں کبھی یہ سوال جمال چاچا یا ابا جی سے نہ کر سکا۔

جمال چاچا دو تین مہینے میں دو چار دن کے لیے گاؤں ضرور آتے تھے اور وہ صرف کھڑے کھڑے اپنے بھائیوں کے گھر جاتے تھے۔ اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو تحفے وغیرہ دیتے پھر سارا وقت ہمارے گھر گزارتے۔ ان کے بھتیجے اور بھتیجیاں بعد میں ہمارے گھر آ کر ان سے ملتے تھے۔

جمال چاچا اس مرتبہ آئے تو ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی موجود تھے۔ وہ ابا جی کو سمجھا رہے تھے کہ بھائی علی نواز! تم فراز کو ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دے دو ورنہ اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس کی ذہانت خاک میں مل جائے گی۔"

"بات کیا ہے نوازے؟" جمال چاچا نے پوچھا۔ وہ ابا جی کو اسی بے تکلفی سے مخاطب کرتے تھے، جواب میں ابا جی بھی انہیں جمالے کے نام سے پکارتے تھے۔

"بھائی جمال!" ہیڈ ماسٹر نے کہا "اچھا ہوا تم آ گئے، تم ہی میاں علی نواز کو سمجھاؤ۔ میری بات تو سمجھتا ہی نہیں۔"

جب جمال چاچا کو مسئلے کا علم ہوا تو وہ ابا جی پر برس پڑے "واہ نوازے! تو نے خوب دوستی نبھائی ہے۔ یار! لاہور میں میرا اتنا بڑا گھر موجود ہے۔ تو اس کے باوجود پریشان ہو رہا ہے۔ او عقل کے دشمن! فراز اگر گجرات کے بجائے لاہور میں پڑھ لے تو کیا فرق پڑے گا؟"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب جلدی سے بولے۔

"یار، جمالے! بات اصل میں یہ ہے کہ......"

"او بس کر اوئے۔" جمال چاچا نے ابا جی کو جھڑک دیا "کیا فراز صرف تیرا ہی بیٹا ہے، میرا کوئی حق نہیں ہے؟" پھر انہوں نے مجھ سے کہا "جا بیٹا! تو جا کر روانگی کی تیاری کر۔"

میں بھی خوش ہو گیا کہ یہ مسئلہ تو کسی طرح حل ہوا۔

"دیکھ جمالے!" ابا جی نے کہا "میں نے فراز کو بساط بھر اچھے سے اچھا کھلایا اور اچھے سے اچھا پہنایا ہے لیکن میں نے کبھی اسے کھلی چھوٹ نہیں دی ہے۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ......"

"کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نظر سے۔" جمال چاچا نے ابا جی کا جملہ پورا کر دیا "تو فکر مت کر۔ فراز اب میری ذمے داری ہے۔ تجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

☆☆☆

یوں میں جمال چاچا کے ساتھ لاہور آ گیا۔ یہاں انہوں نے مجھے شہر کے بہترین کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ اس کے علاوہ میری تعلیم کے لیے دو ٹیوٹر بھی لگا دیے۔

میں کالج سے آنے کے بعد کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا تھا، پھر سر عارف آ جاتے تھے۔ وہ مجھے فزکس اور میتھ پڑھاتے تھے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد سر اکبر آ جاتے تھے۔ وہ مجھے کیمسٹری کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اردو بھی پڑھایا کرتے تھے۔ یوں میرا زیادہ وقت پڑھائی میں گزر جاتا تھا۔

شام کو پانچ بجے میں اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے جاتا تھا۔

اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ انٹرمیڈیٹ میں بھی پورے بورڈ میں میری پہلی پوزیشن آ گئی۔

جمال چاچا نے اس موقع پر ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کر ڈالا۔ اس پارٹی میں جمال چاچا کے تمام دوست تو شریک تھے ہی، انہوں نے ابا جی، اماں اور میری دونوں بہنوں نسرین اور ثمرین کے علاوہ گاؤں کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی خاص طور پر اس پارٹی میں مدعو کیا تھا۔

جمال چاچا کے دوستوں نے مجھے اتنے تحائف دیے تھے کہ میرا کمرا ابھر گیا تھا۔

سب سے بڑا تحفہ تو جمال چاچا ہی کا تھا۔ میں جب بھی گاؤں جاتا تھا، گاؤں کے لوگ مجھے حیرت اور رشک سے دیکھتے تھے۔

جب کھلاڑیوں نے قے کرنا شروع کردی

1976-77ء میں ویسٹ انڈیز کے دورے میں ڈومینکا کے ریسٹورنٹ میں کھانے کے دوران ٹیم کے کھلاڑیوں نے ماؤنٹین چکن منگوائی اور بہت زیادہ شوق سے کھائی، میں نے دال منگوائی اور علیحدہ میز پر کھائی، کھانے کے بعد جب ساتھی کھلاڑیوں نے مجھے بتایا کہ ہم نے یہ ڈش کھائی ہے تو میں نے انہیں بتایا کہ یہ مینڈک کی بریانی ہوتی ہے۔ انہوں نے ریسٹورنٹ کے مالک سے پوچھا، جس نے میری بات کی تصدیق کردی۔ اس کے بعد کھلاڑیوں نے قے کرنا شروع کردی۔

یادداشت: آصف نواز (سابق کرکٹر)

میرا ایڈمیشن انجینئرنگ کالج میں ہو گیا۔

جمال چاچا محبت تو مجھ سے پہلے بھی کرتے تھے، اب تو ان کی محبت بہت گہری ہو گئی تھی۔

میں انجینئرنگ کے پہلے سال میں کامیاب ہوا تو ابا جی اور اماں خاص طور پر لاہور آئے تھے۔ اس موقعے پر جمال چاچا نے ابا جی سے کہا "یار نوازے! اگر تو بُرا نہ مانے تو ایک بات کہوں؟"

ابا جی نے انہیں گھورتے ہوئے کہا "تجھے بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟"

"یار، میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تُو فراز کو میرا بیٹا بنا دے۔"

"او، فراز تیرا ہی بیٹا ہے۔" ابا جی نے کہا "پچھلے تین سال سے تو یہ تیرے ہی ساتھ رہ رہا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" جمال چاچا نے کہا "میں فراز کو باقاعدہ اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔ تجھے کوئی اعتراض ہے؟"

"اوئے، مجھے کیا اعتراض ہوگا جمالے؟" ابا جی نے ہنس کر کہا "میں تو فراز کو تیرے حوالے کر ہی چکا ہوں۔"

"بس تو پھر میں کل ہی اعلان کر دوں گا کہ فراز اب میرا بیٹا ہے۔"

پھر واقعی انہوں نے یہی کیا، میں ان کا بیٹا بن گیا۔

ابا جی شاید اس لیے مطمئن تھے کہ میں لاہور میں رہوں یا گاؤں میں، بیٹا تو انہی کا رہوں گا۔

☆☆☆

میں ان دنوں انجینئرنگ کے تیسرے سال میں تھا جب میری ملاقات ثمین سے ہوئی۔ میں کبھی بھی پہلی نظر کی محبت کا قائل نہیں رہا اور ان لوگوں کا مذاق اُڑاتا تھا جو ایسی غیر منطقی بات کرتے تھے لیکن ثمین کو دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ پہلی نظر کی محبت کیا ہوتی ہے۔

وہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتی تھی اور میرے ایک دوست کی بہن کی کلاس فیلو تھی۔ میں نے اپنے اسی دوست اکبر کے گھر میں ثمین کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ پھر اکبر کی بہن مائرہ کے توسط سے ثمین سے اکثر ملاقات ہونے لگی۔

ایک دن میں نے ہمت کر کے اس سے کہا ''مس ثمین! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ اگر......''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا تو میں کچھ گڑبڑا گیا۔ ''کیسی ضروری بات؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ بات یہاں اس شور شرابے میں تو نہیں ہوسکتی۔'' میں نے حوصلہ پا کر کہا ''اگر آپ میرے ساتھ ایک کپ چائے پینا پسند کریں تو......''

''فراز صاحب!'' اس نے کہا ''میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں کہ آپ کہیں گے اور میں چل دوں گی۔''

''آپ بھی مجھے غلط مت سمجھیں۔'' میں نے کہا ''میں بھی کوئی گرا پڑا لڑکا نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔

میں اکبر کے پاس تو اکثر جاتا رہتا تھا۔ وہ بھی ہمارے گھر آجاتا تھا۔

دوسرے دن میں اکبر کے گھر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھا۔ میں نے .... فون پر بات کرنا چاہی لیکن وہ بھی بند تھا۔

میں واپس جانے کو مڑا تو مائرہ نے مجھے روک لیا ''فراز بھائی! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اوہو، آپ کی بھی کوئی ضروری بات ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ میں ان لوگوں سے بہت بے تکلف تھا ''جی فرمایئے، میں سن رہا ہوں۔''

''آپ بیٹھیں تو سہی۔'' اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور بولی ''ثمین سے آپ کی کیا بات ہوئی تھی؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا، گویا ثمین نے مائرہ کو بھی میرے بارے میں بتا دیا تھا۔

''ثمین سے؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا ''اس سے تو میری کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''کل اس سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی؟'' مائرہ نے مجھے شوخ نظروں سے گھورا۔

''ہاں ملاقات ضرور ہوئی تھی لیکن وہ محترمہ تو میری کوئی بات سننے کی روادار ہی نہیں تھیں، پھر ان سے کیا بات ہوسکتی تھی؟''

''آپ نے اس کو چائے پلانے کی آفر کی تھی؟''

''ہاں، کی تو تھی۔'' میں نے کہا ''لیکن تم یہ وکیلوں کی طرح جرح کیوں کررہی ہو؟''

''وہ آج آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ فراز بھائی کوئی فلرٹ قسم کے لڑکے نہیں ہیں۔ وہ کروڑ پتی باپ کے بیٹے ہیں اس کے باوجود میں نے آج تک ان کا کوئی ایسا اسکینڈل نہیں سنا۔''

''مائرہ صاحبہ!'' میں نے ہنس کر کہا ''آپ کی بہت نوازش ہے کہ آپ نے میری تعریف کی۔''

''فراز بھائی! ایک بات بتائیں۔'' اس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا ''ثمین آپ کو کیسی لگتی ہے؟''

''کیسی لگتی ہے کیا مطلب بھئی؟'' میں نے کہا ''مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس لیے تو میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

''اچھا، تو یہ بات ہے۔'' مائرہ آنکھیں نچا کر بولی ''گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ وہ بھی آپ کے بارے میں یہی کہہ رہی تھی۔''

''لیکن وہ تو......''

''فراز بھائی!'' مائرہ نے کہا ''وہ بے چاری ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی لڑکیاں ہر معاملے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہیں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولی ''آپ ایسا کریں، کل یونیورسٹی آجائیں۔''

اس وقت اکبر آگیا اور میں مائرہ سے زیادہ بات نہ کرسکا۔

دوسرے دن میں یونیورسٹی پہنچا تو مائرہ میرا ہی انتظار کررہی تھی۔ اس کے ساتھ ثمین بھی تھی۔

''فراز بھائی!'' مائرہ نے کہا ''اب آپ لوگوں کو جو کچھ کہنا سننا ہے، براہِ راست کہیں، میں لائبریری سے ہو کر آتی ہوں۔'' وہ فوراً وہاں سے چلی گئی۔

ثمین کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کی گھنی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولی ''فراز صاحب! میں اپنے اس دن کے رویّے پر بہت شرمندہ ہوں۔''

''شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے مس ثمین!'' میں

نے کہا ''میں سیدھا سادا، صاف گو آدمی ہوں۔ مجھے اس قسم کی باتوں کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟''

ثمین کا چہرہ حیا سے سرخ ہوگیا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''فراز صاحب! اس کا فیصلہ تو میرے والدین کریں گے۔ یہ بات آپ ان ہی سے کریں تو بہتر ہے۔''

''ظاہر ہے ان کی مرضی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''جی نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' ثمین نے شرما کر کہا۔

''ٹھیک ہے، اب میں اپنے والدین ہی کو آپ کے گھر بھیجوں گا۔'' میں نے کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

ثمین چند ہی دنوں میں میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ مجھے اس کے علاوہ دنیا میں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔

میں نے دوسرے ہی دن جمال چاچا سے اس کے بارے میں بات کی تو وہ بولے ''ماشاءاللہ! ہمارا بیٹا اب واقعی جوان ہوگیا ہے۔'' پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولے ''فراز بیٹا! تمہارے باپ نے مجھ پر بہت بھاری ذمّے داری عائد کی ہے۔ میں پہلے اس لڑکی کے بارے میں خود چھان بین کروں گا، پھر کوئی فیصلہ کرسکوں گا۔''

''آپ ضرور... چھان بین کریں چاچا!'' میں نے کہا ''وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے والد کسی سرکاری محکمے میں گریڈ سترہ کے افسر ہیں۔ میں کل ان کے بارے میں سب کچھ آپ کو بتا دوں گا۔''

''کل کیوں بیٹا؟'' جمال چاچا نے کہا ''مائرہ اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہے۔ تم ابھی اسے فون کرلو۔''

میں نے مائرہ سے فون پر بات کی اور ثمین کے بارے میں سب کچھ پوچھ لیا۔

میں نے جمال چاچا کو بھی وہی ساری باتیں بتا دیں۔

دو دن بعد چاچا نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا ''فراز بیٹا! میں نے معلومات کروالی ہیں۔ ثمین کا خاندان انتہائی سلجھا ہوا اور شریف ہے۔ اس کے والد سمیع الدین صاحب بھی بہت نیک اور بااصول شخص ہیں۔ میں کل ہی نواز ے اور بھابی کو گاؤں سے بلواتا ہوں۔ ہم ثمین کا رشتہ لینے جائیں گے۔ اس معاملے میں دیر یوں بھی نہیں کرنا چاہیے کہ خوبصورت لڑکیوں کا رشتہ تو کوئی بھی لاسکتا ہے۔''

چاچا نے ٹیلی فون کرکے دوسرے ہی دن ابا جی اور اماں

میرے بزرگ

میرے بزرگ دورۂ نادری میں ایران سے ہندوستان گئے تھے۔ میرے دادا (اخوند محمد اکبر) ایک مشہور قصیدے کا شعر جو حضرت امام رضا علیہ السلام کی شان میں ہے، اکثر لکھ کر اپنے بستوں میں رکھتے تھے تاکہ جس کسی کے ہاتھ پڑے، وہ پڑھے اور ثواب عام ہو۔ وہی فرمایا کرتے تھے کہ یہ قصیدہ حضرت کے روضہ میں ایک دروازے کی محراب پر سربلند ہوا ہے۔ ان کا مطبوع شعر یہ تھا

یارب ایں ارض مقدس چہ مقام است و چہ جا است
کز زمیں تا بفلک مظہر انوار خدا است

میاں عبدالرزاق .... (کابلی دروازے کے پاس) اسی محلے میں صاحبِ تدریس تھے۔ ان کے درس میں (ذوق) جا کر شریک ہونے لگے۔ وہیں والد مرحوم (محمد باقر) سے ملاقات ہوئی اور کئی برس تک دونوں کی تعلیم ایک استاد کے دامنِ شفقت میں ہوتی رہی۔ نیکی کی بنیاد استقلال پر ہوتی ہے۔ اول کا رابطہ آخیر دم تک قائم رہا۔

والد مرحوم کا اور ان کا آغاز تحصیل میں ساتھ ہوا تھا۔ ساتھ بڑھے، ہر معرکے میں شریکِ حال رہے اور تھوڑے فاصلے میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔

والد مرحوم نے بہ نیت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن (ذوق) تشریف لائے۔ ان سے تاریخ کے لیے کہا۔ اسی وقت تامل کر کے کہا ''تعزیت گاہ امام دارین'' پوری تاریخ ہے۔

1835ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہوگئی۔ اسی سن میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ 1836ء میں اردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان کا پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔ یہ 13 ستمبر 1857ء تک جاری رہا۔

اقتباس: سوانح محمد حسین آزاد
مرسلہ: دین محمد، مظفر آباد، کشمیر

کوگاؤں سے بلالیا۔
ان لوگوں کو بھی بہت خوشی ہوئی۔ اباجی نے ہنس کر کہا "جمالے! پہلے اس نالائق کو انجینئر تو بن جانے دے۔"
"میرے بیٹے کو آئندہ نالائق مت کہنا۔" جمال چاچا بُرا مان کر بولے "اور جہاں تک انجینئرنگ کا سوال ہے تو ہم ابھی کون سا اس کی شادی کررہے ہیں، ہم تو ابھی صرف منگنی کریں گے۔ شادی تو اس وقت ہوگی جب یہ انجینئر بن جائے گا۔"
وہ لوگ دوسرے ہی دن ثمین کے گھر جاپہنچے۔ حسبِ توقع ان لوگوں نے سوچنے کو کچھ وقت مانگا۔ ظاہر ہے لڑکی والے پہلی ہی ملاقات میں تو ہاں نہیں کردیتے۔
دو دن بعد جب اباجی، چاچا اور اماں ان کے گھر گئے تو ثمین کے والد سمیع الدین صاحب نے کہا "جمال صاحب! ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ فراز بیٹا انتہائی ذہین اور شریف ہے لیکن......"
"لیکن کیا؟" جمال چاچا نے پوچھا۔
"لیکن ہمارے خاندان میں منگنی کا رواج نہیں ہے۔"
"منگنی تو ایک دنیاوی رسم ہے بھائی صاحب!" اباجی نے کہا "اصل اہمیت تو زبان کی ہے۔ تو پھر ہم اس رشتے کو پکا سمجھیں؟"
"آپ نے ٹھیک کہا نواز صاحب!" انہوں نے کہا۔ "اصل فیصلے تو اس زبان ہی سے ہوتے ہیں۔ میں آپ سب کو زبان دے رہا ہوں کہ آج کے بعد ثمین آپ کی امانت ہے۔"
اماں نے جھٹ مٹھائی کا ڈبا کھول کر سب کا منہ میٹھا کرایا۔
یہ ساری تفصیل مجھے اماں ہی سے معلوم ہوئی تھی کیونکہ میں خود تو وہاں موجود نہیں تھا۔
ثمین کے ساتھ رشتہ پکا ہونے کے بعد میری بے تابی کچھ اور بڑھ گئی۔
میری تعلیم مکمل ہونے میں اب ایک ہی سال تو رہ گیا تھا اور یہ ایک سال بھی مجھے اک صدی کے برابر لگ رہا تھا۔ اس کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ ثمین مجھ سے ٹیلی فون پر بات کرنے لگی۔
ہم لوگ رات کو گھنٹوں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔
محل نما گھر، بڑی بڑی شاندار گاڑیاں، بہترین ملبوسات اور بیش قیمت زیورات اس کا خواب تھے۔
میں ثمین کی محبت میں اپنی پڑھائی سے غافل نہیں ہوا تھا۔ امتحان نزدیک آئے تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ اب ہم اتنی دیر تک بات نہیں کرسکیں گے ورنہ میں فیل ہوجاؤں گا۔"
"ابھی تو امتحانات میں پورے چھ مہینے باقی ہیں فراز!" ثمین نے کہا۔
"اور یہی چھ مہینے میرے لیے بہت اہم ہیں۔" میں نے کہا "بس میں امتحان سے فارغ ہوجاؤں، پھر دن رات تم ہی سے باتیں کروں گا کیونکہ امتحان کے فوراً بعد میں تم سے شادی کرنے والا ہوں۔"
جمال چاچا نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ میں یونیورسٹی سے واپسی پر ہیڈ آفس کا ایک چکر لگالیا کروں تاکہ مجھ میں کاروبار کی سوجھ بوجھ بھی پیدا ہوجائے۔
میں ان کا حکم ٹال بھی نہیں سکتا تھا اس لیے یونیورسٹی کے بعد ہیڈ آفس جانے لگا۔
وہاں جاکر مجھے علم ہوا کہ جمال چاچا کے کتنے کاروبار ہیں اور کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں؟ دو ٹیکسٹائل ملز اور گارمنٹس اسٹورز کے علاوہ بہت سی کمپنیوں میں ان کے شیئرز تھے اور وہ ان دنوں ایک فائیو اسٹار ہوٹل بنا رہے تھے جو کراچی میں تھا اور تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔
جمال چاچا میرے اندازوں سے کہیں زیادہ دولت مند تھے۔ میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ جمال چاچا نے اپنی اربوں روپے کی جائداد اور کاروبار مجھے دینے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ گاؤں میں ان کے سگے بھائی اور بھتیجے موجود تھے۔
ایک دن میں نے جمال چاچا سے پوچھ ہی لیا "چاچا! گاؤں میں آپ کے بھائی اور بھتیجے موجود ہیں۔ ان کی مالی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ انہیں اپنے ساتھ بزنس میں کیوں نہیں لگاتے؟"
انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے "فراز بیٹا! جب بابا کا انتقال ہوا تو میری عمر صرف پندرہ سال تھی۔ ہماری اچھی خاصی زمین تھی۔ بابا کے مرتے ہی دونوں بھائیوں نے آنکھیں پھیرلیں اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے اپنے حصے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے مجھے بُری طرح جھڑک دیا۔ میں نے اسی دن گھر چھوڑ دیا اور لاہور چلا آیا۔ یہاں آکر معمولی معمولی کام کرتا رہا۔ اس دور میں ایک نوازے کی ذات تھی جو مجھے خط کے ذریعے حوصلہ دیتا تھا۔ میں نے لوگوں کی گاڑیاں صاف کیں، سامان ڈھویا، پھلوں کا ٹھیلا لگایا، پھر کسی نہ کسی طرح میں نے چھوٹی سی ایک دکان خریدی۔ اس دور میں دکانوں اور مکانوں کی قیمت اتنی نہیں چڑھی تھی۔ میں نے اس دکان میں کپڑے کا کاروبار شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے

ے اس کام میں بہت برکت دی اور صرف دو سال کے ے میں وہ دکان بیچ کر میں نے انارکلی میں ایک دکان لی۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا نوازا کہ میں نے اس ایک دکان سے تین مزید دکانیں خرید لیں۔ پھر میں نے ایک بڑی ٹیکسٹائل مل خریدی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بڑی مل بن گئی۔ کپڑے کے اس کاروبار میں اللہ تعالیٰ نے میرا ہاتھ ایسا پکڑا کہ میں دن دونی ... رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔
گاؤں سے تہی دست نکلنے والا ایک بے آسرا لڑکا بیس سال کے عرصے میں کروڑ پتی ہوگیا۔ میں اپنے بھائیوں کی حتی المقدور مدد کرتا رہتا ہوں لیکن انہوں نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے، وہ یاد آتا ہے تو میرے دل میں ان کی نفرت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ان لوگوں نے تو مجھے میرے حق سے بھی محروم کردیا تھا، میں انہیں اپنی محنت کی کمائی میں شریک کیوں کروں؟"
"جمال چاچا! اب انہیں معاف کردیں، وہ آپ کا خون ہیں۔"
"میں انہیں معاف کرچکا ہوں لیکن یہ کسی بھی طرح گوارہ نہیں کروں گا کہ وہ میری خون پسینے کی کمائی میں حصے دار بھی بن جائیں۔ پھر تمہیں تو ایسی بات کرنا بھی نہیں چاہیے۔" جمال چاچا مسکرا کر بولے "یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں اس میں دوسروں کو بھی شریک کرلوں؟"
میری سمجھ میں آگیا کہ جمال چاچا اپنی تمام دولت اور جائداد میرے نام کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میرے دل میں بھی لالچ آگیا تھا۔ مجھے یہ عیش و آرام پھر سے نصیب ہوسکتا تھا۔"
اس کے بعد تو میں واقعی خود کو اربوں کے اس کاروبار اور جائداد کا وارث سمجھنے لگا۔
ایک دن میں گھر آیا تو چاچا بہت خوش تھے۔ میں سمجھا کہ ان کا ہوٹل والا پروجیکٹ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔
وہ ہنس کر بولے "فراز بیٹا! تم پوچھو گے نہیں کہ میں آج اتنا خوش کیوں ہوں؟"
"میں اس لیے نہیں پوچھوں گا کہ آپ خود ہی بتادیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔
جمال چاچا نے بھی زوردار قہقہہ لگایا اور بولے "تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ بات دراصل یہ ہے [illegible] کہ میں نے تمہارے لیے ایک چاچی لانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"
"واقعی!" میں خوشی سے چیخا "لیکن یہ تو [illegible] چاچا! آپ نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے ہی کرلیا، اب [illegible] کر ہی لیا ہے تو یہ بھی بتادیں کہ ان خاتون کا نام کیا ہے اور کہاں پائی جاتی ہیں۔"
"وہ اتنی بڑی تو نہیں ہے کہ اسے خاتون کہا جائے۔" چاچا ہنس کر بولے "وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔"
"چاچا! چھوٹی ہوں یا بڑی میری تو وہ چاچی ہی ہوئی نا؟ میں تو اسے خاتون ہی کہوں گا۔"
"اچھا تم جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ ہم ابھی لڑکی والوں کے گھر جارہے ہیں۔"
"ہم!" میں نے ہنس کر پوچھا۔
"اوئے گاؤں سے نوازا بھی آگیا ہے اور بھابی بھی!" انکل مسکرائے۔
"اباجی آئے ہیں؟" میں نے خوش ہوکر کہا "کہاں ہیں وہ لوگ؟"
"وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو پہنچے ہیں۔" چاچا نے کہا "وہ بھی لڑکی کے گھر جانے کی تیاری کررہے ہیں۔"
اباجی اور اماں واقعی تیار تھے، وہ دونوں ہی بہت خوش تھے۔
ہم لڑکی کے گھر پہنچے تو ان لوگوں نے بہت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ خاصے آزاد خیال لوگ تھے۔ انہوں نے اماں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اجازت دے دی کہ میں بھی شائلہ سے مل لوں۔
میں نے شائلہ کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت پُرکشش بلکہ حسین لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ واقعی کم سن تھی اور عمر میں مجھ سے بھی دو چار سال چھوٹی ہی ہوگی۔ اسے خاتون کہنا واقعی ...... اس کے حسن کی توہین تھی۔
ایک ہفتے کے اندر اندر شائلہ جمال چاچا کی دلہن بن کر ہمارے گھر میں آگئی۔
شادی کے تیسرے ہی دن جمال چاچا، شائلہ کو لے کر ہنی مون کے لیے یورپ چلے گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ فراز بیٹا، میں ذرا لمبی چھٹی پر جارہا ہوں۔ یوں بھی میں نے برسوں سے آرام نہیں کیا ہے، میں چند ماہ ہر فکر سے بے نیاز ہوکر گزارنا چاہتا ہوں۔
میں فائنل ائیر کا امتحان دے چکا تھا اور اب رزلٹ کے انتظار میں تھا۔ ان دنوں میرے پاس بھی وقت تھا اس لیے میں چاچا کے کاروبار پر بھرپور توجہ دینے لگا۔
اس دن میں آفس میں ہی تھا کہ ثمین کا ٹیلی فون آگیا۔ وہ شکایتی انداز میں بولی "فراز! اب تو تمہارے امتحان بھی

ہو چکے ہیں، اب تمہیں کیا مصروفیت ہے کہ تم مجھے فون نہیں کر رہے ہو؟“

”وہ اصل میں چاچا یورپ گئے ہوئے ہیں۔ کام کا سارا دباؤ مجھ پر ہے اس لیے......“

”ارے بھئی، اب یہ کاروبار وغیرہ کا چکر چھوڑو اور کوئی اچھی سی جاب ڈھونڈو۔“

”کیوں بھئی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی، اب وہاں تمہاری وہ حیثیت تو رہی نہیں ہے، کل کو چاچا کے بچے ہوں گے تو وہی سارے کاروبار اور جائداد وغیرہ کے مالک ہوں گے۔“

مجھے اس کی بات سن کر دھچکا سا لگا۔ میں نے اب تک اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا ”تم ٹھیک کہتی ہو ثمین! اب واقعی میری حیثیت وہ نہیں رہی ہے۔ میں تم سے رات کو بات کروں گا۔“ میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

میرے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں اس وقت واقعی بہت خود غرضی سے سوچ رہا تھا کہ اب اس دولت، جائداد، کاروبار اور محل نما بنگلے پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ مجھے اب اپنا راستہ خود بنانا ہوگا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ گزشتہ چھ سال سے میں جس شاہانہ انداز میں زندگی گزارنے کا عادی ہوگیا ہوں، کیا میں اس کے بغیر زندگی گزار پاؤں گا؟

”ہاں، مجھے اب یہ عیش و آرام ترک کرنا ہی پڑے گا۔ یہ مہنگے ملبوسات، بیش قیمت پرفیوم، شاندار گاڑیاں، وسیع و عریض بنگلا اور ملازموں کی فوج۔ مجھے سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔

جمال چاچا کو بھلا اس بڑھاپے میں شادی کرنے کی کیا سوجھی تھی؟ میں نے خود غرضی سے سوچا۔ اس لمحے میں یہ بھول گیا کہ میری معمولی سی خوشی پر چاچا کتنے خوش ہوتے تھے اور معمولی سی تکلیف پر کتنے بے چین ہو جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے بیٹوں سے بڑھ کر چاہا تھا اور میں ان کے لیے اس انداز میں سوچ رہا تھا۔

میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں پڑھا لکھا ہوں، انجینئرنگ کی ڈگری میرے پاس ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے زورِ بازو سے بھی تو حاصل کرسکتا ہوں۔ جب جمال چاچا واجبی سی تعلیم ہونے کے باوجود بزنس ایمپائر قائم کرسکتے تھے تو میں کیوں نہیں کرسکتا؟

میرا رزلٹ آیا تو میں حسبِ معمول بہترین نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔

رزلٹ آتے ہی مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرف سے مجھے ملازمت کی پیشکش کی گئی۔ میں نے دو بڑی کمپنیوں کے علاوہ سب سے معذرت کرلی۔ باقی دو کمپنیوں سے میں نے کہا کہ میں فی الحال اپنے ایک ضروری پروجیکٹ میں مصروف ہوں۔ میں چھ ماہ بعد آپ کی پیشکش قبول کرسکتا ہوں۔

میں جانتا تھا کہ چھ ماہ بعد بھی وہ کمپنیاں مجھے ملازمت دینے سے انکار نہیں کریں گی۔ انکار کریں بھی تو میں امریکا، کسی خلیجی ریاست کی طرف نکل جاؤں گا۔

اب مجھے چاچا کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔

رات کو ثمین سے میری بات ہوئی تو میں نے اسے بتادیا کہ مجھے کئی کمپنیز سے جاب کی بہت اچھی آفرز ہوئی ہیں۔ چاچا کے آنے کے بعد میں کوئی ملازمت کرلوں گا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ ثمین نے کہا۔

”تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو کسی قسم کا پچھتاوا تو نہیں ہوگا کہ ہم نے تو ایک کروڑ پتی لڑکے سے رشتہ طے کیا تھا، یہ تو چند ہزار روپے کا ملازم نکلا۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو فراز!“ ثمین نے بُرا مان کر کہا ”میں نے ایک لمحے کے لیے بھی تمہاری دولت یا جائداد کے بارے میں نہیں سوچا، رہی بات میرے گھر والوں کی تو ابو کل ہی کہہ رہے تھے کہ اب فراز کو کہیں ملازمت کرلینا چاہیے۔ وہ جمال صاحب کا حقیقی بیٹا تو ہے نہیں۔ اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔“

مجھے یہ سن کر بہت سکون محسوس ہوا ورنہ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں ثمین کے گھر والے انکار نہ کردیں۔ والدین کی تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی کو زیادہ سے زیادہ عیش و آرام میسر آئے۔ ممکن ہے ان لوگوں نے یہی سوچ کر رشتہ طے کیا ہو لیکن ثمین کی بات سن کر میرے تمام خدشات دور ہو گئے تھے۔

☆☆☆

جمال چاچا پورے چھ ماہ بعد یورپ اور امریکا کے دورے سے لوٹے۔ وہ پہلے سے کہیں تر و تازہ اور جوان لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے اپنی عمر کے دس بارہ برس جھٹک دیے ہوں۔ شائلہ بھی بہت کھلی کھلی سی نظر آرہی تھی۔ اس کے حسن میں ایک انوکھا نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ حسین تو وہ پہلے بھی تھی لیکن اب اس میں بڑے گھر کی بیگمات والی تمکنت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ جدید فیشن کے ہیئر اسٹائل اور لباس نے اس کا حسن دو آتشہ کردیا تھا۔

پھر میں نے خود کو ملامت کی کہ شائلہ کے بارے میں مجھے اس انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔

جمال چاچا مجھ سے یوں ملے جیسے برسوں بعد ملے ہوں۔ شائلہ بھی بہت اپنائیت سی ملی۔ اس کی آنکھوں میں ایک سحر سا تھا۔ مجھے ان آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خوف سا محسوس ہوتا تھا۔

اس دن میں نے بھی آفس سے چھٹی کرلی تھی۔ جمال چاچا مجھے اپنے سفر کی روداد مزے لے لے کر سنا رہے تھے۔ اس دوران میں شائلہ کی نظریں مجھ پر ٹکی رہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہیں پا رہی ہو۔

رات کو کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے میں نے جمال چاچا سے کہا ”چاچا! اب تو آپ کی تھکن اُتر گئی ہوگی۔ اب آپ اپنا بزنس سنبھالیں۔“

”بیٹا جی! میں سب سمجھتا ہوں۔ اب تُو بھی چاہتا ہوگا کہ تیری بھی شادی ہو جائے اور تُو بھی میری طرح طویل چھٹی پر نکل جائے۔“ پھر وہ چونک کر بولے ”ہاں، تیرے امتحان میں کامیابی کی خبر مجھے ملی تھی۔ تو نے تو واقعی مجھے سرخ رو کردیا انجینئر صاحب! اب میں نوازے کے سامنے سر اٹھا کر کہہ سکوں گا کہ دیکھو، میرا بیٹا، انجینئر بن گیا ہے اور کس شان سے کامیاب ہوا ہے۔“

”چاچا! میں......“

”میں نے ماڈرن آٹوز والوں کو فون کردیا تھا۔ تجھے اپنی کامیابی کا تحفہ پسند آیا؟“

”بہت پسند آیا چاچا جی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اس موقعے پر مجھے ایک کار تحفے میں دی تھی۔

”چاچا جی! میں آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور آپ......“

”اوئے، میں تیری ”ضروری بات“ سمجھتا ہوں۔ تُو فکر مت کر، میں ابھی نوازے کو فون کرتا ہوں کہ وہ کل آکر ثمین کے گھر والوں سے شادی کی تاریخ لے لے۔“

چاچا جی کے اس جملے سے شائلہ کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

”ایک ضروری بات اور بھی ہے“ میں نے ہچکچا کر کہا۔

”چل! وہ ضروری بات بھی کہہ دے۔“ چاچا جی ہنس کر بولے۔

”رزلٹ آتے ہی مجھے دو تین ملٹی نیشنل کمپنیوں سے ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلے ماہ سے ملازمت کرلوں۔“

”کیا؟“ چاچا ایک دم سنجیدہ ہو گئے ”بیٹا! تجھے ملازمت کی کیا ضرورت ہے؟“ [illegible]

لگے ”جتنی تنخواہ تجھے وہاں سے ملے گی، اس سے کئی گنا زیادہ تو تو خود اپنی کمپنی کے ملازمین کو دے دیتا ہے۔“

”چاچا! اب صورتِ حال وہ نہیں ہے۔ اب آپ کی......“

”فراز!“ جمال چاچا غصے کی شدت سے کانپنے لگے ”تُو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اب تیری حیثیت میں کوئی فرق آگیا ہے۔ میرے دس بیٹے بھی پیدا ہو جائیں تو تیری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہ کاروبار اور جائداد تیری ہے اور تیری ہی رہے گی۔ ہاں، مجھے تجھ سے یہ امید ضرور ہے کہ تو اپنے بھائیوں کو ہر طرح سے سہارا دے گا اور ایک دن وہ خود بھی اتنے ہی بڑے کاروبار اور جائداد کے مالک ہوں گے۔ لیکن تو نے تو میرا دل ہی توڑ دیا ہے نواز بیٹا!“ چاچا شدتِ جذبات سے رو رہے تھے۔ ”میں نے تو ہمیشہ تجھے اپنا بیٹا سمجھا لیکن تو نے میرے بارے میں اس انداز میں سوچا...... مجھے...... تجھ سے یہ امید نہیں تھی بیٹا جی!“ جمال چاچا پھر رونے لگے۔

میں آگے بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گیا اور گلوگیر لہجے میں بولا ”مجھے معاف کردیں چاچا! میں نے اَن جانے میں اپنی باتوں سے آپ کا دل دکھایا ہے، مجھے معاف کردیں پلیز!“

”اوئے تو مرد ہو کر رو رہا ہے، چھ فٹ دو انچ کا آدمی بچوں کی طرح آنسو بہا رہا ہے۔“

ان کی بات پر مجھے ہنسی آگئی ”چاچا! آپ بھی تو رو رہے ہیں۔“

”اوئے، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“ جمال چاچا نے میری پیٹھ پر دھپ رسید کرتے ہوئے کہا ”بیٹا جی! آئندہ بھولے سے بھی ایسی بات مت کرنا ورنہ مجھ سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہوگا۔“

”تم بہت الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگے ہو فراز!“ شائلہ نے پہلی دفعہ زبان کھولی ”جمال تو سارا وقت تمہارا ہی ذکر کرتے رہتے ہیں اور تم......“

”باپ بیٹے کے بیچ میں تم مت بولو شائلہ!“ چاچا نے سرد لہجے میں کہا۔

شائلہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اسے اپنی توہین کا احساس ہوا ہوگا۔

اسی رات میں نے ثمین کو فون کیا اور اسے بھی سب کچھ بتادیا۔

”فراز! میں جانتی ہوں کہ چاچا تمہیں بہت چاہتے ہیں لیکن بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ ویسے تو تم بھی بہت ذہین

اور سمجھ دار ہو۔“

ثمین بہت دوراندیش لڑکی تھی۔

”میں نے ہر طرح سے غور کرلیا ہے۔“ میں نے کہا ”تم تو اب شادی کی تیاریاں شروع کردو۔ چاچا کل اباجی اور اماں کو یہاں بلا رہے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ اسی ہفتے کے اندر اندر ہماری شادی ہوجائے۔“

میں جانتا تھا کہ یہ بات سن کر ثمین شرم سے گلنار ہوگئی ہوگی۔ اس لیے وہ چند لمحے تک کچھ بھی نہ بولی۔

”ہیلو!“ میں نے کہا ”تم سو تو نہیں گئیں؟“

”میں جاگ رہی ہوں۔“ ثمین نے کہا ”لیکن اب واقعی مجھے شدید نیند آرہی ہے، باقی باتیں کل۔“

شادی کی بات پر وہ ہمیشہ یہی کہتی تھی۔ میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔

دوسرے دن جمال چاچا نے ثمین کے گھر والوں کو خصوصی دعوت دی۔ اس دعوت میں ثمین بھی آئی تھی۔ مجھے جلد ہی محسوس ہوگیا کہ شمائلہ کا رویہ ثمین کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ یہ بات یقیناً ثمین نے بھی محسوس کی ہوگی لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد شمائلہ میرے کمرے میں آگئی۔ وہ اکثر میرے کمرے میں آجاتی تھی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”فراز! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ شمائلہ اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد بولی ”آخر تمہیں اس لڑکی ثمین میں ایسا کیا نظر آگیا تھا؟ تم ذہین ہو، ڈیشنگ پرسنالٹی کے مالک ہو۔ تمہیں تو ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی مل سکتی تھی۔“

میں نے چاہا کہ میں اسے کوئی سخت جواب دے دوں، لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ وہ میرے خلاف چاچا کے کان بھرنا شروع کردے گی۔ وہ تو یوں بھی آج کل شمائلہ کے حسن کے اسیر تھے۔

”دیکھو فراز! اب بھی وقت ہے، تم اس ثمین سے اپنا پیچھا چھڑالو۔“

”میرے والدین اور چاچا ثمین کے گھر والوں کو زبان دے چکے ہیں۔ اگر میں نے ایسی کوئی کوشش بھی کی تو والدین بھی مجھے دھتکار دیں گے اور چاچا بھی مجھے گھر سے نکال دیں گے۔“

”یہ تمہاری بھول ہے فراز!“ شمائلہ نے کہا ”جمال تو تمہارے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔“

”میں انہیں آپ سے زیادہ جانتا ہوں شمائلہ صاحبہ!“ میں نے تلخ لہجے میں کہا ”وہ مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہیں لیکن اپنی زبان سے کسی بھی قیمت پر نہیں پھریں گے۔“

شمائلہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔

مجھے اب اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ آخر کیوں ثمین کی مخالف ہورہی تھی؟

پھر کئی دن تک شمائلہ نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

ان ہی دنوں مجھے اطلاع ملی کہ اماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں فوراً گاؤں چلا گیا۔ اماں واقعی بہت بیمار تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے ساتھ لاہور چلیں، وہاں ان کا علاج بہت اچھی طرح ہوجائے گا لیکن وہ راضی نہ ہوئیں۔

اباجی نے بتایا کہ تمہاری ماں کا علاج تو چل رہا ہے اور وہ ٹھیک بھی ہورہی ہیں۔ ”انہیں کوئی ایسی بیماری نہیں ہے، بس بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور بیٹا! آج کل یہ کوئی بیماری نہیں ہے۔“

اس موقعے پر میری ہمت نہ پڑی کہ میں اباجی سے اپنی شادی کی بات کرتا۔ یوں بھی اب میری دونوں بہنیں جوان ہوچکی تھیں۔ اصولی طور پر تو پہلے ان کی شادیاں ہونا چاہیے تھیں۔

میں نے لاہور واپس آکر چاچا سے بھی کہہ دیا کہ جب تک میری بہنوں کی شادی نہیں ہوجاتی، میں شادی نہیں کرسکتا۔

یوں میری شادی کا معاملہ کچھ اور آگے بڑھ گیا۔

اب شمائلہ کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے۔ وہ ہر ہفتے ہزاروں روپے کی شاپنگ کرتی تھی۔ بہترین ملبوسات اور جیولری کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا...... اس کے ساتھ ہی وہ اپنے دوستوں اور محلّے والوں کی دعوتیں بھی کرتی رہتی تھی۔ گویا چاچا کی شدید محنت کی کمائی کو بہت بے دردی سے لٹا رہی تھی۔

وہ چاچا کے دفتر میں معمولی ملازمت کے لیے آئی تھی اور اپنی خوبصورتی کے بل بوتے پر اس کمپنی کی مالکن بن بیٹھی تھی۔

اب وہ جمال چاچا کو بالکل نظرانداز کرنے لگی تھی۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ اس کا جھکاؤ میری طرف ہے۔ وہ مجھ سے ہنس ہنس کر بہت اپنائیت سے باتیں کرتی تھی لیکن جمال چاچا سے بہت سرد مہری سے پیش آتی تھی۔

جمال چاچا نے تو عملاً اب سب کچھ میرے حوالے کردیا تھا اور خود کبھی کبھار ہی دفتر آتے تھے۔

ایک دن میں ایک طویل میٹنگ نمٹا کر اپنے آفس پہنچا شمائلہ کو اپنی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”شمائلہ! آپ یہاں......؟“

”ارے پریشان کیوں ہوگئے فراز!“ وہ ہنس کر بولی ”یہ کرسی تمہاری ہے اور تمہاری ہی رہے گی۔“ یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی اُٹھ گئی لیکن اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے لہرا رہے تھے۔

”خیریت تو ہے شمائلہ! آپ کچھ پریشان نظر آرہی ہیں؟“

”آج تمہارے چاچا سے زبردست جھڑپ ہوئی ہے۔ نہ مجھے کہیں گھمانے لے جاتے ہیں، نہ میری کسی بات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں تو ان سے شادی کرکے پچھتا رہی ہوں۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”اور کیسی باتیں کروں؟ میری اور ان کی عمر میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اگر......“

”شمائلہ!“ میں نے سرد لہجے میں کہا ”یہ باتیں آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھیں، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔“

”ہاں، اب کیا ہوسکتا ہے۔“ وہ گویا خودکلامی کے انداز میں بولی ”اس بڈھے کھوسٹ نے تو زندگی اجیرن کردی ہے۔“

”شمائلہ!“ میں نے چیخ کر کہا ”آپ کو شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے؟ آپ پلیز...... یہاں سے چلی جائیں ورنہ......“

شمائلہ کو بھی شاید اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ جلدی سے بولی ”فراز! ان باتوں کا ذکر جمال کے سامنے مت کرنا پلیز! میں غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔“

”آیندہ اگر آپ نے ایسی کوئی بھی بات کی تو میں چاچا کو سب کچھ بتا دوں گا۔ وہ میری بات پر یقین نہیں کریں گے تو کیا ہوگا، وہ زیادہ سے زیادہ مجھے اپنے گھر سے نکال دیں گے نا؟“

”فراز! پلیز ایسی بات بھی مت کرنا۔ اس گھر میں تم ہی تو ہو جس سے میں اپنا دکھ درد کہہ دیتی ہوں۔ سوری، مجھے معاف کردو۔“ یہ کہہ کر شمائلہ وہاں سے چلی گئی۔

میں دیر تک سوچتا رہا کہ چاچا بے چارے نے شمائلہ سے شادی کرکے بہت گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ وہ چاچا کی دولت بے دریغ لٹا رہی تھی۔ اس کے دونوں بھائی اب بہت اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ اس کے باپ کے پاس پہلے پرانی سائیکل تک نہیں تھی، اب وہ نئے ماڈل کی کرولا میں گھومتا تھا۔ وہ ریکروٹنگ کا کام کرتا تھا اور میں نے سنا تھا کہ لوگوں کو باہر بھجوانے کے بہانے ان سے بھاری رقمیں اینٹھ چکا تھا۔ اب ریکروٹنگ کے ساتھ ساتھ اس نے ٹریول ایجنسی بھی بنالی تھی اور اپنا دفتر بھی لاہور کے بہترین کاروباری علاقے میں منتقل کرلیا تھا۔ یہ سب کچھ چاچا کی دولت ہی سے ہورہا تھا۔

چاچا نے اپنے اکاؤنٹ آفیسر سے کہہ رکھا تھا کہ شمائلہ کو جتنے بھی کیش کی ضرورت ہو، اسے دے دیا جائے۔

پہلے تو تھوڑے سے کیش سے شمائلہ کا کام چل جاتا تھا لیکن بعد میں جب بڑی بڑی رقموں کے چیک میرے پاس آنے لگے تو میں نے اکاؤنٹ آفیسر سے ان کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ یہ رقم مسز جمال کو چاہیے۔

”آپ ایسے تمام چیکس کا اندراج ایک علیحدہ رجسٹر میں بھی کریں اور مسز جمال کے نام سے کریں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے ایسا ہی کیا ہے سر!“ اس نے جواب دیا۔

شمائلہ کے جانے کے بعد میں نے اکاؤنٹ آفیسر کو بلایا اور اس سے کہا ”مجھے ان تمام رقوم کی تفصیلات چاہئیں جو اب تک جمال چاچا نے اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کرائی تھیں، جمال چاچا اسے اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے بھی چیک دیتے رہتے تھے۔

اگر یہی صورتِ حال مزید سال بھر تک برقرار رہی تو ہماری کمپنی دیوالیہ ہوسکتی تھی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس سلسلے میں تو چاچا سے بات ضرور کروں گا۔

اس سے پہلے کہ میں گھر پہنچتا، چاچا کا فون آگیا۔

”السلام علیکم!“ میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”وعلیکم السلام!“ چاچا نے کہا پھر پوچھا ”فراز بیٹا! کیا شمائلہ وہاں آئی تھی؟“

”جی ہاں، وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی گئی ہیں۔“

”آج اس نے کتنی رقم آفس سے لی ہے؟“ چاچا نے پوچھا۔

”میں ابھی اکاؤنٹ سیکشن سے معلوم کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”فراز بیٹا! آج کے بعد شمائلہ کو وہاں سے کچھ مت دینا۔“

”جی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”میں بھلا کیسے انکار کرسکتا ہوں۔“

”کیوں؟“ چاچا نے درشت لہجے میں کہا ”تمہاری مرضی کے بغیر تو کوئی وہاں سے ایک پیسا بھی نہیں لے سکتا۔ تم کہہ دینا کہ آپ کو جو کچھ بھی لینا ہے، چاچا سے لیں۔“ پھر وہ بولے ”تم گھر آؤ، پھر تفصیل سے بات کروں گا۔“ یہ کہہ کر

انہوں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں گھر پہنچا تو چاچا، شمائلہ کے ساتھ کہیں جارہے تھے۔

''فراز بیٹا! تم بھی ہمارے ساتھ چلو، ہم آؤٹنگ کے لیے جارہے ہیں۔''

''چاچا! آپ جائیے۔'' میں نے کہا ''میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں۔''

''چلو نا فراز!'' شمائلہ نے کہا۔

''میں واقعی بہت تھکا ہوا ہوں' ورنہ آپ کو کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''بھئی، ناراض کیوں ہوتے ہو؟'' شمائلہ نے چہک کر کہا ''تم آرام کرو۔''

وہ دونوں واپس آئے تو چاچا کچھ چپ چپ سے تھے لیکن مجھے دیکھ کر جبراً مسکرادیے تھے۔

کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے پھر وہ لوگ سونے چلے گیے۔ میں بھی اپنے کمرے میں آگیا۔

میں کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ شمائلہ کی چیخوں سے کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دیوار گیر گھڑی اس وقت پانچ بجارہی تھی۔ میں ننگے پاؤں اُٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔

شمائلہ کی دل خراش چیخوں سے گھر کے ملازم بھی حواس باختہ ہوکر دوڑ پڑے تھے۔

''کیا بات ہے...... کیا ہوا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''یہ...... یہ...... کچھ...... بول ہی نہیں...... رہے ہیں...... فراز...... یہ......''

میں نے آگے بڑھ کر چاچا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ان کی پیشانی برف کی طرح ٹھنڈی ہورہی تھی۔ میں نے نبض دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے بوکھلاہٹ میں نبض ہی نہیں مل رہی تھی۔

''غلام رسول!'' میں نے چیخ کر ملازم کو آواز دی ''جلدی ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔''

''جی صاحب!'' غلام رسول دوڑتا ہوا چلا گیا۔

شمائلہ مستقل رورہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ چاچا کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب آکر انہیں ایک انجکشن دیں گے اور وہ مسکراتے ہوئے اُٹھ جائیں گے۔''

اس سے زیادہ شاید میں خود کو تسلیاں دے رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا بنگلا نزدیک ہی تھا۔ وہ دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گیے۔

انہوں نے چاچا کا معائنہ کیا، ان کی نبض دیکھی، اسٹیتھس کوپ لگا کر دل کی دھڑکن سنی، پھر افسردگی سے سر ہلا کر بولے ''سوری فراز بیٹا! جمال صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انہیں بہت شدید ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور......'' وہ کچھ اور بھی کہہ رہے تھے لیکن مجھے کمرے کی چھت تیزی سے اپنی طرف آتی محسوس ہوئی، پھر میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں اپنے کمرے کے بجائے کہیں اور تھا۔ میری ایک جانب ایک کرسی پر شمائلہ بیٹھی تھی، دائیں جانب سفید کپڑوں میں ایک نرس کھڑی تھی۔

اس نے مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر کہا ''تھینکس گاڈ! آپ کو ہوش تو آیا۔''

مجھے معلوم ہوا کہ مجھے دو دن بعد ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اگر مزید چند گھنٹے مریض کو ہوش نہ آیا تو اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔

چاچا کا خیال آیا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے مجھے اپنوں سے بڑھ کر چاہا تھا لیکن میں کیسا بدنصیب بیٹا تھا کہ آخری وقت میں نہ ان کا چہرہ دیکھ سکا، نہ ان کے جنازے کو کندھا دے سکا۔

شمائلہ نے کہا ''فراز! تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو' ورنہ تمہاری حالت پھر بگڑ جائے گی۔''

''میں بہت ڈھیٹ ہوں شمائلہ صاحبہ!'' میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''اتنی آسانی سے نہیں مروں گا۔''

چاچا کا سوئم بھی ہوچکا تھا۔ اباجی اور اماں بھی گاؤں سے آگئے تھے اور چاچا کے بھائی اور بھتیجے بھی۔

وہ سب لوگ چاچا کے چالیسویں تک رُکے، پھر گاؤں واپس چلے گیے۔

شمائلہ ان دنوں عدت میں تھی۔

ایک رات وہ میرے کمرے میں آگئی، میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوگیے نا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

''آپ عدت میں ہیں۔'' میں نے کہا ''آپ کو یوں میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے۔''

''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں فراز!'' شمائلہ نے کہا۔

''تمہارے چاچا نے کوئی وصیت نامہ تو چھوڑا نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی پوری جائداد کی وارث میں ہوں۔ ان کے بھائی بھی جائداد پر نظریں جمائے بیٹھے ہوں

گے لیکن میں اتنی آسانی سے جائداد انہیں دوں گی نہیں۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اب یہ آپ جناب کا چکر چھوڑو۔'' شمائلہ نے کہا ''میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔''

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر لٹھ رسید کردی ہو ''کیا...... کیا کہا آپ نے؟''

''ہاں، میں نے وہی کہا ہے جو تم نے سنا ہے۔ تم اس بات پر اچھی طرح غور کرلو۔ انکار کی صورت میں تمہیں یہ بنگلا، گاڑی، دولت، کاروبار سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ دوسری صورت میں سب کچھ تمہارا ہوگا۔ تم اچھی طرح فیصلہ کرلو۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میں ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ گزشتہ کئی برس سے میں جو شاہانہ زندگی گزار رہا تھا، اسے ترک کرنا بہت مشکل تھا۔ ایک دفعہ تو میرے دل میں آیا کہ میں شمائلہ کی بات مان لوں لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی کہ شمائلہ اس شخص کی بیوہ ہے جسے تم اپنا باپ کہتے تھے۔ کیا تم ایسا کرسکو گے؟ کیا دنیا والے تم پر تھوکیں گے نہیں؟ کیا تم ان کی نظروں سے تم ہمیشہ کے لیے گر نہیں جاؤ گے؟

دوسرے دن میں آفس میں بیٹھا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف شمائلہ تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جمال کے بریف کیس میں جو کاغذات تھے، اس میں سے اس کا وصیت نامہ بھی نکلا ہے۔ تم فوراً گھر پہنچو۔

میرے دل میں امید کی ایک کرن جاگی کہ یقیناً چاچا نے اپنا وارث مجھے بنایا ہوگا۔ وہ ہر آدمی سے یہی کہتے تھے کہ میری جائداد کا وارث فراز ہے۔

میں گھر پہنچا تو شمائلہ نے مجھے اپنے بیڈروم ہی میں بلوالیا اور چاچا کا وصیت نامہ میرے حوالے کردیا۔ وصیت نامہ کیا، وہ چاچا کے ذاتی لیٹر ہیڈ پر ٹائپ کی ہوئی ایک تحریر تھی جس کی رو سے ان کی پوری جائداد اور کاروبار کی وارث شمائلہ تھی۔ اگر اس تحریر کے آخر میں چاچا کے دستخط نہ ہوتے تو میں اسے کبھی تسلیم نہیں کرتا لیکن میں چاچا کے دستخط اچھی طرح پہچانتا تھا۔

''پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

اس لمحے وہ مجھے ایسی چڑیل لگ رہی تھی جو انسانی خون پیتی ہو اور خوبصورت لڑکی کے روپ میں رہتی ہو۔

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ...... میں...... یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہ دولت اور جائداد نہیں چاہیے۔''

''اچھی طرح سوچ لو۔'' شمائلہ نے کہا ''بعد میں مجھ سے شکایت مت کرنا۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''میں سب کچھ سوچ چکا ہوں شمائلہ! اس دولت اور جائداد کی میں اتنی بڑی قیمت نہیں چکا سکتا۔''

''قیمت تو تم اب چکاؤ گے۔'' شمائلہ نے کہا اور جھپٹ کر اندر سے بولٹ کرلیا۔

''کیا...... کیا...... کررہی ہیں آپ؟''

شمائلہ نے اچانک اپنی قمیص کا گریبان پھاڑ ڈالا بلکہ قمیص کو جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا پھر اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اسے بھی پھاڑ دیا۔

اچانک مجھے بیڈ پر دھکا دیا اور پھر پوری قوت سے چیخنے لگی ''بچاؤ...... بچاؤ......''

میں بُری طرح گھبرا گیا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن اس نے کھینچ کر مجھے پھر بیڈ پر گرالیا اور جونک کی طرح مجھے لپٹ گئی۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی ''بچاؤ...... بچاؤ۔''

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی پھر کسی نے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا اور کنڈی کھول کر اندر آگیا۔ وہ ہمارا ملازم غلام رسول تھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں سے دوسرے ملازم بھی اندر آگیے۔

ہم دونوں کے حلیے، میرے چہرے اور بازوؤں پر پڑے ہوئے شمائلہ کے ناخنوں کے نشان اور پھٹا ہوا لباس دیکھ کر وہ لوگ وہی سمجھے جو شمائلہ انہیں سمجھانا چاہتی تھی۔

شمائلہ نے چیخ کر کہا ''غلام رسول! پولیس کو فون کرو۔'' اس نے ایک چادر اپنے جسم پر لپیٹتے ہوئے کہا ''اور خیال رکھنا، یہ یہاں سے بھاگنے نہ پائے۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وہاں رکوں یا بھاگ جاؤں؟ بھاگنے میں زیادہ بدنامی تھی اس لیے میں نے وہاں رکنے کا فیصلہ کرلیا۔

آدھے گھنٹے بعد پولیس کار ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی وہاں آگیے۔ انہوں نے کمرے کا منظر اور میرا حلیہ دیکھ کر فوراً ہی مجھے حراست میں لے لیا۔

شمائلہ سب انسپکٹر کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر نے مجھے بھی وہاں بلالیا اور مجھے باقاعدہ فرد جرم سنا دی۔ پھر وہ لوگ مجھے گرفتار کرکے لے گیے اور حوالات میں بند کردیا۔

شمائلہ نے مجھ پر الزام لگایا تھا کہ فراز نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی ہے۔

شمائلہ نے یقیناً پولیس کے سب انسپکٹر کو رشوت میں

خاصی بھاری رقم بھی دی ہوگی اس لیے وہ میری کوئی بات سننے ہی کو تیار نہیں تھا۔

میری گرفتاری کی خبر سن کر اباجی اور اماں بھی لاہور آ گئے۔ ایک دفعہ ثمین بھی آئی تھی لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں اجنبیت نظر آئی۔

میں نے رو رو کر اباجی کو بتایا کہ میں بے قصور ہوں۔ شمائلہ نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔

''ہمیں تجھ پر اعتماد ہے بیٹا!'' اباجی نے کہا ''وہ لڑکی مجھے شروع ہی سے پسند نہیں تھی۔ تُو فکر مت کر۔ میں تیرے لیے شہر کے بہت قابل وکیل کی خدمات حاصل کروں گا۔''

پولیس نے جوڈیشل ریمانڈ پر مجھے جیل بھیج دیا۔

اباجی نے بہت قابل وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس وکیل نے پہلی ہی پیشی میں میری ضمانت کرادی۔

پھر اس نے میری طرف سے بھی شمائلہ پر ہتک عزت اور جائداد کو غیر قانونی طور پر ہتھیانے کا الزام لگا دیا۔

میرے حق میں گھر کے دو تین ملازمین نے گواہی دی کہ شمائلہ بی بی نے فراز صاحب کو خود اپنے بیڈروم میں بلایا تھا۔ ٹیلی فون ایکسچینج میں بھی شمائلہ کی اس کال کا ریکارڈ تھا جس کے ذریعے اس نے مجھے گھر بلایا تھا۔

کیس چل ہی رہا تھا کہ میں ایک دن ثمین کے گھر چلا گیا۔

اس کے والد نے کہا ''فراز! اب تم یہاں مت آیا کرو۔ تمہاری وجہ سے محلے میں ہماری پہلے ہی بہت بدنامی ہوچکی ہے۔''

''انکل! کیا آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''ارے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔'' انہوں نے کہا ''دنیا تو یہی سمجھتی ہے۔''

''اور ثمین......!'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو اب تمہارا نام سننے کی بھی روادار نہیں ہے۔''

میں بوجھل قدموں سے واپس آ گیا۔

میں ان دنوں اپنے ایک دوست کے گھر میں مقیم تھا۔

چوتھی پیشی میں عدالت نے مجھے بری کر دیا۔

میں لاہور سے بددل ہو کر کراچی چلا گیا۔ کچھ عرصہ وہاں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کی پھر اس کمپنی کے ہیڈ آفس میں میرا ٹرانسفر ہوگیا اور میں امریکا چلا گیا۔

☆☆☆

پھر وقت کا پہیا اتنی تیزی سے گھوما کہ نہ جانے کتنے ماہ و سال سبک رفتار پنچھی کی طرح اُڑ گئے۔ گزرے ہو... کی راکھ میرے بالوں میں پھیل گئی۔ میں نے دن رات محنت کی، کام، کام اور بس کام!

تاریخ گویا اپنے آپ کو پھر دُہرا رہی تھی۔ ... گزر گئے۔ اب میں ڈالرز میں لکھ پتی تھا۔ میں نے ... آ کر اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا جو میری محنت اور لگن ... سے خوب پھل پھول گیا۔

چاچا نے بھی شاید اسی طرح محنت کی ہوگی، میں ... سوچتا تھا۔

بیس برس میں اباجی اور اماں جی اس دنیا سے ... ہوگئے تھے۔ میں نے اپنی دونوں بہنوں کی شادیاں ... تھیں اور دونوں اپنے گھروں میں خوش تھیں لیکن میں نے ... تک خود شادی نہیں کی تھی۔

☆☆☆

اپنی بہن کی بیٹی حرا کی شادی کے موقعے پر مجھے ... آنا پڑا۔ میری بہن نوشین کراچی میں ...... علاقے میں رہتی تھی۔ وہاں سے عبداللہ شاہ غازی کا مزار زیادہ دور نہیں تھا۔

ایک دن میں یوں ہی ٹہلتا ہوا مزار کی طرف نکل گیا۔ میں مزار پر فاتحہ پڑھ کر واپس آیا تو ایک فقیرنی کو ... ٹھٹک گیا۔ میں شاید اسے کبھی نہ پہچان پاتا لیکن اس ... آنکھیں اب بھی ویسی ہی تھیں۔ وہ شمائلہ تھی۔

شمائلہ نے بھی مجھے پہچان لیا۔ وہ دوڑ کر میرے قد... سے لپٹ گئی اور رو رو کر معافی مانگنے لگی۔

میں اسے لے کر نسبتاً ایک پُرسکون گوشے میں چلا گیا۔ وہاں میں لوگوں کی نظروں میں تماشا بن رہا تھا۔ اس نے ... کہ سارا پلان میرے باپ کا تھا۔ وہ وصیت نامہ بھی جعلی تھا ... میرے باپ نے تیار کیا تھا۔ پھر اس نے جمال کی ... جائداد جوئے اور شراب میں اُڑا دی، پھر بنگلا بھی بیچ کھایا ... مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

''مجھے معاف کر دو فراز!...... معاف کر دو۔ میں ... تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔''

اس نے واقعی میرا بہت دل دکھایا تھا۔ اس نے میری محبت کو مجھ سے چھین لیا تھا لیکن شمائلہ کے اس عبرت ناک انجام پر میں لرز کر رہ گیا تھا۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔

دوسرے دن شمائلہ کی اکڑی ہوئی لاش مزار کے ... سے ملی۔ وہ شاید مجھ سے معافی مانگنے کے لیے ہی زندہ تھی۔